فہرست مضامین معارف القرآن جلد ششم ۶

سورۂ فرقان پ۱۸

سورۃ الشعراء پ ۱۹

سُوْرَۃُ عَنکَبُوت پ ۲۰

سُوْرَۃُ رُوم پ ۲۱

تمّت

سورة مریم

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰیَۃً وَّسِتُّ رُکُوْعَاتٍ

سُوْرَۃُ مریم مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اٹھانوے آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

کٓھٰیٰعٓصٓ ۞ ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا ۞ اِذْ نَادٰی

یہ مذکور ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندہ زکریا پر جب پکارا اُس نے

رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۞ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ

اپنے رب کو چھپی آواز سے بولا اے میرے رب بوڑھی ہوگئیں میری ہڈیاں اور شعلہ نکلا

الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ۞ وَاِنِّیْ

سر سے بڑھاپے کا اور تجھ سے مانگ کر اے رب میں کبھی محروم نہیں رہا اور میں

خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَھَبْ

ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے اور عورت میری بانجھ ہے سو بخش تو

لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۞ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ

مجھ کو اپنے پاس سے ایک کام اُٹھانیوالا جو میری جگہ بیٹھے اور یعقوب کی اولاد کی،

وَاجْعَلْہُ رَبِّ رَضِیًّا ۞ یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُہٗ

اور کر اُس کو اے رب من مانتا اے زکریا ہم تجھ کو خوشخبری سُناتے ہیں ایک لڑکے کی جسکا نام ہے

یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۞ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ

یحیٰی نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی بولا اے رب کہاں سے ہوگا مجھ کو

لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ

لڑکا اور میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا یہاں تک کہ

عِتِيًّا ﴿٨﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ
اکڑ گیا　کہا یُونہی ہوگا　فرمادیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے　اور تجھ کو پیدا کیا میں نے

مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿٩﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ
پہلے سے　اور نہ تھا تو کوئی چیز　بولا اے رب ٹھہرا دے میرے لئے کوئی نشانی　فرمایا

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿١٠﴾ فَخَرَجَ عَلٰى
تیری نشانی یہ کہ بات نہ کرے تو لوگوں سے تین رات تک　صحیح تندرست　پھر نکلا اپنے لوگوں

قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿١١﴾
کے پاس حجرہ سے　تو اشارہ سے کہا اُن کو　کہ یاد کرو　صبح　اور　شام

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾ وَّ
اے یحییٰ　اُٹھا لے کتاب زور سے　اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکا پن میں　اور

حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ
شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی　اور تھا پرہیزگار　اور نیکی کرنے والا اپنے ماں باپ سے　اور

يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ
نہ تھا زبردست　خود سر　اور سلام ہے اُس پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے

وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾ ع
اور جس دن اُٹھ کھڑا ہو زندہ ہو کر

ع ۱ / ۱۵ / ۴

خلاصۂ تفسیر

کٓہٰیٰعٓصٓ ○ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آئندہ قصہ آتا ہے) تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کے مہربانی فرمانے کا اپنے (مقبول) بندہ (حضرت) زکریا (علیہ السلام کے حال) پر جبکہ اُنھوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا (جس میں یہ) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں (بوجہ پیری کے) کمزور ہو گئیں اور (میرے) سر میں بالوں کی سفیدی پھیل پڑی (یعنی تمام بال سفید ہوگئے اور اس حالت کا مقتضا یہ ہے کہ میں اس حالت میں اولاد کی درخواست نہ کروں مگر چونکہ آپ کی قدرت و رحمت بڑی کامل ہے) اور (میں اس قدرت و رحمت کے ظہور کا خوگر ہمیشہ رہا ہوں چنانچہ

اس کے قبل کبھی) آپ سے (کوئی چیز) مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں (اس بنا پر بعید سے بعید مقصود بھی طلب کرنا مضائقہ نہیں) اور (اُس طلب کا مرجع یہ امر خاص ہوگیا ہے کہ) میں اپنے (مرنے کے) بعد (اپنے) رشتہ داروں (کی طرف) سے (یہ) اندیشہ رکھتا ہوں (کہ میری مرضی کے موافق شریعت اور دین کی خدمت نہ بجالاویں گے۔ یہ امر مرجع ہے طلب اولاد کے لئے جس میں خاص خاص اوصاف پائے جاویں جن کو توقع خدمتِ دین میں دخل ہو) اور (چونکہ میری پیرانہ سالی کے ساتھ) میری بیوی (بھی) بانجھ ہے (جس کے کبھی باوجود صحتِ مزاج کے اولاد ہی نہیں ہوئی اسلئے اسبابِ عادیہ اولاد ہونے کے بھی مفقود ہیں سو (اس صورت میں) آپ مجھ کو خاص اپنے پاس سے (یعنی بلا توسط اسبابِ عادیہ کے) ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دیدیجئے کہ وہ (میرے علومِ خاصّہ میں) میرا وارث بنے اور (میرے جد) یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان (کے علوم متوارثہ میں اُن) کا وارث بنے (یعنی علومِ سابقہ ولاحقہ اُس کو حاصل ہوں) اور (بوجہ باعمل ہونے کے) اس کو اے میرے رب (اپنا) پسندیدہ (ومقبول) بنائیے (یعنی عالم بھی ہو اور عامل بھی ہو۔ حق تعالیٰ کا بواسطہ ملائکہ کے ارشاد ہوا کہ) اے زکریا ہم تم کو ایک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جسکا نام یحییٰ ہوگا کہ اسکے قبل (خاص اوصاف میں) ہم نے کسی کو اسکا ہم صفت نہ بنایا ہوگا (یعنی جس علم وعمل کی تم دُعا کرتے ہو وہ تو اس فرزند کو ضرور ہی عطا کریں گے اور مزید برآں کچھ اوصافِ خاصّہ بھی عنایت کئے جاویں گے مثلاً خشیتِ الٰہیہ سے خاص درجہ کی رقتِ قلب وغیرہ۔ چونکہ اس اجابتِ دُعا میں کوئی خاص کیفیت حصولِ ولد کی بتلائی نہ گئی تھی اس لئے اس کے استفسار کیلئے) زکریا (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے میرے رب میرے اولاد کس طرح پر ہوگی حالانکہ میری بی بی بانجھ ہے اور (ادھر) میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں (پس معلوم نہیں کہ ہم جوان ہونگے یا مجھ کو دوسرا نکاح کرنا ہوگا یا بحالتِ موجودہ اولاد ہوگی) ارشاد ہوا کہ حالت (موجودہ) یُوں ہی رہے گی (اور پھر اولاد ہوگی اے زکریا) تمہارے رب کا قول ہے کہ یہ (امر) مجھ کو آسان ہے اور (یہ کیا اس سے بڑا کام کرچکا ہوں مثلاً) میں نے تم کو (ہی) پیدا کیا ہے حالانکہ (پیدائش کے قبل) تم کچھ بھی نہ تھے (اسی طرح خود اسبابِ عادیہ بھی کوئی چیز نہ تھے جب معدوم کو موجود کرنا آسان ہے تو ایک موجود سے دوسرا موجود کردینا کیا مشکل ہے یہ سب ارشاد تقویت رجا کے لئے تھا نہ کہ دفع شبہ کے لئے، کیونکہ زکریا علیہ السلام کو کوئی شبہ نہ تھا جب) زکریا (علیہ السلام کو قوی اُمید ہوگئی تو انھوں) نے عرض کیا کہ اے میرے رب (وعدہ پر تو اطمینان ہوگیا اب اس وعدہ کے قریب وقوع یعنی حمل کی بھی) کوئی علامت میرے لئے مقرر فرما دیجئے (تاکہ زیادہ شکر کروں اور خود وقوع تو محسوساتِ ظاہرہ ہی میں سے ہے) ارشاد ہوا کہ تمھاری (وہ) علامت یہ ہے کہ تم تین رات (اور تین دن تک) آدمیوں سے بات (چیت) نہ کرسکو گے حالانکہ تندرست ہوگے (کوئی بیماری وغیرہ

۲

نہ ہوگی اور اسی وجہ سے ذکر اللہ کے ساتھ تکلم پر قدرت رہے گی چنانچہ باذن اللہ تعالیٰ زکریا علیہ السلام کی بیوی حاملہ ہوئیں اور حسب اخبار الٰہی زکریا علیہ السلام کی زبان بستہ ہوگئی) پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے اور اُن کو اشارہ سے فرمایا (کیونکہ زبان سے تو بول نہ سکتے تھے) کہ تم لوگ صبح اور شام خدا کی پاکی بیان کیا کرو۔ (یہ تسبیح اور امر بالتسبیح یا تو حسب معمول تھا ہمیشہ تذکیراً زبان سے کہتے تھے آج اشارۃً سے کہا یا اس نعمتِ جدیدہ کے شکر میں خود بھی تسبیح کی کثرت فرمائی اور اوروں کو بھی اسی طور پر امر فرمایا غرض پھر یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سنِ شعور کو پہنچے تو اُن کو حکم ہوا کہ) اے یحییٰ کتاب کو (یعنی توریت کو کہ اسوقت وہی کتاب شریعت تھی اور انجیل کا نزول بعد میں ہوا) مضبوط ہو کر لو (یعنی خاص کوشش کے ساتھ عمل کرو) اور ہم نے ان کو (انکے) لڑکپن ہی میں (دین کی) سمجھ اور خاص اپنے پاس سے رقتِ قلب (کی صفت) اور پاکیزگی (اخلاق کی) عطا فرمائی تھی (حکم میں علم کی طرف اور حنان اور زکوٰۃ میں اخلاق کی طرف اشارہ ہوگیا) اور (آگے اعمالِ ظاہرہ کیطرف اشارہ فرمایا کہ) وہ بڑے پرہیزگار اور اپنے والدین کے خدمت گزار تھے (اسمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی طرف اشارہ ہوگیا) اور وہ (خلق کے ساتھ) سرکشی کرنیوالے (یا حق تعالیٰ کی) نافرمانی کرنے والے نہ تھے اور (عند اللہ ایسے وجیہ اور مکرم تھے کہ اُنکے حق میں منجانب اللہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ) ان کو (اللہ تعالیٰ کا) سلام پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اُٹھائے جاویں گے۔

معارف و مسائل

سورۂ کہف کے بعد سورۂ مریم شاید اس مناسبت سے رکھی گئی کہ جیسے سورۂ کہف بہت سے واقعاتِ عجیبہ پر مشتمل تھی اسی طرح سورۂ مریم بھی ایسے واقعاتِ غریبہ پر مشتمل ہے (روح المعانی)

کٓھٰیٰعٓصٓ حروف مقطعہ اور متشابہات میں سے ہے جسکا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے بندوں کے لئے اِس کی تفتیش بھی اچھی نہیں۔ نِدَآءً خَفِیًّا، اس سے معلوم ہوا کہ دُعار کا آہستہ اور خفیہ کرنا افضل ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ خیر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی، یعنی بہترین ذکر خفی (آہستہ) ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہو جائے (ضرورت سے نہ گھٹے نہ بڑھے) (قرطبی)

اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا، کمزوری ہڈیوں کی ذکر فرمائی کیونکہ وہی عمود بدن ہیں، جب ہڈی ہی کمزور ہو جائے تو سارے بدن کی کمزوری ہے۔ اشتعال کے لفظی معنی بھڑک اُٹھنے کے ہیں اس جگہ بالوں کی سفیدی کو آگ کی روشنی سے تشبیہ دیکر اسکا پورے سر پر پھیل جانا مقصود ہے۔

دُعا میں اپنی حاجتمندی کا اظہار مستحب ہے | اس جگہ دُعار سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے

ضعف و کمزوری کا ذکر کیا، اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان حالات کا مقتضا یہ تھا کہ اولاد کی خواہش نہ کروں۔ ایک دوسری وجہ امام قرطبی نے تفسیر میں یہ بھی بیان فرمائی کہ دُعا مانگنے کے وقت اپنے ضعف و بدحالی اور حاجتمندی کا ذکر کرنا قبولیتِ دُعاء کے لئے اقرب ہے اسی لئے علماء نے فرمایا کہ انسان کو چاہیئے کہ دُعاء کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حاجتمندی کا ذکر کرے۔

مَوَالِیَ ، مولیٰ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اُن میں سے ایک معنی چچا زاد بھائی اور اپنے عصبات کے بھی آتے ہیں اس جگہ وہی مُراد ہے۔

انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی | یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ، باتفاق جمہور علماء اس جگہ وراثت سے وراثتِ مالی مراد نہیں، کیونکہ اوّل تو حضرت زکریا کے پاس کوئی بڑی دولت ہونا ثابت نہیں جس کی فکر ہو کہ اسکا وارث کون ہوگا اور ایک پیغمبر کی شان سے بھی ایسی فکر کرنا بعید ہے اس کے علاوہ صحیح حدیث جس پر صحابہؓ کرام کا اجماع ثابت ہے یہ ہے

انّ العلماء ورثۃ الانبیاء وانّ الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا انما ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر رواہ احمد وابو داؤد وابن ماجہ والترمذی	بیشک علماء وارث ہیں انبیاء کے کیونکہ انبیاء علیہم السلام دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ اُن کی وراثت علم ہوتا ہے جس نے علم حاصل کرلیا اُس نے بڑی دولت حاصل کرلی۔

یہ حدیث کتبِ شیعہ کافی، کلینی وغیرہ میں بھی موجود ہے، اور صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا نورث وما ترکنا صدقۃ	ہم انبیاء کی مالی وراثت کسی کو نہیں ملتی ہم جو مال چھوڑیں وہ سب صدقہ ہے۔

اور خود اس آیت میں یَرِثُنِیْ کے بعد وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ کا اضافہ اسکی دلیل ہے کہ وراثت مالی مُراد نہیں کیونکہ جس لڑکے کی پیدائش کی دُعا کی جارہی ہے اسکا آلِ یعقوب کے لئے مالی وارث بننا بظاہر حال ممکن نہیں۔ کیونکہ آلِ یعقوب کے وارث اُن کے عصبات قریبہ ہونگے اور وہ وہی مَوَالِیَ ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا وہ بلاشبہ قرابت و عصوبت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے اقرب ہیں اقرب کے ہوتے ہوئے عصبہ بعید کو وراثت. ملنا اُصولِ وراثت کے خلاف ہے۔

روح المعانی میں کتبِ شیعہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

روی الکلینی فی الکافی عن ابی البختری عن ابی عبداللہ قال ان سلیمان ورث داؤد وان محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم ورث سلیمان	سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی مالی وراثت ملنے کا کوئی احتمال و امکان ہی نہیں، مراد اس سے علوم نبوت کی وراثت ہے اس سے معلوم ہوا کہ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ میں بھی وراثت مالی مراد نہیں۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا، لفظ سَمِیّ کے معنے ہمنام کے بھی آتے ہیں، اور مثل و مشابہ کے بھی، اس جگہ اگر پہلے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب واضح ہے کہ ان سے پہلے یحییٰ نام کسی شخص کا نہیں ہوا تھا۔ یہ نام کی یکتائی اور امتیاز بھی بعض خاص صفات میں اُنکی یکتائی کیطرف مشیر تھی اسلئے اس کو ان کی صفتِ خاص میں ذکر کیا گیا۔ اور اگر دوسرے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب یہ ہوگا کہ بعض خاص صفات اور حالات اُن کے ایسے ہیں جو پچھلے انبیاء میں کسی میں نہ تھے اُن صفاتِ خاصّہ میں وہ بے مثل تھے۔ مثلاً اُن کا حَصُوْر ہونا وغیرہ اسلئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یحییٰ علیہ السلام پچھلے سارے انبیاء سے مطلقاً افضل ہوں کیونکہ اُن میں حضرت خلیل اللہ اور حضرت کلیم اللہ کا ان سے افضل ہونا مسلّم و معروف ہے۔ (مظہری)

عِتِيًّا، عتو سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تأثر قبول نہ کرنا ہے مراد اس سے ہڈیوں کا خشک ہوجانا ہے۔

سَوِيًّا، کے معنے تندرست کے ہیں یہ لفظ اس لئے بڑھایا گیا کہ زکریا علیہ السلام پر اس حالت کا طاری ہونا کہ کسی انسان سے بات نہ کرسکیں کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا اور اسی وجہ سے ذکر اللہ اور عبادت میں اُنکی زبان ان تینوں دنوں میں برابر کھلی ہوئی تھی بلکہ یہ حالت بطور معجزہ اور علامتِ حمل کے اُن پر طاری کی گئی تھی۔ حَنَانًا، اس لفظ کے لغوی معنے رقتِ قلب اور رحمت و شفقت کے ہیں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کو امتیازی طور پر دی گئی تھی۔

وقف لازم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا

اور مذکور کر کتاب میں مریم کا جب جدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان

شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا

میں پھر پکڑ لیا اُن سے ورے ایک پردہ پھر بھیجا ہم نے اسکے پاس

رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ

اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اُس کے آگے آدمی پورا بولی مجھ کو رحمٰن کی

بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ

پناہ تجھ سے اگر ہے تو ڈر رکھنے والا بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے

رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ

رب کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا بولی کہاں سے ہوگا میرے

غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ
لڑکا اور چھوا نہیں مجھ کو آدمی نے اور میں بدکار کبھی نہیں تھی بولا یونہی ہے
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً
فرمادیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے اور اُس کو ہم کیا چاہتے ہیں لوگوں کے لئے نشانی اور مہربانی اپنی
مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾
طرف سے، اور ہے یہ کام مقرر ہو چکا

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کتاب (یعنی قرآن کے اس خاص حصہ یعنی سورت) میں حضرت مریم (علیہا السلام) کا قصہ بھی ذکر کیجئے (کہ وہ زکریا علیہ السلام کے قصۂ مذکورہ سے خاص مناسبت رکھتا ہے اور وہ اُسوقت واقع ہوا) جب کہ وہ اپنے گھروالوں سے علیحدہ (ہوکر) ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لئے) گئیں پھران (گھروالے) لوگوں کے سامنے سے اُنھوں نے (درمیان میں) پردہ ڈال لیا (تاکہ اس کی آڑ میں غسل کرسکیں) پس (اس حالت میں) ہم نے اپنے فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) کو بھیجا اور وہ (فرشتہ) اُن کے سامنے (ہاتھ پاؤں اور صورت وشکل میں) ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا (چونکہ حضرت مریم نے اُس کو انسان سمجھا اسلئے گھبراکر) کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اپنے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خداترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جاویگا) فرشتہ نے کہا کہ (میں بشر نہیں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو بلکہ) میں تو تمہارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں (اس لئے آیا ہوں) تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں (یعنی تمہارے منہ میں یا گریبان میں دَم کردوں جس کے اثر سے باذن اللہ حمل رہ جاوے اور لڑکا پیدا ہو) وہ (تعجب سے) کہنے لگیں (نہ کہ انکار سے) کہ میرے لڑکا کس طرح ہوجاویگا حالانکہ (اسکی شرائط عادیہ میں سے مرد کے ساتھ مقاربت ہے اور وہ بالکل مفقود ہے کیونکہ) مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا (یعنی نہ تو نکاح ہوا) اور نہ میں بدکار ہوں، فرشتہ نے کہا کہ (بس بغیر کسی بشر کے چھونے کے) یوں ہی (لڑکا) ہوجاوے گا (اور میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ) تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات (کہ بغیر اسباب عادیہ کے بچہ پیدا کردوں) مجھ کو آسان ہے اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم بغیر اسباب عادیہ کے) اس خاص طور پر اس لئے پیدا کریں گے تاکہ ہم اُس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی (قدرت کی) بنادیں اور (نیز اُسکے ذریعہ لوگوں کو ہدایت پانے کے لئے) اس کو باعث رحمت بنادیں اور یہ (بے باپ کے اس بچہ کا پیدا ہونا) ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہوکر رہے گی)۔

معارف ومسائل

اِنْتَبَذَتْ ، نبذ سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے دُور ڈالنے اور پھینکنے کے ہیں ۔ انتباذ کے معنی مجمع سے ہٹ کر دُور چلے جانے کے ہوئے ۔ مَكَانًا شَرْقِيًّا ، یعنی گھر کے اندر مشرقی جانب کے کسی گوشہ میں چلی گئیں ۔ اُن کا گوشہ میں جانا کس غرض کے لئے تھا اسمیں احتمالات اور اقوال مختلف ہیں بعض نے کہا کہ غسل کرنے کے لئے اُس گوشہ میں گئی تھیں ۔ بعض نے کہا کہ حسبِ عادت عباداتِ الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے محراب کی شرقی جانب کے کسی گوشہ کو اختیار کیا تھا ۔ قرطبی نے اسی دوسرے احتمال کو احسن قرار دیا ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نصارٰی نے جو جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنایا اور اس جانب کی تعظیم کرتے ہیں اُس کی وجہ یہی ہے ۔

فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا ، رُوح سے مُراد جمہور کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں ۔ اور بعض نے کہا کہ خود حضرت عیسٰی علیہ السلام مُراد ہیں ، اللہ تعالیٰ نے اُن کے بطن سے پیدا ہونے والے بشر کی شبیہ اُن کے سامنے کردی ۔ مگر پہلا قول راجح ہے بعد کے کلمات سے اسی کی تائید ہوتی ہے ۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ، فرشتہ کو اُس کی اپنی اصلی صورت و ہیئت میں دیکھنا انسان کے لئے آسان نہیں ، اُس کی ہیبت غالب آجاتی ہے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم کو غارِ حرار میں اور بعد میں پیش آیا ۔ اس مصلحت سے جبرئیلِ امین حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بشکلِ انسانی ظاہر ہوئے ۔ جب حضرت مریم نے ایک انسان کو اپنے قریب دیکھا جو پردہ کے اندر آگیا تو خطرہ ہوا کہ اس کا ارادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اس لئے فرمایا :

إِنِّىٓ أَعُوذُ بِٱلرَّحْمَٰنِ مِنكَ ، (میں اللہ رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں تجھ سے) بعض روایات میں ہے کہ جبرئیلِ امین نے یہ کلمہ سُنا تو اللہ کے نام کی تعظیم کے لئے کچھ پیچھے ہٹ گئے ۔

إِن كُنتَ تَقِيًّا ، یہ کلمہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی ظالم سے مجبور ہو کر فریاد کرے کہ اگر تو مؤمن ہے تو مجھ پر ظلم نہ کر ۔ تیرا ایمان اس ظلم سے روکنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے ۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لئے مناسب ہے کہ اللہ سے ڈرو ، غلط اقدام سے بچو ۔ خلاصہ یہ ہے کہ إِن كُنتَ تَقِيًّا ، استعاذہ کی شرط نہیں بلکہ استعاذہ کے مؤثر ہونے کی شرط برائے ترغیب ہے ۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ کلمہ بطور مبالغہ کے لایا گیا ہے کہ اگر تم متقی بھی ہو تب بھی میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اور اسکے خلاف ہو تو معاملہ ظاہر ہے ۔ (مظہری)

لِأَهَبَ لَكِ ، اس میں عطار فرزند کو جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طرف اس لئے منسوب کیا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے بھیجا تھا کہ اُن کے گریبان میں پھونک ماردیں ۔ یہ پھونک عطار فرزند کا ذریعہ بن جائے گی ، اگرچہ یہ عطار دراصل فعلِ الٰہی ہے ۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ

پھر پیٹ میں لیا اس کو پھر یکسو ہوئی اسکو لیکر ایک بعید مکان میں، پھر لے آیا اسکو درد زہ

اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ

ایک کھجور کی جڑ میں بولی کسی طرح میں مر چکتی اس سے پہلے اور ہو جاتی

نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ

بھولی بسری پس آواز دی اسکو اسکے نیچے سے کہ غمگین مت ہو کر دیا تیرے

رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ

رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ اور ہلا اپنی طرف کھجور کی جڑ

تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ

اُس سے گریں گی تجھ پر پکی کھجوریں اب کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی رکھ

فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ

پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی تو کہیو میں نے مانا ہے رحمٰن کا

صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ ۚ

روزہ سو بات نہ کروں گی آج کسی آدمی سے

خلاصۂ تفسیر

پھر (اس گفتگو کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے اُن کے گریبان میں پھونک مار دی جس سے) اُن کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا، پھر (جب اپنے وقت پر حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے آثار محسوس ہوئے تو) اس حمل کو لئے ہوئے (اپنے گھر سے) کسی دُور جگہ (جنگل پہاڑ میں) الگ چلی گئیں پھر (جب درد شروع ہوا تو) دردِ زہ کی وجہ سے کھجور کے درخت کی طرف آئیں (کہ اس کے سہارے بیٹھیں اُٹھیں، اب حالت یہ تھی کہ نہ کوئی انیس نہ جلیس، درد سے بے چین، ایسے وقت جو سامان راحت و ضرورت کا ہونا چاہیئے وہ ندارد، ادھر بچہ ہونے پر بدنامی کا خیال، آخر گھبرا کر) کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مرگئی ہوتی اور ایسی نیست و نابود ہو جاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی، پس (اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت) جبرئیل (علیہ السلام پہنچے اور اُن کے احترام کی وجہ سے سامنے نہیں گئے بلکہ جس مقام پر حضرت مریم تھیں اس سے اسفل مقام میں آڑ میں آئے اور

اُنھوں) نے اُن کے (اس) پائیں (مکان) سے ان کو پکارا۔ (جس کو حضرت مریم نے پہچانا کہ یہ اُسی فرشتہ کی آواز ہے جو اوّل ظاہر ہوا تھا) کہ تم (بے سروسامانی سے یا خوفِ بد نامی سے) مغموم مت ہو، (کیونکہ بے سروسامانی کا تو یہ انتظام ہوا ہے کہ) تمہارے رب نے تمہارے پائیں (مکان) میں ایک نہر پیدا کردی ہے (جس کے دیکھنے سے اور پانی پینے سے فرحت طبعی ہو ونیز حسبِ روایتِ روح انکو اس وقت پیاس بھی لگی تھی اور حسب مسئلہ طبیہ گرم چیزوں کا استعمال قبلِ وضع یا بعد وضع مسہلِ ولادت و دافعِ فضلات و مقوی طبیعت بھی ہے اور پانی میں اگر سخونت (گرمی) بھی ہو جیسا بعض چشموں میں مشاہد ہے تو اور زیادہ مزاج کے موافق ہوگا، ونیز کھجور کثیر الغذار مولّدِ خون، مسمّن و مقوی گردہ کمر و مفاصل ہونے کی وجہ سے زچہ کے لئے سب غذاؤں اور دواؤں سے بہتر ہے اور حرارت کی وجہ سے جو اُس کی مضرت کا احتمال ہے سو اوّل تو رطب میں حرارت کم ہے، دوسرے پانی سے اسکی اصلاح ہوسکتی ہے تیسرے مضرت کا ظہور جب ہوتا ہے کہ عضو میں ضعف ہو ورنہ کوئی چیز بھی کچھ نہ کچھ مضرت سے خالی نہیں ہوتی ونیز خرق عادت (کرامت) کا ظہور اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت ہونے کی وجہ سے موجب مسرتِ روحانی بھی ہے) اور اس کھجور کے تنہ کو (پکڑ کر) اپنی طرف ہلاؤ اس سے تم پر تر و تازہ کھجوریں جھڑیں گی (کہ اس سے پھل کے کھانے میں لذتِ جسمانی اور بطور خرق عادت کے پھل کے آنے میں لذتِ روحانی مجتمع ہے) پھر (اس پھل کو) کھاؤ اور (وہ پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو (یعنی بچّہ کے دیکھنے سے اور کھانے پینے سے اور علامت قبول عند اللہ ہونے سے خوش رہو) پھر (جب بدنامی کے احتمال کا موقع آوے یعنی کوئی آدمی اس قصہ پر مطلع ہو تو اسکا یہ انتظام ہوا ہے کہ) اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو بھی (آتا اور اعتراض کرتا) دیکھو تو (تم کچھ مت بولنا بلکہ اشارہ سے اس سے) کہہ دینا کہ میں نے تو اللہ کے واسطے (ایسے) روزہ کی منت مان رکھی ہے (جس میں بولنے کی بندش ہے) سو (اس وجہ سے) میں آج (دن بھر) کسی آدمی سے نہیں بولوں گی (اور خدا کے ذکر اور دُعا میں مشغول ہونا اور بات ہے بس تم اتنا جواب دیکر بے فکر ہوجانا، اللہ تعالیٰ اس مولود مسعود کو خرقِ عادت کے طور پر بولتا کردیگا جس سے ظہور اعجاز دلیل نزاہت و عصمت ہوجاویگی غرض ہر غم کا علاج ہوگیا۔)

معارف و مسائل

تمنائے موت کا حکم | یہ تمنائے موت اگر غمِ دُنیا سے تھی تب تو غلبۂ حال کو اسکا عذر کہا جاویگا جس میں انسان من کلّ الوجوہ مکلف نہیں رہتا اور اگر غمِ دین سے تھا کہ لوگ بدنام کریں گے اور شاید مجھے اس پر صبر نہ ہوسکے تو بے صبری کی معصیت میں ابتلا ہوگا، موت سے اس معصیت کی حفاظت رہیگی تو ایسی تمنا ممنوع نہیں ہے اور اگر شبہ ہو کہ حضرت مریم کو جو کہا گیا کہ تم کہہ دینا

کہ میں نے نذر کی ہے سو اُنھوں نے نذر تو نہ کی تھی، جواب یہ ہے کہ اسی سے یہ حکم بھی مفہوم ہو گیا کہ تم نذر بھی کر لینا اور اس کو ظاہر کر دینا۔

سکوت کا روزہ شریعتِ اسلامیہ میں منسوخ ہو گیا قبل از اسلام یہ بھی عبادت میں داخل تھا کہ بولنے کا روزہ رکھے، صبح سے رات تک کسی سے کلام نہ کرے۔ اسلام نے اس کو منسوخ کر کے یہ لازم کر دیا کہ صرف بُرے کلام گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ عام گفتگو ترک کرنا اسلام میں کوئی عبادت نہیں رہی اس لئے اس کی نذر ماننا بھی جائز نہیں۔ لما رواہ ابوداؤد مرفوعًا لایتم بعد احتلام ولا صمات یوم الی اللیل وحسنہ السیوطی والعزیزی، یعنی بچہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے مرنے سے یتیم نہیں کہلاتا، اُس پر احکام یتیم کے جاری نہیں ہوتے اور صبح سے شام تک خاموش رہنا تو (اسلام میں) کوئی عبادت نہیں۔ اور در درزہ میں پانی اور کھجور کا استعمال طبًّا بھی مفید ہے اور اکل و شرب کا حکم بظاہر اباحت کے لئے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلافِ عقل نہیں اور حمل و تولد بلا توسط مرد کے خارق عادت (معجزہ) ہے اور خوارق میں کتنا ہی استبعاد ہو مضائقہ نہیں بلکہ وصفِ اعجاز کا اور زیادہ ظہور ہے لیکن اس میں اس وجہ سے زیادہ استبعاد بھی نہیں کہ حسب تصریح کتبِ طب عورت کی منی میں قوتِ منعقدہ کے ساتھ قوتِ عاقدہ بھی ہے اس لئے مرض رَجا میں اعضاء کی کچھ نا تمام صورت بھی بن جاتی ہے کما صرح بہ فی القانون، پس اگر یہی قوتِ عاقدہ اور بڑھ جائے تو زیادہ مستبعد نہیں ہے۔ (بیان القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجور کا درخت ہلانے کا حکم دیا، حالانکہ اُس کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ بغیر اُن کے ہلانے کے خود ہی کھجوریں اُن کی گود میں گر جاتیں مگر حکمت یہ ہے کہ اس میں تحصیلِ رزق کے لئے کوشش کرنے کا سبق ملتا ہے اور یہ بھی بتلانا ہے کہ رزق کے حاصل کرنے میں کوشش اور محنت کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ (رُوح المعانی)

سَرِيًّا، لفظ سری کے لغوی معنی چھوٹی نہر کے ہیں۔ اس موقع پر حق تعالیٰ نے ایک چھوٹی نہر اپنی قدرت سے بلا واسطہ جاری فرمادی یا جبرئیل کے ذریعہ چشمہ جاری کرا دیا، دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت مریم کی تسلی کے اسباب ذکر کرنے کے وقت تو پہلے پانی کا ذکر فرمایا پھر کھانے کی چیز کھجور کا، اور جب استعمال کا ذکر آیا تو ترتیب بدل کر پہلے کھانے کا حکم فرمایا پھر پانی پینے کا۔ **كُلِي وَاشْرَبِي**، وجہ غالبًا یہ ہے کہ انسان کی فطری عادت ہے کہ پانی کا اہتمام کھانے سے پہلے کرتا ہے خصوصًا کوئی ایسی غذا جس کے بعد پیاس لگنا یقینی ہو اُسکے کھانے سے پہلے پانی مہیا کرتا ہے مگر استعمال کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے غذا کھاتا ہے پھر پانی پیتا ہے۔ (رُوح المعانی)

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا

پھر لائی اس کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں وہ اُس کو کہنے لگے اے مریم تو نے کی یہ چیز طوفان

فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ

کی اے بہن ہارون کی نہ تھا تیرا باپ بُرا آدمی اور نہ تھی تیری

اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ

ماں بدکار پھر ہاتھ سے بتلایا اُس لڑکے کو بولے ہم کیونکر بات کریں اُس شخص سے

فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ

کہ وہ ہے گود میں لڑکا وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اُس نے کتاب دی ہے اور

جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِيْ

مجھ کو اُس نے نبی کیا اور بنایا مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں اور تاکید کی مجھ کو

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ

نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ اور سلوک کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں

يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ

بنایا مجھ کو زبردست بدبخت اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن

اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

مروں اور جس دن اُٹھ کھڑا ہوں زندہ ہوکر

خلاصۂ تفسیر

(غرض مریم علیہا السلام کی اس کلام سے تسلی ہوئی اور عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوئے) پھر وہ ان کو گود میں لئے ہوئے (وہاں سے بستی کو چلیں اور) اپنی قوم کے پاس لائیں، لوگوں نے (جو دیکھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی یہ بچہ کیسا، بدگمان ہوکر) کہا اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا (یعنی نعوذ باللہ بدکاری کی، اور یوں تو بدکاری کوئی بھی کرے بُرا ہے لیکن تم سے ایسا فعل ہونا زیادہ غضب کی بات ہے کیونکہ) اے ہارون کی بہن! (تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا چنانچہ) تمہارے باپ کوئی بُرے آدمی نہ تھے (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو، پھر ہارون جو تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں جن کا نام ان ہارون نبی کے نام پر رکھا

گیا ہے وہ کیسے کچھ نیک شخص ہیں، غرض جسکا خاندان کا خاندان پاک صاف ہو اُس سے یہ حرکت ہونا کتنا بڑا غضب ہے) پس مریم (علیہا السلام) نے (یہ ساری تقریر سُن کر کچھ جواب نہیں دیا بلکہ) بچہ کی طرف اشارہ کر دیا (کہ اس سے کہو جو کچھ کہنا ہو یہ جواب دیگا) وہ لوگ (سمجھے کہ یہ ہمارے ساتھ تمسخر کرتی ہیں) کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسے شخص سے کیونکر باتیں کریں جو ابھی گود میں بچہ ہی ہے (کیونکہ بات اُس شخص سے کی جاتی ہے جو کہ وہ بھی بات چیت کرتا ہو، سو جب یہ بچہ ہے اور بات پر قادر نہیں، تو اس سے کیا بات کریں اتنے میں) وہ بچہ (خود ہی) بول اُٹھا کہ میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں (نہ تو اللہ ہوں جیسا کہ جہلاء نصاریٰ سمجھیں گے اور نہ غیر مقبول ہوں جیسا یہود سمجھیں گے اور بندہ ہونے کے اور پھر خاص ہونے کے یہ آثار ہیں کہ) اُس نے مجھ کو کتاب (یعنی انجیل) دی (یعنی گو آئندہ دے گا مگر بوجہ یقینی ہونے کے ایسا ہی ہے جیسا کہ دیدی) اور اس نے مجھ کو نبی بنایا (یعنی بناوے گا) اور مجھ کو برکت والا بنایا (یعنی مجھ سے خلق کو دین کا نفع پہنچے گا) میں جہاں کہیں بھی ہوں (گا مجھ سے برکت پہنچیگی وہ نفع تبلیغ دین ہے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے اُنھوں نے تو نفع پہنچا ہی دیا) اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جبتک میں (دُنیا میں) زندہ رہوں (اور ظاہر ہے کہ آسمان پر جانے کے بعد مکلّف نہیں رہے اور یہ دلیل ہے بندہ ہونے کی جیسا کہ اور دلائل ہیں خصوصیت کے) اور مجھ کو میری والدہ کا خدمتگذار بنایا (اور چونکہ بے باپ پیدا ہوئے ہیں اس لئے والدہ کی تخصیص کی گئی) اور اس نے مجھکو سرکش بدبخت نہیں بنایا (کہ ادائے حقِ خالق یا ادائے حقِ والدہ سے سرکشی کروں یا حقوق و اعمال کے ترک سے بدبختی خرید لوں) اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا (کہ وہ زمانہ قرب قیامت کا بعد نزول من السماء کے ہوگا) اور جس روز میں (قیامت میں) زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا (اور اللہ کا سلام دلیل ہے خاص بندہ ہونے کی)۔

معارف و مسائل

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ، ان الفاظ سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت مریم کو جب غیبی بشارتوں کے ذریعہ اسکا اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بدنامی اور رُسوائی سے بچا دیں گے تو خود ہی اپنے نومولود بچے کو لیکر اپنے گھر واپس آگئیں۔ پھر یہ واپسی پیدائش کے کتنے دن بعد ہوئی۔ ابن عساکر کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولادت سے چالیس روز بعد جب نفاس سے فراغت و طہارت ہو چکی اُس وقت اپنے گھر والوں کے پاس آئیں (رُوح المعانی)

شَیْئًا فَرِیًّا، لفظ فری عربی زبان میں دراصل کاٹنے اور پھاڑنے کے معنی میں آتا ہے، جس کام یا جس چیز کے ظاہر ہونے میں غیر معمولی کاٹ چھانٹ ہو اُس کو فری کہتے ہیں۔ ابو حیان نے فرمایا کہ

ہر امرِ عظیم کو فری کہا جاتا ہے خواہ وہ اچھائی کے اعتبار سے عظیم ہو یا برائی کے اعتبار سے۔ اس جگہ بڑی برائی کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا اکثر استعمال ایسی ہی چیز کے لئے معروف ہے جو اپنی شناعت اور برائی کے اعتبار سے غیر معمولی اور بڑی سمجھی جاتی ہو۔

یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ ، حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ساتھی تھے حضرت مریم کے زمانے سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے یہاں حضرت مریم کو ہارون کی بہن قرار دینا ظاہر ہے کہ اپنے اس ظاہری مفہوم کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا اسی لئے جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے پاس بھیجا تو انھوں نے سوال کیا کہ تمہارے قرآن میں حضرت مریم کو اُخت ہارون کہا گیا ہے حالانکہ ہارون علیہ السلام اُن سے بہت قرنوں پہلے گزر چکے ہیں حضرت مغیرہ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا جب واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہدیا کہ اہلِ ایمان کی عادت یہ ہے کہ تبرکاً انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے نام رکھتے ہیں اور اُن کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد و مسلم والترمذی والنسائی) اس حدیث کے مطلب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت مریم کی نسبت حضرت ہارون کیطرف اس لئے کردی گئی کہ وہ اُن کی نسل و اولاد میں سے ہیں اگرچہ زمانہ کتنا ہی بعید ہو گیا ہو جیسے عرب کی عادت ہے کہ قبیلہ تمیم کے آدمی کو اخا تمیم اور عرب کے آدمی کو اخا عرب بولتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں ہارون سے مراد ہارون نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق مراد نہیں بلکہ حضرت مریم کے اپنے بھائی کا نام ہارون تھا جو تبرکاً حضرت ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا تھا اس طرح مریم کو اخت ہارون کہنا اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے درست ہو گیا۔

مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ ، ان الفاظِ قرآن سے اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ اور صالحین کی اولاد میں ہو وہ اگر کوئی برا کام کرتا ہے تو وہ عام لوگوں کے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے اُس کے بڑوں کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے اس لئے اولاد صالحین کو اعمالِ صالحہ اور تقویٰ کی زیادہ فکر کرنا چاہیے۔

اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ، ایک روایت میں ہے کہ جس وقت خاندان کے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو ملامت کرنا شروع کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے۔ جب انھوں نے ان لوگوں کی ملامت کو سنا تو دودھ چھوڑ دیا اور اپنی بائیں کروٹ پر سہارا لیکر اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کا بندہ ہوں، اس پہلے ہی لفظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ اگرچہ میری پیدائش معجزانہ انداز سے ہوئی ہے مگر میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں تاکہ لوگ میری پرستش میں مبتلا نہ ہو جائیں

اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا، ان الفاظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت اور کتاب ملنے کی خبر دی۔ حالانکہ کسی پیغمبر کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبوت وکتاب نہیں ملتی! اسلئے مفہوم اسکا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرما دیا ہے کہ مجھے اپنے وقت پر نبوت اور کتاب دیں گے اور یہ بالکل ایسا ہے جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ مجھے نبوت اُس وقت عطا کردی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اُن کا خمیر ہی تیار ہورہا تھا! اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اس کے سوا نہیں کہ عطاءِ نبوت کا وعدہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے قطعی اور یقینی تھا یہاں بھی اسی یقین کو عطاء نبوت کے لفظ ماضی سے تعبیر کردیا گیا ہے۔ عطاءِ نبوت کا اظہار کرنے سے ان لوگوں کی بدگمانی رفع کردی گئی کہ میری والدہ پر بدکاری کا الزام لگانا سراسر غلط ہے کیونکہ میرا نبی ہونا اور مجھے رسالت کا ملنا اسکی دلیل ہے کہ میری پیدائش میں کسی گناہ کا دخل نہیں ہوسکتا۔

اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ، کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اسکو وصیت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس جگہ فرمایاکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی اسکا مفہوم یہی ہے کہ بڑی تاکید سے ان دونوں چیزوں کا مجھے حکم دیا۔

نماز اور زکوٰۃ، ایسی عبادتیں ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی و رسول کی شریعت میں فرض رہی ہیں البتہ مختلف شریعتوں میں انکی تفصیلات اور جزئیات مختلف رہی ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز اور زکوٰۃ فرض تھے۔ رہا یہ معاملہ کہ عیسٰی علیہ السلام تو کبھی مالدار ہی نہیں ہوئے، نہ گھر بنایا نہ کچھ جمع کیا پھر زکوٰۃ کا اُن کو حکم دینا کس بناء پر ہے؟ تو اسکا مقصد واضح یہ ہے کہ انکی شریعت میں قانون یہ بنادیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس مال ہو اُسپر زکوٰۃ فرض ہے عیسٰی علیہ السلام بھی اسکے مخاطب ہیں کہ جب کبھی مال بقدرِ نصاب جمع ہوجاوے تو زکوٰۃ ادا کریں پھر اگر عمر بھر میں کبھی مال جمع ہی نہ ہو تو یہ اُس کے منافی نہیں۔ (روح)

مَا دُمْتُ حَیًّا، یعنی نماز اور زکوٰۃ کا حکم میرے لئے دائمی ہے جب تک زندہ ہوں ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ حیات ہے جو اس عالمِ دُنیا میں زمین پر ہے کیونکہ یہ اعمال اسی زمین پر ہوسکتے ہیں اور یہیں سے متعلق ہیں آسمان پر اُٹھائے جانے کے بعد نزول کے زمانے تک رخصت کا زمانہ ہے۔

بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ، اس جگہ صرف والدہ کا ذکر کیا والدین کا نہیں۔ اسمیں اشارہ کردیا کہ میرا وجود معجزانہ طور پر بغیر والد کے ہوا ہے اور بچپن کا یہ معجزانہ کلام اسکے لئے کافی شہادت اور دلیل ہے۔

ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ

یہ ہے عیسٰی مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ

يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ

جھگڑتے ہیں اللہ ایسا نہیں کہ رکھے اولاد وہ پاک ذات ہے

اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ وَاِنَّ اللّٰهَ

جب ٹھہرالیتا ہے کسی کام کا کرنا، سو یہی کہتا ہے اسکو کہ ہو وہ ہو جاتا ہے اور کہا بیشک

رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا، سو اسکی بندگی کرو، یہ ہے راہ سیدھی

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

پھر جُدی جُدی راہ اختیار کی فرقوں نے اُن میں سے سو خرابی ہے

كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ

منکروں کو جس وقت دیکھیں گے ایک دن بڑا کیا خوب سُنتے اور

اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِىْ ضَلٰلٍ

دیکھتے ہونگے، جس دن آئیں گے ہمارے پاس، پر بے انصاف آج کے دن صریح بہک

مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِىَ الْاَمْرُ ۘ

رہے ہیں اور ڈر سُنا دے اُن کو اُس پچھتاوے کے دن کا، جب فیصل ہو چکے گا کام

وَهُمْ فِىْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحْنُ

اور وہ بھول رہے ہیں اور وہ یقین نہیں لاتے ہم وارث ہوں گے

نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾

زمین کے اور جو کوئی ہے زمین پر اور وہ ہماری طرف پھر آئیں گے

وقف منزل لازم

ع ۲۵ / ۵

خلاصۂ تفسیر

یہ ہیں عیسیٰ بن مریم (جن کے اقوال و احوال مذکور ہوئے جس سے ان کا بندۂ مقبول ہونا معلوم ہوتا ہے نہ جیسے کہ عیسائیوں نے ان کو بندوں کی فہرست سے خارج کر کے خدا تک پہنچا دیا ہے اور نہ ویسے جیسا کہ یہودیوں نے ان کو مقبولیت سے خارج کر کے طرح طرح کی تہمتیں لگائی ہیں) میں (بالکل) سچی بات کہہ رہا ہوں جس میں یہ (افراط و تفریط کرنے والے) لوگ جھگڑ رہے ہیں (چنانچہ

یہود و نصاریٰ کے اقوال اوپر معلوم ہوئے اور چونکہ یہود کا قول ظاہراً بھی موجب تنقیص نبی تھا جو کہ بداہۃً باطل ہے اس لئے اسکے رد کی طرف اس مقام پر توجہ نہیں فرمائی بخلاف قولِ نصاریٰ کے کہ ظاہراً مثبت زیادتِ کمال تھا کہ نبوت کے ساتھ خدا کا بیٹا ہونا ثابت کرتے تھے اس لئے آگے اس کو رَد فرماتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ اسمیں حق تعالیٰ کی تنقیص بوجہ انکارِ توحید کے لازم آتی ہے حالانکہ) اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ (کسی کو) اولاد بنائے وہ (بالکل) پاک ہے (کیونکہ اس کی یہ شان ہے کہ) وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے (اور ایسے کمال کے واسطے اولاد کا ہونا عقلاً نقص ہے) اور (آپ اثباتِ توحید کے لئے لوگوں سے فرما دیجئے کہ مشرکین بھی سُن لیں کہ) بیشک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (خالص خدا کی عبادت کرنا یعنی توحید اختیار کرنا دین کا) سیدھا راستہ ہے سو (توحید پر باوجود ان عقلی اور نقلی دلائل قائم ہونے کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارہ میں) باہم اختلاف ڈال دیا (یعنی توحید کا انکار کر کے طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے) سو ان کافروں کے لئے ایک بڑے (بھاری) دن کے آجانے سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے کہ یہ دن ایکہزار سال دراز اور ہولناک ہونے کی وجہ سے بہت عظیم ہوگا) جس روز یہ لوگ (حساب و جزا کے لئے) ہمارے پاس آویں گے (اس روز) کیسے کچھ شنوا اور بینا ہو جائیں گے۔ (کیونکہ قیامت میں یہ حقائق پیشِ نظر ہو جاویں گے اور تمامتر غلطیاں رفع ہو جاویں گی) لیکن یہ ظالم آج (دُنیا میں کیسی) صریح غلطی میں (مبتلا ہو رہے) ہیں، اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جبکہ (جنت دوزخ کا) اخیر فیصلہ کر دیا جاویگا (جسکا ذکر حدیث میں ہے کہ جنت اور دوزخ والوں کو موت دکھلا کر اس کو ذبح کر دیا جاویگا اور دونوں کو خلود (یعنی ہمیشہ ہمیشہ اسی حال میں زندہ رہنے کا حکم سُنا دیا جاوے گا، رواہ الشیخان والترمذی۔ اور اسوقت کی حسرت کا بیحد ہونا ظاہر ہے) اور وہ لوگ (آج دُنیا میں) غفلت میں (پڑے) ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لیکن آخر ایک دن مریں گے) اور تمام زمین اور زمین پر رہنے والوں کے وارث (یعنی آخر مالک) ہم ہی رہ جاویں گے اور یہ سب ہمارے ہی پاس لوٹائے جاویں گے (پھر اپنے کفر و شرک کی سزا بھگتیں گے)۔

معارف و مسائل

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود و نصاریٰ کے بیہودہ خیالات میں افراط و تفریط کا یہ عالم تھا کہ نصاریٰ نے تو تعظیم میں اتنی زیادتی کی کہ انکو خدا تعالیٰ

کا بیٹا بنادیا، اور یہود نے اُن کی توہین و تذلیل میں یہانتک کہدیا کہ وہ یوسف نجار کی ناجائز اولاد ہیں۔ معاذاللہ، حق تعالیٰ نے ان دونوں غلط کاروں کی غلطی بتلاکر اسکی صحیح حیثیت ان آیات میں واضح فرمادی۔ (قرطبی)

قَوْلَ الْحَقِّ، بفتح لام اس کی واضح ترکیب نحوی یہ ہے کہ اقول قول الحق اسکی اصل ہے اور بعض قراءتوں میں قولُ الحق بضم لام بھی ہے تو اس صورتمیں مراد یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام خود قول حق ہیں جیساکہ ان کو کلمۃ اللہ کا لقب بھی دیا گیا ہے کیونکہ انکی پیدائش بلا واسطہ سبب ظاہری کے صرف اللہ تعالیٰ کے قول سے ہوئی ہے۔ (قرطبی)

یَوْمَ الْحَسْرَۃِ، اس روز کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کہ اہلِ جہنم کو تو یہ حسرت ہونا ظاہر ہے کہ اگر وہ مومن صالح ہوتے تو ان کو جنت ملتی اب جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ ایک خاص قسم کی حسرت اہلِ جنت کو بھی ہوگی جیساکہ طبرانی اور ابو یعلی نے بروایت حضرت معاذ یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت کو کسی چیز پر حسرت نہ ہوگی بجز ان لمحات وقت کے جو بغیر ذکر اللہ کے گزر گئے۔ اور بغویؒ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مرنے والے کو حسرت و ندامت سے سابقہ پڑے گا۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یہ ندامت و حسرت کس بناء پر ہوگی تو آپؐ نے فرمایا کہ نیک اعمال کرنے والے کو اس پر حسرت ہوگی کہ اور زیادہ نیک اعمال کیوں نہ کرلئے کہ اور زیادہ درجاتِ جنت ملتے اور بدکار آدمی کو اس پر حسرت ہوگی کہ وہ اپنی بدکاری سے باز کیوں نہ آگیا۔ (مظہری)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ڛ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۴۱ اِذْ

اور مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا۔ بیشک تھا وہ سچا نبی جب

قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ

کہا اپنے باپ کو اے باپ میرے کیوں پوجتا ہے اس کو جو نہ سُنے اور نہ دیکھے

وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝۴۲ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ

اور نہ کام آئے تیرے کچھ اے باپ میرے مجھ کو آئی ہے خبر ایک

الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝۴۳

چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلادوں تجھ کو راہ سیدھی

يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ

اے باپ میرے مت پوج شیطان کو بیشک شیطان ہے رحمٰن کا

عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ

نافرمان　اے باپ میرے میں ڈرتا ہوں کہیں آ لگے تجھ کو　ایک　آفت

الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ

رحمٰن سے　پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی　وہ بولا کیا تو پھرا ہوا ہے

عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي

میرے ٹھاکروں سے اے ابراہیم　اگر تو باز نہ آئے گا تو تجھ کو سنگسار کرونگا اور دُور ہو جا میرے

مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ

پاس سے ایک مدت　کہا تیری سلامتی رہے　میں گناہ بخشواؤں گا تیرا اپنے رب سے　بیشک

كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ

وہ ہے مجھ پر مہربان　اور چھوڑتا ہوں تم کو　اور جن کو تم پوجتے ہو　اللہ کے سوا

وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾

اور میں بندگی کرونگا اپنے رب کی، اُمید ہے کہ نہ رہوں گا اپنے رب کی بندگی کر کر　محروم

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ

پھر جب جُدا ہوا اُن سے　اور جن کو وہ پوجتے تھے　اللہ کے سوا　بخشا ہم نے اُس کو

إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ

اسحٰق　اور یعقوب　اور دونوں کو نبی کیا　اور دیا ہم نے اُن کو اپنی

رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾

رحمت سے　اور کیا اُن کے واسطے سچا بول اُونچا

ع ۳ / ۶

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) میں (لوگوں کے سامنے حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا (قصہ) ذکر کیجئے (تاکہ ان کو توحید و رسالت کا مسئلہ زیادہ منکشف ہو جاوے) وہ (ہر قول فعل میں) بڑے راستی والے تھے (اور) پیغمبر تھے (اور وہ قصہ جس کا ذکر کرنا اس جگہ مقصود ہے اُس وقت ہوا تھا) جب کہ انھوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک

تھا، کہا کہ اے میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سُنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے (مُراد بت ہیں حالانکہ اگر کوئی دیکھتا سُنتا کچھ کام آتا بھی ہو مگر واجب الوجود نہ ہو تب بھی لائق عبادت نہیں چہ جائیکہ ان اوصاف سے بھی عاری ہو تو وہ بدرجۂ اولیٰ لائق عبادت نہ ہوگا)، اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا (مراد اس سے وحی ہے جس میں احتمال غلطی کا ہو ہی نہیں سکتا پس میں جو کچھ کہہ رہا ہوں قطعاً حق ہے جب یہ بات ہے) تو تم میرے کہنے پر چلو میں تم کو سیدھا رستہ بتلاؤں گا (اور وہ توحید ہے) اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش مت کرو (یعنی شیطان کو اور اس کی عبادت کو تو تم بھی بُرا سمجھتے ہو اور بُت پرستی میں شیطان پرستی بالیقین لازم ہے کہ وہی یہ حرکت کراتا ہے۔ اور کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ حق تعالیٰ کے مقابلے میں بھی اسکی تعلیم کو حق سمجھے یہی عبادت ہے پس بُت پرستی میں شیطان پرستی ہوئی اور) بیشک شیطان (حضرت) رحمان کا نافرمانی کرنے والا ہے (تو وہ کب اطاعت کے لائق ہوگا) اے میرے باپ، میں اندیشہ کرتا ہوں (اور وہ اندیشہ یقینی ہے) کہ تم پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے (خواہ دُنیا میں یا آخرت میں) پھر تم (عذاب میں) شیطان کے ساتھی ہو جاؤ (یعنی جب اطاعت میں اس کا ساتھ دوگے تو نفس عقوبت میں بھی اسکا ساتھ ہوگا گو شیطان کو دُنیا میں عذاب نہ ہوا ہو اور اس شیطان کی معیت اور مشارکت فی العقوبت کو کوئی اپنی بھلائی چاہنے والا پسند نہ کریگا۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ تمام تر نصائح سنکر) باپ نے جواب دیا کہ کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم (اور اس لئے مجھ کو بھی منع کرتے ہو یاد رکھو) اگر تم (ان بُتوں کی مذمت سے اور مجھ کو ان کی عبادت سے منع کرنے سے) باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مار پتھروں کے سنگسار کردونگا (پس تم اس سے باز آجاؤ) اور ہمیشہ ہمیش کے لئے مجھ (کو کہنے سُننے) سے برکنار رہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا (بہتر) میرا اسلام لو (اب تم سے کہنا سُننا بے سود ہے) اب میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی (اس طرح) درخواست کرونگا (کہ تمکو ہدایت کرے جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے) بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے (اس لئے اسی سے عرض کرونگا جسکا قبول فرمانا یا نہ فرمانا دونوں مختلف اعتبار سے رحمت اور مہربانی ہے) اور (تم اور تمہارے ہم مذہب جب میری حق بات کو بھی نہیں مانتے تو تم میں رہنا بھی فضول ہے اس لئے) میں تم لوگوں سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کر رہے ہو اُن سے (بدناً بھی) کنارہ کرتا ہوں (جیسا قلباً پہلے ہی سے برکنار ہوں، یعنی یہاں رہتا بھی نہیں) اور (اطمینان سے علیحدہ ہوکر) اپنے رب کی عبادت کرونگا (کیونکہ یہاں رہ کر اس میں بھی مزاحمت ہوگی) اُمید (یعنی یقین) ہے

کہ اپنے رب کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا (جیسا بُت پرست اپنے باطل معبودوں کی عبادت کر کے محروم رہتے ہیں، غرض اس گفتگو کے بعد اُن سے اس طرح علیحدہ ہوئے کہ ملکِ شام کیطرف ہجرت کر کے چلے گئے) پس جب ان لوگوں سے اور جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے اُن سے (اس طرح) علیحدہ ہوگئے (تو) ہم نے اُن کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا فرمایا جو کہ رفاقت کے لئے اُن کی بُت پرست برادری سے بدرجہا بہتر تھے) اور ہم نے (ان دونوں میں) ہر ایک کو نبی بنایا اور ان سب کو ہمنے (طرح طرح کے کمالات دیگر) اپنی رحمت کا حصہ دیا اور (آئندہ نسلوں میں) ہمنے انکا نام نیک اور بلند کیا (کہ سب تعظیم اور ثنا کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور اسحٰق کے قبل اسماعیل ان ہی صفات کے ساتھ عطا ہو چکے تھے)

معارف و مسائل

صدیق کی تعریف صِدِّيقًا نَّبِيًّا، لفظ صِدّیق بکسرِ صاد قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اسکے معنے اور تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ جس شخص نے عمر میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ صدیق ہے بعض نے فرمایا کہ جو شخص اعتقاد اور قول و عمل ہر چیز میں صادق ہو یعنی جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر ہو اور اسکا ہر فعل اور ہر حرکت و سکون اسی اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔ روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں اسی آخری معنے کو اختیار کیا ہے اور پھر صِدّیقیت کے درجات متفاوت ہیں۔ اصل صدیق تو نبی و رسول ہی ہو سکتا ہے اور ہر نبی و رسول کے لئے صِدّیق ہونا وصف لازم ہے مگر اس کا عکس نہیں کہ جو صِدّیق ہو اسکا نبی ہونا ضروری ہو بلکہ غیر نبی بھی جو اپنے نبی و رسول کے اتباع میں صدق کا یہ مقام حاصل کرلے وہ بھی صِدّیق کہلائے گا۔ حضرت مریم کو خود قرآنِ کریم نے أُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ کا خطاب دیا ہے حالانکہ جمہور اُمّت کے نزدیک وہ نبی نہیں، اور کوئی عورت نبی نہیں ہو سکتی۔

اپنے بڑوں کو نصیحت کرنے کا طریقہ اور اُس کے آداب يَا أَبَتِ، عربی لغت کے اعتبار سے یہ لفظ باپ کی تعظیم و محبت کا خطاب ہے۔ حضرت خلیل اللہ علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو حق تعالےٰ نے جو مقام جامعیتِ اوصاف و کمالات کا عطا فرمایا تھا، اُن کی یہ تقریر جو اپنے والد کے سامنے ہو رہی ہے اعتدالِ مزاج اور رعایتِ اضداد کی ایک بے نظیر تقریر ہے کہ ایک طرف باپ کو شرک کفر اور کُھلی گمراہی میں نہ صرف مبتلا بلکہ اسکا داعی دیکھ رہے ہیں جس کے مٹانے ہی کے لئے خلیل اللہ پیدا کئے گئے ہیں، دوسری طرف باپ کا ادب اور عظمت و محبت ہے۔ ان دونوں ضدوں کو حضرت خلیل اللہ نے کس طرح جمع فرمایا۔ اوّل تو يَا أَبَتِ کا لفظ جو باپ کی مہربانی اور محبت کا

داعی ہے ہر جملہ کے شروع میں اس لفظ سے خطاب کیا پھر کسی جملہ میں باپ کی طرف کوئی لفظ ایسا منسوب نہیں جس سے اسکی توہین یا دل آزاری ہو کہ اُس کو گمراہ یا کافر کہتے بلکہ حکمتِ پیغمبرانہ کے ساتھ صرف اُن کے بُتوں کی بے بسی اور بے حسی کا اظہار فرمایا کہ ان کو خود اپنی غلط روش کیطرف توجہ ہو جائے۔ دوسرے جملہ میں اپنی اس نعمت کا اظہار فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو علومِ نبوت کی عطا فرمائی تھی تیسرے اور چوتھے جملے میں اُس انجام بد سے ڈرایا جو اس شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والا تھا۔ اس پر بھی باپ نے بجائے کسی غور و فکر یا یہ کہ آپکی فرزندانہ گزارش پر کچھ نرمی کا پہلو اختیار کرتے پورے تشدد کے ساتھ خطاب کیا، اُنھوں نے تو خطاب یٰٓاَبَتِ کے پیارے لفظ سے کیا تھا جسکا جواب عرف میں یَا بُنَیَّ کے لفظ سے ہونا چاہئے تھا مگر آزر نے ان کا نام لیکر یٰٓاِبْرٰهِيْمُ سے خطاب کیا اور اُن کو سنگسار کر کے قتل کرنے کی دھمکی اور گھر سے نکل جانیکا حکم دیدیا۔ اسکا جواب حضرت خلیل اللہ کیطرف سے کیا ملتا ہے وہ سُننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

سَلٰمٌ عَلَيْكَ ، یہاں لفظ سلام دو معنے کے لئے ہو سکتا ہے اول یہ کہ یہ سلام متاطعہ ہوجیسے کسی سے قطع تعلق کرنیکا شریفانہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ بات کا جواب دینے کے بجائے لفظ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جائے جیسا کہ قرآن کریم نے اپنے مقبول و صالح بندوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ، یعنی جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو یہ اُن سے دو بدو ہونیکے بجائے لفظ سلام کہتے ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ باوجود مخالفت کے میں تمھیں کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں سلام عرفی سلام ہی کے معنے میں ہو۔ اسمیں فقہی اشکال یہ ہے کہ کسی کافر کو ابتداءً سلام کرنا حدیث میں ممنوع ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَبْدَأُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى بِالسَّلَامِ (یعنی یہود و نصاریٰ کو ابتداءً سلام نہ کرو) مگر اس کے بالمقابل بعض روایاتِ حدیث میں ایک ایسے مجمع کو ابتدائی سلام کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس میں کفار و مشرکین اور مسلمان سب جمع تھے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت اُسامہ رضؓ کی روایت سے ثابت ہے۔

اسی لئے فقہاءِ اُمت کا اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہوا۔ بعض صحابہؓ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے قول و عمل سے اسکا جواز ثابت ہوتا ہے بعض سے عدم جواز جس کی تفصیل قرطبی نے احکام القرآن میں اسی آیت کے تحت بیان کی ہے۔ اور امام نخعی نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر تمھیں کسی کافر یہودی نصرانی سے ملنے کی کوئی دینی یا دُنیوی ضرورت پیش آجائے تو اس کو ابتدائی سلام کرنے میں مضائقہ نہیں اور بے ضرورت سلام کی ابتداء کرنے سے بچنا چاہئے۔ اسمیں مذکورہ

دونوں حدیثوں کی تطبیق ہو جاتی ہے واللہ اعلم۔ (قرطبی)

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ، یہاں بھی یہ اشکال ہے کہ کسی کافر کے لئے استغفار کرنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا کہ وَاللہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَالَمْ اُنْهَ عَنْهُ (یعنی بخدا میں آپ کے لئے اسوقت تک ضرور استغفار یعنی دعاء مغفرت کرتا رہونگا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے منع نہ فرما دیا جائے)۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ (یعنی نبی اور ایمان والوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں) اس آیت کے نازل ہونے پر آپ نے چچا کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ سے وعدہ کرنا کہ آپ کے لئے استغفار کرونگا یہ ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے اس کے بعد ممانعت کردی گئی سورۂ ممتحنہ میں حق تعالیٰ نے خود اس واقعہ کو بطور استثناء ذکر فرما کر اس کی اطلاع دیدی ہے اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ اور اُس سے زیادہ واضح سورۂ توبہ میں آیتِ مذکورہ مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا کے بعد دوسری آیت میں فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ جس سے معلوم ہوا کہ یہ استغفار اور اسکا وعدہ باپ کے کفر پر جمے رہنے اور خدا کا دشمن ثابت ہونے سے پہلے کا تھا جب یہ حقیقت واضح ہوگئی تو انھوں نے بھی برارت کا اعلان کردیا۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ، ایک طرف تو حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باپ کے ادب و محبت کی رعایت میں یہ انتہا کردی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے دوسری طرف یہ بھی نہیں ہونے دیا کہ حق کے اظہار اور اُس پر مضبوطی کو کوئی ادنیٰ سی ٹھیس لگے، باپ نے جو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اس کو اس جملہ میں بخوشی منظور کرلیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ میں تمھارے بُتوں سے بیزار ہوں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ، اس جملے سے پہلے جملے میں ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول آیا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے دعا کرنے میں ناکام و نامراد نہیں ہونگا۔ ظاہر یہ ہے کہ گھر اور خاندان سے جُدائی کے بعد تنہائی کی وحشت وغیرہ کے اثرات سے بچنے کی دُعا مُراد تھی مذکورہ جملہ میں اس دُعا کی قبولیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے گھر، خاندان اور اُن کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسکی مکافات اس طرح فرمائی کہ ان کو صاحبزادہ اسحٰق علیہ السلام عطا فرمایا اور ساتھ ہی اس کا

عمر دراز پانا اور صاحبِ اولاد ہونا بھی لفظ یعقوب بڑھا کر ذکر فرما دیا اور صاحبزادہ کا عطا ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا تھا، تو اسکا حاصل یہ ہوا کہ باپ کے خاندان سے بہتر ایک مستقل خاندان دے دیا جو انبیاء صلحاء پر مشتمل تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ

اور مذکور کر کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ تھا چُنا ہوا اور تھا

رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ

رسول نبی اور پکارا ہم نے اس کو داہنی طرف سے طور پہاڑ کی اور

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ

نزدیک بُلایا اسکو بھید کہنے کو اور بخشا ہم نے اس کو اپنی مہربانی سے بھائی اُس کا ہارون

نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ

نبی اور مذکور کر کتاب میں اسمٰعیل کا وہ تھا وعدہ کا

الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ

سچا اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز کا

وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ

اور زکوٰۃ کا اور تھا اپنے رب کے یہاں پسندیدہ اور مذکور کر کتاب میں

اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا

ادریس کا وہ تھا سچا نبی اور اُٹھالیا ہم نے اسکو ایک اونچے

عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ

مکان پر یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا اللہ نے پیغمبروں میں

مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۤ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ

آدم کی اولاد میں اور ان میں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى

اولاد میں اور اسرائیل کی اور اُن میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا جب اُن کو

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ السجدة

سُنائے آیتیں رحمٰن کی گرتے ہیں سجدہ میں اور روتے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور اس کتاب (یعنی قرآن) میں موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے (یعنی لوگوں کو سنائیے ورنہ کتاب میں ذکر کرنے والا تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہے) وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے خاص کئے ہوئے (بندے) تھے اور وہ رسول بھی تھے، نبی بھی تھے اور ہم نے اُن کو کوہِ طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور ہم نے اُن کو راز کی باتیں کرنے کے لئے مقرب بنایا اور ہم نے اُن کو اپنی رحمت (اور عنایت) سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا (یعنی اُن کی درخواست کے موافق اُن کو نبی کیا کہ اُن کی مدد کریں) اور اس کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے (بڑے) سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا خصوصاً اور بھی احکام کا عموماً حکم کرتے رہتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بیشک وہ بڑی راستی والے نبی تھے اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رُتبہ تک پہنچا دیا یہ (حضرات جن کا شروع سورت سے یہاں تک ذکر ہوا زکریا علیہ السلام سے ادریس علیہ السلام تک یہ) وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے (خاص) انعام فرمایا ہے (چنانچہ نبوت سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوگی) منجملہ (دیگر) انبیاء (علیہم السلام) کے (یہ وصف سب مذکورین میں مشترک ہے اور یہ سب) آدم (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے) اور (بعضے ان میں) ان لوگوں کی نسل سے (تھے) جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (چنانچہ بجز ادریس علیہ السلام کے کہ وہ اجداد نوح علیہ السلام سے ہیں باقی سب میں یہ وصف ہے) اور (بعضے ان میں) ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے چنانچہ حضرت زکریا و یحییٰ و عیسیٰ و موسیٰ علیہ السلام دونوں کی اولاد میں تھے اور اسحٰق و اسمٰعیل و یعقوب علیہ السلام صرف حضرت ابراہیم کی اولاد میں تھے) اور (یہ سب حضرات) اُن لوگوں میں سے (تھے) جن کو ہم نے ہدایت فرمائی اور ان کو مقبول بنایا (اور باوجود اس مقبولیت و اختصاص کے ان سب حضرات موصوفین کی عبدیت کی یہ کیفیت تھی کہ) جب ان کے سامنے (حضرت) رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو (غایت افتقار و انکسار و انقیاد کے اظہار کے لئے) سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

معارف و مسائل

كَانَ مُخْلَصًا ، مخلَص بفتح لام وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خالص کرلیا ہو یعنی جس کو غیر اللہ کیطرف التفات نہ ہو، اُس نے اپنے نفس اور تمام خواہشات کو اللہ کی مرضی کے لئے مخصوص کردیا ہو۔ یہ شان خصوصی طور پر انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے جیساکہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ، یعنی ہم نے ان کو مخصوص کردیا ہے ایک خاص کام یعنی دارِ آخرت کی یاد کے لئے۔ اُمت میں جو حضرات کاملین انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر ہوں اُن کو بھی اس مقام کا ایک درجہ ملتا ہے اسکی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ قدرتی طور پر گناہوں اور بُرائیوں سے بچادیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ ، یہ مشہور پہاڑ ملک شام میں مصر اور مدین کے درمیان اقع ہے آج بھی اسی نام سے مشہور ہے حق تعالیٰ نے اسکو بھی بہت سی چیزوں میں ایک خصوصیت و امتیاز دیا ہے الْاَيْمَنِ ، طور کی یہ داہنی جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کیونکہ وہ مدین سے چلے تھے جب طور کے بالمقابل پہنچے تو طور اُنکی داہنی جانب تھا۔ نَجِيًّا سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اُس کو نجی کہا جاتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ، ھبہ کے لفظی معنے عطیہ کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ ان کی امداد کے لئے حضرت ہارون کو بھی نبی بنا دیا جائے یہ دُعا قبول کی گئی اسی کو لفظ وَهَبْنَا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ہم نے عطیہ دیدیا موسیٰ علیہ السلام کو ہارون کا۔ اسی لئے حضرت ہارون کو ھبۃ اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ (مظہری)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ، ظاہر یہی ہے کہ اس سے مُراد حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام ہیں مگر اُن کا ذکر اُن کے والد اور بھائی ابراہیم و اسحٰق کے ذکر کے ساتھ نہیں فرمایا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر درمیان میں آنے کے بعد ان کا ذکر فرمایا۔ شاید اس سے مقصود ان کے ذکر کا خاص اہتمام ہو کہ ضمنی لانے کے بجائے مستقلاً ذکر کیا گیا اور یہاں جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے اُنمیں انکے زمانۂ بعثت کی ترتیب نہیں رکھی گئی کیونکہ ادریس علیہ السلام جن کا ذکر ان سب کے بعد آرہا ہے وہ زمانے کے لحاظ سے ان سب سے مقدم ہیں۔

كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ ، ایفاء وعدہ ایک ایسا خلقِ حسن ہے کہ ہر شریف آدمی اس کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو ایک رذیل حرکت قرار دیا جاتا ہے حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت بتلایا ہے، اسی لئے اللہ کا کوئی نبی و رسول ایسا نہیں جو

صادق الوعد نہ ہو مگر اس سلسلہ کلام میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے ذکر کیساتھ کوئی خاص وصف بھی ذکر کیا گیا ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ یہ وصف دوسروں میں نہیں بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انمیں یہ خاص صفت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے جیسے ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ان کا مُخلَص ہونا ذکر فرمایا ہے حالانکہ یہ صفت بھی تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسمیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا اس لئے اُن کے ذکر میں اسکا ذکر فرمایا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا صدقِ وعد میں امتیاز اس بنار پر ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کا وعدہ اللہ سے یا کسی بندے سے کیا اس کو بڑی مضبوطی اور اہتمام سے پورا کیا، اُنھوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو ذبح کرنے کے لئے پیش کر دیں گے اور اُس پر صبر کرینگے اس میں پُورے اُترے۔ ایک شخص سے ایک جگہ ملنے کا وعدہ کیا وہ وقت پر نہ آیا تو اُسکے انتظار میں تین دن اور بعض روایات میں ایک سال اُسکا انتظار کرتے رہے (مظہری) اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ترمذی میں بروایت عبداللہ ابن ابی الحمسار ایسا ہی واقعہ وعدہ کر کے تین دن تک اُسی جگہ انتظار کرنے کا منقول ہے (قرطبی)

ایفائے وعدہ کی اہمیت اور اُس کا درجہ ایفائے وعدہ انبیاء وصلحار کا وصفِ خاص اور تمام شریف انسانوں کی عادت ہے اسکے خلاف کرنا فساق فجار رذیل لوگوں کی خصلت ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے العدۃ دین، وعدہ ایک قرض ہے یعنی جس طرح قرض کی ادائیگی انسان پر لازم ہے اسی طرح وعدہ پورا کرنے کا اہتمام بھی لازم ہے۔ دوسری ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں وأی المؤمن واجب یعنی وعدہ مومن کا واجب ہے۔

حضرات فقہار نے باتفاق یہ فرمایا ہے کہ وعدہ کا قرض ہونا اور ایفاءِ وعدہ کا واجب ہونا اس معنی میں ہے کہ بلا عذر شرعی اس کو پورا نہ کرنا گناہ ہے لیکن وہ ایسا قرض نہیں جس کی چارہ جوئی عدالت سے کی جاسکے اور زبردستی وصول کیا جاسکے جس کو فقہار کی اصطلاح میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ دیانۃً واجب ہے قضاءً واجب نہیں۔ (قرطبی وغیرہ)

مصلح کا فرض ہے کہ اصلاح کا کام اپنے اہل و عیال سے شروع کرے وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خصوصی اوصاف میں ایک یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو ہر مومن مسلمان کے ذمہ واجب ہے کہ اپنے اہل و عیال کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا رہے۔ قرآنِ حکیم میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو

آگ سے پھر اسمیں حضرت اسماعیل کی خصوصیت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ عام ہے اور سبھی مسلمان اس کے مکلف ہیں لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام اسکے اہتمام و انتظام میں امتیازی کوشش فرماتے تھے جیساکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خصوصی ہدایت ملی تھی کہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ یعنی اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے آپ نے اس کی تعمیل میں اپنے خاندان کو جمع کر کے خصوصی خطاب فرمایا۔

دوسری بات یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب پوری قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ سبھی کو پیغام حق پہنچاتے اور امرِ الٰہی کا پابند کرتے ہیں، اہل و عیال کی خصوصیت میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ دعوتِ پیغمبرانہ کے خاص اُصول ہیں اُن میں یہ اہم بات ہے کہ جو ہدایت عام خلق اللہ کو دی جائے اُس کو پہلے اپنے گھر سے شروع کرے۔ اپنے گھر والوں کو اسکا ماننا اور منوانا نسبتۃً آسان بھی ہوتا ہے اُس کی نگرانی بھی ہر وقت کی جا سکتی ہے اور وہ جب کسی خاص رنگ کو اختیار کر لیں اور اسمیں پختہ ہو جاویں تو اس سے ایک دینی ماحول پیدا ہو کر دعوت کو عام کرنے اور دوسروں کی اصلاح کرنے میں بڑی قوت پیدا ہو جاوے گی۔ اصلاحِ خلق کے لئے سب سے زیادہ مؤثر چیز ایک صحیح دینی ماحول کا وجود میں لانا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر بھلائی یا بُرائی تعلیم و تعلم اور افہام و تفہیم سے زیادہ ماحول کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ، حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے ایکہزار سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں (روح المعانی بحوالہ مستدرک حاکم) اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی و رسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے نازل فرمائے (کما فی حدیث ابی ذر زمخشری) اور ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو علم نجوم اور حساب بطور معجزہ عطا کیا گیا (بحر محیط) اور سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے قلم سے لکھنا اور کپڑا سینا ایجاد کیا ان سے پہلے لوگ عموماً جانوروں کی کھال بجائے لباس استعمال کرتے تھے اور سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے بھی آپ نے ہی ایجاد فرمائے اور اسلحہ کی ایجاد بھی آپ سے شروع ہوئی۔ آپ نے اسلحہ تیار کر کے بنو قابیل سے جہاد کیا (بحر محیط۔ قرطبی۔ مظہری۔ روح)

وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، یعنی ہم نے ادریس علیہ السلام کو مقام بلند پر اُٹھالیا۔ معنے یہ ہیں کہ اُن کو نبوت و رسالت اور قربِ الٰہی کا خاص مقام عطا فرمایا گیا۔ اور بعض روایات میں جو اُنکا آسمان پر اُٹھانا منقول ہے اُن کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا:

هذا من اخبار كعب الاحبار الاسرائيليات وفي بعضه نكارة	یہ کعب احبار کی اسرائیلی روایات میں سے ہے اور اُن میں سے بعض میں نکارت و اجنبیت ہے۔

اور قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ بہرحال اس معاملہ میں صریح نہیں کہ یہاں رفعتِ درجہ مراد ہے یا زندہ آسمان میں اٹھانا مراد ہے اسلئے انکار رفع الی السماء قطعی نہیں اور تفسیرِ قرآن اس پر موقوف نہیں (بیان القرآن)

فائدہ از بیان القرآن رسول اور نبی کی تعریف میں فرق اور باہمی نسبت رسول اور نبی کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، آیاتِ مختلفہ میں غور کرنے سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں نسبت عموم و خصوص من وجہ کی ہے۔ رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعت جدیدہ پہنچائے خواہ وہ شریعت خود اس رسول کے اعتبار سے بھی جدید ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف اُن کی اُمت کے اعتبار سے جدید ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہ در اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم شریعت ہی تھی لیکن قوم جرہم جن کی طرف اُن کو مبعوث فرمایا تھا اُن کو اس شریعت کا علم پہلے سے نہ تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہوا۔ اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں یا جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے فرستادہ قاصدین کو آیتِ قرآن اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ میں رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ انبیاء نہیں تھے۔

اور نبی وہ ہے جو صاحبِ وحی ہو خواہ شریعتِ جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعتِ قدیمہ کی جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعتِ موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ رسول نبی سے عام ہے اور دوسرے اعتبار سے لفظ نبی بہ نسبت رسول کے عام ہے جس جگہ یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کئے گئے جیسا کہ آیات مذکورہ میں رَسُوْلًا نَّبِيًّا، آیا ہے وہاں تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص اور عام دونوں جمع ہو سکتے ہیں کوئی تضاد نہیں لیکن جس جگہ یہ دو لفظ باہم متقابل آئے ہیں جیسے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ میں تو اس جگہ بقرینۂ مقام لفظ نبی کو خاص اُس شخص کے معنی میں لیا جائیگا جو شریعتِ سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ، اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ، اس سے مراد صرف ابراہیم علیہ السلام ہیں وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ، اس سے مراد اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام ہیں وَاِسْرَآءِيْلَ، اس سے مراد حضرت موسیٰ و ہارون و حضرت زکریا و یحیٰی و عیسٰی علیہ السلام ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا، سابقہ آیات میں چند اکابر انبیاء علیہم السلام کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے جس میں اُن کی عظمتِ شان کو بیان کیا گیا ہے، چونکہ انبیاء کی عظمت میں عوام سے غلو کرنے کا خطرہ تھا جیسے یہود نے حضرت عُزیر کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا ہی بنا دیا اسلئے اس مجموعہ کے بعد ان سب کا اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ گزار اور خوف و خشیت سے بھرپور ہونا اس آیت میں ذکر فرما دیا گیا تاکہ افراط و تفریط کے درمیان رہیں۔ (بیان القرآن)

تلاوتِ قرآن کے وقت بکا یعنی آب دیدہ ہونا سُنّتِ انبیاء ہے اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ قرآن کی تلاوت کے وقت بکاء (رونے) کی کیفیت پیدا ہونا محمود اور انبیاء علیہم السلام کا وصف ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ و تابعین اور اولیاء اللہ سے بکثرت اسکے واقعات منقول ہیں۔

قرطبی نے فرمایا کہ علماء نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیتِ سجدہ تلاوت کی جائے اُس کے سجدے میں اُس کے مناسب دُعا کیجائے، مثلاً سورۂ سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ السَّاجِدِیْنَ لِوَجْهِكَ الْمُسَبِّحِیْنَ بِحَمْدِكَ وَاَعُوْذُبِكَ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ عَنْ اَمْرِكَ اور سُبْحَانَ الَّذِیْ کے سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الْبَاكِیْنَ اِلَیْكَ الْخَاشِعِیْنَ لَكَ اور آیتِ مذکورہ خَرُّوْا سُجَّدًا کے سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِكَ الْمُنْعَمِ عَلَیْهِمِ الْمَهْدِیِّیْنَ السَّاجِدِیْنَ لَكَ الْبَاكِیْنَ عِنْدَ تِلَاوَةِ اٰیَاتِكَ (قرطبی)

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا

پھر اُن کی جگہ آئے ناخلف کھو بیٹھے نماز اور پیچھے پڑ گئے

الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ

مزوں کے سو آگے دیکھ لیں گے گمراہی کو مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا

وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ

اور کی نیکی سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں اور اُن کا حق ضائع نہ ہوگا

شَیْئًا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ

کچھ باغوں میں بسنے کے جن کا وعدہ کیا ہے رحمٰن نے اپنے بندوں سے

بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا ﴿۶۱﴾ لَا یَسْمَعُوْنَ

اُن کے بن دیکھے بیشک ہے اُس کے وعدہ پر پہنچنا نہ سُنیں گے وہاں

فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً

بک بک سوائے سلام اور اُن کے لئے ہے اُن کی روزی وہاں صبح

وَّعَشِیًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ

اور شام یہ وہ بہشت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی

كَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾

ہوگا پرہیزگار

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکورین) کے بعد (بعضے) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا (خواہ اعتقاداً کہ انکار کیا یا عملاً کہ اس کے ادا کرنے میں یا حقوق و آدابِ ضروریہ میں کوتاہی کی) اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی (جو ضروری طاعت سے غافل کرنے والی تھیں) سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے (خواہ ابدی ہو یا غیر ابدی) ہاں مگر جس نے (کفر و معصیت سے) توبہ کرلی (اور مطلب کفر سے توبہ کرنے کا یہ ہے کہ) ایمان لے آیا اور (معصیت سے توبہ کرنا یہ ہے کہ) نیک کام کرنے لگا سو یہ لوگ (بلا خرابی دیکھے) جنت میں جاویں گے اور (جزا ملنے کے وقت) ان کا ذرا نقصان نہ کیا جاویگا (یعنی ہر نیک عمل کی جزا ملے گی یعنی) ان ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (جاویں گے) جنکا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے (اور) اس کے وعدہ کی ہوئی چیز کو یہ لوگ ضرور پہنچیں گے اس (جنت) میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہ سننے پاویں گے (کیونکہ وہاں فضول بات ہی نہ ہوگی) بجز (فرشتوں اور ایک دوسرے کے) سلام (کرنے) کے (اور ظاہر ہے کہ سلام سے بہت ہی خوشی اور راحت ہوتی ہے تو وہ فضول نہیں) اور اُن کو کھانا صبح و شام ملا کریگا (یعنی یہ تو معیّن طور پر ہوگا اور یوں دوسرے وقت بھی اگر چاہیں گے ملے گا) یہ جنّت (جسکا ذکر ہوا) ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اسکا مالک ایسے لوگوں کو بنادیں گے جو کہ خدا سے ڈرنے والے ہوں (جو مبنیٰ ہے ایمان اور عمل صالح کا)

معارف و مسائل

خَلْفٌ، یہ لفظ بسکون لام بُرے قائمقام بُری اولاد کے لئے اور بفتح لام اچھے قائمقام اور اچھی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے (مظہری) مجاہد رح کا قول ہے کہ یہ واقعہ قرب قیامت میں صلحاء اُمّت کے ختم ہو جانے کے بعد ہوگا کہ نماز کی طرف التفات نہ رہے گا اور فسق و فجور کھُلّم کھُلّا ہونے لگے گا۔

نماز بے وقت یا بلا جماعت پڑھنا اضاعتِ نماز اور گناہِ عظیم ہے

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ، نماز کے ضائع کرنے سے مُراد جمہور مفسّرین عبداللہ بن مسعود۔ نخعی۔ قاسم۔ مجاہد۔ ابراہیم۔ عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کے نزدیک نماز کو اُس کے وقت سے مؤخر کر کے پڑھنا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نماز کے آداب و شرائط میں سے کسی میں کوتاہی کرنا جسمیں وقت بھی داخل ہے اضاعتِ نماز میں شامل ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اضاعتِ صلوٰۃ سے مُراد بے جماعت کے گھر میں نماز پڑھ لینا ہے (قرطبی۔ بحر محیط)

حضرت فاروق اعظم رضہ نے اپنے سب عُمّالِ حکومت کو یہ ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا تھا:

ان اھمّ امرکم عندی الصّلوٰۃ ۔ فمن ضیّعھا فھولما سواھا اضیع (موطاء مالک)

میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے تو جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے تمام احکام دین کو بھی اور زیادہ ضائع کرے گا۔

حضرت حذیفہ رضؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کے آداب اور تعدیلِ ارکان میں کوتاہی کرتا ہے تو اُس سے دریافت کیا کہ تم کب سے یہ نماز پڑھتے ہو؟ اُس نے کہا کہ چالیس سال سے، حضرت حذیفہ رضؓ نے فرمایا کہ تم نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی اور اگر تم اسی طرح کی نمازیں پڑھتے ہوئے مر گئے تو یاد رکھو کہ فطرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مرو گے۔

ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو نماز میں اقامت نہ کرے۔ مراد یہ ہے کہ جو رکوع اور سجدہ میں اور رکوع سے کھڑے ہو کر یا دو سجدوں کے درمیان سیدھا کھڑا ہونا یا سیدھا بیٹھنے کا اہتمام نہ کرے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے وضو اور طہارت میں کوتاہی کی یا نماز کے رکوع سجدے میں یا ان دونوں کے درمیان سیدھا کھڑے ہونے بیٹھنے میں جلد بازی کی اُس نے نماز کو ضائع کر دیا۔

حضرت حسنؒ نے اضاعتِ صلوٰۃ اور اتباعِ شہوات کے بارے میں فرمایا کہ مسجدوں کو معطل کر دیا اور صنعت و تجارت اور لذات و خواہشات میں مبتلا ہو گئے۔

امام قرطبیؒ ان روایات کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ آج اہلِ علم اور معروف بالصلاح لوگوں میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو نماز کے آداب سے غافل، محض نقل و حرکت کرتے ہیں۔ یہ چھٹی ہجری کا حال تھا جس میں ایسے لوگ خال خال پائے جاتے تھے آج یہ صورتِ حال نمازیوں میں عام ہو گئی، اِلّا ما شاء اللہ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَاَعْمَالِنَا

وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ، شہوات سے مراد دُنیا کی وہ لذتیں ہیں جو انسان کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کریں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شاندار مکانوں کی تعمیر اور ایسی شاندار سواریوں کی سواری جس پر لوگوں کی نظریں اُٹھیں، اور ایسا لباس جس سے عام لوگوں میں امتیاز کی شان نظر آئے شہوات مذکورہ میں داخل ہیں (قرطبی)

فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا، لفظ غیّ عربی زبان میں رشاد کے بالمقابل ہے ہر بھلائی اور خیر کو رشاد اور ہر بُرائی اور شر کو غیّ کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے منقول ہے کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس میں سارے جہنم سے زیادہ طرح طرح کے عذاب جمع ہیں۔

ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے

اس کو اللہ تعالیٰ نے اُس زناکار کے لئے تیار کیا ہے جو اپنی زناکاری پر مصر اور عادی ہے اور اُس شرابخور کے لئے جو شراب کا عادی ہے اور اس سود خور کے لئے جو سود خوری سے باز نہیں آتا اور اُن لوگوں کے لئے جو ماں باپ کی نافرمانی کریں اور جھوٹی شہادت دینے والوں کے لئے اور اُس عورت کے لئے جو کسی دوسرے کے بچہ کو اپنے شوہر کا بچہ بنا دے۔ (قرطبی)

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا، لغو سے مُراد کلام باطل فضول اور گالی گلوج اور ایذاء دینے والا کلام ہے کہ اہلِ جنت اِس سے پاک صاف رہیں گے کوئی کلمہ اُنکے کان میں ایسا نہ پڑیگا جو اُن کو رنج و تکلیف پہنچائے۔

اِلَّا سَلٰمًا، یہ استثناءِ منقطع ہے مُراد یہ ہے کہ وہاں جسکا جو کلام سُننے میں آویگا وہ سلامتی اور بھلائی اور خوشی میں اضافہ کرے گا۔ اصطلاحی سلام بھی اس میں داخل ہے جو اہلِ جنت آپس میں ایک دوسرے کو کریں گے اور اللہ کے فرشتے ان سب کو کریں گے۔ (قرطبی)

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا، جنت میں یہ نظام شمسی اور طلوع و غروب بالليل والنهار تو نہ ہوگا، ایک قسم کی روشنی ہمہ وقت رہے گی مگر رات اور دن اور صبح اور شام کے امتیازات کسی خاص انداز سے ہونگے۔ اسی صبح و شام میں اہل جنت کا رزق ان کو پہنچے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اہلِ جنت کو جس وقت جس چیز کی خواہش ہوگی وہ اُسی وقت بلا تاخیر پوری کیجاوے گی (وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ) اعلانِ عام ہے پھر صبح شام کی تخصیص، کیوجہ انسانی عادت و فطرت کی بناء پر ہے کہ وہ صبح شام کھانے پینے کا عادی ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ جس شخص کو صبح شام کی غذا پوری ملے وہ آرام و عیش والا ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرما کر کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کا کھانا دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے صبح اور شام۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں صبح شام کا لفظ بولکر عموم مراد ہے جیسے رات دن کا لفظ بھی یا مشرق مغرب کا لفظ عموم کے لئے بولا جاتا ہے کوئی خاص وقت یا جگہ مراد نہیں ہوتی تو مطلب یہ ہوگا کہ اُنکا رزق اُن کی خواہش کے موافق ہر وقت موجود رہے گا۔ واللہ اعلم (قرطبی)

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا

اور ہم نہیں اُترتے مگر حکم سے تیرے رب کے اُسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو

خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ

ہمارے پیچھے اور جو اسکے بیچ میں ہے اور تیرا رب نہیں ہے بھولنے والا رب

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ط

آسمانوں کا اور زمین کا اور جو اُنکے بیچ ہے سو اُسی کی بندگی کر اور قائم رہ اسکی بندگی پر

ع ۱۵

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ

کسی کو پہچانتا ہے تو اُسکے نام کا اور کہتا ہے آدمی کیا جب میں مرجاؤں

لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ

تو پھر نکلوں گا زندہ ہوکر کیا یاد نہیں رکھتا آدمی کہ ہم نے اسکو بنایا

مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ

پہلے سے اور وہ کچھ چیز نہ تھا سو قسم ہے تیرے رب کی ہم گھیر بلائیں گے اُن کو

وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ

اور شیطانوں کو پھر سامنے لائیں گے گرد دوزخ کے گھٹنوں پر گرے ہوئے پھر

لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾

جدا کرلیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے جونسا ان میں سے سخت رکھتا تھا رحمٰن سے اکڑ

ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِنْ

پھر ہم کو خوب معلوم ہے جو بہت قابل ہیں اُس میں داخل ہونے کے اور کوئی نہیں

مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ

تم میں جو نہ پہنچے گا اُس پر ہو چکا یہ وعدہ تیرے رب پر لازم مقرر پھر

نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

بچائیں گے ہم اُن کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اسمیں اوندھے گرے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہ آرزو ظاہر فرمائی کہ ذرا زیادہ آیا کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور (ہم آپ کی درخواست کا جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے جواب دیتے ہیں سُنیے وہ یہ ہے کہ) ہم (یعنی فرشتے) بدون آپکے رب کے حکم کے وقتاً فوقتاً نہیں آسکتے اسی کی (ملک) ہیں ہمارے آگے کی سب چیزیں (مکان ہو یا زمان، مکانی ہو یا زمانی) اور (اسی طرح) ہمارے پیچھے کی سب چیزیں، اور جو چیزیں اُن کے درمیان میں ہیں (آگے کا مکان تو جو منہ کے سامنے ہو اور پیچھے کا جو پشت کی طرف ہو اور ما بین ذلک جسمیں یہ شخص خود ہو اور آگے کا زمان جو مستقبل ہو اور پیچھے کا جو ماضی ہو اور ما بین ذلک جو زمانہ حال ہو) اور آپ

کا رب بھولنے والا نہیں (چنانچہ یہ سب امور آپ کو پہلے سے معلوم ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم تکویناً و تشریعاً مسخر امر حق ہیں
اپنی رائے سے ایک مکان سے دوسرے مکان میں یا جب ہم چاہیں کہیں آجا نہیں سکتے لیکن جب ہمارا
بھیجنا مصلحت ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھیجدیتے ہیں یہ احتمال نہیں کہ شاید کسی مصلحت کے وقت بھول جاتے ہوں)
وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں سو (جب ایسا حاکم
و مالک ہے تو اے مخاطب) تو اسکی عبادت (اور اطاعت) کیا کر اور (ایک آدھ بار نہیں بلکہ) اسکی عبادت
پر قائم رہ (اور اگر اس کی عبادت نہ کریگا تو کیا دوسرے کی عبادت کریگا) بھلا تو کسی کو اسکا ہم صفت جانتا ہے
(یعنی کوئی اسکا ہم صفت نہیں تو لائق عبادت بھی کوئی نہیں، پس اسی کی عبادت کرنا ضرور ہوا) اور انسان
(منکر آخرت) یوں کہتا ہے کہ میں جب مرجاؤنگا تو کیا پھر زندہ کرکے قبر سے نکالا جاؤں گا (اللہ تعالیٰ جواب
دیتے ہیں کہ) کیا (یہ) انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم اس کو اسکے قبل (عدم سے) وجود میں لاچکے ہیں، اور
یہ (اسوقت) کچھ بھی نہ تھا (جب ایسی حالت سے حیات کی طرف لانا آسان ہے تو دوبارہ حیات دینا تو
بدرجۂ اولیٰ آسان ہے) سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو (قیامت میں زندہ کرکے موقفِ حشر میں) جمع کرینگے
اور (انکے ساتھ) شیاطین کو بھی (جو دُنیا میں ان کے ساتھ رہ کر بہکاتے سکھاتے تھے جیسا دوسری آیت
میں ہے قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ) پھر ان (سب) کو دوزخ کے گرداگرد اس حالت سے حاضر
کریں گے کہ (مارے ہیبت کے) گھٹنوں کے بل گرے ہونگے پھر (ان کفار کے) ہر گروہ میں سے
(جیسے یہود و نصاریٰ و مجوس بُت پرست) ان لوگوں کو جُدا کریں گے جو ان میں سب سے زیادہ اللہ
سے سرکشی کیا کرتے تھے (تاکہ ایسوں کو اوروں سے پہلے دوزخ میں داخل کریں) پھر (یہ نہیں کہ
اس جُدا کرنے میں ہم کو کسی تحقیقات کی ضرورت پڑے کیونکہ) ہم (خود) ایسے لوگوں کو خوب جانتے
ہیں جو دوزخ میں جانے کے زیادہ (یعنی اول) مستحق ہیں (پس اپنے علم سے ایسوں کو الگ کرکے
اول اُن کو پھر دوسرے کفار کو دوزخ میں داخل کریں گے اور یہ ترتیب صرف اوّلیت میں ہے، اور
آخریت نہ ہونے میں تو سب مساوی ہیں اور جہنم کا وجود ایسا یقینی ہے کہ اسکا معائنہ سب مومن و
کافر کو کرایا جائے گا گو صورت اور غرض معائنہ کی مختلف ہوگی کفار کو بطور دخول کے اور تعذیب
ابدی کے واسطے اور مومنین کو بطور عبور پُل صراط اور زیادتِ شکر اور فرح کے واسطے کہ اُس کو دیکھ کر جو
جنت میں پہنچیں گے تو اور زیادہ شکر کریں گے اور خوش ہونگے) اور (بعض گنہگاروں کو سزائے محدود
کے لئے جو کہ درحقیقت تطہیر ہے اسی عموم معائنہ کی خبر دی جاتی ہے کہ) تم میں سے کوئی بھی نہیں جسکا
اس پر گزر نہ ہو (کسی کا دخولاً اور کسی کا عبوراً) یہ (وعدہ کے موافق) آپ کے رب کے اعتبار سے
(بطور) لازم (مؤکد کے) ہے جو (ضرور) پورا ہو کر رہے گا پھر (اس جہنم پر عبور سے یہ نہ سمجھا جائے کہ
اسمیں مومن و کافر برابر ہیں بلکہ) ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو خدا سے ڈر (کر ایمان لا) تے تھے،

(خواہ اول ہی دفعہ میں نجات ہو جاوے جیسے مؤمنین کاملین کو اور خواہ بعد کسی قدر تکلیف کے جیسے کہ مؤمنین ناقصین کو) اور ظالموں کو (یعنی کافروں کو) اسمیں (ہمیشہ کے لئے) ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے رنج وغم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

معارف و مسائل

وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ، لفظ اصطبار کے معنے مشقت و تکلیف پر ثابت قدم رہنا ہے اس میں اشارہ ہے کہ عبادت پر دوام و ثبات مشقت چاہتا ہے عبادتگزار کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا، لفظ سمی کے مشہور معنے ہمنام کے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ مشرکین اور بُت پرستوں نے اگرچہ عبادت میں اللہ تعالےٰ کے ساتھ بہت سے انسانوں، فرشتوں پتھروں اور بُتوں کو شریک کر ڈالا تھا اور ان سب کو الٰہ یعنی معبود کہتے تھے مگر کسی نے لفظ اللہ معبود باطل کا نام کبھی نہیں رکھا۔ یہ ایک تکوینی اور تقدیری امر تھا کہ دُنیا میں اللہ کے نام سے کوئی بُت اور کوئی الٰہ باطل موسوم نہیں ہوا اس لئے اس معنے کے اعتبار سے بھی مضمون آیت کا واضح ہے کہ دُنیا میں اللہ کا کوئی ہمنام نہیں۔

اور اکثر مفسرین مجاہد، ابن جبیر، قتادہ، ابن عباس رض سے اس جگہ اس لفظ کے معنی مثل اور شبیہ کے منقول ہیں اسکا مطلب واضح ہے کہ صفاتِ کمال میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل و عدیل یا نظیر نہیں ہے۔

لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ، اس جگہ والشیاطین کا واؤ بمعنے مَعَ ہے اور مُراد یہ ہے کہ ہر کافر کو اُس کے شیطان کے ساتھ ایک سلسلہ میں باندھ کر اُٹھایا جائیگا اس صورت میں یہ صرف کافروں کے حشر کا بیان ہوگا، اور اگر مراد عام لیجائے جس میں مؤمن و کافر سب داخل ہیں تو شیاطین کے ساتھ ان سب کے حشر کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کافر تو اپنے شیطان کے ساتھ بندھا ہوا حاضر ہوگا اور مؤمنین بھی اس موقفِ حشر میں الگ نہیں ہوں گے اس لحاظ سے سب کیساتھ شیاطین کا اجتماع ہو جائے گا۔ (قرطبی)

حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا، ابتدائے حشر کے وقت مؤمنین و کفار، ورسعداء و اشقیاء سب جہنم کے گرد جمع کئے جاویں گے اور سب پر ہیبت طاری ہوگی سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہونگے۔ پھر مؤمنین اور سعداء کو جہنم سے عبور کرا کر جنت میں داخل کیا جائے گا تاکہ اس منظر جہنم کو دیکھنے کے بعد اُن کو مکمل خوشی اور دائمی اور مخالفین دین پر شماتت اور اس پر اللہ کا مزید شکر نصیب ہو۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ، لفظ شیعہ اصل لغت میں کسی خاص شخص یا خاص عقیدہ

کے متبعین کو کہا جاتا ہے اس لئے بمعنی فرقہ بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ اور مراد آیت کی یہ ہے کہ کفار کے مختلف فرقوں میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوگا اس کو ان سب میں ممتاز کر کے مقدم کیا جاوے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ جہنم میں اس ترتیب سے داخل کیا جائے گا کہ جس کا جرم سب سے زیادہ ہوگا وہ سب سے پہلے اسکے بعد دوسرے اور تیسرے درجے کے مجرمین داخلِ جہنم کئے جاویں گے ۔ (مظہری)

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ، یعنی کوئی انسان مومن یا کافر ایسا نہ رہے گا جسکا ورود جہنم پر نہ ہو۔ ورود سے مراد دخول نہیں بلکہ عبور ہے جیسا کہ ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں لفظ مرور بھی آیا ہے ۔ اور اگر دخول مراد لیا جاوے تو مومنین متقین کا دخول اس طرح ہوگا کہ جہنم اُن کے لئے برد و سلام بن جائے گی اُن کو اُس کی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی جیسا کہ حضرت ابو سُمَیَّہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نیک آدمی یا فاجر آدمی باقی نہ رہے گا جو ابتداءً جہنم میں داخل نہ ہو مگر اسوقت مومنین متقین کے لئے جہنم برد و سلام بن جائے گی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے نارِ نمرود برد و سلام بنا دی گئی تھی اس کے بعد مومنین کو یہاں سے نجات دیکر جنت میں لیجایا جائے گا یہی معنے آیت کے اس اگلے جملے کے ہیں ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ، یہ مضمون حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے اور قرآن کریم میں جو لفظ ورود کا آیا ہے اگر اسکے معنے دخول کے بھی لئے جاویں تو دخول بطور عبور کے مراد ہوگا اسلئے کوئی تضاد نہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا

اور جب سنائے اُن کو ہماری آیتیں کھلی ہوئی کہتے ہیں جو لوگ کہ منکر ہیں ایمان والوں کو

اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا

دونوں فرقوں میں کس کا مکان بہتر ہے اور کس کی اچھی لگتی ہے مجلس اور کتنی ہلاک کرچکے

قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ

ہم پہلے ان سے جماعتیں وہ ان سے بہتر تھے سامان میں اور نمود میں تو کہہ جو رہا

فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا

بھٹکتا سو چاہیئے اس کو کھینچ لے جائے رحمٰن لنبا یہانتک کہ جب دیکھیں گے

يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ

جو وعدہ ہوا تھا اُن سے یا آفت اور یا قیامت سو تب معلوم کرلیں گے کس کا

شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى

بُرا ہے مکان اور کس کی فوج کمزور ہے اور بڑھاتا جاتا ہے اللہ سوجھنے والوں کو سوجھ

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾

اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر رکھتی ہیں تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر پھر جانے کو جگہ

خُلاصۂ تفسیر

اور جب ان منکر لوگوں کے سامنے ہماری (وہ) کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جنہیں مؤمنین کا حق پر ہونا اور کفار کا باطل پر ہونا مذکور ہوتا ہے) تو یہ کافر لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ (یہ بتلاؤ ہم) دونوں فریقوں میں (یعنی ہم میں اور تم میں دُنیا میں) مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی اچھی ہے (یعنی ظاہر ہے کہ خانگی اور مجلسی ساز و سامان اور اہل و اعوان میں ہم بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مقدمہ تو محسوس ہے اور دوسرا مقدمہ عرفی ہے کہ انعام و احسان اور عطاءِ نعمت اُس شخص کے لئے ہوتا ہے جو دینے والے کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہو، ان دونوں مقدموں سے ثابت ہوا کہ ہم اللہ کے محبوب و مقبول ہیں اور تم مغضوب و مخذول۔ آگے اللہ تعالیٰ ایک جواب الزامی اور ایک تحقیقی دیتے ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں) اور (یہ نہیں دیکھتے کہ) ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے ایسے گروہ (ہیبت ناک سزاؤں سے کہ بالیقین عذاب تھے) ہلاک کئے ہیں جو سامان اور نمود میں ان سے بھی (کہیں زیادہ) اچھے تھے (اس سے معلوم ہوا کہ مقدمہ ثانیہ غلط ہے بلکہ کسی حکمت اور مصلحت سے نعمتِ دنیویہ مبغوض و مردود کو بھی دی جا سکتی ہے، آگے دوسرا جواب ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں (یعنی تم) اللہ تعالیٰ اُن کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے (یعنی اس نعمتِ دنیوی میں یہ حکمت ہے کہ مہلت دے کر اتمامِ حجت کر دے جیسا دوسری آیت میں ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ اور یہ مہلت چند روزہ ہے) یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے جب اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو (دُنیا میں) خواہ قیامت کو (دوسرے عالم میں) سو (اُس وقت) اُن کو معلوم ہو جاوے گا کہ بُرا مکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں (یعنی دُنیا میں جو اپنے اہلِ مجلس کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں وہاں معلوم ہوگا کہ ان میں کتنا زور ہے کیونکہ وہاں تو کسی کا کوئی زور ہوگا ہی نہیں۔ اسی کو اضعف فرمایا تھا) اور (مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو (دُنیا میں تو) ہدایت بڑھاتا ہے (یعنی اصل سرمایہ یہ ہے کہ اگر اسکے ساتھ مال و دولت نہو

مضر نہیں) اور (آخرت میں ظاہر ہوگا کہ) جو نیک کام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں وہ تمھارے رب کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی بہتر ہیں (پس اُن کو ثواب میں بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی جن میں مکان اور باغات سب کچھ ہوں گے اور انجام ان اعمال کا ابدیت اور دوام ہے ان نعمتوں کا یہی کیفیۃً وکمیۃً مسلمانوں ہی کی حالت اخیرہ بہتر ہوگی اور اخیر ہی کا اعتبار بھی ہے)۔

معارف ومسائل

خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا، یہاں کفار نے مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے دو چیزیں پیش کیں۔ اوّل دُنیا کا مال و دولت اور ساز و سامان دوسرے حشم خدم اور اپنا جتھہ اور جماعت کہ یہ بظاہر کفار کو بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ حاصل تھی اور یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کے لئے نشہ کا کام کرتی ہیں اور اُن کا فخر و غرور اچھے اچھے عقلمند ذہین لوگوں کو غلط راستوں پر ڈالدیتا ہے اور پچھلے دَور کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور حکومت و سلطنت والوں کی عبرت خیز تاریخ سے غافل کر کے اپنے موجودہ حال کو اپنا ذاتی کمال اور دائمی راحت کا ذریعہ باور کرا دیتا ہے۔ بجز اُن لوگوں کے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق دُنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ کسی کو اپنا ذاتی کمال یا دائمی ساتھی نہ سمجھیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر زبان سے بھی ادا کریں اور اُس کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرنے میں بھی اسکے احکام کی پابندی کریں اور اسکے فنا یا کم ہوجانے کے خطرہ سے بھی کسی وقت غافل نہ ہوں تو وہی اس شر سے محفوظ رہتے ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام میں، حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام اور صحابہ کرامؓ میں بہت سے اغنیاء صحابہ اور اسی طرح اُمت میں لاکھوں اولیاء، صلحاء جن کو حق تعالےٰ نے دُنیا کا مال و دولت بھی خوب عطا فرمایا اور دین کی دولت اور اپنا خوف بھی بے انتہاء۔

کفار کے اس مغالطہ کو قرآن حکیم نے اس طرح دُور فرمایا کہ دُنیا کی چند روزہ نعمت و دولت نہ اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہوسکتی ہے نہ دُنیا ہی میں وہ کسی ذاتی کمال کی علامت سمجھی جاتی ہے کیونکہ بہت سے بےعقل جاہلوں کو دُنیا بس یہ چیزیں عقلاء اور دانشمندوں سے زیادہ مل جاتی ہیں۔ پچھلی تاریخ اُٹھا کر دیکھو تو یہ حقیقت کُھل جائے گی کہ ایسی ایسی بلکہ ان سے بھی زیادہ کتنی دولتوں اور شوکتوں کے ڈھیر زمین پر ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

رہا حشم و خدم اور دوست و احباب کی کثرت سو اس کی حقیقت بھی اول تو دُنیا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے کہ آڑے وقت میں کوئی کام نہیں آتا۔ پھر اگر دُنیا میں وہ برابر خدمت کرتے بھی رہے تو وہ کے دن کی، اس کے بعد محشر کے میدان میں اُن کا کون ساتھی ہوگا؟

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا، باقیات صالحات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جسکی تفصیل سورۂ کہف میں گزر چکی ہے اور مختار قول یہی ہے کہ اس سے مُراد وہ تمام طاعات اور نیک کام ہیں جن کے فوائد باقی رہنے والے ہیں۔ مَرَدًّا کا لفظ بمعنے مرجع ہے مُراد انجام و عاقبت ہے۔ مُراد آیت کی واضح ہے کہ اعمالِ صالحہ ہی اصل دولت ہیں جن کا ثواب بڑا اور انجام دائمی راحت ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾

بھلا تونے دیکھا اُس کو جو منکر ہوا ہماری آیتوں سے اور کہا مجھ کو مل کر رہے گا مال اور اولاد

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا

کیا جھانک آیا ہے غیب کو، یا لے رکھا ہے رحمٰن سے عہد یہ نہیں،

سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ

ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور بڑھاتے جائیں گے اس کو عذاب میں لنبا اور ہم لے لینگے

مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً

اسکے مرنے پر جو کچھ وہ بتلا رہا ہے اور آئیگا ہمارے پاس اکیلا۔ اور پکڑ رکھا ہے لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو

لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ

معبود تاکہ وہ ہوں اُنکے لئے مدد، ہرگز نہیں، وہ منکر ہوں گے اُن کی بندگی سے اور

يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع

ہو جائیں گے اُن کے مخالف

ع ۵ / ۱۷ / ۸

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ (جن کا حق یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا جن میں سے آیاتِ بعث بھی ہیں) کفر کرتا ہے اور (علیٰ سبیل الاستہزاء) کہتا ہے کہ مجھ کو (آخرت میں) مال اور اولاد ملیں گے (مطلب یہ کہ اس کی حالت بھی قابلِ تعجب ہے آگے اسکا رد ہے کہ) کیا یہ شخص غیب پر مطلع ہو گیا ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے (یعنی اس دعوے کا علم آیا بلا واسطہ اسباب ہوا ہے

کہ علمِ غیب ہے یا بواسطہ اسباب ہوا ہے پھر چونکہ وہ دعویٰ احکمِ عقلی تو ہے نہیں بلکہ امر نقلی ہے۔ اس لئے صرف دلیلِ نقلی کہ اخبارِ خداوندی ہے اس کی دلیل ہو سکتی ہے سو دونوں طریق مفقود ہیں اول تو عقلاً بھی ممتنع ہے اور دوسرا وقوعاً منتفی ہے) ہرگز نہیں (محض غلط کہتا ہے اور) ہم اسکا کہا ہوا بھی لکھ لیتے ہیں (اور وقت پر یہ سزا دیں گے کہ) اسکے لئے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور اسکی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جاویں گے (یعنی وہ تو دُنیا سے مرجائے گا اور اموال و اولاد پر کوئی اسکا اختیار نہ رہے گا ہم ہی سب کے مالک رہیں گے اور قیامت میں ہم اس کو نہ دیں گے بلکہ) وہ ہمارے پاس (مال و اولاد سے) تنہا ہو کر آوے گا اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تاکہ ان کے لئے وہ (عند اللہ) باعثِ عزت ہوں (جیسا اس آیت میں حکایت ہے يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ سوالیا) ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ تو (قیامت میں خود) اُن کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں گے (جیسا سورۂ یونس کے تیسرے رکوع میں گزر چکا قَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ) اور (اُلٹے) ان کے مخالف ہو جاویں گے، (قالاً بھی جیسا گزرا اور حالاً بھی کہ بجائے عزت کے سببِ ذلت ہو جاوینگے ان معبودین میں اصنام بھی ہوں گے سو اُن کا ناطق ہونا جیسا یکفرون کا مقتضا ہے مثل نطقِ جوارح کے مستبعد و مستغرب نہیں)۔

معارف و مسائل

لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا، بخاری و مسلم میں حضرت خباب بن الارتؓ کی روایت ہے کہ ان کا کچھ قرض عاص بن وائل کے ذمہ تھا یہ اُنکے پاس تقاضہ کے لئے گئے اُس نے کہا میں تو تمہارا قرض اُسوقت تک نہیں دُوں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر و انکار کا معاملہ نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا جبتک کہ تم مرو پھر زندہ ہو۔ عاص بن وائل نے کہا کہ اچھا کیا میں مرکر پھر زندہ ہونگا۔ اگر ایسا ہے تو بس تمہارا قرض بھی اُسیوقت چکاؤں گا جب دوبارہ زندہ ہونگا کیونکہ اُسوقت بھی میرے پاس مال اور اولاد ہونگے۔ (قرطبی)

قرآن کریم نے اس احمق کے جواب میں فرمایا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ دوبارہ زندہ ہونے کے وقت بھی اُسکے پاس مال اور اولاد ہونگے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ، کیا اسنے غیب کی باتوں کو جھانک کر معلوم کرلیا ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا اللہ رحمٰن سے اس نے مال و اولاد کے لئے کوئی عہد اور وعدہ لے لیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں۔ پھر اسنے یہ خیال کیسے پکا لیا وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ، یعنی جس مال اور اولاد کا یہ ذکر کر رہا ہے آخرت میں ملنے کا معاملہ تو بہت دُور ہے

دنیا میں بھی جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس کو بھی چھوڑنا پڑیگا اور اسکے وارث آخر کار ہم ہونگے یعنی یہ مال و اولاد اس سے چھن کر بالآخر اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

وَيَأْتِينَا فَرْدًا، اور قیامت کے روز یہ اکیلا ہمارے دربار میں حاضر ہوگا نہ کوئی اولاد ساتھ ہوگی نہ مال۔ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا، یعنی یہ خود تراشیدہ بُت اور معبود باطل جن کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ یہ اُن کے مددگار ہونگے محشر میں اس کے برعکس یہ اُن کے دشمن ہو جاویں گے اللہ تعالیٰ اُن کو نُطق و زبان عطا فرما دیں گے اور یہ بولیں گے کہ یا اللہ ان کو عذاب و سزا دیجئے کہ انھوں نے تجھ کو چھوڑ کر ہمیں معبود بنا لیا تھا۔ (قرطبی)

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اُچھالتے ہیں ان کو اُبھار کر

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ

سو تو جلدی نہ کر اُن پر ہم تو پوری کرتے ہیں اُن کی گنتی جس دن ہم اکٹھا کر لائینگے

الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ

پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بُلائے ہوئے اور ہانک لے جائیں گے گنہگاروں کو

جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ

دوزخ کیطرف پیاسے نہیں اختیار رکھتے لوگ سفارش کا مگر جس نے لے لیا ہے

عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

رحمٰن سے وعدہ

وقف لازم وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

(آپ جو اِن کی گمراہی سے غم کرتے ہیں تو) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر (ابتلاءً) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو (کفر و ضلال پر) خوب اُبھارتے (اور اُکساتے) رہتے ہیں (پھر جو خود ہی اپنے اختیار سے اپنے بدخواہ کے بہکانے میں آجاوے اسکا کیوں غم کیا جاوے) سو (جب شیاطین ابتلاءً مسلّط ہوئے ہیں اور تعجیل سزائے مستحق میں ابتلاء رہتا نہیں تو) آپ اُن کے لئے جلدی (عذاب ہونے کی درخواست) نہ کیجئے ہم اُن کی باتیں (جن پر سزا ہوگی) خود شمار کر رہے ہیں، (اور وہ سزا اُس روز واقع ہوگی) جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن (کے دار النعیم) کی طرف مہمان بنا کر جمع

کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کیطرف پیاسا ہانکیں گے (اور کوئی ان کا سفارشی بھی نہ ہوگا کیونکہ وہاں) کوئی سفارش کا اختیار نہ رکھے گا مگر ہاں جس نے رحمان کے پاس سے اجازت لی ہے (وہ انبیاء و صلحاء ہیں اور اجازت خاص ہے مؤمنین کے ساتھ پس کفار محلِ شفاعت نہ ہوئے)۔

معارف و مسائل

تَؤُزُّهُمْ اَزًّا، عربی لغت میں لفظ ھَزٌّ، اَزٌّ، فَزٌّ، حَضٌّ، سب ایک معنی میں ہیں یعنی کسی کام کے لئے اُبھارنا اور آمادہ کرنا۔ خفت و شدت اور کمی زیادتی کے لحاظ سے ان میں باہمی فرق ہے۔ لفظ اَزٌّ کے معنی پوری قوت اور تدبیر و تحریک کے ذریعہ کسی شخص کو کسی کام کے لئے آمادہ بلکہ مجبور کر دینے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ شیاطین ان کو اعمالِ بد پر اُبھارتے رہتے ہیں اور اُن کی خوبیاں اُن کے دل پر مسلط کر دیتے ہیں خرابیوں پر نظر نہیں ہونے دیتے۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا، مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے عذاب کے بارے میں جلدی نہ کریں وہ تو عنقریب ہونے ہی والا ہے کیونکہ ہم نے اُن کو گنے چنے ایام اور مدت دُنیا میں رہنے کی دی ہے وہ بہت جلد پوری ہونے والی ہے اسکے بعد عذاب ہی عذاب ہے نَعُدُّ لَهُمْ، یعنی ہم ان کیلئے شمار کرتے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ انکی کوئی چیز آزاد نہیں اُن کی عمر کے دن رات گِنے ہوئے ہیں، اُنکے سانس، اُن کی نقل و حرکت کا ایک ایک قدم، اُن کی لذات اُن کی زندگی کا ایک ایک لحظہ ہم گِن رہے ہیں، یہ گنتی پوری ہوتے ہی ان پر عذاب ٹوٹ پڑے گا۔

مامون رشید نے ایک مرتبہ سورۂ مریم پڑھی۔ جب اس آیت پر پہنچے تو حاضرین مجلس جو علماء فقہاء تھے اُن میں سے ابنِ سماک کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے متعلق کچھ کہیں اُنھوں نے عرض کیا کہ جب ہمارے سانس گِنے ہوئے ہیں ان پر زیادتی نہیں ہوسکتی تو یہ کسقدر جلد ختم ہو جائیں گے اسی کو بعض شعراء نے کہا ہے ؎

حیاتك انفاس تعد فکلما ؛ مضی نفس منك انتقصت به جزءًا

یعنی تیری زندگی کے سانس گِنے ہوئے ہیں، جب ایک سانس گزرتا ہے تو تیری زندگی کا ایک جزء کم ہوجاتا ہے کہا جاتا ہے کہ انسان دن رات میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ (قرطبی)

اور بعض حضرات نے فرمایا ؎

وکیف یفرح بالدنیا و لذتها ؛ فتی یُعَدُّ علیه اللفظ وَالنفس

یعنی دُنیا اور اسکی لذت پر وہ شخص کیسے مگن اور بے فکر ہوسکتا ہے جس کے الفاظ اور سانس گِنے جارہے ہوں (روح) يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا، لفظ وفد ایسے آنے والوں کے

جو جو صورتیں کسی کے ذہن میں آسکتی تھیں وہ سبھی جمع کی گئیں۔ کفار کیطرف سے جو ایذائیں آپکو پہنچی ہیں اُن میں شاید یہ آخری سخت اور روحانی ایذا تھی کہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ عالم و فاضل اور مقدس ترین اُم المؤمنین صدیقہ عائشہؓ پر اور اُن کے ساتھ حضرت صفوان بن معطلؓ جیسے مقدس صحابی پر عبداللہ ابن اُبَیّ منافق نے تہمت گھڑی۔ منافقین نے اس کو رنگ دیئے اور پھیلایا۔ اسمیں سبسے زیادہ رنج دہ یہ بات ہوئی کہ چند سیدھے سادے مسلمان بھی اُن کی سازش سے متأثر ہوکر تہمت کے تذکرے کرنے لگے۔ اس بے اصل و بے دلیل ہوائی تہمت کی چند روز میں خود ہی حقیقت کھُل جاتی مگر اُم المؤمنینؓ کو اور خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اس تہمت سے رُوحانی ایذا پہنچی تھی حق تعالیٰ نے اُسکے ازالہ اور صدیقہ رضؓ کی برارت کے لئے وحیِ الٰہی کے کسی اشارہ پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قرآن کے تقریباً دو رکوع ان کی برارت میں نازل فرمائے۔ اور جن لوگوں نے یہ تہمت گھڑی یا جن لوگوں نے اسکے تذکرے میں حصّہ لیا ان سب پر عذابِ دنیا و آخرت کی ایسی وعیدیں بیان فرمائیں کہ شاید اور کسی موقع پر ایسی وعیدیں نہیں آئیں۔

درحقیقت اس واقعہ افک نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی عفت و تقدس کے ساتھ اُن کی اعلیٰ عقل و فہم کے کمالات کو بھی روشن کر دیا۔ اسی لئے اس واقعہ میں جو آیات اُوپر مذکور ہوئیں اُنمیں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس حادثہ کو اپنے لئے شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لئے خیر ہے اس سے بڑی خیر کیا ہوگی کہ اللہ تعالےٰ نے دسؔ آیات میں اُن کی پاکی اور نزاہت کی شہادت دی جو قیامت تک تلاوت کی جائے گی۔ خود صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اپنی جگہ یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالےٰ بذریعہ وحی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر میری صفائی اور برارت ظاہر فرما دیں گے مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے معاملہ میں قرآن کی آیات نازل ہو جاویں گی جو ہمیشہ پڑھی جاویں گی۔ اس جگہ واقعہ کی کچھ مزید تفصیل جان لینا بھی آیات کے سمجھنے میں معین ہوگا اسلئے اسکو مختصراً لکھا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپس آنے کے بعد حضرت صدیقہؓ اپنے گھریلو کاموں میں مشغول ہوگئیں ان کو کچھ خبر نہیں تھی کہ منافقین نے اُن کے بارے میں کیا خبریں اُڑائی ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرتِ صدیقہؓ کا بیان یہ ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد کچھ میری طبیعت خراب ہوگئی اور سب سے بڑی وجہ طبیعت خراب ہونے کی یہ ہوگئی کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم اپنے ساتھ نہ دیکھتی تھی جو ہمیشہ سے معمول تھا بلکہ اس عرصہ میں آپؐ کا معاملہ یہ رہا کہ گھر میں تشریف لاتے اور سلام کرتے پھر پُوچھ لیتے کیا حال ہے اور واپس تشریف لیجاتے تھے۔ مجھے چونکہ اسکی کچھ خبر نہ تھی کہ میرے بارے میں کیا خبر مشہور کیجا رہی ہے اس لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

کے اس طرز عمل کا راز مجھ پر نہ کھلتا تھا۔ میں اسی غم میں گھُلنے لگی۔ ایک روز اپنی کمزوری کی وجہ سے مسطحؓ صحابی کی والدہ اُمِ مسطحؓ کو ساتھ لیکر میں نے قضاءِ حاجت کے لئے باہر جانیکا ارادہ کیا کیونکہ اُسوقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا۔ جب میں قضاءِ حاجت سے فارغ ہو کر گھر کیطرف آنے لگی تو اُمِ مسطحؓ کا پاؤں اُن کی بڑی چادر میں اُلجھا اور یہ گر پڑیں۔ اسوقت اُنکی زبان سے یہ کلمہ نکلا تَعِسَ مِسطَح یہ ایسا کلمہ ہے جو عرب میں بد دُعا کے لئے استعمال ہوتا ہے اسمیں ماں کی زبان سے اپنے بیٹے مسطح کے لئے بد دُعا کا کلمہ سُن کر صدیقہ عائشہ رضؓ کو تعجب ہوا۔ ان سے فرمایا کہ یہ بہت بُری بات ہے تم ایک نیک آدمی کو بُرا کہتی ہو جو غزوۂ بدر کا شریک تھا یعنی ان کا بیٹا مسطحؓ، اسپر اُمِ مسطحؓ نے تعجب سے کہا کہ بیٹی کیا تم کو خبر نہیں کہ مسطحؓ میرا بیٹا کیا کہتا پھرتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے تب اُن کی والدہ نے مجھے یہ سارا واقعہ اہلِ افک کی چلائی ہوئی تہمت کا اور مسطح کا اسمیں شریک ہونا بیان کیا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سُنکر میرا مرض دوگنا ہو گیا۔ جب میں گھر میں واپس آئی اور حسبِ معمول رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے سلام کیا اور مزاج پُرسی فرمائی تو صدیقہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں۔ آپؐ نے اجازت دیدی۔ منشاء یہ تھا کہ والدین سے اس معاملہ کی تحقیق کریں۔ میں نے جاکر والدہ سے پُوچھا، اُنھوں نے تسلّی دی کہ تم جیسی عورتوں کے دُشمن ہوا کرتے ہیں اور ایسی چیزیں مشہور کیا کرتے ہیں تم اسکے غم میں نہ پڑو خود بخود معاملہ صاف ہو جاویگا۔ میں نے کہا، سُبحان اللہ! لوگوں میں اسکا چرچا ہو چکا میں اس پر کیسے صبر کروں۔ میں ساری رات روتی رہی، نہ میرا آنسو تھما نہ آنکھ لگی۔ دوسری طرف رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اس خبر کے پھیلنے سے سخت غمگین تھے اور اس عرصہ میں اس معاملے کے متعلق کوئی وحی بھی آپ پر نہ آئی تھی اسلئے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور اُسامہ بن زیدؓ جو دونوں گھر کے ہی آدمی تھے ان سے مشورہ لیا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے تو کُھل کر عرض کیا کہ جہانتک ہمارا علم ہے ہمیں عائشہ رضؓ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں۔ اُنکی کوئی بات ایسی نہیں جس سے بدگمانی کی راہ پیدا ہو۔ آپ ان افواہوں کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے (آپؐ کو غم و اضطراب سے بچانے کے لئے) یہ مشورہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کچھ تنگی نہیں فرمائی اگر افواہوں کی بناء پر عائشہ رضؓ کیطرف سے کچھ تکدّر طبعی ہو گیا ہے تو عورتیں اور بہت ہیں۔ اور آپ کا یہ تکدّر اسطرح بھی رفع ہو سکتا ہے کہ بریرہ رضؓ جو صدیقہ عائشہ رضؓ کی کنیز ہیں اُن سے انکے حالات کی تحقیق فرما لیجئے۔ چنانچہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے پُوچھ گچھ فرمائی بریرہ رضؓ نے عرض کیا کہ اور تو کوئی بات عیب کی مجھے ان میں نظر نہیں آئی بجز اسکے کہ نو عمر لڑکی ہیں بعض اوقات آٹا گوندھ کر رکھدیتی ہیں خود سو جاتی ہیں بکری آکر آٹا

کہا جاتی ہے (اسکے بعد حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ دینا اور بر سرِ منبر تہمت گھڑنے والوں اور افواہ پھیلانے والوں کی شکایت کا ذکر فرمانا اور طویل قصہ مذکور ہے۔ آگے کا مختصر قصہ یہ ہے کہ) صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ سارا دن پھر دوسری رات بھی مُسلسل روتے ہوئے گزری میرے والدین بھی میرے پاس آگئے تھے وہ ڈر رہے تھے کہ رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائیگا۔ میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے اور جب سے یہ قصہ چلا تھا اس سے پہلے آپ میرے پاس آکر نہ بیٹھے تھے پھر آپ نے ایک مختصر خطبۂ شہادت پڑھا اور فرمایا اے عائشہ مجھے تمھارے بارمیں یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم بَری ہو تو ضرور اللہ تعالےٰ تمھیں بَری کر دینگے (یعنی برارت کا اظہار بذریعہ وحی فرمادینگے) اور اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہے تو اللہ سے توبہ استغفار کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کرکے توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول فرمالیتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا کلام پُورا فرمالیا تو میرے آنسو بالکل خشک ہوگئے۔ میری آنکھوں میں ایک قطرہ نہ رہا۔ میں نے اپنے والد ابوبکر صدیق رضؓ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ ابوبکر رضؓ نے عذر کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ جواب دیجئے انھوں نے بھی عذر کردیا کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اب مجبور ہوکر مجھے ہی بولنا پڑا، میں ایک کم عمر لڑکی تھی اب تک قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھ سکی تھی۔ اسوقت اس رنج وغم اور انتہائی صدمہ کی حالت میں جبکہ اچھے اچھے عقلاء کو بھی کوئی معقول کلام کرنا آسان نہیں ہوتا حضرت صدیقہ رضؓ نے جو کچھ فرمایا وہ ایک عجیب و غریب عاقلانہ فاضلانہ کلام ہے اسکے الفاظ بعینہٖ لکھے جاتے ہیں۔

واللّٰہ لقد عرفت لقد سمعتم ھٰذا الحدیث حتّٰی استقر فی انفسکم وصدقتم بہٖ ولئن قلت لکم انی بریئۃ واللّٰہ یعلم انی بریئۃ لا تصدقونی ولئن اعترفت لکم بامر واللّٰہ یعلم انی منہ بریئۃ لتصدقونی واللّٰہ لا اجد لی ولکم مثلا الا کما قال ابو یوسف فصبر جمیل واللّٰہ المستعان علٰی ما تصفون

بخدا مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ نے اس بات کو سُنا اور سُنتے رہے یہانتک کہ آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور آپ نے اُسکی (عملاً) تصدیق کردی۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بَری ہوں جیسا کہ اللہ جانتا ہے کہ واقع میں بَری ہوں تو آپ میری تصدیق نہ کرینگے اور اگر میں ایسے کام کا اعتراف کرلوں جس سے میرا بَری ہونا اللہ تعالےٰ جانتا ہے تو آپ میری بات مان لیں گے۔ واللہ اب میں اپنے اور آپکے معاملہ کی کوئی مثال بجز اسکے نہیں پاتی جو یوسف علیہ السلام کے والد یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی غلط بات سُنکر فرمائی تھی کہ میں صبرِ جمیل اختیار کرتا ہوں اور اللہ سے اُس معاملہ میں مدد طلب کرتا ہوں جو تم بیان کر رہے ہو۔

صدیقہ رضہ فرماتی ہیں کہ اتنی بات کرکے میں الگ اپنے بستر پر جاکر لیٹ گئی اور فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ جیسا کہ میں فی الواقع بَری ہوں اللہ تعالیٰ میری برارت کا اظہار بذریعہ وحی ضرور فرما دیں گے لیکن یہ وہم وخیال بھی نہ تھا کہ میرے معاملے میں قرآن کی آیات نازل ہونگی جو ہمیشہ تلاوت کی جاوینگی کیونکہ میں اپنا مقام اس سے بہت کم محسوس کرتی تھی۔ ہاں یہ خیال تھا کہ غالباً آپ کو خواب میں میری برارت ظاہر کردیجاوے گی۔ صدیقہ رضہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی اس مجلس سے ابھی نہیں اُٹھے تھے اور گھر والوں میں بھی کوئی نہیں اُٹھا تھا کہ آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی جس سے سخت سردی کے زمانے میں آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ پھوٹنے لگتا تھا جب یہ کیفیت رفع ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہنستے ہوئے اُٹھے اور سب سے پہلا کلمہ جو فرمایا وہ یہ تھا البشریٰ یا عائشۃ اما اللہ فقد ابرأك یعنی اے عائشہ رضہ خوشخبری سنو اللہ تعالیٰ نے تو تمھیں بَری کردیا۔ میری والدہ نے کہا کہ کھڑی ہوجاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو۔ میں نے کہا کہ نہ میں اس معاملہ میں اللہ کے سوا کسی کا احسان مانتی ہوں نہ کھڑی ہوں گی میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ اُسی نے مجھے بَری فرمایا۔

حضرت صدیقہ رضہ کی چند خصوصیات

امام بغوی رح نے انھیں آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضہ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو اِن کے علاوہ کسی دوسری عورت کو نصیب نہیں ہوئیں اور صدیقہ عائشہ رضہ بھی (بطور تحدیث بالنعمۃ) ان چیزوں کو فخر کے ساتھ بیان فرمایا کرتی تھیں ایک یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے جبرئیل امین ایک ریشمی کپڑے میں میری تصویر لیکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ یہ تمھاری زوجہ ہے (رواہ الترمذی عن عائشۃ رضہ) اور بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امین اپنی ہتھیلی میں یہ صورت لیکر تشریف لائے تھے۔

دوسری یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوا کسی کنواری لڑکی سے نکاح نہیں کیا۔ **تیسری** یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات اُنکی گود میں ہوئی۔ **چوتھی** یہ کہ بیتِ عائشہ رضہ ہی میں آپ مدفون ہوئے۔ **پانچویں** یہ کہ آپ پر اُسوقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جبکہ آپ حضرت صدیقہ رضہ کے ساتھ ایک لحاف میں ہوتے تھے دوسری کسی بی بی کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔ **چھٹی** یہ کہ آسمان سے اُن کی برارت نازل ہوئی۔ **ساتویں** یہ کہ وہ خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں اور صدیقہ ہیں اور اُن میں سے ہیں جن سے دُنیا ہی میں مغفرت کا اور رزقِ کریم کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے۔ (مظہری)

حضرت صدیقہ رضہ کی فقیہانہ اور عالمانہ تحقیقات اور فاضلانہ تقریر کو دیکھکر حضرت موسیٰ بن طلحہ رضہ نے فرمایا کہ میں نے صدیقہ عائشہ رضہ سے زیادہ فصیح وبلیغ نہیں دیکھا۔ (رواہ الترمذی)

تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچے کو گویائی دیکر اُس کی شہادت سے اُن کی برات ظاہر فرمائی اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُنکے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے اُن کو بری کیا اور حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دس آیات نازل کر کے اُن کی برات کا اعلان کیا، جس نے اُن کے فضل و عزت کو اور بڑھا دیا۔

آیاتِ مذکورہ کی اجمالی تفسیر خلاصۂ تفسیر کے عنوان میں آچکی ہے اب آیات کے خاص خاص جملوں سے متعلق کچھ مباحث ہیں وہ دیکھئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَاۗءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، اِفْک کے اصلی لغوی معنے پلٹ دینے اور بدل دینے کے ہیں۔ بدترین قسم کا جھوٹ جو حق کو باطل سے اور باطل کو حق سے بدل دے پاکباز متقی کو فاسق، فاسق کو متقی پرہیزگار بنا دے اس جھوٹ کو بھی افک کہتے ہیں۔ عُصْبَہ کے معنے جماعت کے ہیں جو دس سے چالیس تک ہو، اس سے کم و بیش کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے مِنْكُمْ سے مُراد مؤمنین ہیں۔ اس تہمت کا اصل گھڑنے والا اگرچہ مسلمان نہیں بلکہ منافق عبداللہ ابن اُبی تھا جو مؤمنین میں داخل نہیں مگر منافقین جو دعویٰ اسلام کا کرتے تھے اُن پر بھی ظاہری احکام مؤمنین کے جاری ہوتے تھے اسلئے مِنْكُمْ کے لفظ میں اسکو بھی شامل کر لیا گیا، مسلمانوں میں سے دو مرد اور ایک عورت اسمیں مبتلا ہوئے جن پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آیات نازل ہونے کے بعد حدِ قذف جاری فرمائی۔ کما مرّ سابقاً۔ مگر مؤمنین سب تائب ہو گئے اور اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اُنہیں سے حضرت حسانؓ اور مسطحؓ دونوں شرکائے بدر میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مغفرت کا اعلان فرما دیا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے سامنے کوئی حضرت حسانؓ کی بُرائی کرتا تو وہ پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ یہ بھی اُن دو مَردوں میں شامل تھے جن پر حدِ قذف لگائی گئی تھی اور صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ حسانؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف سے کفار کا شاعرانہ مقابلہ خوب کیا ہے اسلئے ان کو بُرا نہیں کہنا چاہئے۔ اور وہ جب صدیقہ عائشہؓ کے پاس حاضر ہوتے تو اُن کو تعظیم تکریم کے ساتھ بٹھاتی تھیں۔ (مظہری وغیرہ)

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ، یہ خطاب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صدیقہ عائشہؓ اور صفوانؓ اور تمام مؤمنین کو ہے جن کو اس افواہ کی اشاعت سے صدمہ پہنچا۔ اور معنے یہ ہیں کہ اس واقعہ کو آپ بُرا نہ سمجھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں برات نازل فرما کر ان کا اعزاز اور بڑھا دیا۔ اور جن لوگوں نے یہ حرکات کی تھیں اُن کی وعید شدید نازل فرما دی جو قیامت تک محرابوں میں پڑھی جائے گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ، یعنی جن لوگوں نے اس بہتان میں جتنا حصہ لیا اُسی مقدار سے اسکا گناہ لکھا گیا ہے اور اُسی تناسب سے اُس کو عذاب ہوگا۔ جس نے یہ خبر گھڑی اور چلتی کی جسکا ذکر آگے آتا ہے وہ سب سے زیادہ عذاب کا مستحق ہے، جس نے خبر سُنکر تائید کی وہ اُس سے کم، جس نے سُنکر سکوت کیا وہ اُس سے کم۔

وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ، لفظ کِبر بکسر الکاف کے معنے بڑے کے ہیں مُراد یہ ہے جس نے اس تہمت میں بڑا کام کیا یعنی اسکو گھڑا اور چلتا کیا اسکے لئے عذابِ عظیم ہے مُراد اس سے عبداللہ بن اُبَی مُنافق ہے (رواہ البغوی وغیرہ)

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ، یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس تہمت کی خبر سُنی تھی تو مُسلمان مرد اور مُسلمان عورتیں اپنے بارے میں یعنی اپنے مسلمان بھائی بہن کے بارے میں نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ کُھلا جھوٹ ہے۔ اس آیت میں کئی چیزیں قابلِ غور ہیں اوّل یہ کہ بِأَنفُسِهِمْ کے لفظ سے قرآن کریم نے یہ اشارہ کیا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو بدنام و رُسوا کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی کو رُسوا کرتا ہے کیونکہ اسلام کے رشتہ نے سب کو ایک بنا دیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے تمام مواقع میں یہ اشارہ استعمال فرمایا ہے جیسا ایک جگہ فرمایا لَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ یعنی عیب نہ لگاؤ اپنے آپ کو۔ مُراد اس سے یہ ہے کہ کسی بھائی مسلمان مرد یا عورت کو۔ دوسری جگہ فرمایا لَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ، اپنے آپ کو قتل نہ کرو مُراد وہی ہے کہ کسی بھائی مسلمان کو قتل نہ کرو۔ تیسری جگہ فرمایا وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ، یعنی نہ نکالو اپنے آپ کو اپنے گھروں سے۔ یہاں بھی کسی مسلمان بھائی کو اُسکے گھر سے نکالنا مُراد ہے۔ چوتھی جگہ فرمایا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ، یعنی اپنے آپکو سلام کرو۔ مُراد وہی بھائی مُسلمان کو سلام کرنا ہے۔ یہ سب آیاتِ قرآن یہ ضمنی ہدایت دیتی ہیں کہ ایک مسلمان جو دوسرے کسی بھی مسلمان پر عیب لگاتا یا اسکو ایذا و نقصان پہنچاتا ہے حقیقت کے اعتبار سے خود اپنے کو عیب دار کرتا ہے اور خود نقصان و تکلیف اُٹھاتا ہے کیونکہ اس کا انجام پُوری قوم کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے بقول سعدی ؎

چو از قومے یکے بے دانشی کرد ❀ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

قرآن کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب مسلمان اُبھرے تو پوری قوم کے ساتھ اُبھرے، اُن کا ہر فرد اُبھرا۔ اور اسی کے چھوڑنے کا نتیجہ آج آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ سب گرے اور ہر فرد گرا۔ دوسری بات اس آیت میں یہ قابلِ نظر ہے کہ مقام کا تقاضا یہ تھا کہ لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَنْتُمْ بِأَنفُسِكُمْ خَيْرًا بصیغہ خطاب کہا جاتا جیسا کہ شروع میں سمعتموہ بصیغہ خطاب آیا ہے مگر

قرآن کریم نے اس مختصر جملے کو چھوڑ کر اس جگہ طرز بدلا کہ صیغہ خطاب یعنی ظَنَنْتُمْ کے بجائے ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ فرمایا۔ اسمیں ہلکا سا اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ یہ فعل جن لوگوں سے سرزد ہوا وہ اس فعل کی حد تک مؤمنون کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے حُسنِ ظن قائم رکھتا۔

تیسری بات یہ قابلِ نظر ہے کہ اس آیت کے آخری جملے وَقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تقاضا ایمان کا یہ تھا کہ مسلمان اس خبر کو سُنتے ہی کہدیتے کہ یہ کُھلا جھوٹ ہے اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان کے بارے میں جب تک کسی گناہ یا عیب کا علم کسی دلیلِ شرعی سے نہ ہو جائے اُسوقت تک اُس کے ساتھ نیک گمان رکھنا اور بلا کسی دلیل کے عیب و گناہ کی بات اُس کی طرف منسوب کرنے کو جھوٹ قرار دینا عین تقاضائے ایمان ہے۔

مسئلہ ۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے ساتھ اچھا گمان رکھنا واجب ہے جب تک کسی دلیلِ شرعی سے اسکے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ اور جو شخص بلا دلیلِ شرعی کے اُس پر الزام لگاتا ہے اُس کی بات کو رد کرنا اور جھوٹا قرار دینا بھی واجب ہے کیونکہ وہ محض ایک غیبت اور مسلمان کو بلا وجہ رُسوا کرنا ہے۔ (مظہری)

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ، اس آیت کے پہلے جملہ میں تو اسکی تلقین ہے کہ ایسی خبر مشہور کرنیوالوں کے بارہ میں مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ اُن کی بات کو چلتا کرنے کے بجائے اُن سے مطالبہ دلیل کا کرتے اور چونکہ تہمتِ زنا کے معاملے میں دلیل شرعی چار گواہوں کے بغیر قائم نہیں ہوتی اسلئے اُن سے مطالبہ یہ کرنا چاہیئے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اُس پر چار گواہ پیش کرو یا زبان بند کرو۔ دوسرے جملے میں فرمایا کہ جب وہ چار گواہ نہیں لاسکے تو اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کہ ایک شخص نے اپنی آنکھ سے ایک واقعہ دیکھا مگر اُسکو اس پر دوسرے گواہ نہیں ملے تو اگر یہ شخص اپنے چشم دید واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اس کو جھوٹا کیسے کہا جاسکتا ہے خصوصاً اللہ کے نزدیک جھوٹا کہنا تو کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب واقعات کے حقائق معلوم ہیں اور یہ واقعہ وجود میں آنا بھی معلوم ہے تو وہ عند اللہ جھوٹ بولنے والا کیسے قرار پایا۔ اس کے دو جواب ہیں اوّل یہ کہ یہاں عند اللہ سے مُراد حکم اللہ اور قانونِ الٰہی ہے یعنی یہ شخص قانونِ الٰہی اور حکمِ خداوندی کی رو سے جھوٹا قرار دیا جائیگا اور اسپر حدِ قذف جاری کی جائے گی کیونکہ حکمِ ربانی یہ تھا کہ جب چار گواہ نہ ہوں تو واقعہ دیکھنے کے باوجود اس کو بیان نہ کرو اور جو بغیر چار گواہوں کے بیان کرے گا وہ

قانوناً اور حکماً جھوٹا قرار پاکر سزا پائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ کوئی کام فضول نہ کرے جسکا کوئی فائدہ نتیجہ نہ ہو خصوصاً ایسا کام جس میں دوسرے مسلمان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہو تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی عیب و گناہ کی شہادت صرف اس نیت سے دے سکتا ہے کہ جرم و گناہ کا انسداد مقصود ہو کسی کو رُسوا کرنا یا ایذا دینا مقصود نہ ہو تو جس شخص نے چار گواہوں کے بغیر اس قسم کی شہادت زبان سے نکالی گویا اُسکا دعویٰ یہ ہے کہ میں یہ کلام اصلاحِ خلق اور معاشرہ کو بُرائی سے بچانے اور انسداد جرائم کی نیت سے کر رہا ہوں مگر جب شریعت کا قانون اسکو معلوم ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ایسی شہادت دینے سے نہ اُس شخص پر کوئی حد و سزا جاری ہوگی اور نہ ثبوت بہم پہنچے گا بلکہ اُلٹی جھوٹ بولنے کی سزا کا میں مستحق ہو جاؤنگا تو اسوقت وہ عنداللہ اپنی اس نیت کے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ میں اصلاحِ خلق اور انسدادِ جرائم کی نیت سے یہ شہادت دے رہا ہوں کیونکہ شرعی ضابطہ کے مطابق شہادت نہونے کی صورت میں یہ نیت ہو ہی نہیں سکتی۔ (مظہری)

ایک اہم اور ضروری تنبیہ مذکورہ دونوں آیتوں میں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمانوں سے حُسنِ ظن رکھنے کی ہدایت اور اسکے خلاف بے دلیل باتوں کی تردید کو واجب قرار دیا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ پھر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے اس خبر کے غلط ہونے پر یقین کیوں نہ فرمایا اور اس خبر کی تردید کیوں نہ کردی اور ایک مہینہ تک تردد کی حالت میں کیوں رہے یہانتک کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو توبہ کرلینا چاہیئے (کما رواہ البخاری)

وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حُسنِ ظن رکھنے کا جو حکم ہے وہ اس تردد کے منافی نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ کیونکہ آپنے اس خبر کی نہ تصدیق فرمائی اور نہ اسکے مقتضا پر کوئی عمل فرمایا نہ اسکا چرچا کرنا پسند فرمایا بلکہ صحابۂ کرام کے مجمع میں یہی فرمایا کہ ما علمت علی اھلی الاخیرا۔ رواہ البخاری۔ یعنی میں اپنی اہلیہ کے بارہ میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ یہ سب انھیں آیاتِ مذکورہ کے مقتضیٰ پر عمل اور حُسنِ ظن رکھنے کے شواہد ہیں۔ البتہ قطعی اور یقینی علم جس سے طبعی تردد بھی رفع ہو جاوے وہ اُسوقت ہوا جب آیاتِ برأت نازل ہوگئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دل میں کوئی شک و تردد پیدا ہو جانا اور احتیاطی تدابیر استعمال کرنا جیسا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حُسنِ ظن بالمؤمنین کے منافی نہیں تھا جبکہ اُسکے مقتضیٰ پر کوئی عمل نہ کیا گیا ہو۔ جن مسلمانوں پر اس معاملے میں حد قذف کی سزا جاری کی گئی اور ان دو آیتوں میں ان پر عتاب کیا گیا اُنھوں نے اس خبر کے مقتضیٰ پر عمل کیا تھا کہ اُسکا چرچا کیا اور پھیلایا وہ نزولِ آیات سے پہلے بھی ناجائز و موجبِ سزا تھا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ یہ آیت اُن مؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی جو غلطی سے اس تہمت میں کسی قسم کی شرکت کر بیٹھے تھے پھر توبہ کرلی اور بعض پر سزا بھی جاری ہوئی۔ ان سب کو اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جو جُرم تم سے سرزد ہوا وہ بہت بڑا جُرم تھا اُس پر دُنیا میں بھی عذاب آسکتا تھا جیسے پچھلی قوموں کے مجرموں پر آیا ہے اور آخرت میں بھی اُسپر عذاب شدید ہوتا مگر اللہ تعالےٰ کا معاملہ تم مؤمنین کیساتھ فضل و رحمت کا ہے، دُنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ اسلئے یہ عذاب تم سے ٹل گیا۔ دُنیا میں اللہ کے فضل و رحمت کے مظاہر یہ ہوئے کہ اوّل اسلام و ایمان کی توفیق بخشی پھر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف عطا فرمایا جو کہ نزولِ عذاب سے مانع ہے اور پھر جو گناہ ہو گیا تھا اُس سے سچی توبہ کی توفیق بخشی پھر اُس توبہ کو قبول فرمالیا۔ اور آخرت میں اللہ کے فضل و رحمت کا اثر یہ ہے کہ تم سے عفو و درگزر اور مغفرت کا وعدہ فرمالیا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ، تَلَقّی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بات پُوچھے اور نقل کرے، یہاں بات کو سُنکر بے دلیل اور بلا تحقیق آگے چلتی کر دینا مُراد ہے۔

وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ، یعنی تم تو اس کو معمولی بات خیال کرتے تھے کہ ہم نے جیسا سُنا ویسا دوسرے سے نقل کر دیا مگر وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا کہ بے دلیل اور بے تحقیق ایسی بات کو چلتا کر دیا جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ایذا ہو، اُس کی رُسوائی ہو اور اُسکے لئے زندگی دُوبھر ہو جائے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ، یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سُنی تھی تو یوں کہدیتے کہ ہمارے لئے ایسی بات زبان سے نکالنا جائز نہیں۔ پاک ہے اللہ، یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اس آیت میں مکرر وہی ہدایت ہے جو اس سے پہلی ایک آیت میں آچکی ہے اسمیں یہ مزید وضاحت ہے کہ مسلمانوں کو ایسی خبر سُننے کے وقت کیا عمل کرنا چاہیئے وہ یہ کہ صاف کہدیں کہ ایسی بات بلا کسی دلیل کے زبان سے نکالنا بھی ہمارے لئے جائز نہیں یہ تو بہتان عظیم ہے۔

ایک شبہ اور جواب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جیسے کسی واقعہ کا صدق بغیر دلیل کے معلوم نہیں ہوتا اس لئے اُسکا زبان سے نکالنا اور چرچا کرنا ناجائز قرار پایا اسی طرح کسی کلام کا کاذب ہونا بھی تو بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا کہ اسکو بہتانِ عظیم کہدیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو گناہوں سے پاک صاف سمجھنا اصل شرعی ہے جو دلیل سے ثابت ہے اسکے خلاف جو بات بغیر دلیل کے کہی جائے اُسکو جھوٹا سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ ایک مؤمن مسلمان

پر بغیر کسی دلیلِ شرعی کے الزام لگایا گیا ہے لہٰذا یہ بہتان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، اس آیت میں پھر اُن لوگوں کی مذمت اور اُن پر دُنیا و آخرت کے عذاب کی وعید ہے جنھوں نے اس تہمت میں کسی طرح کا حصہ لیا۔ اس آیت میں یہ بات زیادہ ہے کہ جو لوگ ایسی خبریں مشہور کرتے ہیں گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بدکاری اور فواحش پھیل جائیں۔

انسدادِ فواحش کا قرآنی نظام اور ایک اہم تدبیر جس کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ آج کل فواحش کی کثرت ہے۔

قرآنِ حکیم نے فواحش کے انسداد کا یہ خاص نظام بنایا ہے کہ اوّل تو اس قسم کی خبر کہیں مشہور نہ ہونے پاوے اور شہرت ہو تو ثبوتِ شرعی کے ساتھ ہو تاکہ اُس شہرت کیساتھ ہی مجمع عام میں حدِ زنا اُس پر جاری کر کے اُس شہرت ہی کو سببِ انسداد بنا دیا جائے۔ اور جہاں ثبوتِ شرعی نہ ہو وہاں اس طرح کی بے حیائی کی خبروں کو چلتا کر دینا اور شہرت دینا جبکہ اسکے ساتھ کوئی سزا نہیں طبعی طور پر لوگوں کے دلوں سے بے حیائی اور فواحش کی نفرت کم کر دینے اور جرائم پر اقدام کرنے اور شائع کرنے کا موجب ہوتی ہے جسکا مشاہدہ آجکل کے اخبارات میں روزانہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں ہر روز ہر اخبار میں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ نوجوان مرد اور عورتیں اُن کو دیکھتے رہتے ہیں روزانہ ایسی خبروں کے سامنے آنے اور اُس پر کسی خاص سزا کے مرتب نہ ہونے کا لازمی اور طبعی اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے وہ فعلِ خبیث نظروں میں ہلکا نظر آنے لگتا ہے اور پھر نفس میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے ایسی خبروں کی تشہیر کی اجازت صرف اُس صورت میں دی ہے جبکہ وہ ثبوت شرعی کے ساتھ ہو اُسکے نتیجہ میں خبر کے ساتھ ہی اس بے حیائی کی ہولناک پاداش بھی دیکھنے سُننے والوں کے سامنے آجائے۔ اور جہاں ثبوت اور سزا نہ ہو تو ایسی خبروں کی اشاعت کو قرآن نے مسلمانوں میں فواحش پھیلانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ کاش مسلمان اس پر غور کریں۔ اس آیت میں ایسی خبریں بلا ثبوت مشہور کرنے والوں پر دُنیا و آخرت دونوں میں عذابِ الیم ہونیکا ذکر ہے۔ آخرت کا عذاب تو ظاہر ہے کہ قیامت کے بعد ہوگا جسکا یہاں مشاہدہ نہیں ہو سکتا مگر دُنیا کا عذاب تو مشاہدہ میں آنا چاہیئے سو جن لوگوں پر حدِ قذف (تہمت کی سزا) جاری کر دی گئی اُن پر تو دُنیا کا عذاب آہی گیا۔ اور اگر کوئی شخص شرائط اجراء حد موجود نہ ہونے کی وجہ سے حدِ قذف سے بچ نکلا تو وہ دُنیا میں بھی فی الجملہ مستحقِ عذاب تو ٹھہرا آیت کے مصداق کیلئے یہ بھی کافی ہے۔

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

صحابۂ کرام کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم | وَلَا يَأْتَلِ، ائتلاء کے معنے قسم کھانے کے ہیں۔ حضرت صدیقہ پر تہمت کے واقعہ میں مسلمانوں میں سے مسطح رضؓ اور حسانؓ مبتلا ہو گئے تھے جن پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نزولِ آیات برارت کے بعد حدِّ قذف جاری فرمائی۔ مسطحؓ اور حسانؓ دونوں ہی جلیل القدر صحابی غزوۂ بدر کے شرکا میں سے ہیں مگر ایک لغزش ہو گئی جس سے توبہ صادقہ نصیب ہوئی اور حق تعالیٰ نے جس طرح حضرت صدیقہ کی برارت نازل فرمادی اسی طرح ان مؤمنین کی توبہ قبول کرنے اور معاف کرنے کا بھی اعلان فرمادیا۔

مسطح رضؓ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عزیز بھی تھے اور مفلس بھی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ اُن کی مالی مدد فرمایا کرتے تھے۔ جب واقعہ اِفک میں اُن کی گونہ شرکت ثابت ہوئی تو صدیقہؓ کے والد کی شفقتِ پدری اور بیٹی کو ایسا سخت صدمہ پہنچانے کیوجہ سے طبعی طور پر مسطحؓ سے رنج پیدا ہو گیا اور قسم کھا بیٹھے کہ آئندہ ان کی کوئی مالی مدد نہیں کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی خاص فقیر کی مالی مدد کرنا کسی خاص مسلمان پر علی التعیین واجب نہیں، اور جس کی مالی مدد کوئی کرتا ہے اگر وہ اُس کو روک لے تو گناہ کی کوئی وجہ نہیں مگر صحابۂ کرام کی جماعت کو حق تعالیٰ دُنیا کے لئے ایک مثالی معاشرہ بنانے والے تھے اس لئے ایک طرف جن لوگوں سے لغزش ہوئی ان کو سچی توبہ اور آئندہ اصلاحِ حال کی نعمت سے نوازا۔ دوسری طرف جن بزرگوں نے طبعی رنج و ملال کے سبب ایسے غریب فقیر کی مدد ترک کرنے کی قسم کھالی اُن کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم اس آیت میں دی گئی کہ اُن کو یہ قسم توڑ دینا اور اسکا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ اُنکی مالی امداد سے دستکش ہو جانا اُن کے مقامِ بلند کے مناسب نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف کر دیا اُن کو بھی عفو و درگزر سے کام لینا چاہیئے۔

چونکہ حضرت مسطحؓ کی مالی امداد کرنا کوئی شرعی واجب حضرت صدیقؓ کے ذمہ نہیں تھا اسی لئے قرآنِ کریم نے عنوان یہ اختیار فرمایا کہ اہلِ علم و فضل جن کو اللہ نے دینی کمالات عطا فرمائے ہیں اور جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی وسعت و گنجائش بھی ہے انکو ایسی قسم نہیں کھانی چاہیئے۔ آیت میں دو لفظ اولوالفضل اور والسعۃ اسی معنے کے لئے آئے ہیں۔

اس آیت کے آخری جملے میں جو ارشاد ہوا کہ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ، یعنی کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف فرمادے تو صدیقِ اکبر رضؓ نے فوراً کہا۔ واللہ انی احب ان یغفر اللہ لی (رواہ الشیخان) یعنی بخدا میں ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے اور فوراً حضرت مسطحؓ کی مالی امداد جاری فرمادی اور یہ بھی فرمایا اب کبھی یہ امداد بند نہ ہوگی (بخاری و مسلم)

یہ وہ مکارمِ اخلاق ہیں جن سے صحابۂ کرام کی تربیت کی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلھا۔ (ازمظہری)

یعنی صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو رشتہ داروں کے صرف احسان کا بدلہ کردے بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ رشتہ داروں کے قطع تعلق کرنے کے باوجود یہ تعلق قائم رکھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ، اس آیت میں بظاہر مکرر وہ مضمون بیان ہوا ہے جو اس سے پہلے آیاتِ قذف میں آچکا ہے وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، لیکن درحقیقت ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ کیونکہ آیات حدِ قذف کے آخر میں توبہ کرنے والوں کا استثناء اور اُنکے لئے مغفرت کا وعدہ ہے۔ اس آیت میں ایسا نہیں بلکہ دُنیا و آخرت کی لعنت اور عذابِ عظیم بلا استثناء مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جنھوں نے حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی اور پھر اُس سے توبہ نہیں کی، یہاں تک کہ قرآن میں اُن کی برات نازل ہونیکے بعد بھی وہ اپنے اس افترار پر قائم اور تہمت کا چرچا کرنے میں مشغول رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی مسلمان سے ممکن نہیں۔ اور جو مسلمان بھی نصوص قرآن کا ایسا خلاف کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا اس لئے یہ مضمون اُن منافقین کے بارے میں آیا ہے جنھوں نے آیات برات صدیقہ نازل ہونے کے بعد بھی اس مشغلہ تہمت کو نہیں چھوڑا اُن کے کافر منافق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں تائبین کیلئے اللہ تعالیٰ نے فضلاً منہ و رحمتہٗ فرماکر مرحوم دارین قرار دیا اور جنھوں نے توبہ نہیں کی اُن کو اس آیت میں ملعون دُنیا و آخرت فرمایا۔ تائبین کو عذاب سے نجات کی بشارت دی اور غیر تائبین کے لئے عذابِ عظیم کی وعید فرمائی۔ تائبین کو اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرماکر مغفرت کی بشارت دی اور غیر تائبین کو اگلی آیت یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ میں معافی نہ ہونے کی وعید فرمائی (کذا ذکرہ سیدی فی بیان القرآن)

ایک اہم تنبیہ حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت کے قضیہ میں جو بعض مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے یہ قضیہ اسوقت کا تھا جب تک آیات برات قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھیں۔ آیات برات نازل ہونے کے بعد جو شخص حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائے وہ بلاشبہ کافر منکرِ قرآن ہے جیساکہ شیعوں کے بعض فرقے اور بعض افراد اسمیں مبتلا پائے جاتے ہیں اُن کے کافر ہونے میں کوئی شک شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں وہ باجماعِ اُمت کافر ہیں۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ، یعنی اُس روز جبکہ اُن کے خلاف خود اُن کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور اُن کے جرائم کی شہادت دینگے جیساکہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جو گنہگار اپنے گناہ کا اعتراف کرلیگا تو اللہ تعالیٰ اسکو معاف فرمادیں گے اور محشر کے مجمع عام کی نظروں سے اُسکے گناہ کو چھپادیں گے اور جو وہاں بھی انکار کریگا کہ میں نے تو یہ کام نہیں کیا ، نگراں فرشتوں نے غلط میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا ہے . تو اسوقت اُن کے منہ بند کردیئے جاویں گے اور ہاتھ پاؤں سے گواہی لی جاوے گی وہ بولیں گے اور شہادت دیں گے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ میں اسی کا بیان ہے - اس آیت میں یہ فرمایا کہ اُن کے مونہوں پر مہر لگا دی جاویگی مگر آیتِ مذکورہ میں یہ ہے کہ خود اُن کی زبانیں شہادت دیں گی - ان دونوں میں کوئی تعارض اسلئے نہیں کہ وہ اپنی زبان کو اپنے اختیار سے استعمال نہ کرسکیں گے کہ اُسوقت جو چاہیں جھوٹی یا سچی بات کہدیں جیسے دُنیا میں اسکا اختیار ہے بلکہ اُن کی زبان اُن کے ارادہ اور قصد کے خلاف حق بات کا اعتراف کرے گی - اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں منہ اور زبان بالکل بند کردی جاویں پھر خود زبان کو بھی حکم ہو کہ سچی بات بولے - واللہ اعلم

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۖ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ، یعنی گندی عورتیں گندے مَردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور پاک صاف عورتیں پاک صاف مَردوں کے لائق ہوتی ہیں اور پاک صاف مرد پاک صاف عورتوں کے لائق ہوتے ہیں -

اس آخری آیت میں اوّل تو عام ضابطہ یہ بتلا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے طبائع میں طبعی طور پر جوڑ رکھا ہے - گندی اور بدکار عورتیں بدکار مَردوں کی طرف اور گندے بدکار مرد گندی بدکار عورتوں کیطرف رغبت کیا کرتے ہیں - اسی طرح پاک صاف عورتوں کی رغبت پاک صاف مَردوں کی طرف ہوتی ہے اور پاک صاف مَردوں کی رغبت پاک صاف عورتوں کیطرف ہوا کرتی ہے - اور ہر ایک اپنی اپنی رغبت کیمطابق اپنا جوڑ تلاش کرتا ہے اور قدرۃً اُسکو وہی ملجاتا ہے -

اس عام عادتِ کلیہ اور ضابطہ سے واضح ہوگیا کہ انبیاء علیہم السلام جو دُنیا میں پاکی اور صفائی ظاہری و باطنی میں مثالی شخصیت ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اُن کو ازواج بھی اُنکے مناسب عطا فرماتے ہیں - اس سے معلوم ہوا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء کے سردار ہیں اُن کو ازواج مطہرات بھی اللہ تعالیٰ نے پاکی اور صفائی ظاہری اور اخلاقی برتری میں آپ ہی

کی مناسب شان عطا فرمائی ہیں۔ اور صدیقہ عائشہؓ اُن سب میں ممتاز ہیں۔ اُن کے بارے میں شک و شبہ وہی کر سکتا ہے جس کو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہو۔ اور حضرت نوحؑ و حضرت لوطؑ علیہما السلام کی بیبیوں کے بارے میں جو قرآن کریم میں اُن کا کافر ہونا مذکور ہے تو اُنکے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ کافر ہونے کے باوجود فسق و فجور میں مبتلا نہیں تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ما بغت امرأۃ نبی قط، یعنی کسی نبی کی عورت نے کبھی زنا نہیں کیا (ذکر فی الدر المنثور) اس سے معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بیوی کا فر ہو جائے اسکا تو امکان ہے مگر بدکار فاحشہ ہو جائے یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بدکاری طبعی طور پر موجب نفرتِ عوام ہے کفر طبعی نفرت کا موجب نہیں (بیان القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا

اے ایمان والو مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھر کے سوائے جب تک بول چال نہ کر لو،

وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور سلام کر لو اُن گھر والوں پر یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو،

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ

پھر اگر نہ پاؤ اسمیں کسی کو تو اس میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ ملے تم کو اور

اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اگر تم کو جواب ملے کہ پھر جاؤ تو پھر جاؤ اسمیں خوب ستھرائی ہے تمہارے لئے اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو

عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ

جانتا ہے نہیں گناہ تم پر اسمیں کہ جاؤ اُن گھروں میں جہاں کوئی نہیں بستا،

فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

اس میں کچھ چیز ہو تمہاری اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو

خلاصۂ تفسیر

حکم پنجم استیذان اور آداب ملاقات باہمی کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنا

سورۂ نور کے شروع ہی سے فواحش اور بیحیائی کی روک تھام کے لئے اُن سے متعلقہ جرائم کی سزاؤں کا ذکر اور بے دلیل کسی پر تہمت لگانے کی مذمت کا بیان تھا آگے اُنہی فواحش کے انسداد اور عفت و عصمت کے تحفظ کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے ایسے حالات ہی پیدا نہ ہوں جہاں سے بیحیائی کو راستہ ملے اِنہی احکام میں سے استیذان کے مسائل و احکام ہیں کہ کسی شخص کے مکان میں بغیر اُس کی اجازت

کے داخل ہونا یا اندر جھانکنا ممنوع کر دیا گیا جسمیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر نہ پڑے۔
آیات مذکورہ میں مختلف قسم کے مکانات کے مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں۔
مکانات کی چار قسمیں ہیں۔ ایک خاص اپنے رہنے کا مکان، جسمیں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال نہیں۔ دوسرے وہ مکان جسمیں کوئی اور بھی رہتا ہو خواہ وہ اپنے محارم ہی کیوں نہوں یا کسی اور کے اسمیں آجانے کا احتمال ہو۔ تیسری قسم وہ مکان جسمیں کسی کا بالفعل رہنا یا نہ رہنا دونوں کا احتمال ہو۔ چوتھی قسم وہ مکان جو کسی خاص شخص کی رہائش کے لئے مخصوص نہ ہو جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ عام لوگوں کے انتفاع اور آمد و رفت کی جگہیں۔ انمیں قسم اوّل کا حکم تو ظاہر تھا کہ اسمیں جانے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں اسلئے اُسکا ذکر ان آیات میں صراحۃً نہیں کیا گیا باقی تین قسموں کے مکانات کے احکام اگلی آیتوں میں بیان فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں (جنہیں دوسرے لوگ رہتے ہوں خواہ وہ اُن کی ملک ہوں یا کسی سے عاریۃً رہنے کو لے لئے ہوں یا کرایہ پر لئے ہوں) داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے اُن کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (یعنی اوّل باہر سے سلام کرکے پھر اُن سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے اور بغیر اجازت لئے ویسے ہی مت گھُس جاؤ۔ اور اگرچہ بعض لوگ اجازت لینے کو اپنی شان کے خلاف سمجھیں لیکن واقع میں) یہی تمھارے لئے بہتر ہے (کہ اجازت لیکر جاؤ اور یہ بات تم کو اس لئے بتائی) تاکہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو کہ اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ یہ حکم ہوا مکانات کی قسم دوم کا) پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو (خواہ واقع میں وہاں کوئی ہو یا نہ ہو) تو (بھی) ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے (کیونکہ اوّل تو یہ احتمال ہے کہ اُس میں کوئی آدمی موجود ہو اگرچہ تمھیں معلوم نہیں۔ اور واقع میں کوئی موجود نہ ہو تو دوسرے کے خالی مکان میں بھی بلا اجازت گھُس جانا، دوسرے کی ملک میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرّف کرنا ہے جو ناجائز ہے۔ یہ حکم ہوا قسم سوم کا) اور اگر (اجازت طلب کرنے کے وقت) تم سے یہ کہہ دیا جاوے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آیا کرو یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے (اس بات سے کہ وہیں جم جاؤ کہ کبھی تو باہر نکلیں گے کیونکہ اسمیں اپنی ذلت اور دوسرے پر بلا وجہ دباؤ ڈال کر تکلیف پہنچانا ہے اور کسی مسلمان کو ایذا دینا حرام ہے) اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب اعمال کی خبر ہے (اگر خلاف حکم کروگے سزا پاؤ گے اور یہی حکم اُس صورت کا ہے کہ گھر والوں نے اگرچہ لوٹ جانے کو کہا نہیں مگر کوئی بولا بھی نہیں۔ ایسی حالت میں تین مرتبہ استیذان اس احتیاط

پر کرلیا جاوے کہ شاید سنا نہ ہو۔ تین مرتبہ تک جب کوئی جواب نہ آوے تو لوٹ آنا چاہیئے جیسا کہ حدیث میں اسکی تصریح موجود ہے) اور تم کو ایسے مکانات میں (بغیر خاص اجازت کے) چلے جانے میں گناہ نہ ہوگا جن میں (گھر کے طور پر) کوئی نہ رہتا ہو (اور) اُن میں تمھاری برت ہو (یعنی ان مکانات کے برتنے اور استعمال کرنے کا تمھیں حق ہو، یہ حکم ہے قسم چہارم کا جو رفاہِ عام کے مکانات ہیں اور جن سے عام لوگوں کے منافع متعلق ہیں۔ تو وہاں جانے کی عادۃً عام اجازت ہوتی ہے) اور تم جو کچھ علانیہ کرتے ہو یا پوشیدہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔ (اس لئے ہر حال میں تقویٰ اور خوفِ خدا لازم ہے)۔

معارف و مسائل

قرآنی آداب معاشرت کا ایک اہم باب کسی کی مُلاقات کو جاؤ تو پہلے اجازت لو بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہو

افسوس ہے کہ شریعتِ اسلام نے جس قدر اس معاملے کا اہتمام فرمایا کہ قرآن حکیم میں اس کے مفصّل احکام نازل ہوئے اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اُس کی بڑی تاکید فرمائی، اُتنا ہی آجکل مسلمان اس سے غافل ہوگئے۔ لکھے پڑھے نیک لوگ بھی نہ اس کو کوئی گناہ سمجھتے ہیں نہ اس پر عمل کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ دُنیا کی دوسری مہذب قوموں نے اس کو اختیار کر کے اپنے معاشرہ کو درست کرلیا مگر مُسلمان ہی اسمیں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ اسلامی احکام میں سب سے پہلے سُستی اسی حکم میں شروع ہوئی بہرحال استیذان قرآن کریم کا وہ واجب التعمیل حکم ہے کہ اسمیں ذراسی سستی اور تبدیلی کو بھی حضرت ابنِ عباسؓ انکار آیت قرآن کے شدید الفاظ سے تعبیر فرما رہے ہیں اور اب تو لوگوں نے واقعی ان احکام کو ایسا نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا اُن کے نزدیک یہ قرآن کے احکام ہی نہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

استیذان کی حکمتیں اور مصالح مہمہ

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے ہر انسان کو جو اسکے رہنے کی جگہ عطا فرمائی خواہ مالکانہ ہو یا کرایہ وغیرہ پر بہرحال اُسکا گھر اُسکا مسکن ہے اور مسکن کی اصل غرض سکون و راحت ہے قرآن عزیز نے جہاں اپنی اس نعمت گرانمایہ کا ذکر فرمایا ہے اسمیں بھی اس طرف اشارہ ہے فرمایا جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا، یعنی اللہ نے تمھارے گھروں سے تمھارے لئے سکون و راحت کا سامان دیا۔ اور یہ سکون و راحت جبھی باقی رہ سکتا ہے کہ انسان دوسرے کسی شخص کی مداخلت کے بغیر اپنے گھر میں اپنی ضرورت کیمطابق آزادی سے کام اور آرام کرسکے۔ اسکی آزادی میں خلل ڈالنا گھر کی اصل مصلحت کو فوت کرنا ہے جو بڑی ایذا و تکلیف ہے۔ اسلام نے کسی کو بھی ناحق تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ استیذان کے احکام

ہیں ایک بڑی مصلحت لوگوں کی آزادی میں خلل ڈالنے اور اُن کی ایذا رسانی سے بچنا ہے جو ہر شریف انسان کا عقلی فریضہ بھی ہے۔ دوسری مصلحت خود اس شخص کی ہے جو کسی کی ملاقات کے لئے اُسکے پاس گیا ہے کہ جب وہ اجازت لیکر شائستہ انسان کی طرح ملیگا تو مخاطب بھی اسکی بات قدر و منزلت سے سُنے گا اور اگر اسکی کوئی حاجت ہے تو اُسکے پُورا کرنیکا داعیہ اُسکے دل میں پیدا ہوگا۔ بخلاف اسکے کہ وحشیانہ طرز سے کسی شخص پر بغیر اسکی اجازت کے مسلط ہوگیا تو مخاطب اسکو ایک بلائے ناگہانی سمجھ کر دفع الوقتی سے کام لیگا خیر خواہی کا داعیہ اگر ہوا بھی تو مضمحل ہوجائیگا اور اسکو ایذاءِ مسلم کا گناہ الگ ہوگا۔

تیسری مصلحت فواحش اور بے حیائی کا انسداد ہے کہ بلا اجازت کسی کے مکان میں داخل ہوجانے سے یہ بھی احتمال ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر پڑے اور شیطان دل میں کوئی مرض پیدا کردے اور اسی مصلحت سے احکام استیذان کو قرآنِ کریم میں حدِ زنا۔ حدِ قذف وغیرہ احکام کے متصل لایا گیا ہے۔

چوتھی مصلحت یہ ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے گھر کی تنہائی میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جس پر دوسروں کو اطلاع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے گھر میں آجائے تو وہ جس چیز کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اُس پر مطلع ہوجائیگا کسی کے پوشیدہ راز کو زبردستی معلوم کرنیکی فکر بھی گناہ اور دوسروں کے لئے موجب ایذا ہے۔ استیذان کے کچھ مسائل تو خود آیاتِ مذکورہ میں آ گئے ہیں پہلے اُن کی تفصیل و تشریح دیکھیئے باقی متفرق مسائل بعد میں لکھے جاویں گے۔

مسئلہ: ان آیات میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا جو مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں جیسا کہ عام احکامِ قرآنیہ اسی طرح مردوں کو مخاطب کرکے آتے ہیں عورتیں بھی اُسمیں شامل ہوتی ہیں بجز مخصوص مسائل کے جنکی خصوصیت مردوں کیساتھ بیان کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ نساءِ صحابہ کا بھی یہی معمول تھا کہ کسی کے گھر جاویں تو پہلے اُن سے استیذان کریں۔ حضرت اُمِّ ایاسؓ فرماتی ہیں کہ ہم چار عورتیں اکثر حضرت صدیقہ عائشہؓ کے پاس جایا کرتی تھیں اور گھر میں جانے سے پہلے اُن سے استیذان کرتی تھیں جب وہ اجازت دیتی تو اندر جاتی تھیں (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم)

مسئلہ: اسی آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے استیذان کا حکم عام ہے مرد عورت محرم غیر محرم سب کو شامل ہے۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد مرد کے پاس، سب کو استیذان کرنا واجب ہے اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی استیذان کرنا چاہیئے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں مرسلاً عطا ابن یسارؒ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا کہ کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے وقت بھی استیذان کروں آپ نے فرمایا ہاں استیذان کرو۔ اُس شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں تو اپنی والدہ ہی کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں

نہ جاؤ۔ اسنے پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہر وقت اُن کی خدمت میں رہتا ہوں آپ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ اپنی والدہ کو ننگی دیکھو اسنے کہا کہ نہیں۔ فرمایا اسی لئے استیذان کرنا چاہیئے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ گھر میں کسی ضرورت سے ستر کھولے ہوئے ہوں۔ (مظہری)

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیت قرآن میں جو غَيْرَ بُيُوتِكُمْ آیا ہے اسمیں بیوتکم سے مراد وہ بیوت اور گھر ہیں جن میں انسان تنہا خود ہی رہتا ہو۔ والدین، بہن بھائی وغیرہ اُس میں نہ ہوں۔

مسئلہ: جس گھر میں صرف اپنی بیوی رہتی ہو اسمیں داخل ہونے کے لئے اگرچہ استیذان واجب نہیں مگر مستحب اور طریق سنت یہ ہے کہ وہاں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے اندر نہ جائے بلکہ داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح پہلے باخبر کردے پھر داخل ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب کبھی باہر سے گھر میں آتے تھے تو دروازہ میں کھنکار کر پہلے اپنے آنے سے باخبر کردیتے تھے تاکہ وہ ہمیں کسی ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو انکو پسند نہ ہو (ابن کثیر بحوالہ ابن جریر وقال اسنادہ صحیح) اور اس صورت میں استیذان کا واجب نہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاءؒ سے دریافت کیا کہ کیا ایک شخص کو اپنی بیوی کے پاس جانیکے وقت بھی استیذان ضروری ہے انھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ واجب نہیں لیکن مستحب اور اَولیٰ وہاں بھی ہے۔

استیذان کا مسنون طریقہ آیت میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ ہے حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا یعنی کسی کے گھر میں اسوقت تک داخل نہ ہو جبتک دو کام نہ کرلو، اوّل استیناس، اسکے لفظی معنی طلب اُنس کے ہیں۔ مراد اس سے جمہور مفسرین کے نزدیک استیذان یعنی اجازت حاصل کرنا ہی استیذان کو بلفظ استیناس ذکر کرنے میں اشارہ اسطرف ہے کہ داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنے میں مخاطب مانوس ہوتا ہے اسکو وحشت نہیں ہوتی۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر والوں کو سلام کرو۔ اسکا مفہوم بعض حضرات مفسرین نے تو یہ لیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو اور جب گھر میں جاؤ تو سلام کرو۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں پہلے استیذان کیا جائے جب اجازت مل جائے اور گھر میں جائیں تو سلام کریں۔ اور اسی کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث کا مقتضیٰ قرار دیا ہے۔ اور ماوردی نے اسمیں یہ تفصیل کی ہے کہ اگر اجازت لینے سے پہلے گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے ورنہ پہلے اجازت لے اور جب گھر میں جائے تو سلام کرے مگر عام روایات حدیث سے جو طریقہ مسنون معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلے باہر سے سلام کرے السلام علیکم اسکے بعد اپنا نام لیکر کہے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

امام بخاری نے الادب المفرد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص سلام سے پہلے استیذان کرے اسکو اجازت نہ دو (کیونکہ اسنے مسنون طریقہ کو چھوڑ دیا) (روح المعانی) اور ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسطرح استیذان کیا کہ باہر سے کہا أَأَلِج کیا میں گھس جاؤں۔ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا باہر جا کر اسکو طریقہ سکھلاؤ کہ یوں کہے السلام علیکم أأدخل یعنی کیا میں داخل ہو سکتا ہوں۔ ابھی یہ خادم باہر نہیں گیا تھا کہ اسنے خود حضورؐ کے کلمات سن لئے اور اسطرح کہا السلام علیکم أأدخل۔ تو آپ نے اندر آنے کی اجازت دیدی (ابن کثیر) اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تأذنوا لمن لم یبدأ بالسلام یعنی جو شخص پہلے سلام نہ کرے اسکو اندر آنے کی اجازت نہ دو (مظہری) اس واقعہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو اصلاحیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ پہلے سلام کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اس نے أَدخل کے بجائے أَلِج کا لفظ استعمال کیا تھا یہ نامناسب تھا کیونکہ الج ولوج سے مشتق ہے جسکے معنے کسی تنگ جگہ میں گھسنے کے ہیں یہ تہذیب الفاظ کے خلاف تھا۔ بہرحال ان روایات سے یہ معلوم ہوا کہ آیت قرآن میں جو سلام کرنے کا ارشاد ہے یہ سلام استیذان ہے جو اجازت حاصل کرنے کے لئے باہر سے کیا جاتا ہے تاکہ اندر جو شخص ہے وہ متوجہ ہو جائے اور جو الفاظ اجازت طلب کرنے کے لئے کہے گا وہ سن لے۔ گھر میں داخل ہونے کے وقت حسب معمول دوبارہ سلام کرے۔

مسئلہ: پہلے سلام اور پھر داخل ہونے کی اجازت لینے کا جو بیان اوپر احادیث سے ثابت ہوا اسمیں بہتر یہ ہے کہ اجازت لینے والا خود اپنا نام لیکر اجازت طلب کرے جیسا کہ حضرت فاروق اعظم کا عمل تھا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر آکر یہ الفاظ کہے۔ السلام علی رسول اللہ السلام علیکم أیدخل عمر یعنی سلام کے بعد کہا کہ کیا عمر داخل ہو سکتا ہے (رواہ قاسم بن اصبغ وابن عبدالبر فی التمہید عن ابن عباس عن ابن عمرؓ۔ ابن کثیر) اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو استیذان کے لئے یہ الفاظ فرمائے۔ السلام علیکم ھذا ابو موسیٰ السلام علیکم ھذا الاشعری (قرطبی) اسمیں بھی پہلے اپنا نام ابوموسیٰ بتلایا پھر مزید وضاحت کے لئے اشعری کا ذکر کیا۔ اور یہ اسلئے کہ جب تک آدمی اجازت لینے والے کو پہچانے نہیں تو جواب دینے میں تشویش ہوگی۔ اس تشویش سے بھی مخاطب کو بچانا چاہیئے۔

مسئلہ: اور اس معاملہ میں سب سے بُرا وہ طریقہ ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اندر سے مخاطب نے پوچھا کون صاحب ہیں

توجواب میں یہ کہدیا کہ میں ہوں، کیونکہ یہ مخاطب کی بات کا جواب نہیں، جس نے اوّل آواز سے نہیں پہچانا وہ مَیں کے لفظ سے کیا پہچانے گا۔

خطیب بغدادی نے اپنے جامع میں علی بن عاصم واسطی سے نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ گئے توحضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ دروازہ پر دستک دی حضرت مغیرہؓ نے اندر سے پوچھا کون ہے تو جواب دیا انا (یعنی مَیں ہوں) توحضرت مغیرہ نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں تو کوئی بھی ایسا نہیں جسکا نام انا ہو پھر باہر تشریف لائے اور اُن کو حدیث سُنائی کہ ایک روز حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت لینے کے لئے دروازہ پر دستک دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر سے پُوچھا کون صاحب ہیں؟ توجابرؓ نے یہی لفظ کہدیا انا یعنی میں ہوں۔ آپ نے بطور زجر و تنبیہ کے فرمایا انا انا یعنی انا انا کہنے سے کیا حاصل ہے اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا۔

مسئلہ: اس سے بھی زیادہ بُرا یہ طریقہ ہے جو آجکل بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں کہ دروازہ پر دستک دی جب اندر سے پُوچھا گیا کہ کون صاحب ہیں تو خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ یہ مخاطب کو تشویش میں ڈالنے اور ایذا پہنچانے کا بدترین طریقہ ہے جس سے استیذان کی مصلحت ہی فوت ہوجاتی ہے۔

مسئلہ: روایاتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ استیذان کا یہ طریقہ بھی جائز ہے کہ دروازہ پر دستک دیدی جائے بشرطیکہ ساتھ ہی اپنا نام بھی ظاہر کرکے بتلا دیا جائے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

مسئلہ: لیکن اگر دستک ہو تو اتنی زور سے نہ دے کہ جس سے سُننے والا گھبرا اُٹھے بلکہ متوسط انداز سے دے جس سے اندر تک آواز تو چلی جائے لیکن کوئی سختی ظاہر نہ ہو۔ جو لوگ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دستک دیتے تھے تو اُن کی عادت یہ تھی کہ ناخنوں سے دروازہ پر دستک دیتے تاکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو (رواہ الخطیب فی جامعہ۔ قرطبی) جو شخص استیذان کے مقصد کو سمجھ لے کہ اصل اُس سے استینا س ہے یعنی مخاطب کو مانوس کرکے اجازت حاصل کرنا وہ خود بخود ان سب چیزوں کی رعایت کو ضروری سمجھے گا جن چیزوں سے مخاطب کو تکلیف ہو اُس سے بچیگا۔ اپنا نام ظاہر کرے اور دستک دے تو متوسط انداز سے دے یہ سب چیزیں اُس میں شامل ہیں۔

تنبیہ ضروری آجکل اکثر لوگوں کو تو استیذان کی طرف کوئی توجہ ہی باقی نہیں رہی جو صریح ترک واجب کا گناہ ہے اور جو لوگ استیذان کرنا چاہیں اور مسنون طریقہ کے مطابق باہر سے پہلے سلام کریں پھر اپنا نام بتلا کر اجازت لیں۔ اُن کے لئے اس زمانے میں بعض دشواریاں یُوں بھی پیش آتی ہیں کہ عموماً مخاطب جس سے اجازت لیتا ہے وہ دروازہ سے دُور ہے۔ وہاں

تک سلام کی آواز اور اجازت لینے کے الفاظ پہنچنا مشکل ہیں اسلئے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اصل واجب یہ بات ہے کہ بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہو۔ اجازت لینے کے طریقے ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف ہوسکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک طریقہ دروازہ پر دستک دینے کا تو خود روایاتِ حدیث سے ثابت ہے اسی طرح جو لوگ اپنے دروازوں پر گھنٹی لگا لیتے ہیں اُس گھنٹی کا بجا دینا بھی واجب استیذان کی ادائیگی کے لئے کافی ہے بشرطیکہ گھنٹی کے بعد اپنا نام بھی ایسی آواز سے ظاہر کردے جس کو مخاطب سُن لے۔ اسکے علاوہ اور کوئی طریقہ جو کسی جگہ رائج ہو اسکا استعمال کرلینا بھی جائز ہے آجکل جو شناختی کارڈ کا رواج یورپ سے چلا ہے یہ رسم اگرچہ اہلِ یورپ نے جاری کی مگر مقصد استیذان اسمیں بہت اچھی طرح پورا ہوجاتا ہے کہ اجازت دینے والے کو اجازت چاہنے والے کا پورا نام و پتہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے بغیر کسی تکلیف کے معلوم ہوجاتا ہے اس لئے اسکو اختیار کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی شخص سے استیذان کیا اور اُسنے جواب میں کہہ دیا کہ اسوقت ملاقات نہیں ہوسکتی لوٹ جائیے تو اس سے بُرا نہ ماننا چاہیئے کیونکہ ہر شخص کے حالات اور اُسکے مقتضیات مختلف ہوتے ہیں بعض وقت وہ مجبور ہوتا ہے باہر نہیں آسکتا نہ آپکو اندر بلا سکتا ہے تو ایسی حالت میں اُسکے عذر کو قبول کرنا چاہیئے۔ آیت مذکورہ میں یہی ہدایت ہے وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۔ یعنی جب آپ سے کہا جائے کہ اسوقت لوٹ جائیں تو آپ کو خوشدلی سے لوٹ آنا چاہیئے اس سے بُرا ماننا یا وہیں جم کر بیٹھ جانا دونوں چیزیں درست نہیں بعض حضرات سلف سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں عمر بھر اس تمنا میں رہا کہ کسی کے پاس جاکر استیذان کروں اور وہ مجھے یہ جواب دے کہ لوٹ جاؤ تو میں اس حکم قرآنی کی تعمیل کا ثواب حاصل کروں مگر عجیب اتفاق ہے کہ مجھے کبھی یہ نعمت نصیب نہ ہوئی۔

مسئلہ: شریعتِ اسلام نے حُسنِ معاشرت کے آداب سکھانے اور سب کو ایذا و تکلیف سے بچانے کا دو طرفہ معتدل نظام قائم فرمایا ہے اس آیت میں جس طرح آنیوالے کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر استیذان کرنے پر آپ کو اجازت نہ ملے اور کہا جائے کہ اسوقت لوٹ جاؤ تو کہنے والے کو معذور سمجھو اور خوشدلی کیساتھ واپس لوٹ جاؤ بُرا نہ مانو اسی طرح ایک حدیث میں اسکا دوسرا رُخ اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لزورك عليك حقا یعنی جو شخص آپ سے ملاقات کے لئے آئے اُسکا بھی آپ پر حق ہے یعنی اسکا یہ حق ہے کہ اسکو اپنے پاس بلا دیا باہر آکر اُس سے ملو اسکا اکرام کرو بات سنو بلا کسی شدید مجبوری اور عذر کے ملاقات سے انکار نہ کرو۔

مسئلہ: اگر کسی کے دروازے پر جاکر استیذان کیا اور اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو سُنت

یہ ہے کہ دوبارہ پھر استیذان کرے اور پھر بھی جواب آوے تو تیسری مرتبہ کرے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ آوے تو اسکا حکم وہی ہے جو ارجعوا کا ہے۔ یعنی لوٹ جانا چاہیئے کیونکہ تین مرتبہ کہنے سے تقریباً یہ تو متعین ہو جاتا ہے کہ آواز سن لی مگر یا تو وہ شخص ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا مثلاً نماز پڑھ رہا ہے یا بیت الخلاء میں ہے یا غسل کر رہا ہے اور یا پھر اسکو اسوقت ملنا منظور نہیں دونوں حالتوں میں وہیں جمے رہنا اور مسلسل دستک وغیرہ دیتے رہنا بھی موجبِ ایذا ہے جس سے بچنا واجب ہے اور استیذان کا اصل مقصد ہی ایذا سے بچنا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا استأذن احدکم ثلاثاً فلم یؤذن لہ فلیرجع۔ یعنی جب کوئی آدمی تین مرتبہ استیذان کرے اور کوئی جواب آوے تو اسکو لوٹ جانا چاہیئے (ابن کثیر بحوالہ صحیح بخاری) اور مسند احمد میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور سنت کیمطابق باہر سے استیذان کیلئے سلام کیا السلام علیکم حضرت سعد بن عبادہ نے سلام کا جواب تو دیا مگر آہستہ کہ حضور نہ سنیں، آپ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ سلام کیا۔ حضرت سعد رضؓ سنتے اور آہستہ جواب دیتے رہے تین مرتبہ ایسا کرنے کے بعد آپ لوٹ گئے جب سعد رضؓ نے دیکھا کہ اب آواز نہیں آرہی تو گھر سے نکل کر پیچھے دوڑے اور یہ عذر پیش کیا کہ یارسول اللہ میں نے ہر مرتبہ آپ کی آواز سنی اور جواب بھی دیا مگر آہستہ دیا تاکہ زبان مبارک سے زیادہ سے زیادہ سلام کے الفاظ میرے بارے میں نکلیں وہ میرے لئے موجب برکت ہوگا (آپ نے اُن کو طریقۂ سنت بتلا دیا کہ تین مرتبہ جواب نہ آنے پر لوٹ جانا چاہیئے) اس کے بعد حضرت سعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر ساتھ لے گئے انھوں نے کچھ مہمانی کی آپ نے اسکو قبول فرمایا۔

حضرت سعد رضؓ کا یہ عمل غلبۂ عشق و محبت کا اثر تھا کہ اسوقت ذہن اسطرف نہ گیا کہ سرورِ دو عالم دروازے پر تشریف فرما ہیں مجھے فوراً جاکر انکے قدم چوم لینے چاہئیں بلکہ ذہن اسطرف متوجہ ہو گیا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے السلام علیکم جتنی مرتبہ زیادہ نکلے گا میرے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ بہرحال اس سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ تین مرتبہ استیذان کے بعد جواب نہ آوے تو سنت یہ ہے کہ لوٹ جائے وہیں جم کر بیٹھ جانا خلاف سنت اور مخاطب کے لئے موجبِ ایذا ہے کہ اسکو دباؤ ڈالکر نکلنے پر مجبور کرنا ہے۔

مسئلہ: یہ حکم اسوقت ہے جبکہ سلام یا دستک وغیرہ کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کی کوشش تین مرتبہ کرلی ہو کہ اب وہاں جم کر بیٹھ جانا موجبِ ایذا ہے لیکن اگر کوئی کسی عالم یا بزرگ کے دروازہ پر بغیر استیذان کئے ہوئے اور بغیر ان کو اطلاع دیئے ہوئے انتظار میں بیٹھ رہے کہ جب اپنی فرصت

کے مطابق باہر تشریف لا دینگے تو ملاقات ہو جائیگی یہ سمیں داخل نہیں بلکہ عین ادب ہے خود قرآن کریم نے لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوں تو اُن کو آواز دیکر بُلانا ادب کیخلاف ہے بلکہ لوگوں کو چاہیئے کہ انتظار کریں جسوقت آپ اپنی ضرورت کیمطابق باہر تشریف لادیں اُسوقت ملاقات کریں۔ آیت یہ ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں بعض اوقات کسی انصاری صحابی کے دروازہ پر پورے دوپہر انتظار کرتا رہتا ہوں کہ جب وہ باہر تشریف لادیں تو اُن سے کسی حدیث کی تحقیق کروں اور اگر میں اُن سے ملنے کے لئے اجازت مانگتا تو وہ ضرور مجھے اجازت دیدیتے مگر میں اسکو خلافِ ادب سمجھتا تھا اسلئے انتظار کی مشقت گوارا کرتا تھا۔ (صحیح بخاری)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ لفظ متاع کے لغوی معنی کسی چیز کے برتنے استعمال کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کے ہیں اور جس چیز سے فائدہ اُٹھایا جائے اسکو بھی متاع کہا جاتا ہے اس آیت میں متاع کے لغوی معنی ہی مُراد ہیں جسکا ترجمہ برَت سے کیا گیا ہے یعنی برتنے کا استحقاق۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ جب استیذان کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جنمیں بغیر اجازت کے کسی مکان میں داخل ہونیکی ممانعت ہے تو صدیق اکبرؓ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ، اس ممانعت کے بعد قریش کے تجارت پیشہ لوگ کیا کرینگے کیونکہ مکہ اور مدینہ سے ملک شام تک اُنکے تجارتی سفر ہوتے ہیں اور اس راستہ میں جابجا اُنکے مسافر خانے بنے ہوتے ہیں جنمیں دوران سفر وہ لوگ قیام کرتے ہیں۔ انمیں کوئی مستقل رہنے والا نہیں ہوتا تو وہاں استیذان کی کیا صورت ہوگی اجازت کس سے حاصل کیجائیگی۔ اسپر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظہری) اس شانِ نزول کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ آیت میں بیوت غیر مسکونہ سے مُراد وہ مکانات اور مقامات ہیں جو کسی خاص فرد یا قوم کے لئے خصوصی طور پر رہائش گاہ نہیں بلکہ افرادِ قوم کو عام اجازت وہاں جانے ٹھہرنے اور استعمال کرنے کی ہے جیسے وہ مسافر خانے جو شہروں اور جنگلوں میں اسی غرض کے لئے بنائے گئے ہوں اور باشتراکِ علت عام مسجدیں، خانقاہیں، دینی مدارس، ہسپتال، ڈاکخانہ، ریلوے اسٹیشن، ہوائی جہازوں کے مستقر اور قومی تفریحات کیلئے جو مکانات بنائے گئے ہوں غرض رفاہِ عام کے سب ادارے اسی حکم میں ہیں کہ وہاں ہر شخص بلا اجازت جا سکتا ہے۔

مسئلہ: رفاہِ عام کے اداروں میں جس مقام پر اُسکے مالکان یا متولیان کیطرف سے داخلہ کے لئے کچھ شرائط اور پابندیاں ہوں اُنکی پابندی شرعاً واجب ہے مثلاً ریلوے اسٹیشن پر اگر بغیر پلیٹ فارم کے جانے کی اجازت نہیں ہو تو پلیٹ فارم ٹکٹ حاصل کرنا ضروری ہے اسکی خلاف ورزی ناجائز ہے ایروڈرم (ہوائی اڈے) کے جس حصہ میں جانیکی محکمہ کیطرف سے اجازت نہ ہو وہاں بغیر اجازت

کے جانا شرعاً جائز نہیں۔
مسئلہ: اسی طرح مساجد، مدارس، خانقاہوں، ہسپتالوں وغیرہ میں جو کمرے وہاں کے منتظمین یا دوسرے لوگوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہوں جیسے مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے خاص حجرے یا ریلوے، ایئرڈروم اور ہسپتالوں کے دفاتر اور مخصوص کمرے جو مریضوں یا دوسرے لوگوں کی رہائش گاہ ہیں وہ بیوت غیر مسکونہ کے حکم میں نہیں، بلکہ مسکونہ کے حکم میں ہیں انمیں بغیر اجازت جانا شرعاً ممنوع اور گناہ ہے۔

استیذان سے متعلق چند دوسرے مسائل

جبکہ یہ معلوم ہوچکا کہ استیذان کے احکامِ شرعیہ کا اصل مقصد لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا اور حُسنِ معاشرت کے آداب سکھانا ہے تو اشتراکِ علت سے مسائل ذیل کا حکم بھی معلوم ہوگیا۔
ٹیلیفون سے متعلق بعض مسائل مسئلہ: کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون پر مخاطب کرنا جو عادۃً اُس کے سونے یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونیکا وقت ہو بلاضرورتِ شدیدہ جائز نہیں کیونکہ اسمیں بھی وہی ایذا رسانی ہے جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اُس کی آزادی میں خلل ڈالنے سے ہوتی ہے۔
مسئلہ: جس شخص سے ٹیلیفون پر بات چیت اکثر کرنا ہو تو مناسب یہ ہے کہ اُس سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ٹیلیفون پر بات کرنے میں کس وقت سہولت ہوتی ہے پھر اُس کی پابندی کرے۔ مسئلہ: ٹیلیفون پر اگر کوئی طویل بات کرنا ہو تو پہلے مخاطب سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ذرا سی فرصت ہو تو میں اپنی بات عرض کردوں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی آنے پر آدمی طبعاً مجبور ہوتا ہے کہ فوراً معلوم کرے کہ کون کیا کہنا چاہتا ہے اور اس ضرورت سے وہ کسی بھی حال میں اور اپنے ضروری کام میں ہو تو اُسکو چھوڑ کر ٹیلیفون اُٹھاتا ہے۔ کوئی بے رحم آدمی اُسوقت لمبی بات کرنے لگے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔
مسئلہ: بعض لوگ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور کوئی پروا نہیں کرتے نہ پوچھتے ہیں کہ کون ہے کیا کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی اخلاق کے خلاف اور بات کرنے والے کی حق تلفی ہے جیسے حدیث میں آیا ہے ان لزورك علیك حقًا یعنی جو شخص آپ کی ملاقات کو آئے اُس کا تم پر حق ہے کہ اس سے بات کرو اور بلا ضرورت ملاقات سے انکار نہ کرو اسی طرح جو آدمی ٹیلیفون پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اسکا حق ہے کہ آپ اسکو جواب دیں۔
مسئلہ: کسی کے مکان پر ملاقات کے لئے جاؤ اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے

ہو تو گھر کے اندر نہ جھانکو کیونکہ استیذان کی مصلحت تو یہی ہے کہ دوسرا آدمی جو چیز آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا آپکو اسکی اطلاع نہ ہونی چاہیئے اگر پہلے ہی گھر میں جھانک کر دیکھ لیا تو یہ مصلحت فوت ہو جاویگی حدیث میں اسکی سخت ممانعت آئی ہے (رواہ البخاری و مسلم عن سہل بن سعد الساعدی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریف یہ تھی کہ کسی کے پاس جاتے اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو دروازے کے بالمقابل کھڑے ہونے کے بجائے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر استیذان فرماتے تھے دروازہ کے بالمقابل کھڑے ہونیسے اسلئے اجتناب فرماتے کہ اول تو اُس زمانے میں دروازوں پر پردے بہت کم تھے اور پردہ بھی ہو تو ہوا سے کھل جانیکا احتمال بہر حال ہے۔ (مظہری)

مسئلہ: جن مکانوں میں داخل ہونا آیاتِ مذکورہ میں بغیر اجازت کے ممنوع قرار دیا ہے یہ عام حالات میں ہے اگر اتفاقاً کوئی حادثہ آگ لگنے یا مکان منہدم ہونیکا پیش آجائے تو اجازت لئے بغیر اسمیں جاسکتے ہیں اور امداد کے لئے جانا چاہیئے۔ (مظہری)

مسئلہ: جس شخص کو کسی نے بُلا کر بھیجا ہے اگر وہ اسکے قاصد کیساتھ ہی آگیا تو اب اسکو اجازت لینے کی ضرورت نہیں قاصد کا آنا ہی اجازت ہے۔ ہاں اگر اسوقت نہ آیا کچھ دیر کے بعد پہنچا تو اجازت لینا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا دعی احدکم فجاء مع الرسول فان ذلک لہ اذن، یعنی جو آدمی بُلایا جائے اور وہ قاصد کیساتھ ہی آجائے تو یہی اسکے لئے اندر آنیکی اجازت ہے۔ (رواہ ابوداؤد۔ مظہری)

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ

کہہ دے ایمان والوں کو نیچی رکھیں ذری اپنی آنکھیں اور تھامتے رہیں اپنے ستر کو اس میں

اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ

خوب ستھرائی ہے اُن کے لئے، بیشک اللہ کو خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں اور کہہ دے ایمان والیوں کو

يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ

نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ص

مگر جو کھُلی چیز ہے اسمیں سے اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے

اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ

یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے

أَوْ بَنِيٓ أَخَوٰتِهِنَّ أَوْ نِسَآئِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التّٰبِعِينَ

یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا اپنے ہاتھ کے مال کے یا کاروبار کرنے والوں کے

غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلٰى

جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جنھوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں

عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ

کے بھید کو اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنے

زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوٓا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۱﴾

سنگار اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب ملکر اے ایمان والو تاکہ تم بھلائی پاؤ

خلاصۂ تفسیر

حکم ششم عورتوں کے پردہ کے احکام آپ مسلمان مردوں سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کیطرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اُس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اسکو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ اُن کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے (اور اسکے خلاف میں آلودگی ہے زنا یا مقدمۂ زنا میں) بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں (پس خلاف کرنے والے سزایابی کے مستحق ہونگے) اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کیطرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اسکو بالکل نہ دیکھیں اور جسکو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا و سحاق سب داخل ہیں) اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں (زینت سے مُراد زیور جیسے کنگن، چوڑی، خلخال، بازوبند طوق، جھومر، پٹی، بالیاں وغیرہ اور ان کے مواقع سے مُراد ہاتھ، پنڈلی، بازو، گردن، سر، سینہ کان، یعنی ان سب مواقع کو سب سے چھپائے رکھیں بلحاظ ان دو استثناؤں کے جو آگے آتے ہیں اور جب ان مواقع کو اجانب سے پوشیدہ رکھنا واجب ہے جن کا ظاہر کرنا محارم کے روبرو جائز ہے جیسا آگے آتا ہے تو اور مواقع و اعضاء جو بدن کے رہ گئے جیسے پشت و شکم وغیرہ جنکا کھولنا محارم کے روبرو بھی جائز نہیں ان کا پوشیدہ رکھنا بدلالۃ النص واجب ہوگیا۔ حاصل یہ ہوا کہ سر سے پاؤں تک تمام بدن اپنا پوشیدہ رکھیں۔ دو استثناء جن کا ذکر اوپر آیا ہے اُن میں سے پہلا استثناء مواقع ضرورت کے لحاظ سے ہے کہ روزمرّہ کے کام کاج میں جن اعضاء کے کھولنے کی ضرورت

ہوتی ہے اُن کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اُس کی تفصیل یہ ہے) مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا (ہی) رہتا ہے (جس کے چھپانے میں ہر وقت حرج ہے مراد اس موقع زینت سے چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں اور اصح قول کے مطابق دونوں قدم بھی ہیں کیونکہ چہرہ تو قدرتی طور پر مجمع زینت ہے اور بعض زینتیں قصداً بھی اسمیں کی جاتی ہیں مثل سرمہ وغیرہ اور ہتھیلیاں اور انگلیاں انگوٹھی چھلے مہندی کا موقع ہے اور قدمین بھی چھلوں اور مہندی کا موقع ہے پس ان مواقع کو اس ضرورت سے مستثنیٰ فرمایا ہے کہ ان کو کھولے بغیر کام کاج نہیں ہو سکتا اور ماظہر کی تفسیر وجہ اور کفین کیساتھ حدیث میں آئی ہے اور قدمین کو فقہاء نے اس پر قیاس کر کے اس حکم میں شامل قرار دیا ہے) اور (خصوصاً سر اور سینہ ڈھکنے کا بہت اہتمام کریں اور) اپنے دوپٹے (جو سر ڈھانکنے کے لئے ہیں) اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں (گو سینہ قمیص سے ڈھک جاتا ہے لیکن اکثر قمیص میں سامنے سے گریبان کھلا رہتا ہے اور سینہ کی ہیئت قمیص کے باوجود ظاہر ہوتی ہے اسلئے اہتمام کی ضرورت ہوئی آگے دوسرا استثناء بیان کیا جاتا ہے جن میں محرم مردوں وغیرہ کو پردہ کے حکم مذکور سے مستثنیٰ کیا گیا ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا (اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی وعلاتی واخیافی) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد ماموں زاد وغیرہ بھائیوں پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی وعلاتی واخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر (نہ کہ چچازاد خالہ زاد بہنوں کی اولاد پر) یا اپنی (یعنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر کیونکہ کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے رواہ فی الدر عن طاؤس و مجاہد و عطاء و سعید بن المسیب و ابراہیم) یا اپنی لونڈیوں پر (مطلقاً گو وہ کافر ہی ہوں کیونکہ مرد غلام کا حکم ابو حنیفہؒ کے نزدیک مثل اجنبی مرد کے ہے اُس سے بھی پردہ واجب ہے رواہ فی الدر عن طاؤس و مجاہد و عطاء و سعید بن المسیبؒ ابراہیم) یا اُن مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں اور ان کو (بوجہ حواس درست نہ ہونے کے عورتوں کیطرف) ذرا توجہ نہ ہو (تابعین کی تخصیص اس لئے ہے کہ اسوقت ایسے ہی لوگ موجود تھے کذا فی الدر عن ابن عباس اور اسی حکم میں ہے ہر مسلوب العقل پس مدار حکم کا سلب حواس پر ہے نہ کہ تابع اور طفیلی ہونے پر مگر اس وقت وہ تابع ایسے ہی تھے اس لئے تابع کا ذکر کر دیا گیا لقول ابن عباس رضؓ فی الدر مغفل فی عقلہ احمق لا یکترث للنساء اور جو سمجھ رکھتا ہو تو وہ بہر حال اجنبی مرد ہے گو بوڑھا یا خصی یا مجبوب ہی کیوں نہ ہو اُس سے پردہ واجب ہے) یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے (مراد وہ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب نہیں پہنچے اور اُنھیں شہوت

کی کچھ خبر نہیں پس ان سب کے سامنے وجہ وکفین وقدمین کے علاوہ زینت کے مواقع مذکورہ کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے یعنی سر اور سینہ اور شوہر کے روبرو کسی جگہ کا بھی اخفار واجب نہیں گو خاص بدن کو دیکھنا خلاف اولیٰ ہے۔ قالت سیدتنا ام المؤمنین عائشۃ رضی اللہ عنہا ما رأیتہ منہ ولا رأی منی ذلک الموضع اوردہ فی المشکوٰۃ وروی بقی بن مخلد وابن عدی عن ابن عباس مرفوعا اذا جامع احدکم زوجتہ او جاریتہ فلا ینظر الی فرجہا فان ذلک یورث العمٰی قال ابن صلاح جید الاسناد کذا فی الجامع الصغیر) اور (پردے کا یہاں تک اہتمام رکھیں کہ چلنے میں) اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جاوے (یعنی زیور کی آواز غیر محرموں کے کان تک پہنچے) اور مسلمانو (تم سے جو ان احکام میں کوتاہی ہو گئی ہو تو) تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (ورنہ معصیت مانع فلاح کامل ہو جاتی ہے)۔

معارف و مسائل

انسداد فواحش اور حفاظت عصمت کا ایک اہم باب۔ پردۂ نسواں

عورتوں کے لئے حجاب اور پردہ کے احکام کی پہلی آیات وہ ہیں جو سورۂ احزاب میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آنے کے وقت نازل ہوئیں جس کی تاریخ بعض حضرات نے ۳ھ ہجری اور بعض نے ۵ھ ہجری بتلائی ہے تفسیر ابن کثیر اور نیل الاوطار میں ۵ھ ہجری کو ترجیح دی ہے اور روح المعانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ذی قعدہ ۵ھ ہجری میں یہ عقد ہوا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پہلی آیت حجاب اسی موقع پر نازل ہوئی۔ اور سورۂ نور کی یہ آیات قصۂ افک کیساتھ نازل ہوئی ہیں جو غزوہ بنی المصطلق یا مریسیع سے واپسی میں پیش آیا یہ غزوہ ۶ھ ہجری میں ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کی آیات پردہ و حجاب نزول کے اعتبار سے بعد میں آئی ہیں سورۂ احزاب کی چار آیتیں متعلقہ حجاب نزول کے اعتبار سے مقدم ہیں اور شرعی پردہ کے احکام اُسی وقت سے شروع ہوئے جبکہ سورۂ احزاب کی آیات نازل ہوئیں، اسلئے حجاب اور پردہ کی پوری بحث تو انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں آوے گی۔ یہاں صرف ان آیات کی تفسیر لکھی جاتی ہے جو سورۂ نور میں آئی ہیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ، یغضّوا، غضّ سے مشتق ہے جس کے معنی کم کرنے اور پست کرنے کے ہیں (راغب)، نگاہ پست اور نیچی رکھنے سے مُراد نگاہ کو اُن چیزوں سے پھیر لینا ہے

جن کی طرف دیکھنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ ابن کثیر۔ ابن حبان نے یہی تفسیر فرمائی ہے اس میں غیر محرم عورت کیطرف بُری نیت سے دیکھنا تحریماً اور بغیر کسی نیت کے دیکھنا کراہۃً داخل ہے اور کسی عورت یا مرد کے ستر شرعی پر نظر ڈالنا بھی اسمیں داخل ہے (مواضع ضرورت جیسے علاج معالجہ وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں) کسی کا راز معلوم کرنے کے لئے اُس کے گھر میں جھانکنا اور تمام وہ کام جن میں نگاہ کے استعمال کرنے کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے اسمیں داخل ہیں۔

وَیَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ، شرمگاہوں کی حفاظت سے مُراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں اُن سب سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں۔ اسمیں زنا، لواطت اور دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہو جائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز و حرام چیزیں داخل ہیں۔ مراد اس آیت کی ناجائز و حرام شہوت رانی اور اُس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے جن میں سے ابتدا اور انتہا کو تصریحاً بیان فرما دیا باقی درمیانی مقدمات سب اسمیں داخل ہو گئے۔ فتنۂ شہوت کا سب سے پہلا سبب اور مقدمہ نگاہ ڈالنا اور دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے ان دونوں کو صراحۃً ذکر کر کے حرام کر دیا گیا اُن کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سُننا۔ ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آگئے۔

ابن کثیر نے حضرت عبیدہؒ سے نقل کیا ہے کہ کلّ ما عصی اللہ بہ فھو کبیرۃ وقد ذکر الطرفین یعنی جس چیز سے بھی اللہ کے حکم کی مخالفت ہوتی ہو سب کبیرہ ہی ہیں لیکن آیت میں اُن کے دو طرف ابتدا و انتہا کو ذکر کر دیا گیا۔ ابتدا نظر اُٹھا کر دیکھنا اور انتہا زنا ہے۔ طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

النظر سھم من سھام ابلیس مسموم من ترکھا مخافتی ابدلتہ ایمانا یجد حلاوتہ فی قلبہ (از ابن کثیر)

نظر ایک زہریلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیر لے تو میں اسکے بدلے اسکو ایسا پختہ ایمان دونگا جسکی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اگر بلا ارادہ اچانک کسی غیر محرم عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی نظر اُسطرف سے پھیر لو (ابن کثیر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ پہلی نظر تو معاف ہے دوسری گناہ ہے، اسکا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلی نظر جو بلا ارادہ اچانک پڑ جائے وہ غیر اختیاری ہونے کے سبب معاف ہے ورنہ بالقصد پہلی نظر بھی معاف نہیں۔

بے ریش لڑکوں کیطرف قصداً نظر کرنا بھی اسی حکم میں ہے

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ بہت سے اسلافِ اُمت کسی امرد (بے ریش) لڑکے کیطرف دیکھتے رہنے سے بڑی سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے اور بہت سے علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے (غالباً یہ اُس صورت میں ہے جبکہ بُری نیت اور نفس کی خواہش کے ساتھ نظر کیجائے واللہ اعلم - ش)

غیر محرم کی طرف نظر کرنا حرام ہے اس کی تفصیل

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ الآیۃ، اس طویل آیت کے ابتدائی حصہ میں تو وہی حکم ہے جو اس سے پہلی آیت میں مردوں کو دیا گیا ہے کہ اپنی نظریں پست رکھیں یعنی نگاہ پھیرلیں - مردوں کے حکم میں عورتیں بھی داخل تھیں مگر اُن کا ذکر علیحدہ تاکید کے لئے کیا گیا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو اپنے محارم کے سوا کسی مرد کو دیکھنا حرام ہے بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ غیر محرم مرد کو دیکھنا عورت کے لئے مطلقاً حرام ہے خواہ شہوت اور بُری نیت سے دیکھے یا بغیر کسی نیت و شہوت کے، دونوں صورتیں حرام ہیں اور اس پر حضرت اُمِ سلمہؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک روز اُمِ سلمہ اور میمونہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں اچانک عبداللہ ابن اُمِ مکتوم نابینا صحابی آگئے اور یہ واقعہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد پیش آیا تھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو حکم دیا کہ ان سے پردہ کرو - اُمِ سلمہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، وہ تو نابینا ہیں نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں نہ ہمیں پہچانتے ہیں - رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم تو نابینا نہیں ہو، تم تو اُن کو دیکھ رہی ہو (رواہ ابو داؤد والترمذی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح) اور دوسرے بعض فقہاء نے کہا کہ بغیر شہوت کے غیر مرد کو دیکھنے میں عورت کے لئے مضائقہ نہیں - ان کا استدلال صدیقہ عائشہؓ کی اُس حدیث سے ہے جسمیں مذکور ہے کہ مسجد نبوی کے احاطہ میں کچھ حبشی نوجوان عید کے روز اپنا سپاہیانہ کھیل دکھا رہے تھے - رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکو دیکھنے لگے اور صدیقہ عائشہؓ نے آپ کی آڑ میں کھڑے ہو کر اُن کا کھیل دیکھا اور اُسوقت تک دیکھتی رہیں جب تک کہ خود ہی اُس سے اکتا گئیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا - اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نظر شہوت تو حرام ہے اور بلا شہوت نظر کرنا بھی خلافِ اَولیٰ ہے اور ایک عورت کو دوسری عورت کے مواضع ستر کو دیکھنا بغیر خاص ضرورتوں کے یہ بھی اسی آیت کے الفاظ سے حرام ہے کیونکہ جیسا اوپر بیان ہوچکا ہے کہ موضع ستر یعنی مردوں کا ناف سے گھٹنوں تک اور عورتوں کا کل بدن بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے، یہ مواضع ستر ہیں اُن کا چھپانا سب[1] سے فرض ہے نہ کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر دیکھ سکتا ہے نہ کوئی عورت دوسری عورت کا ستر دیکھ سکتی ہے اور مرد کسی عورت کا یا عورت کسی مرد کا ستر دیکھے یہ بدرجۂ اولیٰ حرام ہے اور آیت مذکورہ کے حکم غضِ بصر کے

---

[1] یعنی تمام نامحرموں سے، محرم کا حکم آگے آرہا ہے۔ (محمد تقی عثمانی ۱۴۱۹ھ)

خلاف ہے کیونکہ آیت کا مطلب، جو اوپر بیان ہو چکا ہے اسمیں ہر ایسی چیز نظر پست رکھنا اور ہٹالینا مُراد ہے جس کی طرف دیکھنے کو شرع میں ممنوع کیا گیا ہے اسمیں عورت کے لئے عورت کا ستر دیکھنا بھی داخل ہے۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ الآیۃ، زینت لغوی معنے کے اعتبار سے اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مزیّن اور خوش منظر بنائے۔ وہ عمدہ کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، زیور بھی۔ یہ چیزیں جبکہ کسی عورت کے بدن پر نہ ہوں علیحدہ ہوں تو باتفاقِ اُمّت اُن کا دیکھنا مَردوں کے لئے حلال ہے جیسے بازار میں بکنے والے زنانہ کپڑے اور زیور کہ اُن کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے جمہور مفسرین نے اس آیت میں زینت سے مراد محلِ زینت یعنی وہ اعضار جن میں زینت کی چیزیں زیور وغیرہ پہنی جاتی ہیں وہ مُراد لئے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ عورتوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زینت یعنی مواقع زینت کو ظاہر نہ کرے (کذا فی الروح) اس آیت میں جو عورت کے لئے اظہارِ زینت کو حرام قرار دیا ہے آگے اس حکم سے دو استثنار بیان فرمائے گئے ایک منظور کے اعتبار سے ہے یعنی جس کی طرف دیکھا جائے دوسرا ناظر یعنی دیکھنے والوں کے اعتبار سے

احکام پردہ سے استثنار پہلا استثنار، مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا ہے یعنی عورت کے لئے اپنی زینت کی کسی چیز کو مَردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن چیزوں کے جو خود بخود ظاہر ہو ہی جاتی ہیں یعنی کام کاج اور نقل و حرکت کے وقت جو چیزیں عادۃً کھُل ہی جاتی ہیں اور عادۃً اُنکا چھپانا مشکل ہے وہ مستثنیٰ ہیں اُن کے اظہار میں کوئی گناہ نہیں (ابن کثیر) مراد اس سے کیا ہے اسمیں حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس کی تفسیریں مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اوپر کے کپڑے ہیں جیسے بُرقع یا لمبی چادر جو برقع کے قائم مقام ہوتی ہے۔ یہ کپڑے زینت کے کپڑوں کو چھپانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مُراد آیت کی یہ ہوگئی کہ زینت کی کسی چیز کو ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن اوپر کے کپڑوں کے جنکا چھپانا بضرورت باہر نکلنے کے وقت ممکن نہیں جیسے برقع وغیرہ۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مُراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں کیونکہ جب عورت کسی ضرورت سے باہر نکلنے پر مجبور ہو تو نقل و حرکت اور لین دین کے وقت چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا مشکل ہے۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر کیمطابق تو غیر محرم مردوں کے سامنے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنا بھی جائز نہیں صرف اوپر کے کپڑے برقع وغیرہ کا اظہار بضرورت مستثنیٰ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق چہرہ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے اس لئے فقہار اُمت

میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں پردے سے مستثنیٰ اور اُن کا غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے یا نہیں، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر ڈالنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو اُن کا دیکھنا بھی جائز نہیں اور عورت کو اُن کا کھولنا بھی جائز نہیں اسیطرح اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ سترِ عورت جو نماز میں اجماعاً اور خارج نماز علی الاصح فرض ہے اُس سے چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں اگر انکو کھول کر نماز پڑھی تو نماز باتفاق صحیح و درست ہو جائے گی۔

قاضی بیضاوی اور خازن نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مقتضا آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے اصل حکم یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کی کسی چیز کو بھی ظاہر نہ ہونے دے بجز اُسکے جو نقل و حرکت اور کام کاج کرنے میں عادۃً کھل ہی جاتی ہیں انمیں برقع اور چادر بھی داخل ہیں اور چہرہ اور ہتھیلیاں بھی کہ جب عورت کسی مجبوری اور ضرورت سے باہر نکلتی ہے تو برقع چادر وغیرہ کا ظاہر ہونا تو متعین ہی ہے لین دین کی ضرورت میں بعض اوقات چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں بھی کھل جاتی ہیں تو وہ بھی معاف ہیں گناہ نہیں۔ لیکن اس آیت سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ مردوں کو چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنا بھی بلا ضرورت جائز ہے بلکہ مردوں کا تو وہی حکم ہے کہ نگاہ پست رکھیں اگر عورت کہیں چہرہ اور ہاتھ کھولنے پر مجبور ہو جائے تو مردوں کو لازم ہے کہ بلا عذر شرعی اور بلا ضرورت کے اسکی طرف نہ دیکھیں۔ اس توجیہ میں دونوں روایتیں اور تفسیریں جمع ہو جاتی ہیں۔ امام مالکؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ غیر محرم عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر کرنا بھی بغیر ضرورت صحیحہ کے جائز نہیں۔ اور زواجر میں ابن حجر مکّی شافعی رحؒ نے امام شافعی رحؒ کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے کہ اگرچہ عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں سترِ عورت کے فرض میں داخل نہیں ان کو کھول کر بھی نماز ہو جاتی ہے مگر غیر محرم مردوں کو ان کا دیکھنا بلا ضرورتِ شرعیہ جائز نہیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جن فقہاء نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز قرار دیا ہے وہ بھی اسپر متفق ہیں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چہرہ وغیرہ دیکھنا بھی ناجائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حُسن اور زینت کا اصل مرکز انسان کا چہرہ ہے اور زمانہ فتنہ و فساد اور غلبۂ ہویٰ اور غفلت کا ہے اس لئے بجز مخصوص ضرورتوں کے مثلاً علاج معالجہ یا کوئی خطرہ شدیدہ وغیرہ عورت کو غیر محارم کے سامنے قصداً چہرہ کھولنا بھی ممنوع ہے اور مردوں کو اُس کیطرف قصداً نظر کرنا بھی بغیر ضرورت شرعیہ کے جائز نہیں۔

آیت مذکورہ میں زینتِ ظاہرہ کے استثناء کے بعد ارشاد ہے وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ یعنی آنچل مار لیا کریں اپنے دوپٹوں کا اپنے سینوں پر، خُمُر، خمار کی جمع ہے اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو عورت سر پر استعمال کرے اور اُس سے گلا اور سینہ بھی چھپ جائے۔ جیوب جیب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گریبان۔ چونکہ زمانہ قدیم سے گریبان سینہ ہی پر ہونے کا معمول ہے

اس لئے جیوب کے چھپانے سے مراد سینہ کا چھپانا ہے شروع آیت میں اظہارِ زینت کی ممانعت تھی اس جملہ میں اخفاءِ زینت کی تاکید اور اس کی ایک صورت کا بیان ہے جسکی اصل وجہ ایک رسم جاہلیت کا مٹانا ہے زمانۂ جاہلیت میں عورتیں دوپٹہ سر پر ڈال کر اسکے دونوں کنارے پُشت پر چھوڑ دیتی تھیں جس سے گریبان اور گلا اور سینہ اور کان کھلے رہتے تھے اس لئے مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں بلکہ دوپٹے کے دونوں پلّے ایک دوسرے پر اُلٹ لیں تاکہ یہ سب اعضاء چُھپ جائیں (رواہ ابن ابی حاتم عن ابی جبیرؒ۔ رُح) آگے دوسرا استثناء اُن مردوں کا بیان کیا گیا ہے جن سے شرعًا پردہ نہیں جس کے دو سبب ہیں اوّل تو جن مردوں کو مُستثنیٰ کیا گیا ہے اُن سے کسی فتنہ کا خطرہ نہیں وہ محارم ہیں جن کی طبائع کو حق تعالیٰ نے خِلقۃً ایسا بنایا ہے کہ وہ ان عورتوں کی عصمت کے محافظ ہوتے ہیں اُن سے خود کوئی فتنہ کا احتمال نہیں۔ دوسرے ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے کی ضرورت بھی سہولت پیدا کرنیکی مقتضی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شوہر کے سوا دوسرے محارم کو جو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ احکامِ حجاب پردہ سے استثناء ہے۔ ستر عورت سے استثناء نہیں عورت کا جو بدن ستر میں داخل ہے جسکا کھولنا نماز میں جائز نہیں اُس کا دیکھنا محارم کے لئے بھی جائز نہیں۔[1]

اس آیت میں آٹھ قسم کے محرم مَردوں کا اور چار دوسری اقسام کا پردہ سے استثناء کیا گیا ہے اور سورۂ احزاب کی آیت جو نزول میں اس سے مقدم ہے اسمیں صرف سات اقسام کا ذکر ہے پانچ کا اضافہ سُورۂ نور کی آیت میں کیا گیا ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تنبیہ یاد رہے کہ اس جگہ لفظ محرم عام معنی میں استعمال ہوا ہے جو شوہر پر بھی مشتمل ہے فقہاء کی اصطلاح میں محرم کی جو خاص تفسیر ہے کہ جس سے کبھی نکاح جائز نہ ہو وہ یہاں مراد نہیں۔ تفصیل ان بارہ مستثنیات کی جو سورۂ نور کی مذکورہ آیت میں ہے یہ ہے۔ سب سے پہلے شوہر ہے جس سے بیوی کے کسی عضو کا پردہ نہیں اگرچہ اعضاء مخصوصہ کو بلا ضرورت دیکھنا خلافِ اولیٰ ہے حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا ما رأی منّی ولا رأیت منہ یعنی نہ آپ نے میرے خاص عضو کو دیکھا نہ میں نے آپ کے۔

دوسرے اپنے باپ ہیں، جس میں دادا، پردادا سب داخل ہیں۔ تیسرے شوہر کا باپ ہے اسمیں بھی دادا، پردادا سب داخل ہیں۔ چوتھے اپنے لڑکے جو اپنی اولاد میں ہیں۔ پانچویں شوہر کے لڑکے جو کسی دوسری بیوی سے ہوں۔ چھٹے اپنے بھائی، اسمیں حقیقی بھی داخل ہیں اور باپ شریک یعنی علاتی اور ماں شریک یعنی اخیافی بھی لیکن ماموں، خالہ یا چچا، تایا اور پھوپی کے لڑکے جن کو عام عرف میں بھائی کہا جاتا ہے وہ اسمیں داخل نہیں وہ غیر محرم ہیں۔ ساتویں بھائیوں کے لڑکے یہاں بھی صرف حقیقی یا علاتی یا اخیافی بھائی کے لڑکے مُراد ہیں دوسرے عُرفی بھائیوں کے لڑکے شامل نہیں۔ آٹھویں بہنوں کے لڑکے۔ اسمیں بھی بہنوں سے حقیقی اور علاتی اخیافی بہنیں

---

[1] یہاں مسئلے میں تھوڑی سی تفصیل ہے جو بیان ہونے سے رہگئی ہے۔ وہ تفصیل یہ ہے کہ عورت کے ستر کا وہ حصہ جو ناف اور گھٹنوں کے درمیان ہے نیز پیٹ اور کمر محرم کے لئے بھی دیکھنا جائز نہیں۔ البتہ اس کے علاوہ بدن کے دوسرے حصے، مثلاً سر، کلائیاں پنڈلی وغیرہ محرم کے سامنے کھولی جاسکتی ہے، البتہ زمانہ چونکہ فتنے کا ہے۔ اس لئے بلا ضرورت کھولنے کی عادت ڈالنا مناسب نہیں۔ شاید اسی وجہ سے حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے ستر ہی کو محرم کا ستر قرار دیا ہے، واللہ اعلم (محمد تقی عثمانی ۱۳۱۹ھ)

مراد ہیں۔ ماموں زاد چچا زاد بہنیں داخل نہیں یہ آٹھ قسمیں تو محارم کی ہیں۔

نویں قسم اَوْ نِسَآئِهِنَّ یعنی اپنی عورتیں جس سے مُراد مُسلمان عورتیں ہیں کہ اُن کے سامنے بھی وہ تمام اعضار کھولنا جائز ہے جو اپنے باپ بیٹوں کے سامنے کھولے جاسکتے ہیں اور یہ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ یہ استثنار احکام حجاب و پَردہ سے ہے، احکام ستر سے نہیں۔ اس لئے جو اعضار ایک عورت اپنے محرم مردوں کے سامنے نہیں کھول سکتی اُن کا کھولنا کسی مُسلمان عورت کے سامنے بھی جائز نہیں۔ علاج معالجہ وغیرہ کی ضرورتیں مستثنیٰ ہیں۔

نِسَآئِهِنَّ، مُسلمان عورتوں کی قید سے یہ معلوم ہوا کہ کافر مشرک عورتوں سے بھی پردہ واجب ہے وہ غیر محرم مَردوں کے حکم میں ہیں۔ ابن کثیر نے حضرت مجاہدؒ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ کسی کافر عورت کے سامنے اپنے اعضار کھولے لیکن احادیث صحیحہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں کافر عورتوں کا ازواج مطہرات کے پاس جانا ثابت ہے اسلئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے بعض نے کافر عورتوں کو مثل غیر محرم مَردوں کے قرار دیا ہے بعض نے اس معاملہ میں مسلمان اور کافر دونوں قسم کی عورتوں کا ایک ہی حکم رکھا ہے کہ اُن سے پَردہ نہیں۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ نِسَآئِهِنَّ میں تو سبھی عورتیں مسلم اور کافر داخل ہیں اور سلف صالحین سے جو کافر عورتوں سے پردہ کرنے کی روایات منقول ہیں وہ استحباب پر مبنی ہیں۔ روح المعانی میں مفتی بغداد علامہ آلوسیؒ نے اسی قول کو اختیار فرما کر کہا ہے۔

هٰذا القول اوفق بالناس اليوم فانه لايكاد يمكن احتجاب المسلمات عن الذميات (روح المعانی)	یہی قول آجکل لوگوں کے مناسب حال ہے کیونکہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں کا کافر عورتوں سے پردہ تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

دسویں قسم اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ہے یعنی وہ جو ان عورتوں کے مملوک ہوں۔ ان الفاظ کے عموم میں تو غلام اور لونڈیاں دونوں داخل ہیں لیکن اکثر ائمہ فقہار کے نزدیک اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں، غلام مرد اس میں داخل نہیں۔ اُن سے عام محارم کی طرح پردہ واجب ہے حضرت سعید بن مسیبؒ نے اپنے آخری قول میں فرمایا لا يغرنكم اٰية النور فانه فى الاناث دون الذكور یعنی تم لوگ کہیں سورۂ نور کی اس آیت سے مغالطہ میں نہ پڑجاؤ کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں۔ مرد غلاموں کو بھی شامل ہیں لیکن واقعہ ایسا نہیں یہ آیت صرف عورتوں یعنی کنیزوں کے حق میں ہے مرد غلام اسمیں داخل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ غلام مرد کے لئے اپنی آقا عورت کے بال دیکھنا جائز نہیں (روح المعانی) باقی رہا یہ سوال کہ جب لفظ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ سے صرف عورتیں لونڈیاں ہی مُراد ہیں تو وہ اس سے

پہلے لفظ نسآئہن میں داخل ہیں ان کو علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی اسکا جواب جصاصؒ نے یہ دیا ہے کہ لفظ نسآئہن اپنے ظاہر کے اعتبار سے صرف مسلمان عورتوں کے لئے ہے۔ اور مملوکہ باندیوں میں اگر کافر بھی ہوں تو ان کو مستثنیٰ کرنے کے لئے یہ لفظ علیحدہ لایا گیا ہے۔

گیارھویں قسم اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مُراد وہ مغفّل اور بدحواس قسم کے لوگ ہیں جن کو عورتوں کی طرف کوئی رغبت و دلچسپی ہی نہ ہو (ابن کثیر) اور یہی مضمون ابن جریر نے ابوعبداللہؒ، ابن جبیرؒ، ابن عطیہؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے اسلئے اس سے مراد وہ مرد ہیں جو عورتوں کیطرف نہ کوئی رغبت و شہوت رکھتے ہوں، نہ اُن کے اوصافِ حُسن اور حالات سے کوئی دلچسپی رکھتے ہوں کہ دوسرے لوگوں سے بیان کردیں۔ بخلاف مخنّث قسم کے لوگوں کے جو عورتوں کے اوصاف خاص سے تعلق رکھتے ہوں اُن سے بھی پردہ واجب ہے جیسا کہ صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک مخنّث ازواج مطہرات کے پاس آیا کرتا تھا اور اُمہات المؤمنین اسکو غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ جو اس آیت میں مذکور ہے داخل سمجھ کر اُس کے سامنے آجاتی تھیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اُس کو دیکھا اور اُس کی باتیں سُنیں تو گھروں میں داخل ہونے سے اسکو روک دیا (روح المعانی)

اِسی لئے ابن حجر مکیؒ نے شرح منہاج میں فرمایا ہے کہ مرد اگرچہ عنین (نامرد) یا مجبوب (مقطوع العضو) یا بہت بوڑھا ہو وہ اس غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے لفظ میں داخل نہیں ان سب سے پردہ واجب ہے۔ اس میں غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے لفظ کیساتھ جو التابعین کا لفظ مذکور ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ ایسے مغفّل بدحواس لوگ جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں چلے جائیں وہ مستثنیٰ ہیں۔ اسکا ذکر صرف اسلئے کیا گیا کہ اسوقت ایسے مغفّل قسم کے کچھ مرد ایسے ہی تھے جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں جاتے تھے اصل مدارِ حکم کا ان کے مغفّل بدحواس ہونے پر ہے تابع اور طفیلی ہونے پر نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

بارھویں قسم اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ ہے۔ اس سے مراد وہ نابالغ بچّے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب بھی نہیں پہنچے اور عورتوں کے مخصوص حالات و صفات اور حرکات و سکنات سے بالکل بے خبر ہوں۔ اور جو لڑکا ان اُمور سے دلچسپی لیتا ہو وہ مراہق یعنی قریب البلوغ ہے اُس سے پردہ واجب ہے (ابن کثیر) امام جصاص رحؒ نے فرمایا کہ یہاں طفل سے مراد وہ بچّے ہیں جو مخصوص معاملات کے لحاظ سے عورتوں اور مَردوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے ہوں (ذکرہ عن المجاہد) پردہ سے مستثنیات کا بیان ختم ہوا۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ، یعنی عورتوں پر لازم ہے

کہ اپنے پاؤں اتنی زور سے نہ رکھیں جس سے زیور کی آواز نکلے اور انکی مخفی زینت مردوں پر ظاہر ہو۔

زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا جائز نہیں
شروع آیت میں عورتوں کو اپنی زینت غیر مَردوں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا تھا، آخر میں اسکی مزید تاکید ہے کہ مواضع زینت سر اور سینہ وغیرہ کا چھپانا تو واجب تھا ہی۔ اپنی مخفی زینت کا اظہار خواہ کسی ذریعہ سے ہو وہ بھی جائز نہیں۔ زیور کے اندر خود کوئی چیز ایسی ڈالی جائے جس سے وہ بجنے لگے یا ایک زیور دوسرے زیور سے ٹکرا کر بجے یا پاؤں زمین پر اس طرح مارے جس سے زیور کی آواز نکلے اور غیر محرم مرد سُنیں یہ سب چیزیں اس آیت کی رُو سے ناجائز ہیں۔ اور اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا اس آیت سے ناجائز ثابت ہوا تو خود عورت کی آواز کا سُنانا اُس سے بھی زیادہ سخت اور بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔ اس لئے عورت کی آواز کو بھی ان حضرات نے ستر میں داخل قرار دیا ہے اور اسی بناء پر نوازل میں فرمایا کہ عورتوں کو جہانتک ممکن ہو قرآن کی تعلیم بھی عورتوں ہی سے لینا چاہئیے۔ مَردوں سے تعلیم لینا بدرجۂ مجبوری جائز ہے۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ نماز میں اگر کوئی سامنے سے گزرنے لگے تو مرد کو چاہئیے کہ بلند آواز سے سُبحان اللہ کہہ کر گزرنے والے کو متنبہ کردے مگر عورت آواز نہ نکالے بلکہ اپنی ایک ہتھیلی کی پُشت پر دوسرا ہاتھ مار کر اس کو متنبہ کرے۔

عورت کی آواز کا مسئلہ
کیا عورت کی آواز فی نفسہٖ ستر میں داخل ہے اور غیر محرم کو آواز سُنانا جائز ہے؟ اس معاملے میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رح کی کتب میں عورت کی آواز کو ستر میں داخل نہیں کیا گیا۔ حنفیہ کے نزدیک بھی مختلف اقوال ہیں۔ ابن ہمّام نے نوازل کی روایت کی بناء پر ستر میں داخل قرار دیا ہے۔ اسی لئے حنفیہ کے نزدیک عورت کی اذان مکروہ ہے لیکن حدیث سے ثابت ہے کہ ازواج مطہرات نزولِ حجاب کے بعد بھی پسِ پردہ غیر محارم سے بات کرتی تھیں اس مجموعہ سے راجح اور صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس موقع اور جس محل میں عورت کی آواز سے فتنہ پیدا ہونیکا خطرہ ہو وہاں ممنوع ہے جہاں یہ نہو جائز ہے (جصاص) اور احتیاط اسی میں ہے کہ بلا ضرورت عورتیں پسِ پردہ بھی غیر محرموں سے گفتگو نہ کریں واللہ اعلم

خوشبو لگا کر باہر نکلنا
اسی حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو خوشبو لگا کر نہ نکلے کیونکہ وہ بھی اس کی مخفی زینت ہے غیر محرم تک یہ خوشبو پہنچے تو ناجائز ہے ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رض کی حدیث ہے جس میں خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کو بُرا کہا گیا ہے۔

مزیّن برقع پہن کر نکلنا بھی ناجائز ہے
امام جصاصؒ نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز تک کو

قرآن نے اظہارِ زینت میں داخل قرار دے کر ممنوع کیا ہے تو مزین رنگوں کے کامدار برقعے پہن کر نکلنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں مگر وہ زینت کا سب سے بڑا مرکز ہے اسلئے اسکا بھی غیر محرموں سے چھپانا واجب ہے الا بضرورت (جصاص)

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ ، یعنی توبہ کرو اللہ سے تم سب کے سب اے مؤمن بندو - اس آیت میں اوّل مردوں کو نظریں پست رکھنے کا حکم پھر عورتوں کو ایسا ہی حکم پھر عورتوں کو غیر محرموں سے پردہ کرنے کا حکم الگ الگ دینے کے بعد اس جملے میں سب مرد وعورت کو شامل کرکے ہدایت کی گئی ہے کہ شہوتِ نفسانی کا معاملہ دقیق ہے دوسروں کو اسپر اطلاع ہونا مشکل ہے مگر اللہ تعالیٰ پر ہر ہر چھپا ہوا اور کھلا ہوا یکساں ظاہر ہے اسلئے اگر کسی سے احکامِ مذکورہ میں کسی وقت کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اسپر لازم ہے کہ اس سے توبہ کرے گزشتہ پر ندامت کے ساتھ اللہ سے مغفرت مانگے اور آئندہ اُسکے پاس نہ جانیکا عزم مصمم کرے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ

اور نکاح کردو رانڈوں کا اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

اگر وہ ہوں گے مفلس اللہ اُن کو غنی کر دے گا اپنے فضل سے اور اللہ کشائش والا ہے

عَلِيْمٌ ۝۳۲ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى

سب کچھ جانتا ہے، اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا جب تک کہ

يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ

مقدور دے اُن کو اللہ اپنے فضل سے

خلاصۂ تفسیر

(احرار میں سے) جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور بے نکاح ہونا بھی عام ہے خواہ ابھی تک نکاح ہوا ہی نہ ہو یا ہونے کے بعد بیوی کی موت یا طلاق کے سبب بے نکاح رہ گئے) تم اُن کا نکاح کر دیا کرو اور (اسی طرح) تمھارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس (نکاح) کے لائق ہوں (یعنی حقوقِ نکاح ادا کرسکتے ہوں) ان کا بھی (نکاح کر دیا کرو محض اپنی مصلحت سے اُن کی خواہشِ نکاح کی مصلحت کو فوت نہ کیا کرو۔ اور احرار کے نکاح پیغام

دینے والے کے فقر و افلاس پر نظر کر کے انکار نہ کر دیا کرو جبکہ اُسمیں کسبِ معاش کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ) اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا) اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا (خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مالدار نہ ہونے کیوجہ سے نکاح سے انکار کرو اور نہ یہ خیال کرو کہ نکاح ہو گیا تو خرچ بڑھ جائے گا جو موجودہ حالت میں غنی و مالدار ہے وہ بھی نکاح کرنے سے محتاج و مفلس ہو جائے گا کیونکہ رزق کا مدار اصل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے وہ کسی مالدار کو بغیر نکاح کے بھی فقیر و محتاج کر سکتا ہے، اور کسی غریب نکاح والے کو نکاح کے باوجود فقر و افلاس سے نکال سکتا ہے) اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے (جس کو چاہے مالدار کر دے اور سب کا حال) خوب جاننے والا ہے (جس کو غنی کرنا مقتضائے حکمت و مصلحت ہوگا اسکو غنی کر دیا جاوے گا اور جس کے محتاج و فقیر رہنے ہی میں اسکی مصلحت ہے اُس کو فقیر رکھا جائے گا) اور (اگر کسی کو اپنے فقر و افلاس کیوجہ سے نکاح کا سامان میسر نہ ہو تو) ایسے لوگوں کو کہ جنکو نکاح کا مقدور نہیں اُن کو چاہیئے کہ (اپنے نفس کو) قابو میں رکھیں یہانتک کہ اللہ تعالیٰ (اگر چاہے تو) انکو اپنے فضل سے غنی کر دے (اُسوقت نکاح کریں)۔

معارف و مسائل

بعض احکامِ نکاح پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق عفت و عصمت کی حفاظت اور فواحش و بے حیائی کی روک تھام سے ہے۔ اس سلسلہ میں زنا اور اُسکے متعلقات کی شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا پھر استیذان کا، پھر عورتوں کے پردے کا۔ شریعتِ اسلام چونکہ ایک معتدل شریعت ہے اس کے احکام سب ہی اعتدال پر اور انسان کے فطری جذبات و خواہشات کی رعایت کیساتھ تعدّی اور حد سے نکلنے کی ممانعت کے اصول پر دائر ہیں اسلئے جب ایک طرف انسان کو ناجائز شہوت رانی سے سختی کیساتھ روکا گیا تو ضروری تھا کہ فطری جذبات و خواہشات کی رعایت سے اسکا کوئی جائز اور صحیح طریقہ بھی بتلایا جائے۔ اسکے علاوہ بقاءِ نسل کا عقلی اور شرعی تقاضا بھی یہی ہے کہ کچھ حدود کے اندر رہ کر مرد و عورت کے اختلاط کی کوئی صورت تجویز کی جائے۔ اسی کا نام قرآن و سُنت کی اصطلاح میں نکاح ہے۔ آیتِ مذکورہ میں اسکے متعلق حرّہ عورتوں کے اولیاء اور کنیزوں غلاموں کے آقاؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ اُن کا نکاح کر دیا کریں۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ الآیۃ

اَیَامٰی، اَیِّم کی جمع ہے جو ہر اُس مرد و عورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جبکا نکاح موجود نہ ہو۔ خواہ اوّل ہی سے نکاح نہ کیا ہو یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت سے یا طلاق

سے نکاح ختم ہو چکا ہو۔ ایسے مردوں و عورتوں کے نکاح کے لئے اُن کے اولیار کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔

آیتِ مذکورہ کے طرزِ خطاب سے اتنی بات تو باتفاق ائمہ فقہار ثابت ہے کہ نکاح کا مسنون اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ خود اپنا نکاح کرنے کے لئے کوئی مرد یا عورت بلا واسطہ اقدام کے بجائے اپنے اولیار کے واسطے سے یہ کام انجام دے۔ اسمیں دین و دُنیا کے بہت سے مصالح اور فوائد ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملہ میں کہ لڑکیاں اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کریں، یہ ایک قسم کی بے حیائی بھی ہے اور اسمیں فواحش کے راستے کھُل جانیکا خطرہ بھی۔ اسی لئے بعض روایاتِ حدیث میں عورتوں کو خود اپنا نکاح بلا واسطہ ولی کرنے سے روکا بھی گیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ حکم ایک خاص سنّت اور شرعی ہدایت کی حیثیت میں ہے اگر کوئی بالغ لڑکی اپنا نکاح بغیر اجازت ولی کے اپنے کفو میں کرے تو نکاح صحیح ہو جائے گا اگرچہ خلاف سُنّت کرنے کیوجہ سے وہ موجبِ ملامت ہوگی جبکہ اُسنے کسی مجبوری سے اس پر اقدام نہ کیا ہو۔

امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک اسکا نکاح ہی باطل کالعدم ہوگا جب تک ولی کے واسطہ سے نہ ہو۔ یہ جگہ اختلافی مسائل کی مکمل تحقیق اور دونوں فقہار کے دلائل بیان کرنے کی نہیں لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ مذکورہ آیت سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ نکاح میں اولیار کا واسطہ ہونا چاہیئے باقی یہ صورت کہ کوئی بلا واسطہ اولیار نکاح کرے تو اُس کا کیا حکم ہوگا یہ آیتِ قرآن اُس سے ساکت ہے۔ خصوصاً اسوجہ سے بھی کہ لفظ ایامیٰ میں بالغان مرد و عورت دونوں داخل ہیں اور بالغ لڑکوں کا نکاح بلا واسطہ ولی سب کے نزدیک صحیح ہو جاتا ہے اسکو کوئی باطل نہیں کہتا۔ اسی طرح ظاہر یہ ہے کہ لڑکی بالغ اگر اپنا نکاح خود کرے تو وہ بھی صحیح اور منعقد ہو جائے۔ ہاں خلافِ سنت کام کرنے پر ملامت دونوں کو کی جائے گی۔

نکاح واجب ہے یا سنت یا مختلف حالات میں حکم مختلف ہے اس پر ائمہ مجتہدین تقریباً سبھی متفق ہیں کہ جس شخص کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں غالب گمان یہ ہو کہ وہ حدودِ شریعت پر قائم نہیں رہ سکے گا گناہ میں مبتلا ہو جائے گا اور نکاح کرنے پر اُس کو قدرت بھی ہو کہ اُسکے وسائل موجود ہوں تو ایسے شخص پر نکاح کرنا فرض یا واجب ہے جب تک نکاح نہ کریگا گنہگار رہے گا۔ ہاں اگر نکاح کے وسائل موجود نہیں کہ کوئی مناسب عورت میسر نہیں یا اسکے لئے مہر معجل وغیرہ کی حد تک ضروری خرچ اُسکے پاس نہیں تو اسکا حکم اگلی آیت میں آیا ہے کہ اسکو چاہیئے کہ وسائل کی فراہمی کی کوشش کرتا رہے اور جب تک وہ میسر نہ ہوں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور صبر

کرنے کی کوشش کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمایا ہی کہ وہ مُسلسل روزے رکھے۔ اس سے غلبۂ شہوت کو سکون ہو جاتا ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عکاف رضؓ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پُوچھا کہ کیا تمہاری زوجہ ہے اُنھوں نے عرض کیا نہیں۔ پھر پوچھا کوئی شرعی لونڈی ہے کہا کہ نہیں پھر آپؐ نے دریافت کیا کہ تم صاحبِ وسعت ہو یا نہیں۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ صاحبِ وسعت ہوں۔ مُراد یہ تھی کہ کیا تم نِکاح کے لئے ضروری نفقات کا انتظام کر سکتے ہو جس کے جواب میں اُنھوں نے اقرار کیا۔ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تم شیطان کے بھائی ہو اور فرمایا کہ ہماری سُنت نِکاح کرنا ہے۔ تم میں بدترین آدمی وہ ہیں جو بے نِکاح ہوں اور تمھارے مُردوں میں سب سے رذیل وہ ہیں جو بے نِکاح مر گئے (مظہری)

اس روایت کو بھی جمہور فقہار نے اُسی حالت پر محمول فرمایا ہے جبکہ نِکاح نہ کرنے کی صُورت میں گناہ کا خطرہ غالب ہو۔ عکافؓ کا حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگا کہ وہ صبر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نِکاح کرنے کا حکم دیا اور تبتّل یعنی بے نِکاح رہنے سے سختی کیساتھ منع فرمایا (مظہری) اسی طرح کی اور بھی روایاتِ حدیث ہیں۔ ان سب کا محل جمہور فقہار کے نزدیک وہی صورت ہے کہ نِکاح نہ کریں تو ابتلارِ معصیت کا خطرہ غالب ہو۔ اسی طرح اس پر بھی تقریباً سبھی فقہار کا اتفاق ہے کہ جس شخص کو بظنِ غالب یہ معلوم ہو کہ وہ نِکاح کرنے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائے گا مثلاً بیوی کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قدرت نہیں اُس پر ظلم کا مرتکب ہوگا یا اسکے لئے نِکاح کرنے کی صورت میں کوئی دوسرا گناہ یقینی طور پر لازم آجائیگا ایسے شخص کو نِکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔

اب اُس شخص کا حکم باقی رہا جو حالت اعتدال میں ہے کہ نہ تو ترکِ نِکاح سے گناہ کا خطرہ قوی ہے اور نہ نِکاح کی صورت میں کسی گناہ کا اندیشہ غالب ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں فقہار کے اقوال مختلف ہیں کہ اسکو نِکاح کرنا افضل ہے یا ترکِ نِکاح کرکے نفلی عبادات میں مشغول ہونا افضل ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک نفلی عبادات میں لگنے سے افضل نِکاح کرنا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اشتغالِ عبادت افضل ہے۔ وجہ اس اختلاف کی اصل میں یہ ہے کہ نِکاح اپنی ذات کے اعتبار سے تو ایک مباح ہے جیسے کھانا، پینا، سونا وغیرہ ضروریاتِ زندگی سب مباح ہیں۔ اسمیں عبادت کا پہلو اس نیت سے آجاتا ہے کہ اسکے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو گناہ سے بچا سکے گا اور اولادِ صالح پیدا ہوگی تو اسکا بھی ثواب ملے گا۔ اور ایسی نیک نیت سے جو مباح کام بھی انسان کرتا ہے وہ اُس کے لئے بالواسطہ عبادت بنجاتی ہے کھانا پینا اور سونا بھی اسی

نیت سے عبادت ہو جاتا ہے اور اشتغال بالعبادت اپنی ذات میں عبادت ہے اسلئے امام شافعیؒ عبادت کے لئے خلوت گزینی کو نکاح سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح میں عبادت کا پہلو بہ نسبت دوسرے مباحات کے غالب ہے احادیث صحیحہ میں اُس کو سُنّت المرسلین اور اپنی سنّت قرار دے کر تاکیدات بکثرت آئی ہیں۔ اُن روایاتِ حدیث کے مجموعہ سے اتنا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نکاح عام مباحات کی طرح مُباح نہیں بلکہ سُنّتِ انبیاء ہے جس کی تاکیدات بھی حدیث میں آئی ہیں صرف نیت کی وجہ سے عبادت کی حیثیت اسمیں نہیں بلکہ سُنّتِ انبیاء ہونے کی حیثیت سے بھی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس طرح تو کھانا پینا سونا بھی سُنّتِ انبیاء ہے کہ سب نے ایسا کیا ہے مگر جواب واضح ہے کہ ان چیزوں پر سب انبیاء کا عمل ہونے کے باوجود یہ کسی نے نہیں کہا نہ کسی حدیث میں آیا کہ کھانا پینا اور سونا سُنّتِ انبیاء ہے بلکہ اس کو عام انسانی عادت کے تابع انبیاء کا عمل قرار دیا ہے بخلاف نکاح کے کہ اسکو صراحۃً سُنّت المرسلین اور اپنی سُنّت فرمایا ہے۔

تفسیر مظہری میں اس موقع پر ایک معتدل بات یہ کہی ہے کہ جو شخص حالتِ اعتدال میں ہو کہ نہ غلبۂ شہوت سے مجبور و مغلوب ہو اور نہ نکاح کرنے سے کسی گناہ میں پڑنے کا اندیشہ رکھتا ہو۔ یہ شخص اگر یہ محسوس کرے کہ نکاح کرنے کے باوجود نکاح اور اہل و عیال کی مشغولیت میرے لئے کثرتِ ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ سے مانع نہیں ہوگی تو اُسکے لئے نکاح افضل ہے اور انبیاء علیہم السلام اور صلحاء اُمت کا عام حال یہی تھا۔ اور اگر اسکا اندازہ یہ ہے کہ نکاح اور اہل و عیال کے مشاغل اسکو دینی ترقی، کثرتِ ذکر وغیرہ سے روک دیں گے تو بحالتِ اعتدال اُسکے لئے عبادت کے لئے خلوت گزینی اور ترکِ نکاح افضل ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس کی تطبیق پر شاہد ہیں اُن میں ایک یہ ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ، اسمیں یہی ہدایت ہے کہ انسان کے مال و اولاد اُس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دینے کا سبب نہ بننے چاہئیں۔ واللہ سبحانہٗ تعالیٰ اعلم۔

وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ، یعنی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صالح ہوں اُن کے نکاح کرا دیا کرو۔ یہ خطاب اُن کے آقاؤں اور مالکوں کو ہے اس جگہ صالحین کا لفظ اپنے لُغوی معنے میں آیا ہے یعنی انمیں جو شخص نکاح کی صلاحیت و استطاعت رکھتا ہو اسکا نکاح کرا دینے کا حکم انکے آقاؤں کو دیا گیا ہے مُراد اس صلاحیت سے وہی ہے کہ بیوی کے حقوقِ زوجیت اور نفقہ و مہر معجل ادا کرنے کے قابل ہوں۔ اور اگر صالحین کو معروف یعنی نیک لوگوں کے معنے میں لیا جائے تو پھر انکی تخصیص بالذکر اس وجہ سے ہوگی کہ نکاح کا اصل مقصد حرام سے بچنے کا وہ صالحین ہی میں ہو سکتا ہے۔ بہر حال اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صلاحیت نکاح کی رکھنے والے ہوں اُنکے نکاح

کا حکم اُن کے آقاؤں کو دیا گیا ہے اور مُراد اس سے یہ ہے کہ اگر وہ اپنی نکاح کی ضرورت ظاہر کریں اور خواہش کریں کہ اُن کا نکاح کر دیا جائے تو آقاؤں پر بعض فقہاء کے نزدیک واجب ہوگا کہ انکے نکاح کر دیں اور جمہور فقہاء کے نزدیک اُن پر لازم ہے کہ انکے نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالیں بلکہ اجازت دیدیں کیونکہ مملوک غلاموں اور کنیزوں کا نکاح بغیر مالکوں کی اجازت کے نہیں ہوسکتا۔ تو یہ حکم ایسا ہی ہوگا جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ یعنی عورتوں کے اولیاء پر لازم ہے کہ اپنی زیرِ ولایت عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں اور جیسا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص منگنی لیکر آوے اور اخلاق آپکو پسند ہوں تو ضرور نکاح کر دو اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور وسیع پیمانے کا فساد پیدا ہو جائے گا۔ (رواہ الترمذی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حکم آقاؤں کو اس لئے دیا گیا کہ وہ اجازت نکاح دینے میں کوتاہی نہ کریں۔ خود نکاح کرانا انکے ذمہ واجب ہو یہ ضروری نہیں۔ واللہ اعلم

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں اُن غریب فقیر مسلمانوں کیلئے بشارت ہے جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر وسائلِ مالیہ اُنکے پاس نہیں کہ جب وہ اپنے دین کی حفاظت اور سُنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی نیت صالحہ سے نکاح کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کو مالی غنا بھی عطا فرما دیں گے اور اسمیں اُن لوگوں کو بھی ہدایت ہے جن کے پاس ایسے غریب لوگ منگنی لے کر جائیں کہ وہ محض انکے فی الحال غریب فقیر ہونیکی وجہ سے رشتہ سے انکار نہ کر دیں۔ مال آنے جانے والی چیز ہے اصل چیز صلاحیت عمل ہے اگر وہ انمیں موجود ہے تو اُن کے نکاح سے انکار نہ کریں۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو نکاح کرنیکی ترغیب دی ہے اسمیں آزاد اور غلام سب کو داخل فرمایا ہے اور نکاح کرنے پر اُن سے غنا کا وعدہ فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) اور ابن ابی حاتم نے حضرت صدیق اکبرؓ سے نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم نکاح کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو تو اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ غنا عطا فرمانے کا کیا ہے وہ پورا فرما دیں گے پھر یہ آیت پڑھی۔ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم غنی ہونا چاہتے ہو تو نکاح کر لو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ (رواہ ابن جریر و ذکر البغوی عن عمرؓ نحوہ۔ ابن کثیر)

تنبیہ تفسیر مظہری میں ہے کہ مگر یہ یاد رہے کہ نکاح کرنیوالے کو غنی اور مال عطا فرمانیکا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی حال میں ہے جبکہ نکاح کرنے والے کی نیت اپنی عفت کی حفاظت اور سُنّت پر عمل ہو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد ہو اسکی دلیل اگلی آیت کے یہ الفاظ ہیں۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ، یعنی جو لوگ مال واسباب کے لحاظ سے نکاح پر قدرت نہیں رکھتے اور نکاح کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ بیوی کے حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہو جائیں گے اُن کو چاہیئے کہ عفت اور صبر کیساتھ اسکا انتظار کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے۔ اور اس صبر کے لئے ایک تدبیر بھی حدیث میں یہ بتلادی گئی ہے کہ کثرت سے روزے رکھا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو اتنے مالی وسائل عطا فرمائیں گے جن سے نکاح پر قدرت ہو جائے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ
اور جو لوگ چاہیں لکھت آزادی کی مال دے کر اُن میں سے کہ جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں تو انکو لکھ کر دیدو

عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ۭ وَلَا
اگر سمجھو ان میں کچھ نیکی اور دو اُن کو اللہ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے اور نہ

تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ
زبردستی کرو اپنی چھوکریوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا کہ تم کمانا چاہو اسباب دُنیا کی

الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾
زندگانی کا اور جو کوئی اُن پر زبردستی کریگا تو اللہ اُن کی بےبسی کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

اور تمہارے مملوکوں میں سے (غلام ہوں یا لونڈیاں) جو مکاتب ہونے کے خواہاں ہوں تو (بہتر ہے کہ) اُن کو مکاتب بنا دیا کرو اگر اُن میں بہتری (کے آثار) پاؤ اور اللہ کے (دیئے ہوئے) اس مال میں سے اُن کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے (تاکہ جلدی آزاد ہو سکیں) اور اپنی (مملوکہ) لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو (بالخصوص) جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں (اور تمہاری یہ ذلیل حرکت) محض اسلئے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ (یعنی مال تم کو حاصل ہو جائے اور جو شخص اُن کو مجبور کریگا (اور وہ بچنا چاہیں گی) تو اللہ تعالیٰ اُن کے مجبور کئے جانے کے بعد (اُن کے لئے) بخشنے والا مہربان ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مملوک غلاموں اور لونڈیوں کو اگر نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو آقاؤں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اُن کو نکاح کی اجازت دیدینا چاہیئے اپنی مصلحت کے لئے اُن کے طبعی مصالح کو مؤخر

نہ کریں یہ اُن کے لئے افضل اور بہتر ہے ۔ خلاصہ اس ہدایت کا اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کیساتھ حسنِ معاملہ اور اُن کو تکلیف سے بچانا ہے اسکی مناسبت سے آیتِ مذکورہ میں ایک دوسری ہدایت انکے آقاؤں کے لئے یہ دی گئی ہے کہ اگر یہ مملوک غلام یا لونڈی آقاؤں سے معاملہ مکاتبت کا کرنا چاہیں تو ان کی اس خواہش کو پورا کردینا بھی آقاؤں کے لئے افضل اور مستحب موجبِ ثواب ہے ۔ صاحبِ ہدایہ اور عامۂ فقہاء نے اس حکم کو حکم استحباب ہی قرار دیا ہے یعنی آقا کے ذمہ واجب تو نہیں کہ اپنے مملوک کو مکاتب بنادے لیکن مستحب اور افضل ہے ۔ اور معاملہ مکاتبت کی صورت یہ ہے کہ کوئی مملوک اپنے آقا سے کہے کہ آپ مجھ پر کچھ رقم مقرر کردیں کہ وہ رقم میں اپنی محنت وکسب سے حاصل کرکے آپکو ادا کردوں تو میں آزاد ہوجاؤں اور آقا اسکو قبول کرے ، یا معاملہ برعکس ہو کہ آقا چاہے کہ اُس کا غلام کچھ معینہ رقم اسکو دیدے تو آزاد ہوجائے اور غلام اسکو قبول کرلے ۔ اگر آقا اور مملوک کے درمیان ایجاب وقبول کے ذریعہ یہ معاملہ مکاتبت کا طے ہوجاتا ہے تو وہ شرعاً لازم ہوجاتا ہے آقا کو اسکے فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا جسوقت بھی غلام معینہ رقم کماکر اسکو دیدیگا خود بخود آزاد ہوجائے گا ۔

یہ رقم جو بدلِ کتابت کہلاتی ہیں شریعت نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی خواہ غلام کی قیمت کی برابر ہو یا اُس سے کم یا زیادہ جس پر فریقین میں بات طے ہوجائے وہ بدل کتابت ٹھہرے گا ۔ اپنے مملوک غلام یا لونڈی کو مکاتب بنادینے کی ہدایت اور اسکو مستحب اور افضل قرار دینا شریعتِ اسلام کے اُن ہی احکام میں سے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو لوگ شرعی حیثیت سے غلام ہیں اُن کی آزادی کے زیادہ سے زیادہ راستے کھولے جائیں ۔ تمام کفارات میں اُن کے آزاد کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں ۔ ویسے بھی غلام آزاد کرنے میں بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے مکاتبت کا معاملہ بھی اسی کا ایک راستہ ہے اس لئے اُس کی ترغیب دی گئی ۔ البتہ اُس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی کہ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ، یعنی مکاتب بنانا جب درست ہوگا جبکہ تم اُن میں بہتری کے آثار دیکھو ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ اور اکثر حضرات ائمہ نے اس بہتری سے مراد قوتِ کسب بتلائی ہے یعنی جس شخص میں یہ دیکھو کہ اگر اُس کو مکاتب بنادیا تو کماکر معینہ رقم جمع کرلیگا اُس کو مکاتب بناؤ ورنہ جو اس قابل نہ ہو اُس کو مکاتب بنادینے سے غلام کی محنت بھی ضائع ہوگی آقا کا نقصان بھی ہوگا ۔ اور صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ خیر اور بہتری سے مراد اس جگہ یہ ہے کہ اُسکے آزاد ہونے سے مسلمانوں کو کسی نقصان کے پہنچنے کا خطرہ نہ ہو مثلاً یہ کہ وہ کافر ہو اور اپنے کافر بھائیوں کی مدد کرتا ہو ۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ لفظ خیر اس جگہ دونوں چیزوں پر حاوی ہے کہ غلام میں قوتِ کسب بھی ہو اور اُس کی آزادی سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔ (مظہری)

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ، یعنی بخشش کرو ان پر اُس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو عموماً اور آقاؤں کو خصوصاً کیا گیا ہے کہ جب اس غلام کی آزادی ایک معینہ رقم جمع کر کے آقا کو دینے پر موقوف ہے تو مسلمانوں کو چاہئیے کہ اسمیں اُس کی مدد کریں زکوٰۃ کا مال بھی اُن کو دے سکتے ہیں، اور آقاؤں کو اسکی ترغیب ہے کہ خود بھی اُنکی مالی امداد کریں یا بدلِ کتابت میں سے کچھ کم کر دیں۔ صحابہ کرام کا معمول اسی لئے یہ رہا ہے کہ بدلِ کتابت میں جو رقم اُس پر لگائی جاتی تھی اُسمیں سے تہائی چوتھائی یا اس سے کم حسبِ استطاعت کم کر دیا کرتے تھے۔ (مظہری)

فنِ معاشیات کا ایک اہم مسئلہ اور اُس میں قرآنی فیصلہ

آجکل دُنیا میں مادہ پرستی کا دَور دَورہ ہے۔ ساری دُنیا معاد و آخرت کو بھلا کر صرف معاش کے جال میں پھنس گئی ہے اُن کی علمی تحقیقات اور غور و فکر کا دائرہ صرف معاشیات ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اسمیں بحث و تحقیق کے زور نے ایک ایک معمولی مسئلہ کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے۔ ان فنون میں سب سے بڑا فن معاشیات کا ہے۔

اس معاملہ میں آجکل عقلاءِ دُنیا کے دو نظریئے زیادہ معروف و مشہور ہیں اور دونوں ہی باہم متصادم ہیں اُن کے تصادم نے اقوامِ دُنیا میں تصادم اور جنگ و جدال کے ایسے دروازے کھول دیئے ہیں کہ ساری دُنیا امن و اطمینان سے محروم ہو گئی۔

ایک نظام سرمایہ دارانہ نظام ہے جس کو اصطلاح میں کیپٹل ازم کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظام اشتراکیت کا ہے جس کو کمیونزم یا سوشل ازم کہا جاتا ہے۔ اتنی بات تو مشاہدہ کی ہے جسکا دونوں نظاموں میں سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس دُنیا میں انسان اپنی محنت اور کوشش سے جو کچھ کماتا اور پیدا کرتا ہے اُس سب کی اصل بنیاد قدرتی وسائلِ پیداوار زمین، پانی اور معادن میں پیدا ہونے والی قدرتی اشیاء پر ہے۔ انسان اپنے غور و فکر اور محنت و مشقت کے ذریعہ انھیں وسائلِ پیداوار میں جوڑ توڑ اور تحلیل و ترکیب کے ذریعہ اپنی ضرورت کی لاکھوں اشیاء پیدا کرتا اور بناتا ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ دونوں نظام پہلے یہ سوچتے کہ یہ قدرتی وسائل خود تو پیدا نہیں ہو گئے ان کا کوئی پیدا کرنیوالا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کا اصل مالک بھی وہی ہو گا جو اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہم ان وسائل پر قبضہ کرنے اور اُن کے مالک بننے یا استعمال کرنے میں آزاد نہیں بلکہ اصل مالک و خالق نے اگر کچھ ہدایات دی ہیں تو اُن کے تابع چلنا ہمارا فرض ہے۔ مگر مادہ پرستی کے جنون نے ان سبھی کو اصل خالق و مالک کے تصور ہی سے غافل کر دیا۔ اُن کے نزدیک اب بحث صرف یہ رہ گئی کہ وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر کے اُن سے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے والا اُن سب چیزوں کا خود بخود آزاد مالک و مختار ہو جاتا ہے، یا یہ سب چیزیں وقفِ عام اور مشترک ہیں ہر ایک کو اُن سے نفع اُٹھانیکا یکساں حق حاصل ہے؟

پہلا نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جو انسان کو ان چیزوں پر آزاد ملکیت کا حق دیتا ہے۔

کہ جس طرح چاہے اسکو حاصل کرے اور جہاں چاہے اسکو خرچ کرے اسمیں اُس پر کوئی روک ٹوک برداشت نہیں۔ یہی نظریہ قدیم زمانے کے مشرکین و کفار کا تھا جنھوں نے حضرت شعیب علیہ السلام پر یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ مال ہمارے ہیں ہم ان کے مالک ہیں آپ کو کیا حق ہے کہ ہم پر پابندی لگائیں کہ فلاں کام میں خرچ کرنا جائز اور فلاں میں حرام ہے۔ آیتِ قرآن اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا یہی مطلب ہے۔ اور دوسرا نظریہ اشتراکیت کا ہے جو کسی کو کسی چیز پر ملکیت کا حق نہیں دیتا بلکہ ہر چیز کو تمام انسانوں میں مشترک اور سب کو اُس سے فائدہ اُٹھانے کا یکساں حقدار قرار دیتا ہے اور اصل نظریۂ اشتراکیت کی بنیاد یہی ہے۔ مگر پھر جب دیکھا کہ یہ ناقابلِ عمل تصور ہے اس پر کوئی نظام نہیں چلایا جاسکتا تو پھر کچھ اشیاء کو ملکیت کے لئے مستثنیٰ بھی کردیا ہے۔

قرآن کریم نے ان دونوں بیہودہ نظریوں پر رد کرکے اُصول یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز دراصل اللہ تعالیٰ کی ملک ہے جو اُن کا خالق ہے۔ پھر اُس نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو ایک خاص قانون کے تحت ملکیت عطا فرمائی ہے جن چیزوں کا اس قانون کی رُو سے وہ مالک بنادیا گیا ہے اسمیں دوسروں کے تصرف کو بغیر اسکی اجازت کے حرام قرار دیا مگر مالک بننے کے بعد بھی اسکو آزاد ملکیت نہیں دی کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے خرچ کرے بلکہ دونوں طرف ایک عادلانہ اور حکیمانہ قانون رکھا ہے کہ فلاں طریقہ کمانے کا حلال ہے فلاں حرام اور فلاں جگہ خرچ کرنا حلال ہے اور فلاں حرام۔ اور یہ کہ جو چیز اس کی ملکیت میں دی ہے اُس میں کچھ اور لوگوں کے حقوق بھی لگا دیئے ہیں جن کو ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

آیتِ مذکورہ اگرچہ ایک اور مضمون کے لئے آئی ہے مگر اسکے ضمن میں اسی اہم معاشی مسئلہ کے چند اُصول بھی آگئے ہیں الفاظ آیت پر نظر کیجئے وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ یعنی دو ان حاجتمند لوگوں کو اللہ کے اُس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں دیدیا ہے اسمیں تین باتیں ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ اصل مالک مال اور ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسی نے اپنے فضل سے اسکے ایک حصّہ کا تمھیں مالک بنادیا ہے تیسرے یہ کہ جس چیز کا تم کو مالک بنایا ہے اُس پر کچھ پابندیاں بھی اُسنے لگائی ہیں۔ بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو ممنوع قرار دیا اور بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو لازم و واجب اور بعض میں مستحب اور افضل قرار دیا ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

دوسرا حکم اس آیت میں ایک جاہلیت کی رسم مٹانے اور زنا و فواحش کے انسداد کے لئے یہ دیا گیا۔ ہے وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ، یعنی اپنی لونڈیوں کو اس پر مجبور نہ کرو کہ وہ زناکاری کے ذریعہ مال کما کر تمھیں دیا کریں۔ جاہلیت میں بہت سے لوگ لونڈیوں کو اسی کام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے جب زنا پر سخت سزائیں جاری کیں، آزاد اور غلام

۲۷

سب کو اسکا پابند کیا تو ضروری تھا کہ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانے کے لئے خاص احکام دے۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ، یعنی جبکہ وہ لونڈیاں زنا سے بچنے اور پاکدامن رہنے کا ارادہ کریں تو تمھارا اُن کو مجبور کرنا بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ یہ الفاظ اگرچہ بصورت شرط آئے ہیں مگر باجماع اُمت درحقیقت مراد ان سے شرط نہیں کہ لونڈیاں زنا سے بچنا چاہیں تو اُن کو زنا پر مجبور نہ کیا جائے ورنہ مجبور کرنا جائز ہے بلکہ بتلانا یہ ہے کہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے لونڈیوں میں حیا اور پاکدامنی زمانہ جاہلیت میں نابود تھی۔ اسلام کے احکام کے بعد اُنھوں نے توبہ کی۔ اُنکے آقاؤں نے مجبور کرنا چاہا تو اسپر یہ احکام آئے کہ جب وہ زنا سے بچنا چاہتی ہیں تو تم مجبور نہ کرو۔ اسمیں انکے آقاؤں کو زجر و تنبیہ اور تشنیع کرنا ہے کہ بڑی بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے کہ لونڈیاں تو پاک رہنے کا ارادہ کریں اور تم اُنھیں زنا پر مجبور کرو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ، اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا حرام ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا اور وہ آقا کے جبر و اکراہ سے مغلوب ہو کر زنا میں مبتلا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ کو معاف فرما دیں گے اور اسکا سارا گناہ مجبور کرنیوالے پر ہوگا۔ (مظہری) واللہ اعلم

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
اور ہم نے اُتاریں تمھاری طرف آیتیں کھلی ہوئی اور کچھ حال اُن کا جو ہو چکے تم سے

قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ
پہلے اور نصیحت ڈرنے والوں کو اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی مثال اُسکی

نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا
روشنی کی جیسے ایک طاق اسمیں ہو ایک چراغ وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشہ میں وہ شیشہ ہے جیسے

كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا
ایک تارہ چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اسمیں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کیطرف ہے اور نہ

غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ
مغرب کیطرف، قریب ہے اُسکا تیل کہ روشن ہو جائے، اگرچہ نہ لگی ہو اسمیں آگ روشنی پر روشنی

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ
اللہ راہ دکھلا دیتا ہے اپنی روشنی کی جسکو چاہے، اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا
سب چیز کو جانتا ہے ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا اُن کو بلند کرنے کا اور وہاں اُسکا نام

ع ۴ / ۱۰

اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ
پڑھنے کا یاد کرتے ہیں اس کی وہاں صبح اور شام وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں

وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا
اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے

تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ ۙ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا
جسمیں اُلٹ جائیں گے دل اور آنکھیں تاکہ بدلہ دے اُن کو اللہ اُنکے بہتر سے بہتر کاموں کا

وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾
اور زیادتی دے اُن کو اپنے فضل سے اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا
اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے کام جیسے ریت جنگل میں پیاسا جانے اسکو پانی یہانتک کہ جب

جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ
پہنچا اُس پر اس کو کچھ نہ پایا، اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اُسکو پورا پہنچا دیا اسکا لکھا، اور اللہ جلد لینے

الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ ۙ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ
والا ہے حساب یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اُسپر ایک لہر اس پر ایک اور لہر

مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ
اس کے اوپر بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب نکالے اپنا ہاتھ لگتا نہیں

يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ ع ۱۱
کہ اُسکو وہ سوجھے اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اُس کے واسطے کہیں نہیں روشنی

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے اس سورت میں یا قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے ذریعہ سے) تمھارے پاس کھُلے کھُلے احکام (علمیہ وعملیہ) بھیجے ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں اُن کی (یا اُن جیسے لوگوں کی) بعض حکایات اور (خدا سے) ڈرنیوالوں کے لئے نصیحت کی باتیں (بھیجی ہیں) اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں (میں رہنے والوں) کا اور زمین (میں رہنے والوں) کا (یعنی اہلِ آسمان و زمین میں جن کو ہدایت ہوئی ہے ان سب کو اللہ ہی نے ہدایت دی ہے اور مُراد آسمان و زمین سے کُل عالم ہے پس جو مخلوقات آسمان و زمین سے باہر ہے وہ بھی داخل ہوگئی جیسے حاملانِ عرش) اُس کے نور (ہدایت) کی حالتِ عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے

(اور) اُس میں ایک چراغ (رکھا) ہے اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف ہے) جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پُورب رُخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھم رُخ ہے۔ (یعنی نہ اس کی جانب شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ شروع دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی جانب غربی میں کوئی آڑ پہاڑ ہے کہ آخر دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے بلکہ کھُلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے ایسے درخت کا روغن بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اسکا تیل (اسقدر صاف اور سُلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھُوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نُورٌ عَلٰی نُورٍ ہے (یعنی ایک تو اسمیں خود قابلیت نُور کی اعلیٰ درجہ کی تھی پھر اُوپر سے فاعل یعنی آگ کیساتھ اجتماع ہوگیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کیساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہو ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو صاف روشنی اور دھواں کم ہونے میں مشہور ہے تو اسقدر تیز روشنی ہو گی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہوگئی ہوں اس کو نُورٌ عَلٰی نُورٍ فرمایا۔ یہاں مثال ختم ہوگئی۔ پس اسی طرح مؤمن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نورِ ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اسی کا انشراح قبولِ حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گو بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے جیسے وہ روغنِ زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مومن بھی علمِ احکام سے پہلے ہی اُن پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے اور جب اُس کو علم حاصل ہوتا ہے تو نورِ عمل یعنی عمل کے پختہ ارادہ کیساتھ نورِ علم بھی مل جاتا ہے جس سے وہ فوراً ہی قبول کرلیتا ہے پس عمل و علم جمع ہوکر نُورٌ عَلٰی نُورٍ صادق آجاتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ علمِ احکام کے بعد اسکو کچھ تأمل و تردّد ہو کہ اگر موافق نفس کے پایا تو قبول کرلیا ورنہ رد کردیا۔ اسی انشراح اور نور کو دوسری آیت میں اِس طرح بیان فرمایا ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ، یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھولدیا تو وہ اپنے رب کیطرف سے ایک نُور پر ہوتا ہے اور ایک جگہ فرمایا ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۔ غرض نورِ ہدایت الٰہیہ کی یہ مثال ہے اور) اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے (اور پہنچا دیتا ہے) اور (ہدایت کی جو یہ مثال دی گئی اسی طرح قرآن میں بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں تو اس

سے بھی لوگوں کی ہدایت ہی مقصود ہے اس لئے) اللہ تعالیٰ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ مضامین عقلیہ محسوس چیزوں کی طرح قریب الی الفہم ہو جاویں) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (اسلئے جو مثال افادہ مقصود کیلئے کافی ہو اور جسمیں اغراض مثال کے پورے مرعی ہوں اُسی کو اختیار کرتا ہے مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ مثال نہایت مناسب ہوتی ہے تاکہ خوب ہدایت ہو۔ آگے اہل ہدایت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) وہ ایسے گھروں میں (جاکر عبادت کرتے) ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اُن کا ادب کیا جاوے اور اُن میں اللہ کا نام لیا جاوے (مُراد اُن گھروں سے مسجدیں ہیں اور اُنکا ادب یہ کہ اُن میں جُنُب و حائض داخل نہ ہوں اور اُنمیں کوئی نجس چیز داخل نہ کیجاوے، وہاں غُل نہ مچایا جاوے۔ دُنیا کے کام اور باتیں کرنے کے لئے وہاں نہ بیٹھیں۔ بدبو کی چیز کھاکر اُنمیں نہ جاویں وغیر ذلک، غرض) اُن (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی (نمازوں میں) بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد (یعنی بجاآوری احکام) سے (جو وقت کے متعلق جو حکم ہو) اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے (کہ یہ احکام فرعیہ میں سب سے اہم ہیں) نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور باوجود اطاعت و عبادت کے اُن کی خشیت کا یہ حال ہے کہ) وہ ایسے دن (کی دار و گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں اُلٹ جاویں گی (جیسا دوسری آیت میں ہے يُؤْتُونَ مَآ اٰتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ، یعنی یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اسکے باوجود اُن کے دل قیامت کی باز پرس سے ڈرتے رہتے ہیں اور مقصود اس سے اہلِ نور ہدایت کے اوصاف و اعمال کا بیان فرمانا ہے اور آگے ان کے انجام کا ذکر ہے کہ) انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دیگا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دیگا (جزا وہ جسکا وعدہ مفصل مذکور ہے اور زیادہ وہ جسکا مفصل وعدہ نہیں گو مجمل عنوانوں سے ہوا ہو۔) اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بیشمار (یعنی بہت کثرت سے) دے دیتا ہے (پس ان لوگوں کو جنت میں اسیطرح بیشمار دیگا۔ یہانتک تو ہدایت اور اہلِ ہدایت کا بیان تھا آگے ضلالت اور اہلِ ضلالت کا ذکر ہے یعنی) اور جو لوگ کافر (اور اہلِ ضلال اور نورِ ہدایت سے دُور) ہیں اُن کے اعمال (بوجہ کافروں کی دو قسمیں ہونے کے دو مثالوں کے مشابہ ہیں کیونکہ ایک قسم تو وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے قائل ہیں اور اپنے بعض اعمال پر یعنی جو اُن کے گمان کے مطابق کارِ ثواب اور حسنات ہیں توقع جزائے آخرت کی رکھتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے منکر ہیں قسم اوّل کفار کے اعمال تو) ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا (آدمی) اُسکو (دُور سے)

پانی خیال کرتا ہے (اور اُس کی طرف دوڑتا ہے) یہاں تک کہ جب اسکے پاس آیا تو اُسکو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور (غایت پیاس، پھر نہایت یاس سے جو جسمانی اور روحانی صدمہ پہنچا اور اُس سے تڑپ تڑپ کر مرگیا تو یوں کہنا چاہیئے کہ بجائے پانی کے) قضاء الٰہی یعنی موت کو پایا سو اللہ تعالیٰ نے اُس (کی عمر) کا حساب اس کو برابر سرابر چکا دیا (اور بیباق کر دیا یعنی عمر کا خاتمہ کر دیا) اور اللہ تعالیٰ (جس چیز کی میعاد آجاتی ہے اسکا) دم بھر میں حساب (فیصل) کر دیتا ہے (اُس کو کچھ بکھیڑا نہیں کرنا پڑتا کہ دیر لگے اور میعاد سے کچھ بھی توقف ہو جاوے بس یہ مضمون ایسا ہے جیسا دوسری جگہ ارشاد ہے إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ وقولہ لَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا۔ حاصل اس مثال کا یہ ہوا کہ جیسے پیاسا ریت کو ظاہری چمک سے پانی سمجھا اسی طرح یہ کافر اپنے اعمال کو ظاہری صورت سے مقبول اور مثمر نافع آخرت سمجھا اور جیسا وہ پانی نہیں اسی طرح یہ اعمال شرط قبول یعنی ایمان نہ ہونے کے سبب مقبول اور نافع نہیں ہیں اور جب وہاں جاکر اُس پیاسے کو حقیقت معلوم ہوئی اسی طرح اُس کو آخرت میں پہنچکر حقیقت معلوم ہوگی اور جس طرح یہ پیاسا اپنی توقع کے غلط ہونے سے حسرت وافسوس میں خائب ہو کر مرگیا اسی طرح یہ کافر بھی اپنی توقع کے غلط ہونے پر اسوقت حسرت میں اور ہلاکتِ ابدی یعنی عقابِ جہنم میں مبتلا ہوگا۔ ایک قسم کی مثال تو یہ ہوئی۔ آگے دوسری قسم کے کافروں کے اعمال کی مثال ہے یعنی) یا وہ (اعمال باعتبار خصوصیت منکرین قیامت کے) ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے (جنکا ایک سبب دریا کی گہرائی ہے اور پھر یہ) کہ اُس (سمندر کے اصلی سطح) کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو (پھر وہ موج بھی اکیلی نہیں بلکہ) اُس (موج) کے اوپر دوسری موج (ہو پھر) اُس کے اوپر بادل (ہو جس سے ستارہ وغیرہ کی روشنی بھی نہ پہنچتی ہو غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (ایسی حالت میں کوئی آدمی دریا کی تہ میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور اس کو دیکھنا چاہے) تو (دیکھنا تو درکنار) دیکھنے کا احتمال بھی نہیں (اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر جو آخرت اور قیامت کے اور اسمیں جزاء وسزا ہی کے منکر ہیں اُن کے پاس وہمی نور بھی نہیں جیسے قسم اول کے کافروں کے پاس ایک وہمی اور خیالی نور تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے بعض نیک اعمال کو اپنی آخرت کا سامان سمجھا تھا مگر وہ شرط ایمان نہ ہونے کے سبب حقیقی نور نہ تھا ایک وہمی نور تھا۔ یہ لوگ جو منکر آخرت ہیں انھوں نے اپنے اعتقاد وخیال کے مطابق بھی کوئی کام آخرت کے لئے کیا ہی نہیں جس کے نور کا ان کو وہم وخیال ہو۔ غرض انکے پاس ظلمت ہی ظلمت ہے نور کا وہم وخیال بھی نہیں ہو سکتا جیسا کہ تہ دریا کی مثال میں ہے۔ اور نظر نہ آنے میں ہاتھ کی تخصیص شاید اسلئے کہ انسانی اعضاء وجوارح میں ہاتھ نزدیک تر ہے پھر اس کو جتنا نزدیک کرنا چاہو نزدیک آجاتا ہے اور جب ہاتھ ہی نظر نہ آیا تو دوسرے اعضاء

کا معاملہ ظاہر ہی) اور (آگے ان کفار کے اندھیرے میں رہنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ) جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اُس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسّر آسکتا)

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ کو اہلِ علم آیتِ نور کہتے ہیں کیونکہ اسمیں نورِ ایمان اور ظلمتِ کفر کو بڑی تفصیلی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔

نور کی تعریف امام غزالیؒ نے یہ فرمائی الظاھر بنفسہ والمظھر لغیرہ، یعنی خود اپنی ذات سے ظاہر اور روشن ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر و روشن کرنے والا ہو۔ اور تفسیر مظہری میں ہے کہ نُور دراصل اُس کیفیت کا نام ہے جس کو انسان کی قوتِ باصرہ پہلے ادراک کرتی ہے اور پھر اُسکے ذریعہ اُن تمام چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں جیسے آفتاب اور چاند کی شعاعیں اُن کے مقابل اجسامِ کثیفہ پر پڑکر اوّل اُس چیز کو روشن کر دیتی ہیں پھر اُس سے شعاعیں منعکس ہو کر دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ نور کا اپنے لغوی اور عرفی معنے کے اعتبار سے حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کی ذات پر اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بَری اور وراء الوریٰ ہے۔ اسلئے آیتِ مذکورہ میں جو حق تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا اطلاق ہوا ہے اسکے معنے باتفاق ائمہ تفسیر مُنوِّر یعنی روشن کرنے والے کے ہیں یا پھر صیغہ مُبالغہ کی طرح صاحبِ نور کو نور سے تعبیر کر دیا گیا جیسے صاحبِ کرم کو کرم اور صاحبِ عدل کو عدل کہدیا جاتا ہے۔ اور معنے آیت کے وہ ہیں جو خلاصہ تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نور بخشنے والے ہیں آسمان و زمین کو اور اسمیں بسنے والی سب مخلوق کو۔ اور مراد اس نُور سے نورِ ہدایت ہے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اسکی تفسیر میں نقل کیا ہے اللّٰہ ھادی اھل السّمٰوٰت والارض

نورِ مؤمن مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآیۃ، اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں آتا ہے۔ یہ اُس کی ایک عجیب مثال ہے جیسا کہ ابن جریر نے حضرت اُبَی بن کعبؓ سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے ھو المؤمن الذی جعل اللّٰہ الایمان والقراٰن فی صدرہ فضرب اللّٰہ مثلہ فقال اللّٰہ نور السّمٰوٰت والارض فبدأ بنورہ نفسہ ثم ذکر نور المؤمن فقال مثل نور من اٰمن بہ فکان اُبی بن کعب یقرأھا مثل نور من اٰمن بہ (ابن کثیر)

یعنی یہ مثال اُس مؤمن کی ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن کا نورِ ہدایت ڈالدیا ہے اس آیت میں پہلے تو اللہ تعالےٰ نے خود اپنے نور کا ذکر فرمایا اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ پھر قلبِ مؤمن کے نور کا ذکر فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ ۔ اور اس آیت کی قراءت بھی حضرت ابی ابن کعب

کی مثل نورہٖ کے بجائے مثل نور من اٰمن بہ کی ہے اور سعید بن جبیرؒ نے بھی قرات اور آیت کا یہی مفہوم حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مَثَلُ نُوْرِہٖ کی ضمیر کے متعلق ائمہ تفسیر کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں فطرۃً رکھا گیا ہے اُس کی مثال یہ ہے کَمِشْکٰوۃٍ الخ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ہی مؤمن کیطرف راجع ہو جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے حاصل اس مثال کا یہ ہے کہ مؤمن کا سینہ ایک طاق کی مثال ہے اسمیں اسکا دل ایک قندیل کی مثال ہے اسمیں نہایت شفاف روغنِ زیتون فطری نورِ ہدایت کی مثال ہے جو مؤمن کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ جسکا خاصہ خود بخود بھی قبولِ حق کا ہے پھر جس طرح روغنِ زیتون آگ کے شعلہ سے روشن ہو کر دوسروں کو روشن کرنے لگتا ہے اسی طرح فطری نورِ ہدایت جو قلبِ مؤمن میں رکھا گیا ہے جب وحی الٰہی اور علمِ الٰہی کے ساتھ اُسکا اتصال ہو جاتا ہے تو روشن ہو کر عالم کو روشن کرنے لگتا ہے اور حضرات صحابہ و تابعین نے جو اس مثال کو قلبِ مؤمن کیساتھ مخصوص فرمایا وہ بھی غالباً اسلئے ہے کہ فائدہ اس نور کا صرف مؤمن ہی اُٹھاتا ہے۔ ورنہ وہ فطری نورِ ہدایت جو ابتداء تخلیق کے وقت انسان کے قلب میں رکھا جاتا ہے وہ مؤمن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں وہ نورِ ہدایت رکھا جاتا ہے اسی کا یہ اثر دُنیا کی ہر قوم ہر خطہ ہر مذہب و مشرب کے لوگوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے وجود کو اور اُس کی عظیم قدرت کو فطرۃً مانتا ہے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کے تصوّر اور تعبیر میں خواہ کیسی ہی غلطیاں کرتا ہو مگر اللہ تعالیٰ کے نفسِ وجود کا ہر انسان فطرۃً قائل ہوتا ہے بجز چند مادہ پرست افراد کے جن کی فطرت مسخ ہو گئی ہے کہ وہ خدا ہی کے وجود کے منکر ہیں۔

ایک صحیح حدیث سے اس عموم کی تائید ہوتی ہے جسمیں یہ ارشاد ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ، یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اسکے ماں باپ اسکو فطرت کے تقاضوں سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈالدیتے ہیں۔ اس فطرت سے مُراد ہدایت ایمان ہے۔ یہ ہدایتِ ایمان اور اسکا نور ہر انسان کی پیدائش کے وقت اُسمیں رکھا جاتا ہے اور اسی نورِ ہدایت کی وجہ سے اُسمیں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب انبیاء اور اُنکے نائبوں کے ذریعہ وحیِ الٰہی کا علم اُن کو پہنچتا ہے تو وہ اسکو بسہولت قبول کر لیتے ہیں بجز اُن ممسوخ الفطرت لوگوں کے جنھوں نے اُس فطری نور کو اپنی حرکتوں سے مٹا ہی ڈالا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو عطاء نور کو عام بیان فرمایا ہے جو تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو شامل ہے مؤمن کافر کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ اور آخر آیت میں یہ فرمایا یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور کیطرف جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے یہاں مشیت الٰہی کی قید اُس نورِ فطرت کے لئے نہیں جو ہر انسان میں رکھا ہے بلکہ نورِ قرآن کے لئے ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بجز اُس خوش نصیب کے جس کو اللہ تعالیٰ کیطرف سے توفیق نصیب ہو۔ ورنہ انسان کی کوشش بھی بلا توفیقِ الٰہی بیکار بلکہ بعض اوقات مضر بھی پڑ جاتی ہے ؎

اذا لم یکن عون من اللہ للفتی ٭ فاول ما یجنی علیہ اجتہادہٗ

یعنی اگر اللہ کی طرف سے بندہ کی مدد نہ ہو تو اس کی کوشش ہی اُس کو اُلٹا نقصان پہنچا دیتی ہے۔

نورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امام بغویؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے کعب احبار سے پوچھا کہ اس آیت کی تفسیر میں آپ کیا کہتے ہیں مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآیۃ کعب احبار جو تورات و انجیل کے بڑے عالم مسلمان تھے انھوں نے فرمایا کہ یہ مثال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بیان کی گئی ہے۔ مشکوٰۃ آپکا سینہ اور زجاجہ (قندیل) آپ کا قلبِ مبارک، اور مصباح (چراغ) نبوت ہے۔ اور اس نورِ نبوت کا خاصہ یہ ہے کہ نبوّت کے اظہار و اعلان سے پہلے ہی اسمیں لوگوں کے لئے روشنی کا سامان ہے پھر وحیِ الٰہی اور اسکے اعلان کا اس کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے تو یہ ایسا نور ہوتا ہے کہ سارے عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوت و بعثت بلکہ آپ کی پیدائش سے بھی پہلے جو بہت سے عجیب و غریب واقعات عالم میں ایسے پیش آئے جو آپ کی نبوت کی بشارت دینے والے تھے جنکو اصطلاحِ محدثین میں ارہاصات کہا جاتا ہے۔ کیونکہ معجزات کا لفظ تو اس قسم کے اُن واقعات کے لئے مخصوص ہے جو دعوائے نبوت کی تصدیق کے لئے اللہ تعالیٰ کیطرف سے کسی پیغمبر کے ہاتھ پر جاری کئے جاتے ہیں۔ اور دعوائے نبوت سے پہلے جو اس قسم کے واقعات دُنیا میں ظاہر ہوں ان کو ارہاصات کا نام دیا جاتا ہے، اس طرح کے بہت سے واقعات عجیبہ صحیح روایات سے ثابت ہیں جن کو شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے خصائص کبریٰ میں اور ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں اور دوسرے علماء نے بھی اپنی مستقل کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ اسکا ایک کافی حصہ اس جگہ تفسیر مظہری میں بھی نقل کر دیا ہے۔

روغنِ زیتون کی برکات شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ، اس سے زیتون اور اسکے درخت کا مبارک اور نافع و مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسمیں بیشمار منافع اور فوائد رکھے ہیں۔ اس کو چراغوں میں روشنی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی روشنی ہر تیل کی روشنی سے زیادہ صاف شفاف ہوتی ہے اس کو روٹی کے ساتھ سالن کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پھل کو بطور تفکہ کے کھایا بھی جاتا ہے اور یہ ایسا تیل ہے جس کے نکالنے کیلئے کسی مشین یا چرخی وغیرہ کی ضرورت نہیں خود بخود اسکے پھل سے نکل آتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ روغنِ زیتون کو کھاؤ بھی اور بدن پر مالش بھی کرو کیونکہ یہ شجرۂ مبارکہ ہے (رواہ البغوی والترمذی عن عمرؓ مرفوعاً۔ مظہری)

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ لا یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْہَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ الآیۃ، سابقہ آیت میں حق تعالیٰ نے قلبِ مؤمن میں اپنا نورِ ہدایت ڈالدینے کی ایک خاص مثال بیان فرمائی تھی اور آخر میں یہ فرمایا تھا کہ اس نور سے فائدہ وہ ہی لوگ اُٹھاتے ہیں جنکو اللہ چاہتا اور توفیق دیتا ہے۔ اس آیت میں ایسے مومنین کا مستقر اور محل بیان فرمایا گیا کہ ایسے مومنین کا اصل مقام و مستقر جہاں وہ اکثر اوقات خصوصاً پانچ نمازوں کے اوقات میں دیکھے جاتے ہیں وہ بیوت یعنی مکانات ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اُن کو بلند و بالا رکھا جائے اور اُن میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے اور ان بیوت و مکانات کی شان یہ ہے کہ اُن میں اللہ کے نام کی تسبیح و تقدیس صبح شام یعنی تمام اوقات میں ایسے لوگ کرتے رہتے ہیں جن کی خاص صفات کا بیان آگے آتا ہے۔

اس تقریر کی بنار اسپر ہے کہ نحوی ترکیب میں فِیْ بُیُوْتٍ کا تعلق آیت کے جملہ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ کے ساتھ ہو (کما یستفاد من ابن کثیر وغیرہ من المفسرین) بعض حضرات نے اسکا تعلق لفظ یُسَبِّحُ محذوف کے ساتھ کیا ہے جس پر آگے آنیوالا لفظ یُسَبِّحُ دلالت کرتا ہے مگر پہلا احتمال نسقِ کلام کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مثالِ سابق میں اللہ تعالیٰ کے جس نورِ ہدایت کا ذکر ہوا ہے اُس کے ملنے کی جگہ وہ بیوت و مکانات ہیں جہاں صبح شام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک ان بیوت سے مُراد مساجد ہیں۔

مساجد اللہ کے گھر ہیں انکی تعظیم واجب ہے قرطبی نے اسی کو ترجیح دی اور استدلال میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احبّ اللّٰہ عزّ وجلّ فلیحبّنی و من احبّنی فلیحبّ اصحابی و من احبّ اصحابی فلیحبّ القراٰن و من احبّ القراٰن فلیحبّ المساجد فانھا افنیۃ اللّٰہ اذن اللّٰہ فی رفعھا و بارک فیھا میمونۃ میمون اھلھا محفوظۃ محفوظ اھلھا ھم فی صلاتھم واللّٰہ عزّ وجلّ فی حوائجھم

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اسکو چاہیئے کہ مجھ سے محبت کرے۔ اور جو مجھ سے محبت رکھنا چاہے اُسکو چاہیئے کہ میرے صحابہ سے محبت کرے۔ اور جو صحابہ سے محبت رکھنا چاہے اُسکو چاہیئے کہ قرآن سے محبت کرے۔ اور جو قرآن سے محبت رکھنا چاہے اُسکو چاہیئے کہ مسجدوں سے محبت کرے کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں، اللہ نے اُن کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور اُن میں برکت رکھی ہے وہ بھی بابرکت ہیں اور اُن کے رہنے والے بھی بابرکت۔ وہ بھی اللہ کی حفاظت میں ہیں

هم فی المساجد واللہ من وراۓھم (قرطبی) | اور اُن کے رہنے والے بھی حفاظت میں ۔ وہ لوگ اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے کام بناتے اور حاجتیں پوری کرتے ہیں وہ مسجدوں میں رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُنکے پیچھے اُن کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں (قرطبی)

رفع مساجد کے معنے | اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ ، اَذِنَ ، اِذْن سے مشتق ہے جس کے معنی اجازت دینے کے ہیں اور ترفع ، رفع سے مشتق ہے جس کے معنے بلند کرنے اور تعظیم کرنے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے مسجدوں کو بلند کرنے کی ۔ اجازت دینے سے مراد اُس کا حکم کرنا ہے اور بلند کرنے سے مُراد اُن کی تعظیم کرنا ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلند کرنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں میں لغو کام کرنے اور لغو کلام کرنیسے منع فرمایا ہے (ابن کثیر)

عکرمہؒ و مجاہدؒ امام تفسیر نے فرمایا کہ رفع سے مراد مسجد کا بنانا ہے جیسے بنار کعبہ کے متعلق قرآن میں آیا ہے وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ کہ اسمیں رفع قواعد سے مُراد بنار قواعد ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رفع مساجد سے مراد مساجد کی تعظیم و احترام اور اُن کو نجاستوں اور گندی چیزوں سے پاک کھنا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسجد میں جب کوئی نجاست لائی جاوے تو مسجد اُس سے اس طرح سمٹتی ہے جیسے انسان کی کھال آگ سے ۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے مسجد میں سے ناپاکی اور گندگی اور ایذا کی چیز کو نکالدیا اللہ تعالیٰ اُسکے لئے جنت میں گھر بنا دیں گے ۔ رواہ ابن ماجہ ۔ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنے گھروں میں (بھی) مسجدیں (یعنی نماز پڑھنے کی مخصوص جگہیں) بنائیں اور اُن کو پاک صاف رکھنے کا اہتمام کریں ۔ (قرطبی)

اور اصل بات یہ ہے کہ لفظ تُرْفَعَ میں مسجدوں کا بنانا بھی داخل ہے اور اُن کی تعظیم و تکریم اور پاک صاف رکھنا بھی ۔ پاک صاف رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ ہر نجاست اور گندگی سے پاک رکھیں ۔ اور یہ بھی داخل ہے کہ اُن کو ہر بدبو کی چیز سے پاک رکھیں ۔ اسی لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لہسن یا پیاز کھا کر بغیر منہ صاف کئے ہوئے مسجد میں آنیسے منع فرمایا ہے جو عام کتب حدیث میں معروف ہے ۔ سگرٹ ، حقہ ، پان کا تمباکو کھا کر مسجد میں جانا بھی اسی حکم میں ہے ۔ مسجد میں مٹی کا تیل جلانا جسمیں بدبو ہوتی ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے ۔

صحیح مسلم میں حضرت فاروق اعظم رضؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس شخص کے منہ سے لہسن یا پیاز کی بدبو محسوس فرماتے تھے اسکو مسجد سے نکال کر بقیع میں بھیجدیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جسکو لہسن پیاز کھانا ہی ہو تو اُسکو خوب اچھی طرح پکا کر کھائے کہ اُن کی بدبو ماری جائے حضرات فقہار نے اس حدیث سے استدلال کر کے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی ایسی بیماری ہو کہ اُسکے پاس کھڑے

ہونے والوں کو اُس سے تکلیف پہنچے اُس کو بھی مسجد سے ہٹایا جاسکتا ہے اُس کو خود چاہیئے کہ جب تک ایسی بیماری میں ہے نماز گھر میں پڑھے۔

رفع مساجد کا مفہوم جمہور صحابہؓ و تابعین کے نزدیک یہی ہے کہ مسجدیں بنائی جائیں اور اُن کو ہر بُری چیز سے پاک صاف رکھا جائے۔ بعض حضرات نے اسمیں مسجدوں کی ظاہری شان و شوکت اور تعمیری بُلندی کو بھی داخل قرار دیا ہے اور استدلال کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر سال کی لکڑی سے شاندار بنائی تھی اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے مسجد نبوی میں نقش و نگار اور تعمیری خوبصورتی کا کافی اہتمام فرمایا تھا اور یہ زمانہ اجلّہ صحابہ کا تھا کسی نے اُنکے اس فعل پر انکار نہیں کیا اور بعد کے بادشاہوں نے تو مسجدوں کی تعمیرات میں بڑے اموال خرچ کئے ہیں۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانۂ خلافت میں دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر و تزیین پر پورے ملک شام کی سالانہ آمدنی سے تین گُنا زیادہ مال خرچ کیا تھا اُن کی بنائی ہوئی یہ مسجد آج تک قائم ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر نام و نمود اور شہرت کیلئے نہ ہو اللہ کے نام اور اللہ کے گھر کی تعظیم کی نیت سے کوئی شخص مسجد کی تعمیر شاندار بلند و مستحکم خوبصورت بنائے تو کوئی ممانعت نہیں بلکہ اُمید ثواب کی ہے۔

بعض فضائل مساجد | ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے فرض نماز کے لئے مسجد کیطرف نکلا اُسکا ثواب اُس شخص جیسا ہے جو احرام باندھ کر گھر سے حج کے لئے نکلا ہو اور جو شخص نماز اشراق کے لئے اپنے گھر سے وضو کر کے مسجد کیطرف چلا تو اسکا ثواب عمرہ کرنے والے جیسا ہے۔ اور ایک نماز کے بعد دوسری بشرطیکہ ان دونوں کے درمیان کوئی کام یا کلام نہ کرے، علیین میں لکھی جاتی ہے۔ اور حضرت بریدہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اندھیرے میں مساجد کو جاتے ہیں اُن کو قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت سُنادیجئے (رواہ مسلم)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا، گھر میں یا دُکان میں نماز پڑھنے کی نسبت بیس سے زائد درجہ افضل ہے اور یہ اسلئے کہ جب کوئی شخص وضو کرے اور اچھی طرح (سنت کے مطابق) وضو کرے پھر مسجد کو صرف نماز کی نیت سے چلے اور کوئی غرض نہ ہو تو ہر قدم پر اسکا مرتبہ ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے اور ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے یہانتک کہ وہ مسجد میں پہنچ جائے۔ پھر جب تک جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہے گا اسکو نماز ہی کا ثواب ملتا رہے گا اور فرشتے اسکے لئے یہ دُعا کرتے رہیں گے کہ یا اللہ، اسپر رحمت نازل فرما اور اسکی مغفرت فرما، جب تک کہ وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے اور اسکا وضو نہ ٹوٹے۔ اور حضرت حکم بن عُمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا میں مہمانوں کی طرح رہو اور مسجدوں کو اپنا

گھر بناؤ اور اپنے دِلوں کو رقت کی عادت ڈالو (یعنی رقیق القلب نرم دل بنو) اور (اللہ کی نعمتوں میں) کثرت سے تفکر و غور کیا کرو اور بکثرت (اللہ کے خوف سے) رویا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خواہشاتِ دُنیا تمھیں اس حال سے مختلف کر دیں کہ تم گھروں کی فضول تعمیرات میں لگ جاؤ جنہیں رہنا بھی نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنے کی فکر میں لگ جاؤ اور مستقبل کے لئے ایسی فضول تمناؤں میں مبتلا ہو جاؤ جو پا نہ سکو۔ اور حضرت ابوالدرداء رضہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ تمھارا گھر مسجد ہونا چاہیئے کیونکہ میں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ مساجد متقی لوگوں کے گھر ہیں جس شخص نے مساجد کو (کثرتِ ذکر کے ذریعہ) اپنا گھر بنا لیا، اللہ تعالےٰ اُسکے لئے راحت و سکون اور پُل صراط پر آسانی سے گزرنے کا ضامن ہو گیا۔ اور ابوصادق ازدی نے شعیب بن الحجاب کو خط لکھا کہ مسجدوں کو لازم پکڑو کیونکہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ مساجد ہی انبیاء کی مجالس تھیں۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانے میں ایسے لوگ ہونگے جو مسجدوں میں آکر جگہ جگہ حلقے بنا کر بیٹھ جاویں گے اور وہاں دُنیا ہی کی اور اُسکی محبت کی باتیں کرینگے تم ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے مسجد میں آنے والوں کی ضرورت نہیں۔

اور حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں بیٹھا گویا وہ اپنے رب کی مجلس میں بیٹھا ہے اس لئے اُسکے ذمہ ہے کہ زبان سے سوائے کلمۂ خیر کے اور کوئی کلمہ نہ نکالے۔ (قرطبی)

مساجد کے پندرہ آداب علماء نے آداب مساجد میں پندرہ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ **اوّل** یہ کہ مسجد میں پہنچنے پر اگر کچھ لوگوں کو بیٹھا دیکھے تو اُن کو سلام کرے اور کوئی نہ ہو تو اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ کہے (لیکن یہ اُس صورت میں ہے جبکہ مسجد کے حاضرین نفلی نماز یا تلاوت و تسبیح وغیرہ میں مشغول نہ ہوں ورنہ اسکو سلام کرنا درست نہیں۔ ش) **دوسرے** یہ کہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد کی پڑھے (یہ بھی جب ہے کہ اسوقت نماز پڑھنا مکروہ نہ ہو، مثلاً عین آفتاب کے طلوع یا غروب یا استواء نصف النہار کا وقت نہ ہو۔ ۱۲ ش) **تیسرے** یہ کہ مسجد میں خرید و فروخت نہ کرے۔ **چوتھے** یہ کہ وہاں تیر تلوار نہ نکالے۔ **پانچویں** یہ کہ مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کرنے کا اعلان نہ کرے۔ **چھٹے** یہ کہ مسجد میں آواز بلند نہ کرے۔ **ساتویں** یہ کہ وہاں دُنیا کی باتیں نہ کرے **آٹھویں** یہ کہ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ **نویں** یہ کہ جہاں صف میں پوری جگہ نہ ہو وہاں گھس کر لوگوں پر تنگی پیدا نہ کرے۔ **دسویں** یہ کہ کسی نماز پڑھنے والے کے آگے سے نہ گزرے **گیارھویں** یہ کہ مسجد میں تھوکنے ناک صاف کرنے سے پرہیز کرے۔ **بارھویں** اپنی انگلیاں نہ چٹخائے۔ **تیرھویں** یہ کہ اپنے بدن کے کسی حصہ سے کھیل نہ کرے۔ **چودھویں** نجاسات سے پاک صاف رہے اور کسی چھوٹے بچے یا مجنون کو ساتھ نہ لے جائے۔ **پندرھویں** یہ کہ وہاں کثرت سے ذکر اللہ میں مشغول رہے۔

قرطبی نے یہ پندرہ آداب لکھنے کے بعد فرمایا ہے کہ جس نے یہ کام کرلئے اُس نے مسجد کا حق ادا کر دیا اور مسجد اُسکے لئے حرز وامان کی جگہ بن گئی۔

احقر نے مساجد کے آداب و احکام ایک مستقل رسالہ بنام آدابُ المساجدؔ میں جمع کر دیئے ہیں جن کو ضرورت ہو اُسکا مطالعہ فرمائیں۔

جو مکانات، ذکر اللہ، تعلیم قرآن تعلیم دین کے لئے مخصوص ہوں وہ بھی مساجد کے حکم میں ہیں۔

تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے فرمایا کہ فِیْ بُیُوْتٍ کا لفظ قرآن میں عام ہے جس طرح مساجد اسمیں داخل ہیں اسی طرح وہ مکانات جو خاص تعلیم قرآن تعلیم دین یا وعظ و نصیحت یا ذکر و شغل کے لئے بنائے گئے ہوں جیسے مدارس اور خانقاہیں، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں اُن کا بھی ادب احترام لازم ہے۔

اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ میں لفظ اذن کی خاص حکمت

علماء تفسیر کا اتفاق ہے کہ اس جگہ اَذِنَ بمعنے اَمر و حکم ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر لفظ اذن کے اس جگہ لانے میں کیا مصلحت ہے روح المعانی میں ایک لطیف مصلحت یہ بیان کی ہے کہ اسمیں مؤمنین صالحین کو اس ادب کی تعلیم و ترغیب دینا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنے کے ہر کام کے لئے ایسے مستعد اور تیار ہونے چاہئیں کہ حکم کی ضرورت نہ پڑے صرف اسکے منتظر ہوں کہ کب ہمیں اس کام کی اجازت ملے تو ہم یہ سعادت حاصل کریں۔

یُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ، یہاں اللہ کا نام ذکر کرنے میں ہر قسم کا ذکر شامل ہے۔ تسبیح و تحمید وغیرہ بھی، نفلی نماز بھی، تلاوتِ قرآن وعظ و نصیحت، تعلیم علمِ دین، اور علوم دینیہ کے سب مشاغل اسمیں داخل ہیں۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، اسمیں اُن مؤمنین کی خاص صفات بیان کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نورِ ہدایت کے خاص مورد اور مسجدوں کو آباد رکھنے والے ہیں اسمیں لفظ رجال کی تعبیر میں اسطرف اشارہ ہے کہ مساجد کی حاضری دراصل مردوں کے لئے ہے عورتوں کی نماز اُن کے گھروں میں افضل ہے۔

مسند احمد اور بیہقی میں حضرت اُمِّ سلمہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا ہے خیر مساجد النساء قعر بیوتھن، یعنی عورتوں کی بہترین مساجد اُنکے گھروں کے تنگ و تاریک گوشے ہیں۔ اس آیت میں مؤمنین صالحین کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ان کو تجارت اور بیع کا مشغلہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔ لفظ تجارت میں چونکہ بیع بھی داخل ہے اسلئے بعض مفسرین نے مقابلہ کیوجہ سے اس جگہ تجارت سے مراد خریداری اور بیع سے مراد فروخت کرنا لیا ہے اور بعض نے تجارت کو اپنے مفہوم عام میں رکھا ہے یعنی لین دین خرید و فروخت کے معاملات، پھر بیع کو الگ کر کے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ معاملات تجارت تو ایک وسیع مفہوم ہے جس کے فوائد و منافع کبھی مدتوں میں وصول ہوتے ہیں اور کسی چیز کو فروخت کر دینے اور قیمت مع نفع کے نقد وصول کرلینے کا فائدہ فوری اور

نقد ہے اُسکو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے مقابلہ میں وہ کسی بڑے سے بڑے دُنیوی فائدہ کا بھی خیال نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ آیت بازار والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اُنکے صاحبزادے حضرت سالمؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ بازار سے گزرے تو نماز کا وقت ہوگیا تھا لوگوں کو دیکھا کہ دُکانیں بند کرکے مسجد کیطرف جارہے ہیں تو فرمایا کہ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

اور عہدِ رسالت میں دو صحابی تھے ایک تجارت کرتے تھے دوسرے صنعت و حرفت یعنی لوہار کا کام کرتے اور تلواریں بنا کر بیچتے تھے۔ پہلے صحابی کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولنے کے وقت اذان کی آواز کان میں پڑجاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔ دوسرے بزرگ کا یہ عالم تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہیں اور کان میں آواز اذان کی آگئی تو اگر ہتھوڑا مونڈھے پر اُٹھائے ہوئے ہیں تو وہیں مونڈھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کو چل دیتے تھے اُٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ تھا۔ اُن کی مدح میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)

صحابۂ کرام اکثر تجارت پیشہ تھے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام زیادہ تر تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ تھے جو کام کہ بازاروں سے متعلق ہیں کیونکہ تجارت و بیع کا مانع از یادِ خدا نہ ہونا اُنہی لوگوں کا وصف ہوسکتا ہے جن کا مشغلہ تجارت و بیع کا ہو ورنہ یہ کہنا فضول ہوگا (رواہ الطبرانی عن ابن عباسؓ۔ روح)

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ، یہ مؤمنین جنکا ذکر اُوپر آیت میں آیا ہی اُنکا آخری وصف ہے جسمیں بتلایا ہے کہ یہ حضرات ہر وقت ذکر اللہ اور طاعات و عبادات میں مشغول رہنے کے باوجود بے فکر اور بے ڈر بھی نہیں ہو جاتے بلکہ قیامت کے حساب کا خوف اُن پر مسلط رہتا ہے۔ اور یہ اُس نورِ ہدایت کا کمال ہے جو اللہ تعالیٰ کیطرف سے اُن کو عطا ہوا ہے جسکا ذکر اوپر آیت میں يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ میں فرمایا۔ آخر میں ایسے حضرات کی جزاء کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُنکے عمل کی بہترین جزاء عطا فرمادیں گے اور پھر فرمایا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ، یعنی صرف جزاءِ عمل دینے پر اکتفا نہیں ہوگا بلکہ اپنی طرف سے مزید انعامات بھی اُن کو ملیں گے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نہ کسی قانون کا پابند ہے نہ اُسکے خزانے میں کبھی کمی آتی ہے وہ جس کو چاہے بے حساب رزق دیدیتا ہے۔ یہاں تک مؤمنین صالحین جن کے سینے نورِ ہدایت کے مشکوٰۃ ہوتے ہیں اور جو نورِ ہدایت کو خاص طور سے قبول کرتے ہیں اُن کا ذکر تھا۔ آگے اُن کفار کا ذکر ہے جن کی فطرت میں تو اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت کا مادہ رکھا تھا مگر جب اس مادہ کو روشن کرنے والی وحیِ الٰہی اُن کو پہنچی تو اُس سے روگردانی اور انکار کرکے نور سے محروم ہوگئے اور اندھیرے ہی اندھیرے میں رہ گئے اور ان میں چونکہ

کافر و منکر دو قسم کے تھے اس لئے ان کی دو مثالیں بیان کی گئیں جن کی تفصیل خلاصہ تفسیر میں آ چکی ہے۔ دونوں مثالیں بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ، یہ جملہ کفار کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا مومنین کے بارے میں یہ ارشاد ہوا تھا يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ کفار کے لئے اس جملہ میں نورِ ہدایت سے محرومی کا ذکر ہے کہ انہوں نے احکامِ الٰہیہ سے انحراف کر کے اپنا فطری نور بھی فنا کر لیا اب جبکہ اللہ کے نورِ ہدایت سے محروم ہو گئے تو نور کہاں سے آئے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شخص محض اسباب علم و بصیرت جمع ہونے سے عالم مبصر نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے آدمی جو دنیا کے کاموں میں بالکل ناواقف بے خبر سمجھے جاتے ہیں آخرت کے معاملہ میں وہ بڑے مبصر عقلمند ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسکے برعکس بہت سے آدمی جو دنیا کے کاموں میں بڑے ماہر اور مبصر محقق مانے جاتے ہیں مگر آخرت کے معاملہ میں بڑے بے وقوف جاہل ثابت ہوتے ہیں۔ (مظہری)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ کی یاد کرتے ہیں جو کوئی ہیں آسمان و زمین میں اور اُڑتے جانور پَر کھولے ہوئے

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ

ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد، اور اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں اور اللہ کی

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ

حکومت ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہی تک پھر جانا ہے تو نے نہ دیکھا کہ اللہ ہانک

يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ

لاتا ہے بادل کو پھر اُن کو ملا دیتا ہے پھر اُن کو رکھتا ہے تہ بر تہ پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے اس

مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ

کے بیچ سے اور اُتارتا ہے آسمان سے اسمیں جو پہاڑ ہیں اولوں کے پھر وہ ڈالتا ہے جس

مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ ؕ

پر چاہے اور بچا دیتا ہے جس سے چاہے ابھی اس کی بجلی کی کوندے لے جائے آنکھوں کو

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

اللہ بدلتا ہے رات اور دن کو اسمیں دھیان کرنے کی جگہ ہے آنکھ والوں کو

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَ

اور اللہ نے بنایا ہر پھرنے والے کو ایک پانی سے پھر کوئی ہے کہ چلتا ہے اپنے پیٹ پر اور

مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ

کوئی ہے کہ چلتا ہے دو پاؤں پر اور کوئی ہے کہ چلتا ہے چار پر بناتا ہے

اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

اللہ جو چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو (دلائل اور مشاہدہ سے) معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (خواہ قالاً جو بعض مخلوقات میں مشاہد بھی ہے خواہ حالاً جو کل مخلوقات میں بدلالت عقل معلوم ہے) اور (بالخصوص) پرند (بھی) جو پر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں (کہ ان کی دلالت علی وجود الصانع اور زیادہ عجیب ہے کہ باوجود اُن کے ثقلِ اجسام کے پھر فضاء میں رُکے ہوئے ہیں اور) سب (پرندوں) کو اپنی اپنی دُعا (اور التجاء اللہ سے) اور اپنی تسبیح (و تقدیس کا طریقہ الہام سے) معلوم ہے اور (باوجود ان دلائل کے پھر بھی بعضے توحید کو نہیں مانتے تو) اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پُورا علم ہے (اس انکار و اعراض پر ان کو سزا دیگا) اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں (اب بھی) اور (انتہا میں) اللہ ہی کیطرف (سب کو) لَوٹ کر جانا ہے (اسوقت بھی حاکمانہ تصرف اُسی کا ہوگا چنانچہ حکومت کا ایک اثر بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ایک) بادل کو (دوسرے بادل کی طرف) چلتا کرتا ہے (اور) پھر اُس بادل (کے مجموعہ) کو باہم ملا دیتا ہے پھر اسکو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اُس (بادل) کے بیچ میں سے نکل (نکل کر) آتی ہے اور اس بادل یعنی اُسکے بڑے بڑے حصّوں میں سے اولے برساتا ہے پھر اُن کو جس (کی جان پر یا مال) پہ چاہتا ہے گراتا ہے (کہ اسکا نقصان ہو جاتا ہے) اور جس سے چاہتا ہے اُس کو ہٹا دیتا ہے (اور اُس کے جان و مال کو بچا لیتا ہے اور) اُس بادل (میں سے بجلی بھی پیدا ہوتی ہے اور ایسی چمکدار کہ اس بادل) کی بجلی کی چمک کی یہ حالت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس نے اب بینائی کو اُچک لیا (یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے تصرفات میں سے ہے اور) اللہ تعالیٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے (یہ بھی منجملہ تصرفات الٰہیہ کے ہے) اس (سب مجموعہ) میں اہلِ دانش کے لئے استدلال (کا موقع) ہے (جس سے مضمون توحید اور مضمون لہٗ ملک السمٰوٰت والارض پر استدلال کرتے ہیں) اور اللہ (ہی کا یہ تصرف بھی ہے کہ اُس) نے ہر چلنے والے جاندار کو (بری ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا ہے پھر اُن (جانوروں) میں بعضے تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں (جیسے سانپ مچھلی) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو دو

پیروں پر چلتے ہیں (جیسے انسان اور پرندے جبکہ ہوا میں نہ ہوں) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں (جیسے مواشی، اسی طرح بعضے زیادہ پر بھی اصل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پورا قادر ہے (اُس کو کچھ بھی مشکل نہیں)۔

معارف و مسائل

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ، شروع آیت میں یہ فرمایا ہے کہ زمین و آسمان اور انکے درمیان کی ہر مخلوق اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے میں مشغول ہے۔ اس تسبیح کا مفہوم حضرت سفیان رہ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ہر چیز آسمان، زمین آفتاب، ماہتاب اور کُل سیارے اور ستارے اور زمین کے عناصر آگ، پانی، مٹی، ہوا سب کو خاص خاص کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے اور جس کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا ہے وہ برابر اُسپر لگا ہوا ہے اُس سے سرِ مو خلاف نہیں کرتا۔ اسی اطاعت و انقیاد کو ان چیزوں کی تسبیح فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اُن کی تسبیح حالی ہے مقالی نہیں۔ اُن کی زبانِ حال بول رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو پاک و برتر سمجھ کر اُسکی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

زمخشری اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ اسمیں بھی کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کے اندر اتنا فہم و شعور رکھا ہو جس سے وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے اور اسمیں بھی کوئی بُعد نہیں کہ انکو کسی خاص قسم کی گویائی عطا فرمائی ہو اور خاص قسم کی تسبیح و عبادت اُن کو سکھا دی ہو جسمیں وہ مشغول رہتے ہوں آخری جملے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ میں اسی مضمون کیطرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور نماز میں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے مگر ہر ایک کی نماز اور تسبیح کا طریقہ اور صورت مختلف ہے۔ فرشتوں کا اور طریقہ، انسان کا دوسرا، اور نباتات کسی اور طرح سے عبادت نماز و تسبیح ادا کرتے ہیں جمادات کسی اور طریق سے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسکو ہدایت دی۔ وہ ہدایت یہی ہے کہ وہ ہر وقت حق تعالیٰ کی اطاعت میں لگی ہوئی اپنی مفوضہ ڈیوٹی کو پورا کر رہی ہے اس کے علاوہ اسکی اپنی ضرریاتِ زندگی کے متعلق بھی اسکو ایسی ہدایت دیدی ہے کہ بڑے بڑے عقلاء کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اپنے رہنے بسنے کے لئے کیسے کیسے گھونسلے اور بِل وغیرہ بناتے ہیں اور اپنی غذا وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کرتے ہیں۔

مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا، یہاں سماء سے مُراد بادل ہے اور جبال سے مُراد بڑے بڑے بادل ہیں اور بَرَدٌ اولے کو کہا جاتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے اُتاریں آیتیں کھول کھول کر بتلانے والی، اور اللہ چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ پر

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

اور لوگ کہتے ہیں ہم نے مانا اللہ کو اور رسول کو اور حکم میں آگئے پھر پھر جاتا ہے ایک فرقہ اُنہیں سے

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ

اس کے پیچھے اور وہ لوگ نہیں ماننے والے اور جب اُن کو بلائیے اللہ اور

وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ يَّكُنْ

رسول کی طرف کہ انہیں تصفیہ کر دکھائیے تبھی ایک فرقہ کے لوگ اُنہیں منہ موڑتے ہیں اور اگر اُن کو

لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ

کچھ پہنچتا ہو تو چلے آئیں اُس کی طرف قبول کر کر کیا اُن کے دلوں میں روگ ہے یا

ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ

دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ بے انصافی کرے گا اُن پر اللہ اور اُس کا رسول کچھ نہیں وہی لوگ

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ

بے انصاف ہیں ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بلائیے اُن کو اللہ اور

رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾

رسول کی طرف فیصلہ کرنے کو ان میں تو کہیں ہم نے سُن لیا اور حکم مان لیا اور وہ لوگ کہ انہی کا بھلا ہے

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اسکے رسول کے اور ڈرتا ہے اللہ سے اور بچکر چلے اُس سے سو وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچنے والے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی اپنی تاکید کی قسمیں کہ اگر تو حکم کرے تو سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں، تو کہہ قسمیں

تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ

نہ کھاؤ حکمبرداری چاہیئے جو دستور ہے، البتہ اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو تو کہہ

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا پھر اگر تم منہ پھیر دو گے تو اسکا ذمہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا

وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ

اور تمہارا ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا اور اگر اُس کا کہا مانو تو راہ پاؤ، اور پیغام لانے والے کا ذمہ نہیں

اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾
مگر پہنچا دینا کھول کر

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (حق کے) سمجھانے والے دلائل (ہدایت عام کے لئے) نازل فرمائے ہیں اور (ان عام میں سے) جس کو اللہ چاہتا ہے راہ راست کیطرف (خاص) ہدایت فرماتا ہے (کہ وہ اُلوہیت کے حقوق علمیہ یعنی عقائد صحیحہ اور حقوقِ عملیہ یعنی طاعت کو بجالاتا ہے ورنہ بہت سے محروم ہی رہتے ہیں) اور یہ منافق لوگ (زبان سے) دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسُول پر ایمان لے آئے اور (خدا و رسُول کا) حکم (دل سے) مانا پھر اسکے بعد (جب عمل کرکے اپنا دعویٰ ثابت کرنیکا وقت آیا تو) انہیں کا ایک گروہ (جو بہت زیادہ شریر ہے خدا و رسُول کے حکم سے) سرتابی کرتا ہے (اسوقت سے وہ صورت مراد ہے کہ جب انکے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہو اور صاحبِ حق اس منافق سے درخواست کرے کہ چلو جناب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے چلیں اس موقع پر یہ سرتابی کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ آپکے اجلاس میں جب حق ثابت ہوجاویگا تو اسی کے موافق آپ فیصلہ کریں گے جیسا عنقریب آیت وَاِذَا دُعُوْا میں اس موقع کا یہی بیان آتا ہے اور تخصیص ایک فریق کی باوجودیکہ تمام منافقین ایسے ہی تھے اسلئے ہے کہ غریب غربا کو باوجود کراہت قلبی کے صاف انکار کرنے کی جرأت وہمت نہیں ہوا کرتی یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جنکو کچھ وجاہت اور قوت حاصل ہو) اور یہ لوگ بالکل ایمان نہیں رکھتے (یعنی دل میں تو کسی منافق کے بھی ایمان نہیں مگر ان کا تو وہ ظاہری ملمع شدہ ایمان بھی نہ رہا جیسا اس آیت میں ہے وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور اس آیت میں ہے قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اور بیان اس حکم عدولی کا یہ ہے کہ) یہ لوگ جب اللہ اور اسکے رسُول کیطرف اس غرض سے بُلائے جاتے ہیں کہ رسُول (صلے اللہ علیہ وسلم) انکے (اور ان کے خصوم کے) درمیان میں فیصلہ کر دیں تو ان میں کا ایک گروہ (وہاں حاضر ہونے سے) پہلوتہی کرتا ہے (اور ٹالتا ہے اور یہ بلانا اگرچہ رسُول ہی کیطرف ہے مگر چونکہ آپ کا فیصلہ حکمِ خداوندی کی بناء پر ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کیطرف بھی نسبت کر دی گئی غرض جب ان کے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہے تب تو انکی یہ حالت ہوتی ہے) اور اگر (اتفاق سے) ان کا حق (کسی دوسرے کے ذمہ ہو) تو سرِتسلیم خم کئے ہوئے (بے تکلف آپکے بلانے پر) آپ کے پاس چلے آتے ہیں (کیونکہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں حق کا فیصلہ ہوگا اسمیں ہمارا فائدہ ہے۔ آگے ان لوگوں کے اعراض اور حاضر نہونے کی وجہ اسباب چند احتمالات کے طور پر بیان کرکے اور سب احتمالات کی نفی اور ایک احتمال کا اثبات ہے) آیا (اس اعراض کا سبب یہ ہے کہ) انکے دِلوں میں (کفر

یقینی کا) مرض ہے (یعنی ان کو اسکا یقین ہے کہ آپ اللہ کے رسول نہیں) یا یہ (نبوت کی طرف سے) شک میں پڑے ہیں (کہ رسول نہونے کا یقین تو نہیں مگر رسول ہونیکا بھی یقین نہیں) یا انکو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اسکا رسول ان پر ظلم کرنے لگیں (اور ان کے ذمہ جو حق ہے اس سے زائد دلادیں، سو واقعہ یہ ہے کہ ان اسباب میں سے کوئی بھی سبب) نہیں (ہے) بلکہ (اصلی سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ (ان مقدمات میں) برسر ظلم (ہوتے) ہیں (اسلئے حضور نبوی میں مقدمہ لانا پسند نہیں کرتے کہ ہم ہار جاوینگے اور باقی اسباب سابقہ سب منفی ہیں) مسلمانوں (کی شان اور ان) کا قول تو جب انکو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اسکے رسول کیطرف بلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ (خوشی خوشی) کہدیتے ہیں کہ ہمنے (تمھارا کلام) سُن لیا اور (اس کو) مان لیا (اور پھر فوراً چلے جاتے ہیں یہ ہے علامت اس کی ایسوں کا آمنّا اور اطعنا کہنا دُنیا میں بھی صادق ہے) اور ایسے (ہی) لوگ (آخرت میں بھی) فلاح پائیں گے اور (ہمارے یہاں کا تو قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور اسکے رسول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اسکی مخالفت سے بچے بس ایسے لوگ بامراد ہوں گے اور (نیز ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ) وہ لوگ بڑا زور لگاکر قسمیں کھایا کرتے ہیں کہ واللہ (ہم ایسے فرمانبردار ہیں کہ) اگر آپ انکو (یعنی ہمکو) حکم دیں (کہ گھر بار سب چھوڑ دو) تو وہ (یعنی ہم) ابھی (سب چھوڑ چھاڑ) نکل کھڑے ہوں آپ (ان سے) کہدیجیے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمھاری) فرمانبرداری کی حقیقت معلوم ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس نے مجھ کو بتلا دیا ہے۔ جیساکہ دوسری جگہ ارشاد ہے قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ اور) آپ (ان سے) کہئے کہ (باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا کام کرو یعنی) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو (آگے اللہ تعالیٰ اہتمام شانِ مضمون کے واسطے خود ان لوگوں کو خطاب فرماتا ہے کہ رسول کے اس کہنے کے اور تبلیغ کے بعد) پھر اگر تم لوگ (اطاعت سے) روگردانی کروگے تو سمجھ رکھو کہ (رسول کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) رسول کے ذمہ وہی تبلیغ (کا کام) ہے جسکا ان پر بار رکھا گیا ہے (جس کو وہ کرچکے اور سبکدوش ہوگئے) اور تمھارے ذمہ وہ (اطاعت کا کام) ہے جسکا تم پر بار رکھا گیا ہے (جس کو تم نہیں بجالائے پس تمھارا ہی ضرر ہوگا) اور اگر (روگردانی نہ کی بلکہ) تمنے ان کی اطاعت کرلی (جو عین اطاعت اللہ ہی کی ہے) تو راہ پر جالگو گے اور (بہرحال) رسول کے ذمہ صرف صاف طور پر پہنچادینا ہے (آگے تم سے بازپرس ہوگی کہ قبول کیا یا نہیں)۔

معارف و مسائل

یہ آیات ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ طبری وغیرہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ منافقین

میں سے ایک شخص بِشر نامی تھا اسکے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین کے متعلق جھگڑا اور خصومت تھی۔ یہودی نے اسکو کہا کہ چلو تمہارے ہی رسُول سے ہم فیصلہ کرالیں مگر بِشر مُنافق ناحق پر تھا یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ گیا تو آپ حق کے موافق فیصلہ کریں گے اور میں ہار جاؤنگا۔ اسنے اس سے انکار کیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بجائے کعب بن اشرف یہودی کے پاس مقدمہ لیجانے کو کہا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور آیت اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ الآیۃ میں جو ان کے دِلوں میں کفرِ یقینی کا مرض یا نبوّت میں شک ہونے کی نفی کی گئی ہے اس کی مُراد یہ ہے کہ یہ کفرِ یقینی یا شک ان کے دربار نبوی میں مقدمہ لانے سے گریز کرنیکا سبب نہیں اگرچہ کفر و شک کا ہونا منافقین میں ثابت اور واضح ہے مگر مقدمہ نہ لانا اصل میں اس سبب سے ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ حق کا فیصلہ ہوگا تو ہم ہار جائیں گے۔

فوز و فلاح کے لئے چار شرطیں وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ اس آیت میں چار چیزیں بیان کر کے فرمایا ہے کہ جو ان چار چیزوں کے پابند ہیں وہ ہی بامراد اور دین و دُنیا میں کامیاب ہیں۔

ایک واقعہ عجیبہ تفسیر قرطبی میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کا نقل کیا جس سے ان چاروں چیزوں کے مفہوم کا فرق اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ ایک روز مسجد نبوی میں کھڑے تھے اچانک ایک رومی دہقانی آدمی بالکل آپکے برابر آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اَنَا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حضرت فاروق اعظم رضؓ نے پُوچھا کیا بات ہے؟ تو کہا میں اللہ کے لئے مسلمان ہو گیا ہوں۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے پُوچھا کیا اسکا کوئی سبب ہے اس نے کہا ہاں۔ بات یہ ہے کہ میں نے تورات، انجیل، زبور اور انبیاء سابقین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر حال میں ایک مسلمان قیدی قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا وہ سُنی تو معلوم ہوا کہ اس چھوٹی سی آیت نے تمام کتبِ قدیمہ کو اپنے اندر سمو لیا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ فاروق اعظم رضؓ نے پُوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے؟ تو اس رومی دہقان نے یہی آیت مذکورہ تلاوت کی اور اُسکے ساتھ اسکی تفسیر بھی عجیب و غریب اس طرح بیان کی کہ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فرائضِ الٰہیہ کے متعلق ہے۔ وَرَسُوْلَهٗ سُنتِ نبوی کے متعلق ہے وَيَخْشَ اللّٰهَ گزشتہ عمر کے متعلق ہے وَيَتَّقْهِ آئندہ باقی عمر کے متعلق ہے۔ جب انسان ان چار چیزوں کا عامل ہو جائے تو اسکو اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کی بشارت ہے اور فائز وہ شخص ہے جو جہنم سے نجات پائے اور جنت میں اُس کو ٹھکانا ملے۔ فاروق اعظم رضؓ نے یہ سُنکر فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم (کے کلام میں اسکی تصدیق موجود ہے آپ) نے فرمایا ہے اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ یعنی اللہ تعالےٰ نے مجھے ایسے جامع کلمات عطا فرمائے ہیں جن کے الفاظ مختصر اور معانی نہایت وسیع ہیں۔ (قرطبی)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي
وعدہ کر لیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں اُنھوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کر دیگا انکو
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ
مُلک میں جیسا حاکم کیا تھا اُن سے اگلوں کو اور جما دیگا اُن کے لئے دین اُن کا
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ
جو پسند کر دیا اُن کے واسطے اور دے گا اُن کو اُن کے ڈر کے بدلے میں امن، میری بندگی کریں گے
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾
شریک نہ کریں گے میرا کسی کو اور جو کوئی ناشکری کریگا اسکے پیچھے سو وہی لوگ ہیں نافرمان
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾
اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو رسُول کے تاکہ تم پر رحم ہو
لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ
نہ خیال کر کہ یہ جو کافر ہیں تھکا دیں گے بھاگ کر مُلک میں اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے
وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع
اور وہ بُری جگہ ہے پھر جانے کی

ع ۷ / ۱۳

خلاصۂ تفسیر

(اے مجموعہ اُمّت) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نورِ ہدایت کا کامل اتباع کریں) اُن سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرما دیگا جیسا ان سے پہلے (اہلِ ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی (مثلاً بنی اسرائیل کو فرعون اور اُس کی قوم قبطیوں پر غالب کیا پھر ملک شام میں عمالقہ جیسی بہادر قوم پر اُن کو غلبہ عطا فرمایا اور مصر و شام کی حکومت کا ان کو وارث بنایا) اور (مقصود اس حکومت دینے سے یہ ہو گا کہ) جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) اُن کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام جیسا کہ دوسری آیت میں ہے رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا) اُس کو اُن کے (نفع آخرت کے) لئے قوت دیگا اور (اُن کو جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے) اُن کے اس خوف کے بعد اُس کو امن سے بدل دیگا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (نہ جلی نہ خفی جس کو ریا کہتے ہیں یعنی یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کا مشروط ہے دین پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کیساتھ۔ اور یہ وعدہ تو دُنیا میں ہے اور آخرت میں ایمان اور عمل صالح پر جو جزائے عظیم اور دائمی راحت کا وعدہ ہے وہ اسکے علاوہ ہے) اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ)

کے ناشکری کریگا (یعنی دین کے خلاف راستہ اختیار کریگا) تو (ایسے شخص کے لئے یہ وعدہ نہیں کیونکہ) یہ لوگ نافرمان ہیں (اور وعدہ تھا فرمانبرداروں کے لئے اسلئے اُن سے دُنیا میں بھی وعدہ حکومت دینے کا نہیں ہے اور آخرت کا عذاب اسکے علاوہ ہے) اور (اے مسلمانوں جب ایمان اور عمل صالح کے دُنیوی اور دینی فوائد سُن لئے تو تم کو چاہیئے کہ خوب) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (باقی احکام میں بھی) رسُول (صلے اللہ علیہ سلم) کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر (کامل) رحم کیا جائے (آگے کفر ومعصیت کا انجام ذکر کیا گیا ہے کہ اے مخاطب) کافروں کی نسبت یہ خیال مت کرنا کہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ جاویں گے اور ہم کو) ہرا دینگے (اور ہمارے قہر سے بچ جاوینگے نہیں بلکہ وہ خود ہاریں گے اور مقہور و مغلوب ہوں گے۔ یہ تو نتیجہ دُنیا میں ہے) اور (آخرت میں) اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول قرطبی نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نزولِ وحی اور اعلانِ نبوت کے بعد دس سال مکہ مکرمہ میں رہے تو ہر وقت کفار ومشرکین کے خوف میں رہے پھر ہجرت مدینہ کا حکم ہوا تو یہاں بھی مشرکین کے حملوں سے ہر وقت کے خطرہ میں رہے کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم سے عرض کیا یا رسُول اللہ کبھی ہم پر ایسا وقت بھی آئیگا کہ ہم ہتھیار کھول کر امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ بہت جلد ایسا وقت آنے والا ہے۔ اُس پر یہ آیات نازل ہوئیں (قرطبی و بحر) حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو اُسنے اُمتِ محمدیہ سے اُنکے وجود میں آنے سے پہلے ہی تورات و انجیل میں فرمایا تھا۔ (بحر محیط)

اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم سے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا کہ آپکی اُمت کو زمین کے خلفاء اور حکمراں بنایا جائیگا اور اللہ کے پسندیدہ دینِ اسلام کو غالب کیا جائیگا اور مسلمانوں کو اتنی قوت و شوکت دی جائے گی کہ اُن کو دشمنوں کا کوئی خوف نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ اس طرح پُورا فرما دیا کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ سلم کے عہدِ مبارک میں مکہ، خیبر، بحرین اور پورا جزیرۃ العرب اور پورا ملک یمن آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم ہی کے ذریعہ فتح ہوا اور ہجر کے مجوسیوں سے اور ملک شام کے بعض اطراف سے آپ نے جزیہ وصول فرمایا۔ اور شاہِ روم ہرقل نے اور شاہ مصر و اسکندریہ مقوقس اور شاہانِ عمان اور بادشاہ حبشہ نجاشی وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کو ہدایا بھیجے اور آپ کی تعظیم و تکریم کی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو وفات کے بعد جو کچھ فتنے پیدا ہو گئے تھے اُن کو ختم کیا اور بلاد فارس اور بلاد شام

و مصر کیطرف اسلامی لشکر بھیجے اور بصری اور دمشق آپ ہی کے زمانے میں فتح ہوئے اور دوسرے ملکوں کے بھی بعض حصے فتح ہوئے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ بنانیکا الہام فرمایا۔ عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے نظامِ خلافت ایسا سنبھالا کہ آسمان نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ایسا نظام کہیں نہ دیکھا تھا۔ اُن کے زمانے میں ملک شام پورا فتح ہوگیا اسی طرح پورا ملک مصر اور ملک فارس کا اکثر حصہ۔ اُنھیں کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کی قیصری اور کسروی کا خاتمہ ہوا۔ اسکے بعد خلافتِ عثمانی کا وقت آیا تو اسلامی فتوحات کا دائرہ مشارق و مغارب تک وسیع ہوگیا۔ بلاد مغرب، اندلس اور قبرص تک اور مشرق اقصیٰ میں بلاد چین تک اور عراق، خراسان، اہواز سب آپکے زمانے میں فتح ہوئے۔ اور صحیح حدیث میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے پوری زمین کے مشارق و مغارب سمیٹ کر دکھائے گئے ہیں اور میری اُمت کی حکومت اُن تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ خلافتِ عثمانیہ کے دَور ہی میں پُورا فرمادیا (یہ سب مضمون تفسیر ابن کثیر سے لیا گیا ہے)۔

اور ایک حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی اس کی مُراد خلافتِ راشدہ ہے جو بالکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر قائم رہی اور حضرت علیؓ مرتضیٰ تک چلی کیونکہ یہ تیس سال کی مدت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے تک پوری ہوئی۔

ابن کثیرؒ نے اس جگہ صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا کام چلتا رہیگا جبتک بارہ خلیفہ رہیں گے۔ ابن کثیرؒ نے اس کو نقل کرکے فرمایا کہ یہ حدیث بارہ خلیفہ عادل اس اُمت میں ہونے کی خبر دے رہی ہے جسکا وقوع ضروری ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب مسلسل اور متصل ہی ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ وقفوں کے بعد ہوں۔ انمیں سے چار تو یکے بعد دیگرے ہو چکے جو خلفاء راشدین تھے پھر کچھ وقفہ کے بعد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ہوئے اُن کے بعد بھی مختلف زمانوں میں ایسے خلیفہ ہوتے رہے اور تاقیامت رہیں گے آخری خلیفہ حضرت مہدی ہونگے۔ روافض نے جن بارہ خلفاء کو متعین کیا ہے اس کی کوئی دلیل حدیث میں نہیں بلکہ انمیں سے بعض تو وہ ہیں جنکا خلافت سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان سب کے درجات برابر ہوں اور سب کے زمانے میں امن و سکون دُنیا کا یکساں ہو۔ بلکہ اس وعدہ کا مدار ایمان و عمل صالح پر استقامت اور مکمل اتباع پر ہے اسکے درجات کے اختلاف سے حکومت کی نوعیت و قوت میں بھی فرق و اختلاف لازمی ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں

جب اور جہاں کوئی مسلمان عادل اور صالح بادشاہ ہوا ہے اس کو اپنے عمل و صلاح کے پیمانے پر اس وعدۂ الٰہیہ کا حصہ ملا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ یعنی اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

آیتِ مذکورہ سے خلفاء راشدین کی خلافت اور مقبولیت عنداللہ کا ثبوت

یہ آیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دلیل بھی ہے کیونکہ جو پیش گوئی اس آیت میں فرمائی گئی تھی وہ بالکل اُسی طرح پوری ہوئی۔ اسی طرح یہ آیت حضرات خلفاء راشدین کی خلافت کے حق و صحیح اور مقبول عنداللہ ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ اپنے رسول اور اسکی اُمت سے فرمایا تھا اُس کا پُورا پُورا ظہور انھیں حضرات کے زمانے میں ہوا۔ اگر ان حضرات کی خلافت کو حق و صحیح نہ مانا جائے جیسے روافض کا خیال ہے تو پھر قرآن کا یہ وعدہ ہی کہیں پُورا نہیں ہوا۔ اور روافض کا یہ کہنا کہ یہ وعدہ حضرت مہدی کے زمانے میں پورا ہوگا ایک مضحکہ خیز چیز ہے اسکا حاصل تو یہ ہوا کہ چودہ سو برس تو پوری اُمت ذلت و خواری میں رہے گی اور قربِ قیامت میں جو چند روز کے لئے اُن کو حکومت ملے گی وہی حکومت اس وعدہ سے مراد ہے معاذاللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے جن شرائط ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر کیا تھا وہ شرائط بھی انھیں حضرات میں سب سے زیادہ کامل و مکمل تھیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پُورا پُورا انھیں کے عہد میں پورا ہوا اُنکے بعد نہ ایمان و عمل کا وہ درجہ قائم رہا نہ خلافت و حکومت کا وہ وقار کبھی قائم ہوا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ، لفظ کفر کے لغوی معنے ناشکری کے اور اصطلاحی معنے ایمان کی ضد ہیں۔ یہاں لفظی معنے بھی مُراد ہوسکتے ہیں اور اصطلاحی بھی یعنی آیت کے یہ ہیں کہ جبوقت اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ اپنا یہ وعدہ پُورا کردے، مسلمانوں کو حکومت قوت اور امن و اطمینان اور دین کو استحکام حاصل ہو جائے اسکے بعد بھی اگر کوئی شخص کفر کرے یعنی اسلام سے پھر جائے یا ناشکری کرے کہ اس اسلامی حکومت کی اطاعت سے گُریز کرے تو ایسے لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں۔ پہلی صورت میں ایمان ہی سے نکل گئے اور دوسری صورتمیں اطاعت سے نکل گئے۔ کفر اور ناشکری ہر وقت ہر حال میں گناہِ عظیم ہے مگر اسلام اور مسلمانوں کی قوت و شوکت اور حکومت قائم ہونیکے بعد یہ چیزیں دوہرے جُرم ہو جاتی ہیں اسلئے بَعْدَ ذٰلِكَ سے مؤکد فرمایا گیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ علماءِ تفسیر نے کہا ہے کہ قرآن کے اس جملے کے سب سے پہلے مصداق وہ لوگ ہوئے جنھوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان غنی رضؓ کو قتل کیا اور جب وہ اس جُرمِ عظیم کے مُرتکب ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے مذکورہ انعامات میں بھی کمی آگئی آپس کے قتل و قتال سے خوف و ہراس میں مبتلا ہوگئے اور بعد اسکے کہ سب

آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سلام کا یہ خطبہ نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت عثمان رضؓ کے خلاف ہنگامہ کیوقت دیا تھا خطبہ کے الفاظ یہ ہیں

"اللہ کے فرشتے تمھارے شہر کے گرد احاطہ کئے ہوئے حفاظت میں اُسوقت سے مشغول تھے جب سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ خدا کی قسم اگر تم نے عثمان کو قتل کر دیا تو یہ فرشتے واپس چلے جاویں گے اور پھر کبھی نہ لوٹیں گے۔ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص ان کو قتل کر دیگا وہ اللہ کے سامنے دست بُریدہ حاضر ہوگا اُس کے ہاتھ نہ ہوں گے۔ اور سمجھ لو کہ اللہ کی تلوار ابتک میان میں تھی، خدا کی قسم اگر وہ تلوار میان سے نکل آئی تو پھر کبھی میان میں نہ جاویگی۔ کیونکہ جب کوئی نبی قتل کیا جاتا ہے تو اُس کے بدلے میں ستر ہزار آدمی مارے جاتے ہیں اور جب کسی خلیفہ کو قتل کیا جاتا ہے تو پینتیس ہزار آدمی مارے جاتے ہیں" (مظہری)

چنانچہ قتل عثمان غنی رضؓ سے جو باہمی خونریزی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اُمت میں چلتا ہی رہا ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی نعمت استخلاف اور استحکام دین کی مخالفت اور ناشکری قاتلانِ عثمان نے کی تھی اُن کے بعد روافض اور خوارج کی جماعتوں نے خلفاء راشدین کی مخالفت میں گروہ بنالئے۔ اسی سلسلے میں حضرت حسین بن علی رضؓ کی شہادت کا عظیم حادثہ پیش آیا۔ نسأل اللہ الھدایۃ وشکر نعمتہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ

اے ایمان والو اجازت لے کر آئیں تم سے جو تمھارے ہاتھ کے مال ہیں اور جو کہ نہیں

يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ

پہنچے تم میں عقل کی حد کو تین بار فجر کی نماز سے پہلے اور جب

تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ڜ ثَلٰثُ

اُتار رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشار کی نماز سے پیچھے یہ تین وقت

عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ

بدن کھلنے کے ہیں تمھارے، کچھ تنگی نہیں تم پر اور نہ اُن پر ان وقتوں کے پیچھے، پھرا ہی کرتے ہو

عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ

ایک دوسرے کے پاس یوں کھولتا ہے اللہ تمھارے آگے باتیں اور اللہ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور جب پہنچیں لڑکے تم میں کے عقل کی حد کو تو اُن کو ویسی ہی

كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ

اجازت لینی چاہیئے جیسے لیتے رہے ہیں اُن سے اگلے، یوں کھول کر سُناتا ہے اللہ تم کو اپنی باتیں

وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمھاری عورتیں جنکو توقع نہیں رہی

نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ

نکاح کی اُن پر گناہ نہیں کہ اُتار رکھیں اپنے کپڑے یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں

بِزِينَةٍ ۖ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾

اپنا سنگار اور اس سے بھی بچیں تو بہتر ہے اُنکے لئے اور اللہ سب باتیں سُنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تمھارے پاس آنے کے لئے) تمھارے مملوکوں کو اور جو تم میں حدِ بلوغ کو نہیں پہنچے اُن کو تین وقتوں میں اجازت لینا چاہیئے (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب دو پہر کو (سونے لیٹنے کیلئے) اپنے (زائد) کپڑے اُتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد یہ تین وقت تمھارے پردے کے ہیں (یعنی یہ اوقات چونکہ عام عادت کے مطابق تخلیہ اور آرام کے ہیں، جسمیں آدمی بے تکلفی سے رہنا چاہتا ہے اور تنہائی میں کسی وقت اعضائے مستورہ بھی کُھل جاتے ہیں، یا کسی ضرورت سے کھولے جاتے ہیں اسلئے اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کو اور اپنے نابالغ بچوں کو سمجھادو کہ بے اطلاع اور بغیر اجازت لئے ہوئے ان اوقات میں تمھارے پاس نہ آیا کریں اور) ان اوقات کے علاوہ نہ (تو بلا اجازت آنے دینے اور منع نہ کرنے میں) تم پر کوئی الزام ہے اور نہ (بلا اجازت چلے آنے میں) اُن پر کچھ الزام ہے (کیونکہ) وہ بکثرت تمھارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں کوئی کسی کے پاس اور کوئی کسی کے پاس (پس ہر وقت اجازت لینے میں تکلیف ہے اور چونکہ یہ وقت پردے کے نہیں ہیں اسلئے ان میں اپنے اعضاءِ مستورہ کو چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے اور جس وقت تم میں کے (یعنی احرار میں کے) وہ لڑکے (جن کا اوپر حکم آیا ہے) حدِ بلوغ کو پہنچیں (یعنی بالغ یا قریبِ بلوغ ہو جاویں) تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہیئے جیسا ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے) لوگ اجازت لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہی اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہی، اور (ایک بات یہ جاننا چاہیئے کہ پردہ کے احکام میں شدت فتنہ کے خوف پر مبنی ہی جہاں فتنہ کا عادۃً احتمال نہو مثلاً جو) بڑی بوڑھی عورتیں جنکو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی اُمید نہ رہی ہو (یعنی وہ محلِ رغبت

نہیں رہیں یہ تفسیر ہے بڑی بوڑھی ہونے کی) اُن کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے (جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے غیر محرم کے روبرو بھی) اُتار رکھیں بشرطیکہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں (جن کا ظاہر کرنا غیر محرم کے سامنے بالکل ناجائز ہے پس مُراد اس سے چہرہ ہتھیلیاں اور بقول بعض دونوں قدم بھی، بخلاف جوان عورت کے کہ بوجہ احتمال فتنہ اسکے چہرہ وغیرہ کا بھی پردہ ضروری ہے) اور (اگرچہ بڑی بوڑھی عورتوں کے لئے غیر محرموں کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے لیکن) اس سے بھی احتیاط رکھیں تو انکے لئے اور زیادہ بہتر ہے (کیونکہ اوّل تو "ہر گندہ پیرے راگندہ خورے" مثل مشہور ہے دوسرے بالکل ہی بے پردگی کا سدِّ باب مقصود ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سُنتا سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور کے بیشتر احکام بے حیائی اور فواحش کے انسداد کے لئے آئے ہیں اور اُنھیں کی مناسبت سے کچھ احکام آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے بھی بیان ہوئے ہیں۔ پھر عورتوں کے پردے کے احکام بیان کئے گئے۔

اقارب و محارم کے لئے خاص اوقات میں استیذان کا حکم

آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے آداب اس سے پہلے اسی سورت کی آیت ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ میں احکام استیذان کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں کہ کسی سے ملاقات کو جاؤ تو بغیر اجازت لئے اُسکے گھر میں داخل نہ ہو۔ گھر زنانہ ہو یا مردانہ آنے والا مرد ہو یا عورت سب کے لئے کسی کے گھر میں جانے سے پہلے اجازت کو واجب قرار دیا گیا ہے مگر یہ احکام استیذان اجانب کے لئے تھے جو باہر سے ملاقات کے لئے آئے ہوں۔

آیاتِ مذکورہ میں ایک دوسرے استیذان کے احکام کا بیان ہے جنکا تعلق اُن اقارب اور محارم سے ہے جو عموماً ایک گھر میں رہتے اور ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اُن سے عورتوں کا پردہ بھی نہیں ایسے لوگوں کے لئے بھی اگرچہ گھر میں داخل ہونے کے وقت اسکا حکم ہے کہ اطلاع کر کے یا کم از کم قدموں کی آہٹ کو ذرا تیز کر کے یا کھانس کھنکار کر گھر میں داخل ہوں اور یہ استیذان ایسے اقارب کے لئے واجب نہیں مستحب ہے جس کو ترک کرنا مکروہ تنزیہی ہے تفسیر مظہری میں ہے فمن اراد الدخول فی بیت نفسہ وفیہ محرماتہ یکرہ لہ الدخول فیہ من غیر استیذان تنزیھا لاحتمال رؤیتہ واحدۃ منھن عریانۃ وھو احتمال ضعیف و مقتضاہ التنزہ (مظہری) یہ حکم تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے کا تھا لیکن گھر میں داخل ہو کر پھر یہ سب ایک جگہ ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اُن کے لئے تین خاص اوقات میں جو انسان کے خلوت

میں رہنے کے اوقات ہیں ایک اور استیذان کا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے وہ تین اوقات صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو آرام کرنے کے وقت اور عشاء کی نماز کے بعد کے اوقات ہیں ان میں محارم اور اقارب کو یہاں تک کہ سمجھدار نابالغ بچوں اور مملوکہ لونڈیوں کو بھی اس استیذان کا پابند کیا گیا ہے کہ ان تین اوقاتِ خلوت میں انہیں سے بھی کوئی کسی کی خلوتگاہ میں بغیر اجازت کے نہ جائے کیونکہ ایسے اوقات میں ہر انسان آزاد و بے تکلف رہنا چاہتا ہے زائد کپڑے بھی اُتار دیتا ہے اور کبھی اپنی بیوی کے ساتھ بے تکلف اختلاط میں مشغول ہوتا ہے ان اوقات میں کوئی ہوشیار بچہ یا گھر کی کوئی عورت یا اپنی اولاد میں سے کوئی بغیر اجازت کے اندر آجائے تو بسا اوقات وہ ایسی حالت میں پائیگا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرماتا ہے اسکو سخت تکلیف پہنچے گی اور کم از کم اسکی بے تکلفی اور آرام میں خلل پڑنا تو ظاہر ہی ہے اس لئے آیاتِ مذکورہ میں اُن کے لئے خصوصی استیذان کے احکام آئے ہیں کہ ان تین وقتوں میں کوئی کسی کے پاس بغیر اجازت کے نہ جائے۔ ان احکام کے بعد پھر یہ بھی فرمایا کہ

لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ، یعنی ان وقتوں کے علاوہ کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک دوسرے کے پاس بلا اجازت جایا کریں کیونکہ وہ اوقات عموماً ہر شخص کے کام کاج میں مشغول ہونے اور اعضائے مستورہ کو چھپائے رہنے کے ہیں جنہیں عادۃً آدمی بیوی کیساتھ اختلاط بھی نہیں کرتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بالغ مرد و عورت کو استیذان کا حکم دینا تو ظاہر ہے مگر نابالغ بچے جو شرعاً کسی حکم کے مکلف نہیں انکو بھی اس حکم کا پابند کرنا بظاہر اُصول کیخلاف ہے۔ جواب یہ ہے کہ اسکے مخاطب درحصل بالغ مرد و عورت ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو بھی سمجھا دیں کہ ایسے وقت میں بغیر پُوچھے اندر نہ آیا کرو۔ جیسے حدیث میں ہے کہ بچّوں کو جب وہ سات سال کے ہوجائیں تو نماز سکھاؤ اور پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر کے بعد اُن کو سختی سے نماز کا پابند کرو نہ مانیں تو مار کر نماز پڑھاؤ۔ اسی طرح اس استیذان کا اصل حکم بالغ مرد و عورت کو ہے۔ اور مذکورہ جملے میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ان وقتوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں نہ تم پر جُناح ہے کہ اُن کو بلا اجازت آنے دو اور نہ ان پر کوئی جُناح ہے کہ وہ بلا اجازت آجائیں اسمیں اگرچہ لفظ جُناح آیا ہے جو عموماً گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی مطلقاً حرج اور مضائقہ کے معنے میں بھی آتا ہے یہاں لَا جُنَاحَ کے معنی یہی ہیں کہ کوئی مضائقہ اور تنگی نہیں ہے اس سے بچّوں کے مکلف اور گناہگار ہونے کا شبہ ختم ہوگیا۔ (بیان القرآن)

مسئلہ: آیتِ مذکورہ میں جو اَلَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کا لفظ آیا ہے جس کے معنے مملوک

غلام اور لونڈی دونوں پر حاوی ہیں۔ انمیں مملوک غلام جو بالغ ہو وہ تو شرعاً اجنبی غیر محرم کے حکم میں ہے۔ اس کی آقا اور مالک عورت کو بھی اس سے پردہ کرنا واجب ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اس لفظ سے مُراد لونڈیاں یا مملوک غلام جو بالغ نہ ہو وہ ہے جو ہر وقت گھر میں آنے جانے کے عادی ہیں۔

مسئلہ: اسمیں علماء و فقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ خاص استیذان اقارب کے لئے واجب ہے یا استحبابی حکم ہے اور یہ کہ یہ حکم اب بھی جاری ہے یا منسوخ ہوگیا۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ آیت محکم غیر منسوخ ہے اور حکم وجوب کے لئے ہے مَردوں کے واسطے بھی عورتوں کے واسطے بھی (قرطبی) لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسکے وجوب کی علت اور وجہ وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ان تین اوقات میں عام آدمی خلوت چاہتا ہے اور اسمیں بسا اوقات اپنی بیوی کیساتھ بھی مشغول ہوتا ہے بعض اوقات اعضائے مستورہ بھی کھلے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ اسکی احتیاط کرلیں کہ ان اوقات میں بھی اعضائے مستورہ کو چھپانے کی عادت ڈالیں اور بیوی سے اختلاط بھی بجز اُس صورت کے نہ کریں کہ کسی کے آنیکا احتمال نہ رہے جیسے عموماً یہی عادت بن گئی ہے تو اس صورت میں ان پر یہ بھی واجب نہیں رہتا کہ اپنے اقارب اور بچوں کو استیذان کا پابند کریں، اور نہ اقارب پر واجب رہتا ہے۔ البتہ اسکا مستحسن اور مستحب ہونا ہر حال میں ہے۔ مگر عام طور پر عمل اس پر زمانۂ دراز سے متروک سا ہوگیا ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں تو اس پر بڑی شدت کے الفاظ استعمال فرمائے اور ایک روایت میں عمل نہ کرنے والے لوگوں کا کچھ عذر بیان کر دیا۔

پہلی روایت ابن کثیر نے بسند ابن ابی حاتم یہ نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتیں ایسی ہیں جن پر لوگوں نے عمل کو چھوڑ ہی دیا ہے۔ ایک یہی آیت استیذان یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، جسمیں اقارب اور نابالغ بچوں کو بھی استیذان کی تعلیم ہے دوسری آیت وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی ہے جسمیں تقسیم میراث کے وقت وارثوں کو اسکی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر مال وراثت تقسیم کرنے کے وقت کچھ ایسے رشتہ دار بھی موجود ہو جاویں جنکا ضابطہ میراث سے کوئی حصہ نہیں ہے تو اُن کو بھی کچھ دیدیا کرو کہ اُن کی دلشکنی نہ ہو۔ تیسری آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ہے جسمیں بتلایا ہے کہ سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور آجکل لوگ معزز مکرم اسکو سمجھتے ہیں جس کے پاس پیسہ بہت ہو جسکا مکان کوٹھی بنگلہ شاندار ہو۔ بعض روایات کے الفاظ اسمیں یہ بھی ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتوں کے معاملہ میں لوگوں پر شیطان غالب آگیا ہے اور پھر فرمایا کہ میں نے تو اپنی لونڈی کو بھی اسکا پابند کر رکھا ہے کہ ان تین وقتوں میں بغیر اجازت میرے پاس نہ آیا کرے۔

دوسری روایت ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ سے یہ منقول ہے کہ دو شخصوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اس استیذانِ اقارب کے متعلق سوال کیا کہ اس پر لوگ عمل نہیں کرتے تو ابن عباسؓ نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ سِتِّیْرٌ یُحِبُّ السَّتْرَ، یعنی اللہ بہت ستر رکھنے والا ہے اور ستر کی حفاظت کو پسند فرماتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت معاشرت بہت سادہ تھی نہ لوگوں کے دروازوں پر پردے تھے نہ گھر کے اندر پردہ دار مسہریاں تھیں اُس وقت کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آدمی کا نوکر یا بیٹا بیٹی اچانک آجاتے اور یہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ مشغول ہوتا، اس لئے اللہ جل شانہٗ نے ان آیات میں تین وقتوں میں استیذان کی پابندی لگا دی تھی۔ اور اب چونکہ دروازوں پر پردے اور گھر میں پردہ دار مسہریاں ہونے لگیں اس لئے لوگوں نے یوں سمجھ لیا کہ بس یہ پردہ کافی ہے اب استیذان کی ضرورت نہیں (ابن کثیر نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا ہے ھٰذا اسناد صحیح الی ابن عباس)۔ بہرحال حضرت ابن عباس رضؓ کی اس دوسری روایت سے اتنی بات نکلتی ہے کہ جب اسطرح کے واقعات کا اندیشہ نہ ہو کہ آدمی بیوی کیساتھ مشغول یا اعضائے مستورہ کھولے ہوئے ہو اور کسی کے آنیکا احتمال ہو ایسے حالات میں کچھ مساہلت ہے۔ لیکن

قرآن نے پاکیزہ معاشرت کی تعلیم دی ہے کہ کوئی کسی کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو سب آرام و راحت سے رہیں جو لوگ اس طرح کے استیذان کا گھر والوں کو پابند نہیں بناتے وہ خود تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں، اپنی ضرورت و خواہش کا کام کرنے میں تنگی برتتے ہیں۔

عورتوں کے احکام پردہ کی تاکید اور اُسمیں سے ایک اور استثناء اس سے پہلے عورتوں کے حجاب اور پردہ کے احکام دو آیتوں میں مفصل آچکے ہیں اور اُن میں دو استثناء بھی ذکر کئے گئے۔ ایک استثناء ناظر یعنی دیکھنے والے کے اعتبار سے، دوسرا استثناء منظور یعنی جس کو دیکھا جائے اُسکے اعتبار سے۔ ناظر کے اعتبار سے تو محارم کو اور اپنی مملوکہ کنیزوں نابالغ بچوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا اور منظور یعنی جس چیز کو نظروں سے چھپانا مقصود ہے اُسکے اعتبار سے زینت ظاھرہ کو مستثنیٰ کیا گیا جسمیں اُوپر کے کپڑے برقع یا بڑی چادر باتفاق مُراد ہیں اور بعض کے نزدیک عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی اس استثناء میں داخل ہیں۔

یہاں اگلی آیت میں ایک تیسرا استثناء عورت کے شخصی حال کے اعتبار سے یہ کیا گیا کہ جو عورت بڑی بوڑھی ایسی ہو جاوے کہ نہ اُس کیطرف کسی کو رغبت ہو اور نہ وہ نکاح کے قابل ہو تو اُسکے لئے پردہ کے احکام میں یہ سہولت دیدی گئی ہے کہ اجانب بھی اسکے حق میں مثل محارم کے ہو جاتے ہیں جن اعضاء کا چھپانا اپنے محرموں سے ضروری نہیں ہے اس بوڑھی عورت کے لئے غیر مردوں غیر محرموں سے بھی اُن کا چھپانا ضروری نہیں۔ اسلئے فرمایا وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ، الآیۃ جسکی

مختصر تفسیر اوپر گزر چکی ہے مگر ایسی بڑی بوڑھی عورت کے لئے بھی ایک قید تو یہ ہے کہ جو اعضاء محرم کے سامنے کھولے جائیں یہ عورت غیر محرم کے سامنے بھی کھول سکتی ہے بشرطیکہ بن سنور کر زینت کر کے نہ بیٹھے۔ دوسری بات آخر میں یہ فرمائی وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ، یعنی اگر وہ غیر محرموں کے سامنے آنے سے بالکل ہی بچیں تو یہ اُن کے لئے بہتر ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى
نہیں ہے اندھے پر کچھ تکلیف اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار
الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ
پر تکلیف اور نہیں تکلیف تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا
بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے یا اپنے بھائی کے گھر سے یا اپنی
اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ
بہن کے گھر سے یا اپنے چچا کے گھر سے یا اپنی پھوپھی کے گھر سے یا اپنے ماموں کے گھر سے
اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
یا اپنی خالہ کے گھر سے یا جس گھر کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے، نہیں گناہ تم پر
جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓي
کہ کھاؤ آپس میں مل کر یا جدا ہو کر پھر جب کبھی جانے لگو گھروں میں تو سلام کہو اپنے
اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
لوگوں پر نیک دعا ہے اللہ کے یہاں سے برکت والی ستھری یوں کھولتا ہے
اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾
اللہ تمہارے آگے اپنی باتیں تاکہ تم سمجھ لو

ع ۱۴

خلاصۂ تفسیر

(اگر تم کسی اندھے لنگڑے بیمار غریب کو اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کے گھر لیجاکر کچھ کھلا پلا دو، یا خود کھا پی لو تو جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ عزیز ملاقاتی ہمارے کھانے اور کھلانے پر راضی ہوگا اسکو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو ان صورتوں میں) نہ تو اندھے آدمی کے لئے کوئی مضائقہ ہے اور نہ لنگڑے آدمی کے لئے اور نہ بیمار آدمی کے لئے کچھ مضائقہ ہے، اور نہ خود تمہارے لئے اس بات میں (کچھ مضائقہ ہے)

کہ تم (خواہ خود یا تم مع اُن معذورین کے سب) اپنے گھروں سے (جن میں بی بی۔ اولاد کے گھر بھی آگئے) کھانا کھالو یا (اُن گھروں میں جنکا ذکر آگے آتا ہے کھالو، یعنی نہ تم کو خود کھانے میں گناہ ہے اور نہ اُن معذورین کو کھلانے میں۔ اسی طرح تمھارے کھلا دینے سے اُن معذورین کو بھی کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں اور وہ گھر یہ ہیں۔ مثلاً) اپنے باپ کے گھر سے (کھالو کھلادو) یا اپنی ماؤں کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اُن گھروں سے جنکی کنجیاں تمھارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (پھر اسمیں بھی) کہ سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر (یہ بھی معلوم کر رکھو کہ) جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو (یعنی وہاں جو مسلمان ہوں اُنکو) سلام کرلیا کرو (جو کہ) دُعا کے طور پر ہے اور) جو خدا کی طرف سے مقرر ہے اور (بوجہ اسپر ثواب ملنے کے) برکت والی (اور بوجہ مخاطب کا دل خوش کرنے کے) عمدہ چیز ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے) احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف و مسائل

گھروں میں داخل ہونے کے بعد کے بعض احکام اور آدابِ معاشرت

پچھلی آیتوں میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے استیذان کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس آیت میں وہ احکام و آداب مذکور ہیں جو اجازت ملنے پر گھر میں جانے کے بعد مستحب یا واجب ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اور اسمیں مذکورہ احکام کو سمجھنے کے لئے پہلے اُن حالات کو معلوم کرلینا مناسب ہے جن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

قرآن کریم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عام تعلیمات میں حقوق العباد کی حفاظت و رعایت کے لئے جتنی تاکیدات آئی ہیں اُن سے کوئی مسلمان بے خبر نہیں۔ کسی دوسرے کے مال میں بغیر اُسکی اجازت کے کوئی تصرف کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے ایسے خوش نصیب لوگوں کو چُن لیا تھا کہ وہ اللہ و رسولؐ کے فرمان پر ہر وقت گوش برآواز رہتے اور ہر حکم کی تعمیل میں اپنی پوری توانائی صرف کرتے تھے قرآنی تعلیمات پر عمل اور اُسکے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کیمیا اثر سے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جماعت تیار کردی تھی کہ فرشتے بھی اُن پر فخر کرتے ہیں۔ دوسروں کے مال میں اُن کی مرضی و اجازت کے بغیر ادنیٰ قسم کا تصرف گوارا نہ ہونا کسی کو ادنیٰ سی تکلیف پہنچانے سے پرہیز کرنا اور اسمیں تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر قائم ہونا سبھی صحابہ کا وصف تھا۔ اسی سلسلے کے چند واقعات عہدِ رسالت میں پیش آئے جن کی وجہ سے آیتِ مذکورہ کے احکام نازل ہوئے۔ حضرات مفسرین نے یہ سب واقعات

لکھے ہیں۔ کسی نے انمیں سے کسی کو شانِ نزول قرار دیا کسی نے کسی دوسرے واقعہ کو مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، یہ مجموعۂ واقعات ہی اس آیت کا شانِ نزول ہے۔ واقعات یہ ہیں۔

(۱) امام بغویؒ نے حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے کہ دُنیا کی عرف عام اور اکثر لوگوں کی طبائع کا حال یہ ہے کہ لنگڑے لُولے اندھے اور بیمار آدمی کیساتھ بیٹھ کر کھانیسے گھِن کرتے ہیں اور ناپسند کرتے ہیں۔ حضرات صحابہ میں سے جو ایسے معذور تھے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہم کسی کیساتھ کھانے میں شریک ہونگے تو شاید اسکو تکلیف ہو اسلئے یہ لوگ تندرست آدمیوں کیساتھ کھانیمیں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ نیز نابینا آدمی کو یہ بھی فکر ہوئی کہ جب چند آدمی کھانیمیں شریک ہوں تو تقاضائے عدل و مروّت یہ ہے کہ کوئی شریک دوسرے سے زیادہ نہ کھائے سب کو برابر حصّہ ملے اور میں نابینا ہونے کی وجہ سے اسکا اندازہ نہیں کرسکتا ممکن ہے کہ میں دوسروں سے زیادہ کھالوں اسمیں دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔ لنگڑے آدمی نے خیال کیا کہ عام تندرست لوگوں کی طرح بیٹھ نہیں سکتا دو آدمی کی جگہ لیتا ہوں، کھانے پر دوسروں کیساتھ بیٹھونگا تو ممکن ہے اُنکو تنگی اور تکلیف پیش آئے، اُنکی اس غایت احتیاط میں ظاہر ہے کہ خود اُنکو تنگی اور تکلیف پیش آتی تھی اسلئے یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کو دوسروں کیساتھ مِلکر کھانے کی اجازت اور ایسی دقیق احتیاط کو چھوڑنے کی تلقین فرمائی جس سے تنگی میں پڑ جائیں۔ اور بغوی نے بروایت ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے جو واقعہ مذکورہ کا دوسرا رُخ ہے وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر۔ تو لوگوں کو اندھے، لنگڑے بیمار لوگوں کے ساتھ مِلکر کھانے میں یہ تردّد پیش آنے لگا کہ بیمار تو عادۃً کم کھاتا ہے، نابینا کو کھانے کی چیزوں میں یہ امتیاز نہیں ہوتا کہ کونسی چیز عمدہ ہے لنگڑے کو اپنی نشست ہموار نہ ہونے کے سبب کھانے میں تکلف ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ لوگ کم کھائیں ہمارے پاس زیادہ آجائے تو ان کی حق تلفی ہوئی کیونکہ مشترک کھانیمیں سبکا حصہ مساوی ہونا چاہیئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جسمیں اس تعمق اور تکلف میں پڑنے سے اُن کو آزاد کر دیا گیا کہ سب مِلکر کھاؤ معمولی کمی بیشی کی فکر نہ کرو۔ اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ مسلمان جب کسی جہاد و غزوہ کے لئے جاتے تو اپنے گھروں کی کنجیاں ان معذوروں کے سپرد کر دیتے تھے اور یہ کہدیتے تھے کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ تم لوگ کھاپی سکتے ہو۔ مگر یہ لوگ اس احتیاط کی بنا پر اُن کے گھروں میں سے کچھ نہ کھاتے کہ شاید اُن کی منشاء کیخلاف خرچ ہوجائے۔ اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔ مسند بزار میں بسند صحیح حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مضمون نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لیجاتے تو عام صحابہؓ کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ سب آپکی رفاقت میں شریکِ جہاد ہوں اور اپنے مکانوں کی کنجیاں ان غریب معذورین کے سپرد کر دیتے تھے اور اُن کو اجازت دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے آپ ہمارے گھروں میں جو کچھ ہے

کھاپی سکتے ہو مگر یہ لوگ غایت تقویٰ سے اس اندیشہ پر کہ شاید اُن کی یہ اجازت بطیبِ خاطر نہو اس سے پرہیز کرتے تھے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس رضؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں جو لفظ صدیقکم کا آیا ہے یعنی اپنے دوست کے گھر سے بھی کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ۔ یہ حارث بن عمروؓ کے واقعہ میں نازل ہوا کہ وہ کسی جہاد میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے اور اپنے دوست مالک بن زیدؓ کو اپنے گھر اور گھر والوں کی نگرانی سپرد کر دی، جب حارثؓ واپس آئے تو دیکھا کہ مالک بن زیدؓ بہت ضعیف کمزور ہو رہے ہیں وجہ دریافت کرنے پر اُنھوں نے کہا کہ میں نے آپکے گھر سے کچھ کھانا آپکے پیچھے مناسب نہیں سمجھا (یہ سب روایات تفسیر مظہری میں ہیں) اور صاف بات یہی ہے کہ اس قسم کے تمام واقعات اس آیت کے نزول کا سبب ہوئے ہیں۔

مسئلہ: جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جن گھروں میں سے بغیر اجازت خاص کے کھانے پینے کی اجازت اس آیت میں دی گئی ہے اسکی بنار اس پر ہے کہ عرب کی عام عادت کیمطابق ایسے قریبی رشتہ داروں میں کوئی تکلف بالکل نہ تھا ایک دوسرے کے گھر سے کچھ کھاتے پیتے تو گھر والے کو کسی قسم کی تکلیف یا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ اس سے خوش ہوتا تھا۔ اسی طرح اس سے بھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی معذور بیمار مسکین کو بھی کھلا دے۔ ان سب چیزوں کی گو صراحتًا اجازت نہ دی ہو مگر عادۃً اجازت تھی اس علّتِ جواز سے ثابت ہوا کہ جس زمانے یا جس مقام میں ایسا رواج نہو اور مالک کی اجازت مشکوک ہو وہاں بغیر صریح اجازت مالک کے کھانا پینا حرام ہے۔ جیساکہ آجکل عام طور پر نہ یہ عادت رہی نہ کوئی اسکو گوارہ کرتا ہے کہ کوئی عزیز قریب اُنکے گھر میں جو چاہے کھائے پیئے یا دوسروں کو کھلائے پلائے۔ اسلئے آجکل عام طور پر اس اجازت پر عمل کرنا جائز نہیں بجز اسکے کہ کسی دوست عزیز کے متعلق کسی کو یقینی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اسکے کھانے پینے یا دوسروں کو کھلانے پلانے سے کوئی تکلیف یا ناگواری محسوس نہ کریگا بلکہ خوش ہوگا تو خاص اسکے گھر سے کھانے پینے میں اس آیت کے مقتضیٰ پر عمل جائز ہے۔

مسئلہ: مذکورہ بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ حکم ابتدار اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا بلکہ حکم اوّل سے آج تک جاری ہے البتہ شرط اسکی مالک کی اجازت کا یقین ہے جب یہ نہو تو وہ مقتضائے آیت میں داخل ہی نہیں۔ (مظہری)

مسئلہ: اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ حکم صرف ان مخصوص رشتہ داروں ہی میں منحصر نہیں بلکہ دوسرے شخص کے بارے میں اگر یہ یقین ہو کہ اُسکی طرف سے ہمارے کھانے پینے اور کھلانے پلانے کی اجازت ہے وہ اس سے خوش ہوگا اسکو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی تو اسکا بھی یہی حکم ہے (مظہری)

احکامِ مذکورہ کا تعلق اُن کاموں سے ہے جو کسی کے گھر میں با جازت داخل ہونے کے بعد جائز یا مستحب ہیں ان کاموں میں بڑا مسئلہ کھانے پینے کا تھا اُس کو پہلے ذکر فرما دیا۔

دوسرا مسئلہ گھر میں داخل ہونے کے آداب کا یہ ہے کہ جب گھر میں باجازت داخل ہو تو گھر میں جو مسلمان ہوں اُن کو سلام کرو۔ آیت عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ سے یہی مُراد ہے کیونکہ مسلمان سب ایک جماعت متحدہ ہیں۔ احادیث کثیرہ صحیحہ میں مسلمان کے باہم ایک دوسرے کو سلام کرنے کی بڑی تاکید اور فضیلت آئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے ہیں اللہ پر اور اسکے رسُول پر اور جب ہوتے ہیں اسکے ساتھ کسی

جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ

جمع ہونے کے کام میں تو چلے نہیں جاتے جبتک اس سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں وہی ہیں

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ

جو مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسُول کو پھر جب اجازت مانگیں تجھ سے اپنے کسی کام کے لئے تو اجازت

لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا

دے جس کو ان میں سے تو چاہے اور معافی مانگ اُن کے واسطے اللہ سے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے مت

تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ

کر لو بُلانا رسُول کا اپنے اندر برابر اُسکے جو بُلاتا ہے تم میں ایک دوسرے کو اللہ جانتا ہے

الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ

اُن لوگوں کو تم میں سے جو سٹک جاتے ہیں آنکھ بچا کر سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں

عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ

اُسکے حکم کا اس سے کہ آ پڑے اُن پر کچھ خرابی یا پہنچے اُن کو عذاب دردناک سُنتے ہو

اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اُس کو معلوم ہے جس حال پر تم ہو

وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ

اور جس دن پھیرے جائیں گے اُس کی طرف تو بتائے گا اُن کو جو کچھ اُنھوں نے کیا، اور اللہ ہر ایک

شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

چیز کو جانتا ہے

ع ۹ ۳ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ پر اور اُسکے رسُول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسُول کے پاس

کسی ایسے کام پر جمع ہوتے ہیں جس کے لئے مجمع کیا گیا ہے (اور اتفاقاً وہاں سے کہیں جانے کی ضرورت پڑتی ہے) تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں (اور آپ اس پر اجازت نہ دیدیں مجلس سے اُٹھ کر) نہیں جاتے (اے پیغمبر) جو لوگ آپ سے (ایسے مواقع پر) اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان رکھتے ہیں (آگے ایسے لوگوں کو اجازت دینے کا بیان ہے) تو جب یہ (اہل ایمان) لوگ (ایسے مواقع پر) اپنے کسی کام کے لئے آپ سے (جانے کی) اجازت طلب کریں تو انمیں آپ جس کے لئے (مناسب سمجھیں اور اجازت دینا) چاہیں اجازت دیدیا کریں (اور جس کو مناسب نہ سمجھیں اجازت نہ دیں کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اجازت طلب کرنے والے اُس کام کو ضروری سمجھتے ہوں جس کے لئے اجازت طلب کر رہے ہیں اور وہ واقع میں ضروری نہ ہو یا ضروری بھی ہو مگر اسکے جانے سے اُس سے بڑا کوئی ضرر پیدا ہونیکا خطرہ ہو اسلئے اجازت و عدم اجازت کا فیصلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا) اور (اجازت دیکر بھی) آپ اُن کے لئے اللہ تعالےٰ سے مغفرت کی دُعا کیا کیجئے (کیونکہ اُن کا یہ رخصت چاہنا اگرچہ قوی عذر ہی کیوجہ سے ہو مگر اسمیں دُنیا کو دین پر مقدم رکھنے کی صورت تو لازم آتی ہے جسمیں ایک کوتاہی کا شائبہ ہے اسکے لئے آپ کی دُعاءِ مغفرت درکار ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اجازت چاہنے والے نے جس عذر و ضرورت کو قوی سمجھ کر اجازت لی ہے اُسمیں اُس سے خطاء اجتہادی ہوگئی ہو کہ غیر ضروری کو ضروری سمجھ لیا اور یہ خطاء اجتہادی ایسی ہو کہ ذرا غور و تأمل سے رفع ہوسکتی ہو تو ایسی صورتمیں غور و فکر کی کمی بھی ایک کوتاہی ہے اس سے استغفار کی ضرورت ہوئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (چونکہ اُن کی نیت اچھی تھی اسلئے ایسے دقائق پر مواخذہ نہیں فرماتا) تم لوگ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بُلانے کو (جب وہ کسی اسلامی ضرورت کے لئے تمکو جمع کریں) ایسا (معمولی بُلانا) مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلالیتا ہے (کہ چاہے آیا یا نہ آیا پھر آکر بھی جب تک چاہا بیٹھا جب چاہا اُٹھ کر بے اجازت چلدیا۔ رسول کا بُلانا ایسا نہیں بلکہ اُنکے اس حکم کی تعمیل واجب ہے اور بے اجازت واپس جانا حرام اور اگر کوئی بلا اجازت چلا گیا تو یہ تو ممکن ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اُسکا جانا مخفی رہ جاوے لیکن یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسرے کی) آڑ میں ہو کر تم میں سے (مجلس نبوی سے) کھسک جاتے ہیں تو جو لوگ اللہ کے حکم کی (جو بواسطہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم پہنچا ہی) مخالفت کرتے ہیں اُن کو اس سے ڈرنا چاہیئے کہ ان پر (دُنیا میں) کوئی آفت آن پڑے یا اُن پر (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب نازل ہو جاوے (اور یہ بھی ممکن ہو کہ دُنیا و آخرت دونوں میں عذاب ہو اور یہ بھی) یاد رکھو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اللہ تعالےٰ اُس حالت کو بھی جانتا ہے جس پر تم (اب) ہو اور اُس دن کو بھی جس میں سب اُسکے پاس (دوبارہ زندہ کر کے)

لائے جاویں گے تو وہ اُن کو سب جتلا دیگا جو کچھ اُنھوں نے کیا تھا (اور تمھاری موجودہ حالت اور روزِ قیامت ہی کی کچھ تخصیص نہیں) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے خصوصاً اور عام معاشرت کے بعض آداب و احکام

آیاتِ مذکورہ میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کسی دینی جہاد وغیرہ کے لئے جمع کریں تو مقتضائے ایمان یہ ہے کہ سب جمع ہو جاویں اور پھر آپ کی مجلس سے بغیر آپ کی اجازت کے نہ جائیں۔ کوئی ضرورت پیش آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرلیں اور اسمیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہے کہ کوئی خاص حرج اور ضرورت نہ ہو تو اجازت دیدیا کریں۔ اسی ضمن میں اُن منافقین کی مذمت ہے جو اس تقاضائے ایمان کے خلاف بدنامی سے بچنے کے لئے حاضر تو ہو جاتے ہیں مگر پھر کسی کی آڑ لیکر چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

یہ آیت غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مشرکین عرب اور دوسری جماعتوں کے متحدہ محاذ نے یکبارگی مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ صحابہ اُن کے حملے سے بچاؤ کیلئے خندق کھودی تھی اسی لئے اس جہاد کو غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے یہ غزوہ شوال ۵ھ ہجری میں ہوا ہے (قرطبی) بیہقی اور ابنِ اسحاق کی روایت میں ہے کہ اسوقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اور تمام صحابہ خندق کھودنے میں مصروفِ کار تھے مگر منافقین اول تو آنے میں سستی کرتے اور پھر آکر بھی معمولی سا کام دکھانے کو کرلیتے اور پھر چپکے سے غائب ہو جاتے تھے اسکے خلاف مؤمنین سب کے سب محنت کیساتھ لگے رہتے اور کوئی مجبوری اور ضرورت پیش آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیکر جاتے تھے اسپر یہ آیت نازل ہوئی (مظہری)

ایک سوال و جواب اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے بغیر آپکی اجازت کے چلا جانا حرام ہے حالانکہ صحابۂ کرام کے بیشمار واقعات ہیں جنہیں وہ آپکی مجلس میں ہوتے اور پھر جب چاہتے چلے جاتے تھے اجازت لینا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ جواب یہ ہے کہ یہ عام مجلسوں کا حکم نہیں بلکہ اسوقت کا ہے جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو کسی ضرورت سے جمع کیا ہو جیسا کہ واقعہ خندق میں ہوا تھا۔ اس تخصیص کیطرف خود آیت کے لفظ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ میں اشارہ موجود ہے۔

امرِ جامع سے کیا مُراد ہے اسمیں اقوال مختلف ہیں مگر واضح بات یہ ہے کہ اَمْرٍ جَامِعٍ سے مراد وہ کام ہے جس کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو جمع کرنا ضروری سمجھیں اور کسی خاص کام کے لئے جمع فرمادیں جیسے غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کا کام تھا (قرطبی۔ مظہری)

یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص ہے یا عام باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی اور اسلامی ضرورت کے لئے جاری کیا گیا ہے اور ایسی ضرورتیں ہر زمانے میں ہو سکتی ہیں اسلئے آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر امام و امیر جس کے قبضہ میں زمام حکومت ہو اُسکا اور اسکی ایسی مجلس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونیکا حکم دیں تو اسکی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے (قرطبی، مظہری۔ بیان القرآن) اور یہ ظاہر ہے کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے لئے یہ حکم زیادہ مؤکد اور اسکی مخالفت کھلی شقاوت ہے جیسے منافقین سے صادر ہوئی۔ اور اسلامی آداب معاشرت کے لحاظ سے یہ حکم باہمی اجتماعات اور عام مجلسوں کے لئے بھی کم از کم مستحب اور مستحسن ضرور ہے کہ جب مسلمان کسی مجلس میں کسی اجتماعی معاملہ میں غور کرنے یا عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں تو جب جانا ہو میر مجلس سے اجازت لیکر جائیں۔

دوسرا حکم آخری آیت میں یہ دیا گیا ہے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ الآیۃ اسکی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں بیان کی گئی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو بلانا ہے (جو نحوی قاعدہ سے اضافت الی الفاعل ہے) اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو بلائیں تو اسکو عام لوگوں کے بلانے کیطرح نہ سمجھو کہ اسمیں آنے نہ آنیکا اختیار رہتا ہے بلکہ اسوقت آنا فرض ہو جاتا ہے اور بغیر اجازت جانا حرام ہو جاتا ہے۔ آیت کے سیاق و سباق سے یہ تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی ہے اسی لئے مظہری اور بیان القرآن میں اسکو اختیار کیا ہے۔ اور اس کی ایک دوسری تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ابن کثیر اور قرطبی وغیرہ نے یہ نقل کی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد لوگوں کا رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی کام کے لئے پکارنا اور بلانا ہے (جو نحوی ترکیب میں اضافت الی المفعول ہوگی)۔

اس تفسیر کی بنا پر معنی آیت کے یہ ہونگے کہ جب تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے بلاؤ یا مخاطب کرو تو عام لوگوں کی طرح آپکا نام لیکر یا محمدؐ نہ کہو کہ بے ادبی ہے بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ وغیرہ کہا کرو۔ اسکا حاصل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کا مسلمانوں پر واجب ہونا اور ہر ایسی چیز سے بچنا ہے جو ادب کے خلاف ہو یا جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے۔ یہ حکم ایسا ہوگا جیسے سورۂ حجرات میں اسی طرح کے کئی حکم دیئے گئے ہیں مثلاً لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بات کرو تو ادب کی رعایت رکھو، ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سے باتیں نہ کرو جیسے لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور مثلاً یہ کہ جب آپ گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر سے آواز دیکر نہ بلاؤ بلکہ آپکے باہر تشریف لانیکا انتظار کرو اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ میں اسی کا بیان ہے۔

تنبیہ اس دوسری تفسیر میں ایک عام ادب بزرگوں اور بڑوں کا بھی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں بڑوں کو اُن کا نام لے کر پکارنا اور بلانا بے ادبی ہے تعظیمی لقب سے مخاطب کرنا چاہیئے۔

سُورَۃُ الفُرقَان

سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ سَبْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰیَۃً وَّسِتُّ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱

بڑی برکت ہے اُسکی جس نے اُتاری فیصلہ کی کتاب اپنے بندہ پر تاکہ رہے جہان والوں کے لئے ڈرانے والا

نِ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ

وہ کہ جس کی ہے سلطنت آسمان اور زمین میں اور نہیں پکڑا اُس نے بیٹا اور نہیں

یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا ۝۲

کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں اور بنائی ہر چیز پھر ٹھیک کیا اُس کو ماپ کر

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ

اور لوگوں نے پکڑ رکھے ہیں اس سے ورے کتنے حاکم جو نہیں بناتے کچھ چیز اور وہ خود بنائے گئے ہیں

وَلَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا

اور نہیں مالک اپنے حق میں بُرے کے اور نہ بھلے کے اور نہیں مالک مرنے کے

وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳

اور نہ جینے کے اور نہ جی اُٹھنے کے

خلاصۂ تفسیر

بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے خاص بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام دُنیا جہان والوں کے لئے (ایمان نہ لانے کی صورت میں عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والا ہو، ایسی ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت حاصل ہے اور اس نے کسی کو (اپنی) اولاد

قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اُسکا شریک ہے حکومت میں اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا (کہ کسی چیز کے آثار و خواص کچھ ہیں کسی کے کچھ ہیں) اور ان مشرکین نے خدا کو چھوڑ کر ادر ایسے معبود قرار دے لئے ہیں جو (کسی طرح معبود ہونے کے قابل نہیں کیونکہ وہ) کسی چیز کے خالق نہیں اور بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور خود اپنے لئے نہ کسی نقصان (کے رفع کرنے) کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور نہ کسی کے مرنے کا اختیار رکھتے ہیں (کہ کسی جاندار کی جان نکال سکیں) اور نہ کسی کے جینے کا (اختیار رکھتے ہیں کہ کسی بے جان میں جان ڈال دیں) اور نہ کسی کو (قیامت میں) دوبارہ زندہ کرنیکا (اختیار رکھتے ہیں۔ اور جو شخص ان چیزوں پر قدرت نہیں رکھتا وہ معبود نہیں ہو سکتا)

معارف و مسائل

خصوصیات سُورت | یہ پوری سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ و قتادہ نے تین آیتوں کے متعلق بیان فرمایا کہ یہ مکی نہیں، مدنی ہیں۔ باقی سورت مکی ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور اسمیں کچھ آیات مکی ہیں (قرطبی) اور خلاصہ اس سورت کے مضامین کا قرآنِ کریم کی عظمت اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی حقانیت کا بیان اور دشمنوں کیطرف سے اسپر جو اعتراضات تھے اُن کا جواب ہے۔

تَبٰرَكَ، برکت سے مشتق ہے۔ برکت کے معنے خیر کی کثرت کے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر خیر و برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ فرقان، قرآن کریم کا لقب ہے لغوی معنے اسکے تمیز اور فرق کرنے کے ہیں۔ قرآن چونکہ اپنے واضح ارشادات کے ذریعہ حق و باطل میں تمیز اور فرق بتلاتا ہے اور معجزہ کے ذریعہ اہلِ حق و اہلِ باطل میں امتیاز کر دیتا ہے اسلئے اس کو فرقان کہا جاتا ہے۔

لِلْعٰلَمِيْنَ، اس سے ثابت ہوا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت سارے عالم کیلئے ہے بخلاف پچھلے انبیاء کے کہ اُن کی نبوت و رسالت کسی مخصوص جماعت یا مخصوص مقام کے لئے ہوتی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے چھ خصوصی فضائل کا ذکر فرمایا ہے اُنہیں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت سارے جہان کے لئے عام ہے۔

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا، تخلیق کے بعد تقدیر کا ذکر فرمایا گیا۔ تخلیق کے معنی تو اتنے ہیں کہ بغیر کسی سابق مادہ وغیرہ کے ایک چیز کو عدم سے وجود میں لایا جائے وہ کیسی بھی ہو۔

مخلوقات میں سے ہر ایک چیز میں خاص خاص حکمتیں | اور تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اسکے اجزاء کی ساخت اور شکل و صورت اور آثار و خواص بڑی حکمت کیساتھ اُس کام کے مناسب پیدا کئے جس کام کے لئے اس چیز کو پیدا کیا گیا ہے آسمان کی ساخت اُسکے اجزاء ترکیبی اُنکی

ہیئت اُس کام کے مناسب ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان بنایا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی تخلیق میں وہ چیزیں رکھی گئیں جو اُن کے منشاء وجود کے مناسب ہیں۔ زمین اور اسکے پیٹ میں پیدا ہونیوالی ہر چیز جس پر نظر ڈالو ہر ایک کی ساخت، شکل و صورت، نرمی سختی اُس کام کے مناسب بنائی گئی ہے جس کام کے لئے قدرت نے اسکو پیدا کیا ہے۔ زمین کو نہ اتنا رقیق مادہ پانی کی طرح بنایا کہ جو کچھ اُس پر رکھا جائے وہ اسکے اندر ڈوب جائے، نہ اتنا سخت پتھر اور لوہے کی طرح بنایا کہ اسکو کھود نہ سکیں کیونکہ اُس سے یہی ضرورتیں متعلق تھیں کہ اسکو کھود کر پانی بھی نکالا جاسکے۔ اِس میں بنیادیں کھود کر بڑی اُونچی عمارتیں اِس پر کھڑی کی جاسکیں۔ پانی کو سیّال بنایا جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں، ہوا بھی سیّال ہی ہے مگر پانی سے مختلف، پانی ہر جگہ خود بخود نہیں پہنچتا اُسمیں انسان کو کچھ محنت بھی کرنا پڑتی ہے ہوا کو قدرت نے اپنا جبری انعام بنایا کہ وہ بغیر کسی محنت و عمل کے ہر جگہ پہنچ جاتی ہے بلکہ کوئی شخص ہوا سے بچنا چاہے تو اُس کو اسکے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ جگہ مخلوقاتِ الٰہیہ کی حکمتوں کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں۔ ایک ایک مخلوق کو دیکھو انمیں سے ہر ایک قدرت و حکمت کا شاہکار ہے۔ امام غزالی رحہ نے اپنی ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے بنام الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ۔

ان آیات میں شروع ہی سے قرآن کی عظمت اور جس ذاتِ گرامی پر وہ نازل ہوا ہے اُس کو عبدکا کا خطاب دیکر اُس کی عزت و عظمت کا عجیب و غریب بیان ہے۔ کیونکہ کسی مخلوق کے لئے اس سے بڑا کوئی شرف نہیں ہو سکتا کہ خالق اُسکو یہ کہدے کہ یہ میرا ہے ؎

بندہ حسن بصد زباں گفت کہ بندۂ توام ٭ تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ

اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں ہے یہ مگر طوفان باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے

عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ڔ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ۚ وَقَالُوْٓا

اُسکا اس میں اور لوگوں نے سو آ گئے بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵

یہ نقلیں ہیں پہلوں کی جن کو اُس نے لکھ رکھا ہے سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اسکے پاس صبح اور شام

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

تو کہہ اسکو اُتارا ہے اُسنے جو جانتا ہے چھپے ہوئے بھید آسمانوں میں اور زمین میں بیشک وہ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ

بخشنے والا مہربان ہے اور کہنے لگے یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا

مغ عند المتأخرين

وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ﴿٧﴾

اور پھرتا ہے بازاروں میں کیوں نہ اُترا اس کی طرف کوئی فرشتہ کہ رہتا اس کے ساتھ ڈرانے کو

أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ

یا آپڑتا اس کے پاس خزانہ یا ہو جاتا اسکے لئے ایک باغ کہ کھایا کرتا اسمیں سے، اور کہنے لگے بے انصاف

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا ﴿٨﴾ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ

تم پیروی کرتے ہو اس ایک مرد جادو مارے کی دیکھ کیسی بٹھلاتے ہیں تجھ پر

الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿٩﴾

مثلیں سو بہک گئے اب پا نہیں سکتے راستہ

ع ۱/۹ ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ (قرآن کے بارے میں) یُوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں نرا جھوٹ (ہی جھوٹ) ہے جس کو اس شخص (یعنی پیغمبر) نے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس (گھڑت) میں اس کی مدد کی ہے (مُراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو مسلمان ہوگئے تھے یا آپ کی خدمت میں ویسے ہی حاضر ہوا کرتے تھے) سو (ایسی بات کہنے سے) یہ لوگ بڑے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (اسکا ظلم اور جھُوٹ ہونا آگے بیان میں آئے گا) اور یہ (کافر) لوگ (اپنے اسی اعتراض کی تائید میں) یُوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) بے سند باتیں ہیں جو اگلے لوگوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں جن کو اس شخص (پیغمبر) نے (عمدہ عبارت میں سوچ سوچ کر اپنے صحابہ کے ہاتھ سے) لکھوا لیا ہے (تاکہ محفوظ رہے) پھر وہی (مضامین) اس کو صبح شام پڑھ کر سُنائے جاتے ہیں (تاکہ یاد رہیں، پھر وہی یاد کئے ہوئے مضامین مجمع میں بیان کرکے خدا کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں) آپ (اسکے جواب میں) کہدیجئے کہ اس (قرآن) کو تو اُس ذات (پاک) نے اُتارا ہے جس کو سب چھپی باتوں کی خواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں ہوں خبر ہے (خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ اس کلام کا اعجاز اس کی کھُلی دلیل ہے کہ کفار کا یہ اعتراض غلط اور جھوٹ اور ظلم ہے کیونکہ اگر قرآن اساطیر الاولین، یعنی پُرانے لوگوں کی کہانیاں ہوتا یا کسی دوسرے کی مدد سے تصنیف کیا گیا ہوتا تو ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز کیوں ہوتی) واقعی اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (اس لئے ایسے ایسے جھوٹ اور ظلم پر فوری سزا نہیں دیتا)۔

اور یہ کافر لوگ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ اس رسُول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا (بھی) کھاتا ہے اور (انتظامِ معاش کے لئے ہماری ہی طرح) بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ رسول و پیغمبر انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہیئے جو کھانے

پینے وغیرہ کی ضروریات سے مستغنی ہو اور کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیئے کہ رسُول اگر خود فرشتہ نہیں ہے تو اسکا مصاحب مشیر کوئی فرشتہ ہونا چاہیئے اسلئے کہا کہ) اس (رسُول) کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اسکے ساتھ رہ کر (لوگوں کو عذابِ الٰہی سے) ڈراتا (اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم رسُول کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات سے تو بےفکری ہوتی اس طرح) کہ اسکے پاس (غیب سے) کوئی خزانہ آپڑتا یا اسکے پاس کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھایا پیا کرتا۔ اور (مسلمانوں سے) یہ ظالم یوں (بھی) کہتے ہیں کہ (جب انکے پاس نہ کوئی فرشتہ ہے نہ خزانہ نہ باغ، اور پھر بھی یہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل میں فتور ہے اسلئے) تم لوگ ایک مسلوب العقل آدمی کی راہ پر چل رہے ہو۔ (اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسی عجیب عجیب باتیں بیان کر رہے ہیں سو (ان خرافات سے) وہ (بالکل) گمراہ ہوگئے پھر وہ راہ نہیں پاسکتے۔

معارف و مسائل

کفار و مشرکین جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن پر اعتراضات کیا کرتے تھے یہاں سے ان کے اعتراضات اور پھر جوابات کا سلسلہ شروع ہو کر کچھ دُور تک چلا ہے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ قرآن کوئی اللہ کیطرف سے نازل کیا ہوا کلام نہیں بلکہ آپ نے اس کو خود ہی جھوٹ گھڑ لیا ہے یا پچھلے لوگوں کے قصے یہود و نصاریٰ وغیرہ سے سُن کر اپنے صحابہؓ سے لکھوا لیتے ہیں اور چونکہ خود اُمّی ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا اسلئے ان لکھے ہوئے قصوں کو صبح شام سُنتے رہتے ہیں تاکہ وہ یاد ہو جاویں پھر لوگوں کے سامنے جاکر یہ کہدیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

اس اعتراض کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ کلام خود اسکا شاہد ہے کہ اس کی نازل کرنیوالی وہ ذات پاک حق تعالےٰ کی ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب خفیہ رازوں سے واقف و باخبر ہے۔ اسی لئے قرآن کو ایک کلام معجز بنایا اور ساری دُنیا کو چیلنج کیا کہ اگر اسکو تم خدا کا کلام نہیں مانتے کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک سورۃ بلکہ ایک آیت ہی بنا کر دکھلادو۔ اور یہ چیلنج جسکا جواب دینا عرب کے فصیح و بلیغ لوگوں کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں مگر اُنھوں نے اس سے اعراض اختیار کی۔ کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ قرآن کی ایک آیت کے مقابلہ میں اُس جیسی دوسری آیت لکھ لائے۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنا مال و متاع بلکہ اپنی اولاد اور اپنی جان تک خرچ کرنے کو تیار ہوگئے۔ یہ مختصر سی بات نہ کرسکے کہ قرآن کی مثل ایک سورت لکھ لاتے

یہ دلیل واضح اس امر کی ہے کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں، ورنہ دوسرے انسان بھی ایسا کلام لکھ سکتے، صرف اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہی کا ہے۔ علاوہ فصاحت و بلاغت کے اسکے تمام معانی و مضامین بھی ایسے علوم پر مشتمل ہیں جو اُس ذات کی طرف سے ہو سکتے ہیں جو ہر ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے (اس مضمون کی پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں اعجاز قرآن پر مکمل بحث کی صورت میں بیان ہو چکی ہے اس کو معارف القرآن جلد اوّل میں دیکھ سکتے ہیں)۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ رسول ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں بلکہ فرشتوں کی طرح کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی اور الگ ہوتے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم انکے پاس اللہ کیطرف سے اتنا خزانہ یا باغات ہوتے کہ ان کو اپنے معاش کی فکر نہ کرنا پڑتی، بازاروں میں چلنا پھرنا نہ پڑتا۔ اس کے علاوہ ان کا اللہ کیطرف سے رسول ہونا ہم کیسے مان لیں کہ اوّل تو یہ فرشتہ نہیں، دوسرے کوئی فرشتہ بھی انکے ساتھ نہیں رہتا جو انکے ساتھ اُن کے کلام کی تصدیق کیا کرتا، اسلئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس سے ان کا دماغ چل گیا اور یہ ایسی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ اسکا اجمالی جواب تو اس آیت میں دیا گیا، اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا، یعنی دیکھو تو یہ لوگ آپ کی شان میں کیسی کیسی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب گمراہ ہو گئے اور اب ان کو راہ ملنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ تفصیلی جواب اگلی آیات میں آیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

بڑی برکت ہے اُس کی جو چاہے تو کر دے تیرے واسطے اس سے بہتر باغ کہ نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑩ بَلْ كَذَّبُوْا

بہتی ہیں اُن کے نہریں اور کر دے تیرے واسطے محل کچھ نہیں وہ جھٹلاتے ہیں

بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ⑪ اِذَا رَاَتْهُمْ

قیامت کو اور ہم نے تیار کی ہے اسکے واسطے کہ جھٹلاتا ہے قیامت کو آگ، جب وہ دیکھے گی انکو

مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ⑫ وَاِذَآ اُلْقُوْا

دُور کی جگہ سے سُنیں گے اس کا جھنجھلانا اور چلّانا اور جب ڈالے جائیں گے

مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ⑬ لَا تَدْعُوا

اسکے اندر ایک جگہ تنگ میں ایک زنجیر میں کئی کئی بندھے ہوئے پکاریں گے اُس جگہ موت کو مت پکارو

الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ⑭ قُلْ اَذٰلِكَ

آج ایک مرنے کو اور پکارو بہت سے مرنے کو تو کہہ بھلا یہ چیز

خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّ

بہتر ہے یا باغ ہمیشہ رہنے کا جس کا وعدہ ہو چکا پرہیزگاروں سے وہ ہوگا ان کا بدلہ اور پھر جانے

مَصِيْرًا ۝۱۵ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا

کی جگہ اُن کے واسطے وہاں ہے جو وہ چاہیں رہا کریں ہمیشہ ہو چکا تیرے رب کے ذمہ وعدہ

مَّسْــُٔوْلًا ۝۱۶ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ

مانگا ملتا اور جس دن جمع کر بلائے گا اُن کو اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے پھر اُن سے کہے گا

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝۱۷ قَالُوْا

کیا تم نے بہکایا میرے ان بندوں کو یا وہ آپ بہکے راہ سے بولیں گے

سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ

تو پاک ہے ہم سے بن نہ آتا تھا کہ پکڑیں کسی کو تیرے بغیر

اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰي نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا

رفیق لیکن تو اُن کو فائدہ پہنچاتا رہا اور ان کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بھلا بیٹھے تیری یاد اور

قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۸ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ

یہ تھے لوگ تباہ ہونے والے، سو وہ تو جھٹلا چکے تم کو تمہاری بات میں اب نہ تم لوٹا سکتے ہو

صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ۝۱۹

اور نہ مدد کر سکتے ہو اور جو کوئی تم میں گنہگار ہے اُس کو ہم چکھائیں گے بڑا عذاب

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے رسول سب کھاتے تھے کھانا

الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ

اور پھرتے تھے بازاروں میں اور ہم نے رکھا ہے تم میں ایک دوسرے کے

فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝۲۰ ع

جانچنے کو، دیکھیں ثابت بھی رہتے ہو اور تیرا رب سب کچھ دیکھتا ہے

ع ۲ / ۱۱ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

وہ ذات بڑی عالی شان ہے کہ اگر وہ چاہے تو آپ کو (کفار کی) اس (فرمائش) سے (بھی) اچھی چیز دیدے یعنی بہت سے (غیبی) باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں (بہتر اس لئے کہا کہ وہ تو مطلق باغ کی فرمائش کرتے تھے گو ایک ہی ہو اور متعدد باغ کا ایک سے بہتر ہونا ظاہر ہے) اور

(بلکہ ان باغوں کیساتھ اور بھی مناسب چیزیں دیدے جن کی انھوں نے فرمائش بھی نہیں کی یعنی) آپ کو بہت سے محل دیدے (جو ان باغوں میں بنے ہوں یا باہر ہی ہوں جس سے اُن کی فرمائش اور بھی زیادہ نعمتوں کیساتھ پوری ہوجاوے۔ مطلب یہ کہ جو جنّت میں ملے گا اگر اللہ چاہے تو آپ کو دُنیا ہی میں دیدے لیکن بعض حکمتوں سے نہیں چاہا اور فی نفسہٖ ضروری تھا نہیں پس شبہ محض بیہودہ ہے ان کفار کے ان شبہاتِ مذکورہ کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کو حق کی طلب اور فکر ہوئی ہے اور اس دَوران میں قبل تحقیق ایسے شبہات واقع ہوگئے ہوں بلکہ وجہ اعتراضات کی محض شرارت اور طلبِ حق سے بیفکری ہے اور اس بیفکری اور شرارت کا سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ قیامت کو جھوٹ سمجھ رہے ہیں (اس لئے فکرِ انجام نہیں ہے اور جو جی میں آتا ہے کر لیتے ہیں بک دیتے ہیں) اور (انجام اسکا یہ ہوگا کہ) ہم نے ایسے شخص (کی سزا) کے لئے جو کہ قیامت کو جھوٹا سمجھے دوزخ تیار کر رکھی ہے (کیونکہ قیامت کی تکذیب سے اللہ و رسول کی تکذیب لازم آتی ہے جو اصل سبب ہے دوزخ میں جانیکا اور اس دوزخ کی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (دوزخ) ان کو دُور سے دیکھے گی تو (دیکھتے ہی غضبناک ہوکر اسقدر جوش مارے گی کہ) وہ لوگ (دُور ہی سے) اسکا جوش و خروش سُنیں گے اور (پھر) جب وہ اس (دوزخ) کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈالدیئے جاویں گے تو وہاں موت ہی موت پکاریں گے (جیسا مصیبت میں عادت ہے کہ موت کو بُلاتے اور اسکی تمنّا کرتے ہیں اسوقت ان سے کہا جاویگا کہ) ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو (کیونکہ موت کے پکارنے کی علت مصیبت ہے اور تمھاری مصیبت غیر متناہی ہے اور ہر مصیبت کا مقتضا موت کا پکارنا ہے تو پکارنا بھی کثیر ہوا اور اسی کی کثرت کو موت کی کثرت کہا گیا) آپ (ان کو یہ مصیبت سُنا کر) کہیئے کہ (یہ بتلاؤ کہ) کیا یہ (مصیبت کی) حالت اچھی ہے (جو کہ مقتضیٰ ہے تمھارے کفر و انکار کا) یا وہ ہمیشہ کے رہنے کی جنّت (اچھی ہے) جسکا خدا سے ڈرنے والوں سے (یعنی اہلِ ایمان سے) وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لئے (ان کی اطاعت کا) صلہ ہے اور ان کا (آخری) ٹھکانا (اور) ان کو وہاں وہ سب چیزیں ملیں گی جو کچھ وہ چاہیں گے (اور) وہ (اسمیں) ہمیشہ رہیں گے (اے پیغمبر) یہ ایک وعدہ ہے جو (بطور فضل و عنایت کے) آپ کے رب کے ذمّہ ہے اور قابلِ درخواست ہے (اور ظاہر ہے کہ جنت الخلد ہی بہتر ہے سو اسمیں ترہیب کے بعد ترغیب ایمان کی ہوگئی) اور (وہ دن ان کو یاد دلائیے کہ) جس روز اللہ تعالیٰ ان (کافر) لوگوں کو اور جن کو وہ لوگ خدا کے سوا پُوجتے تھے (جنہوں نے اپنے اختیار سے کسی کو گمراہ نہیں کیا خواہ صرف بُت مراد ہوں یا ملائکہ وغیرہم بھی) ان (سب) کو جمع کریگا پھر (ان معبودین سے ان عابدین کی رُسوائی کے لئے) فرماویگا کیا تم نے میرے ان بندوں کو (راہِ حق سے) گمراہ کیا تھا یا یہ (خود ہی) راہ (حق) سے گمراہ ہوگئے تھے (مطلب یہ کہ

اُنھوں نے تمھاری عبادت جو واقع میں گمراہی ہے تمھارے امر و رضا سے کی تھی جیسا ان لوگوں کا زعم تھا کہ یہ معبودین ہماری اس عبادت سے خوش ہوتے ہیں اور خوش ہو کر اللہ تعالیٰ سے شفاعت کریں گے یا اپنی رائے فاسد سے اختراع کرلی تھی) وہ (معبودین) عرض کریں گے کہ معاذاللہ ہماری کیا مجال تھی کہ ہم آپکے سوا اور کارسازوں کو (اپنے اعتقاد میں) تجویز کریں (عام اس سے کہ وہ کارساز ہم ہوں یا ہمارے سوا اور کوئی ہو۔ مطلب یہ کہ جب خدائی کو آپ میں منحصر سمجھتے ہیں تو ہم شرک کرنے کا ان کو امر یا اس پر رضامندی کیوں ظاہر کرتے) ولیکن (یہ خود ہی گمراہ ہوئے اور گمراہ بھی ایسے نامعقول طور پر ہوئے کہ اسباب شکر کو اُنھوں نے اسباب کفر بنایا چنانچہ) آپ نے (تو) ان کو اور ان کے بڑوں کو (خوب) آسودگی دی (جسکا مقتضیٰ یہ تھا کہ نعمت دینے والے کو پہچانتے اور اس کا شکر و اطاعت کرتے مگر یہ لوگ) یہاں تک (شہوات و تلذذات میں منہمک ہوئے) کہ (آپ کی) یاد (ہی) کو بُھلا بیٹھے اور یہ لوگ خود ہی برباد ہوئے (مطلب جواب کا ظاہر ہے کہ دونوں شقوں میں سے اس شق کو اختیار کیا کہ یہ خود ہی گمراہ ہوئے ہم نے نہیں کیا۔ اور اُن کی گمراہی کو اللہ کی بڑی نعمتیں ان پر مبذول ہونیکا ذکر کرکے۔ اور زیادہ واضح کردیا۔ اسوقت اللہ تعالیٰ ان عابدین کو لاجواب کرنے کے لئے جو اصل مقصود تھا سوال مذکور سے یہ فرمادیگا) تو تمھارے ان معبودوں نے تو تم کو تمھاری (سب) باتوں میں جھوٹا (ہی) ٹھہرادیا (اور انھوں نے بھی تمھارا ساتھ نہ دیا اور جُرم پُورے طور پر قائم ہوگیا) سو (اب) تم نہ تو خود (عذاب کو اپنے اوپر سے) ٹال سکتے ہو اور نہ (کسی دوسرے کیطرف سے) مدد دیئے جاسکتے ہو (حتیٰ کہ جن پر پورا بھروسہ تھا وہ بھی صاف جواب دے رہے ہیں اور تمھاری صریح مخالفت کر رہے ہیں) اور جو (جو) تم میں ظالم (یعنی مشرک) ہوگا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے (اور گو اسوقت مخاطبین سب مشرک ہی ہونگے مگر اس طرح فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ ظلم کا مقتضیٰ عذاب ہونا بیان فرمانا مقصود ہے) اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے (مطلب یہ کہ نبوت و اکلِ طعام وغیرہ میں تنافی نہیں چنانچہ جن کی نبوت دلائل سے ثابت ہے گو معترضین اعتراف نہ کریں، ان سب سے اسکا صدور ہوا ہے پس آپ پر بھی یہ اعتراض غلط ہے) اور (اے پیغمبر اور اے تابعین پیغمبران کفار کے ایسے بیہودہ اقوال سے غمگین مت ہو کیونکہ) ہم نے تم (مجموعہ مکلفین) میں ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے (پس اسی عادت مستمرہ کے موافق انبیاء کو ایسی حالت پر بنایا کہ اُمت کی آزمائش ہو کہ کون انکے حالاتِ بشریہ پر نظر کرکے تکذیب کرتا ہے اور کون اُن کے کمالاتِ نبوت پر نظر کرکے تصدیق کرتا ہے سو جب یہ بات معلوم ہوگئی تو) کیا تم (اب بھی) صبر کروگے (یعنی صبر کرنا چاہیئے) اور (یہ بات یقینی ہے کہ) آپ کا رب خوب دیکھ رہا ہے (تو وقت موعود پر ان کو

سزا دے گا، پھر آپ کیوں ہم و غم میں واقع ہوں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کی طرف سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جو شبہات پیش کئے گئے تھے اور وہاں اُن کا اجمالی جواب دیا گیا تھا ان آیات میں اس کی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حقیقت شناسی سے دُوری کی وجہ سے ایک بات یہ کہی ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے تو اُن کے پاس بہت دولت کے خزانے ہوتے بہت بڑی جائیداد اور باغات ہوتے تاکہ یہ کسبِ معاش سے مستغنی رہتے اسکا جواب یہ دیا گیا کہ ایسا کر دینا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں کہ اپنے رسُول کو دولت کے خزانے دیدیں، بلکہ بڑی سے بڑی حکومت و سلطنت کا مالک بنا دیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو ایسی دولت اور پُوری دُنیا پر بے مثال حکومت عطا فرما کر اپنی اس قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے۔ مگر عامہ خلق کی مصلحت اور بیشمار حکمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ گروہِ انبیاء کو مادّی اور دنیوی مال و دولت سے الگ ہی رکھا جائے۔ خصوصاً سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے حق تعالیٰ کو یہی پسند ہوا کہ وہ عام غریب مسلمانوں کی صفوف میں اور اُنہی جیسے حالات میں رہیں اور خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے اسی حالت کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ مُسند احمد اور ترمذی میں حضرت ابو اُمامہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کے لئے پورے بطحار مکہ اور اسکے پہاڑوں کو سونا بنا دیتا ہوں، تو میں نے عرض کیا نہیں، اے میرے پروردگار مجھے تو یہ پسند ہے کہ مجھے ایک روز پیٹ بھرائی کھانا ملے (جس پر اللہ کا شکر ادا کروں) اور ایک روز بھوکا رہوں (اس پر صبر کروں) اور حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ پھرا کرتے (مظہری)

خلاصہ اسکا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا عام طور پر فقر و فاقہ میں رہنا اللہ تعالیٰ کی ہزاروں حکمتوں اور عام انسانوں کی مصالح کی بناء پر ہے اور اسمیں بھی وہ اس حالت پر مجبور نہیں ہوتے اگر وہ چاہیں تو اللہ تعالےٰ اُن کو بڑا مالدار صاحبِ جائیداد بنا سکتے ہیں مگر اُن کی ذات کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہی کہ وہ مال و دولت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے، فقر و فاقہ ہی کو پسند کرتے ہیں۔

دوسری بات کفار نے یہ کہی تھی کہ یہ پیغمبر ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں، اور کسبِ معاش کے لئے بازاروں میں نہ پھرتے اس اعتراض کی بنیاد بہت سے کفار کا یہ خیال ہے کہ اللہ کا رسُول انسان نہیں ہو سکتا، فرشتہ ہی رسُول ہو سکتا ہے۔ جسکا جواب قرآن کریم میں جا بجا آیا ہے

اور یہاں اسکا یہ جواب دیا گیا کہ جن انبیاء کو تم بھی نبی و رسول مانتے ہو وہ بھی تو انسان ہی تھے انسانوں کیطرح کھاتے پیتے بازاروں میں پھرتے تھے جس سے تمھیں یہ نتیجہ نکال لینا چاہیئے تھا کہ کھانا پینا اور بازار میں پھرنا منصب نبوت و رسالت کے خلاف نہیں۔ آیاتِ مذکورہ میں وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ الآیۃ میں اسی مضمون کا بیان ہے۔

مخلوق میں معاشی مساوات کا نہ ہونا بڑی حکمت پر مبنی ہے وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً، اسمیں اشارہ اس طرف ہے کہ حق تعالیٰ کو قدرت تو سب کچھ تھی وہ سارے انسانوں کو یکساں مالدار بنا دیتے، سب کو تندرست رکھتے، کوئی بیمار نہ ہوتا۔ سب کو عزت وجاہ کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دیتے کوئی ادنیٰ یا کم رتبہ نہ رہ جاتا مگر نظامِ عالم میں اسکی وجہ سے بڑے رخنے پیدا ہوتے اسلئے حق تعالیٰ نے کسی کو مالدار بنایا، کسی کو غریب مفلس۔ کسی کو قوی، کسی کو ضعیف۔ کسی کو تندرست، کسی کو بیمار کسی کو صاحبِ عزت وجاہ، کسی کو گمنام۔ اس اختلافِ انواع واصناف اور اختلافِ احوال میں ہر طبقے کا امتحان اور آزمائش ہے۔ غنی کے شکر کا غریب کے صبر کا امتحان ہے اسی طرح بیمار و تندرست کا حال ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ جب تمھاری نظر کسی ایسے شخص پر پڑے جو مال و دولت میں تم سے زیادہ ہے یا صحت وقوت اور عزت وجاہ میں تم سے بڑا ہے تو تم فوراً ایسے لوگوں پر نظر کرو جو ان چیزوں میں تم سے کم حیثیت رکھتے ہیں (تاکہ تم حسد کے گناہ سے بھی بچ جاؤ اور اپنی موجودہ حالت میں اللہ تعالےٰ کا شکر کرنے کی توفیق ہو۔ (رواہ البخاری ومسلم) مظہری

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ

اور بولے وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے کہ ہم سے ملیں گے کیوں نہ اُترے ہم پر فرشتے یا ہم

نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ

دیکھ لیتے اپنے رب کو، بہت بڑائی رکھتے ہیں اپنے جی میں اور سر چڑھ رہے ہیں بڑی شرارت میں جس دن

يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

دیکھیں گے فرشتوں کو کچھ خوشخبری نہیں اُس دن گنہگاروں کو اور کہیں گے کہیں روک دی جائے کوئی آڑ

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (کیونکہ وہ قیامت اور اس کی پیشی اور حساب کے منکر ہیں) وہ (انکار رسالت کے لئے) یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں

آتے (کہ اگر فرشتے آکر ہم سے کہیں کہ یہ رسُول ہیں) یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں (اور وہ خود ہم سے کہدے کہ یہ رسُول ہیں جب ہم تصدیق کریں۔ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (کہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے آکر ان سے خطاب کریں یا خود حق تعالیٰ سے ہمکلام ہوں) اور (بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دُنیا میں دیکھنے اور اُس سے ہمکلام ہونے کی فرمایش میں تو) یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دُور نکل گئے ہیں (کیونکہ ملائکہ اور انسان کی تو بعض چیزوں میں شرکت بھی ہے کہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں تو کوئی مشارکت اور مشابہت نہیں۔ اور یہ لوگ خدا کو دیکھنے کے لائق تو کیا ہوتے مگر فرشتے ان کو ایک روز دکھلائی دیں گے مگر جس طرح یہ چاہتے ہیں اس طرح نہیں بلکہ اُن کے عذاب و مصیبت اور پریشانی لیکر) چنانچہ جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (اور وہ دن قیامت کا ہے) اُس روز مجرموں (یعنی کافروں) کے لئے کوئی خوشی کی بات (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو جب سامان عذاب کیساتھ آتا دیکھیں گے تو گھبرا کر) کہیں گے پناہ ہے پناہ ہے۔

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا ، لفظ رجا کے عام معنے کسی محبوب و مرغوب چیز کی اُمید کے آتے ہیں اور کبھی یہ لفظ بمعنے خوف بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ابن الانباری نے کتاب الاضداد میں لکھا ہے اس جگہ بھی یہی معنے خوف کے زیادہ واضح ہیں یعنی وہ لوگ جو ہمارے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ اسمیں اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ دور از کار اور جاہلانہ سوالات اور فرمائشوں کی جرأت اُسی شخص کو ہوسکتی ہے جو آخرت کا بالکل منکر ہو۔ آخرت کے قائل پر آخرت کی فکر ایسی غالب ہوتی ہے کہ اُس کو ایسے سوال و جواب کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ آج کل جو تعلیم جدید کے اثر سے اسلام اور اسکے احکام کے بارے میں بہت سے لوگ شبہات اور بحث و مباحثہ میں مشغول نظر آتے ہیں یہ بھی علامت اسکی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ دل میں آخرت کا سچا یقین نہیں ہے۔ اور یہ ہوتا تو اس قسم کے فضول سوالات دل میں پیدا ہی نہ ہوتے۔

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ، حجر کے لفظی معنے محفوظ جگہ کے ہیں اور محجوراً اُس کی تاکید ہے۔ یہ لفظ محاورہ عرب میں اُسوقت بولا جاتا تھا جب کوئی مصیبت سامنے ہو، اُس سے بچنے کے لئے لوگوں سے کہتے تھے کہ پناہ ہے پناہ، یعنی ہمیں اس مصیبت سے پناہ دو تو قیامت کے روز بھی جب کفار فرشتوں کو سامان عذاب لاتا ہوا دیکھیں گے دُنیا کی عادت کے مطابق یہ لفظ کہیں گے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس لفظ کے یہ معنے منقول ہیں حَرَامًا مُّحَرَّمًا، اور مراد یہ ہے کہ قیامت کے روز جب یہ لوگ فرشتوں کو

عذاب کے ساتھ دیکھیں گے اور اُن سے معاف کرنے اور جنّت میں جانیکی درخواست کریں گے یا تمنا ظاہر کرینگے تو فرشتے اُنکے جواب میں کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یعنی جنّت کافروں پر حرام اور ممنوع ہے (مظہری)

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ

اور ہم پہنچے اُن کے کاموں پر جو انھوں نے کئے تھے پھر ہم نے کر ڈالا اسکو خاک اُڑتی ہوئی بہشت کے

الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ

لوگوں کا اس دن خوب ہے ٹھکانا، اور خوب ہے جگہ دوپہر کے آرام کی اور جس دن پھٹ جائے

السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ

آسمان بادل سے اور اُتارے جائیں فرشتے تار لگا کر بادشاہی اس دن

نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ

سچی ہے رحمٰن کی اور ہے وہ دن منکروں پر مشکل اور جس دن

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ

کاٹ کاٹ کھائیگا گنہگار اپنے ہاتھوں کو کہے گا اے کاش کہ میں نے پکڑا ہوتا رسول کے ساتھ

سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ

رستہ اے خرابی میری کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست اُسنے تو بہکا دیا

عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

مجھ کو نصیحت سے مجھ تک پہنچ چکنے کے پیچھے، اور ہے شیطان آدمی کو وقت پر دغا دینے والا

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو

مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ

جھک جھک اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن گنہگاروں میں سے

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور کافی ہے تیرا رب راہ دکھلانے کو اور مدد کرنے کو

خلاصۂ تفسیر

اور ہم (اس روز) ان کے (یعنی کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو کہ وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو (علانیہ طور پر) ایسا (بیکار) کر دیں گے جیسے پریشان غبار

(کہ کسی کام نہیں آتا، اسی طرح ان کفار کے اعمال پر کچھ ثواب نہ ہوگا البتہ) اہلِ جنت اس روز قیامگاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرامگاہ میں بھی خوب اچھے ہونگے (مراد مستقر اور مقیل سے جنت ہے یعنی جنت اُن کے لئے جائے قیام اور جائے آرام ہوگی اور اچھا ہونا اسکا ظاہر ہے) اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور (اُس بدلی کے ساتھ آسمان سے) فرشتے (زمین پر) بکثرت اُتارے جائیں گے (اور اسی وقت حق تعالیٰ حساب وکتاب کے لئے تجلّی فرمادیں گے اور) اس روز حقیقی حکومت (حضرت) رحمان (ہی) کی ہوگی (یعنی حساب و کتاب و جزا و سزا میں کسی کو دخل نہ ہوگا جیسا دُنیا میں ظاہری تصرف تھوڑا بہت دوسروں کے لئے بھی حاصل ہے) اور وہ (دن) کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا (کیونکہ انکے حساب کا انجام جہنم ہی ہے) اور جس روز ظالم (یعنی کافر آدمی غایت حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھاوے گا (اور) کہے گا کیا اچھا ہوتا میں رسُول کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ لیتا ہائے میری شامت (کہ ایسا نہ کیا اور) کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا اُس (کم بخت) نے مجھ کو نصیحت آئے پیچھے اس سے بہکا دیا (اور ہٹا دیا) اور شیطان تو انسان کو (عین وقت پر) امداد کرنے سے جواب دیدیتا ہے (چنانچہ اُس کافر کی اس حسرت کے وقت اُس نے کوئی ہمدردی نہ کی، گو کرنے سے بھی کچھ نہ ہوتا صرف دُنیا ہی میں بہکانے کو تھا) اور (اس دن) رسول (صلے اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے کافروں کی شکایت کے طور پر) کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری (اس قوم) نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا (اور التفات ہی نہ کرتے تھے عمل تو درکنار مطلب یہ کہ خود کفار بھی اپنی ضلالت کا اقرار کریں گے اور رسول بھی شہادت دیں گے۔ کقولہ تعالیٰ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا اور ثبوتِ جرم کی یہی دو صورتیں معتاد ہیں، اقرار اور شہادت اور دونوں کے اجتماع سے یہ ثبوت اور بھی مؤکد ہو جاویگا اور سزایاب ہونگے) اور ہم اسی طرح مجرم لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بناتے رہتے ہیں (یعنی یہ لوگ جو انکارِ قرآن کرکے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں جسکا غم کیا جاوے) اور (جس کو ہدایت دینا منظور ہو اُس کی) ہدایت کرنے کو اور (جو ہدایت سے محروم ہے اُسکے مقابلہ میں آپ کی) مدد کرنے کو آپ کا رب کافی ہے۔

معارف و مسائل

خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا، مُسْتَقَر، مستقل جائے قیام کو کہا جاتا ہے اور مَقِيْل قیلولہ سے مشتق ہے دوپہر کو آرام کرنے کی جگہ کو مقیل کہتے ہیں اس جگہ مقیل کا ذکر خصوصیت سے شاید اسلئے بھی ہوا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ نصف النہار کے

وقت ساری مخلوقات کے حساب کتاب سے فارغ ہو جاویں گے اور دو پہر کے سونے کے وقت اہلِ جنت جنت میں پہنچ جائیں گے اور اہلِ جہنم جہنم میں۔ (قرطبی)

تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ ، ای عن الغمام۔ قرطبی۔ معنے یہ ہیں کہ آسمان شق ہو کر اُس میں سے ایک رقیق بادل اُترے گا جس میں فرشتے ہوں گے۔ یہ ابر بشکل سائبان آسمان سے آویگا اور اس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور اُسکے گرداگرد ملائکہ ہوں گے۔ یہ حساب شروع ہونے کا وقت ہوگا اور اُسوقت آسمان کا پھٹنا صرف کھلنے کے طور پر ہوگا یہ وہ پھٹنا نہیں ہوگا جو پہلی مرتبہ نفخۂ صعق کے وقت آسمان زمین کو فنا کرنے کے لئے ہوگا کیونکہ یہ نزولِ غمام جسکا ذکر آیت میں ہے نفخۂ ثانیہ کے بعد ہے جبکہ سب زمین و آسمان دوبارہ درست ہو چکے ہوں گے۔ (بیان القرآن)

يَقُولُ يٰلَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ، یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے مگر حکم عام ہے واقعہ یہ تھا کہ عقبہ ابن ابی معیط مکہ کے مشرک سرداروں میں سے تھا اس کی عادت تھی کہ جب کسی سفر سے واپس آتا تو شہر کے معزز لوگوں کی دعوت کرتا تھا اور اکثر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ملا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حسب عادت اُس نے معززین شہر کی دعوت کی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی بلایا۔ جب اُسنے آپؐ کے سامنے کھانا رکھا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہارا کھانا اُس وقت تک نہیں کھا سکتا جب تک تم اس کی گواہی نہ دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اُسکا کوئی شریک عبادت میں نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ عقبہ نے یہ کلمہ پڑھ لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شرط کے مطابق کھانا تناول فرمایا۔

عقبہ کا ایک گہرا دوست اُبَی بن خلف تھا جب اُس کو خبر لگی کہ عقبہ مسلمان ہو گیا تو یہ بہت برہم ہوا۔ عقبہ نے عذر کیا کہ قریش کے معزز مہمان محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میرے گھر پر آئے ہوئے تھے اگر وہ بغیر کھانا کھائے میرے گھر سے چلے جاتے تو میرے لئے بڑی رسوائی تھی اس لئے میں نے انکی خاطر سے یہ کلمہ کہہ لیا۔ اُبَی بن خلف نے کہا کہ میں تیری ایسی باتوں کو قبول نہیں کرونگا جب تک تو جاکر اُن کے منہ پر نہ تھوکے۔ یہ کمبخت بدنصیب دوست کے کہنے سے اس گستاخی پر آمادہ ہو گیا اور کر گزرا اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بھی ان دونوں کو ذلیل کیا کہ غزوۂ بدر میں دونوں مارے گئے (بغوی) اور آخرت میں اُنکے عذاب کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ جب آخرت کا عذاب سامنے دیکھے گا تو اسوقت ندامت و افسوس سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے گا اور کہیگا کاش میں فلاں یعنی اُبَی بن خلف کو دوست نہ بناتا۔ (مظہری و قرطبی)

غلط کار اور بے دین دوستوں کی دوستی قیامت کے روز حسرت و ندامت کا باعث ہوگی

تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ آیات اگرچہ خاص عقبہ کے واقعہ میں نازل ہوئی تھیں لیکن جیسا کہ الفاظ آیت کے عام ہیں حکم بھی عام ہے اور شاید اس جگہ اُس دوست کے نام کے بجائے قرآن میں فلانًا کا لفظ اسی عموم کی طرف اشارہ کرنے کے

لئے اختیار کیا گیا ہے۔ ان آیات نے یہ بتلایا ہے کہ جو دو دوست کسی معصیت اور گناہ پر جمع ہوں اور خلافِ شرع اُمور میں ایک دُوسرے کی اعانت کرتے ہوں ان سب کا یہی حکم ہے کہ قیامت کے روز اُس گہرے دوست کی دوستی پر روئیں گے۔ مُسند احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لاتصاحب الا مؤمنا ولا یاکل مالك الا تقی (مظہری) کسی غیر مسلم کو اپنا ساتھی نہ بناؤ، اور تمہارا مال (بطور دوستی کے) صرف متقی آدمی کھائے۔ یعنی غیر متقی سے دوستی نہ کرو، اور ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المرء علی دین خلیلہ فلینظر من یخالل (رواہ البخاری)	ہر انسان (عادۃً) اپنے دوست کے دین اور طریقہ پر چلا کرتا ہے اسلئے دوست بنانے سے پہلے خوب غور کر لیا کرو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے مجلسی دوستوں میں کون لوگ بہتر ہیں تو آپؐ نے فرمایا۔

من ذکرکم باللہ رؤیتہ وزاد فی علمکم منطقہ وذکرکم بالاٰخرۃ عملہ رواہ البزار (قرطبی)	وہ شخص جس کو دیکھ کر خدا یاد آئے اور جس کی گفتگو سے تمہارا علم بڑھے اور جس کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی یاد تازہ ہو۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا، یعنی کہیں گے رسُول (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو مہجور و متروک کر دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شکایت بارگاہِ حق تعالیٰ میں قیامت کے روز ہوگی یا اسی دُنیا میں آپؐ نے یہ شکایت فرمائی؟ ائمۂ تفسیر اس میں مختلف ہیں، احتمال دونوں ہیں۔ اگلی آیت بظاہر قرینہ اسکا ہے کہ یہ شکایت آپؐ نے دُنیا ہی میں پیش فرمائی تھی جس کے جواب میں آپؐ کو تسلی دینے کیلئے اگلی آیت میں فرمایا وَکَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ، یعنی اگر آپکے دشمن قرآن کو نہیں مانتے تو آپؐ کو اس پر صبر کرنا چاہیئے کیونکہ سُنت اللہ ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ہر نبی کے کچھ مجرم لوگ دشمن ہوا کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السّلام اس پر صبر کرتے رہے ہیں۔

قرآن کو عملاً ترک کر دینا بھی گناہِ عظیم ہے۔ اس سے ظاہر یہ ہے کہ قرآن کو مہجور و متروک کر دینے سے مُراد قرآن کا انکار ہے جو کفار ہی کا کام ہے۔ مگر بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر نہ اسکی تلاوت کی پابندی کرتے ہیں نہ اُس پر عمل کرتے وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

من تعلم القراٰن وعلق مصحفہ لم یتعاھدہ ولم ینظر فیہ جاء یوم القیٰمۃ متعلقا بہ یقول یارب العٰلمین ان عبدك ھذا اتخذنی مھجورا فاقض بینی و بینہ۔ ذکرہ الثعلبی (قرطبی)	جس شخص نے قرآن پڑھا مگر پھر اسکو بند کر کے گھر میں معلق کر دیا نہ اسکی تلاوت کی پابندی کی نہ اسکے احکام میں غور کیا، قیامت کے روز قرآن اُسکے گلے میں پڑا ہوا آئیگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کریگا کہ آپکے اس بندہ نے مجھے چھوڑ دیا تھا اب آپ میرے اور اسکے معاملہ کا فیصلہ فرما دیں۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَةً وَّاحِدَةً ۚۛ

اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اُترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ ہوکر

کَذٰلِكَ ۚۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلۡنٰهُ تَرۡتِیۡلًا ﴿۳۲﴾

اسی طرح اُتارا تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل اور پڑھ سُنایا ہم نے اسکو ٹھہر ٹھہر کر

مع عند المتقدمین

خُلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا (مقصود اس اعتراض سے یہ ہے کہ اگر خدا کا کلام ہوتا تو بتدریج نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بتدریج نازل کرنے سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم خود ہی سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا بنا لیتے ہیں آگے اس اعتراض کا جواب ہے کہ ہم اس طرح (تدریجاً) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اسکے ذریعہ آپکے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر اُتارا ہے (چنانچہ تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ پُورا ہوا)۔

معارف و مسائل

یہ وہی سلسلہ کفار و مشرکین کے اعتراضات و جوابات کا ہے جو شروع سورت سے چلا آرہا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی ایک حکمت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اسکے ذریعہ آپکے دل کو قوی رکھنا مقصود ہے۔ نزول تدریجی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویت قلب کی چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ یاد رکھنا آسان ہوگیا، ایک ضخیم کتاب بیک وقت نازل ہوجاتی تو یہ آسانی نہ رہتی اور آسانی کے ساتھ یاد ہوتے رہنے سے دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی۔ دُوسرے جب کفار آپ پر کوئی اعتراض یا آپکے ساتھ کوئی ناگوار معاملہ کرتے تو اُسی وقت آپ کی تسلّی کے لئے قرآن میں آیت نازل ہوجاتی، اور اگر پُورا قرآن ایک دفعہ آگیا ہوتا اور اس خاص واقعہ پر تسلّی کا ذکر بھی نازل ہوگیا ہوتا تو بہر حال اس کو قرآن میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی اور ذہن کا اُسطرف متوجہ ہوجانا بھی عادۃً ضروری نہیں تھا تیسرے پیغام خداوندی آنا تازہ شہادت ہے معیتِ خداوندی کی جو مدارِ اعظم ہے قوتِ قلب کا۔ اور اس جگہ جو حکمت تقویتِ قلب کی بتلائی گئی ہے نزولِ تدریجی کی حکمت اسمیں منحصر نہیں دوسری حکمتیں بھی ہیں جنمیں سے بعض سُورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکۡثٍ میں پہلے آچکی ہے۔ (بیان القرآن)

وَلَا یَاۡتُوۡنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰكَ بِالۡحَقِّ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِیۡنَ

اور نہیں لاتے تیرے پاس کوئی مثل کہ ہم نہیں پہنچا دیتے تجھ کو ٹھیک بات اور اس سے بہتر کھول کر جو لوگ کہ

يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ وَ

گھیر کر لائیں جائیں گے اوندھے پڑے ہوئے اپنے منہ پر دوزخ کیطرف، اُنہی کا بُرا درجہ ہے اور بہت بہکے ہوئے ہیں راہ سے اور

لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا

ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اسکے ساتھ اسکا بھائی ہارون کام بٹانے والا پھر کہا ہم نے

اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾

تم دونوں جاؤ اُن لوگوں کے پاس جنھوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپکے سامنے پیش کریں مگر ہم (اُس کا) ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں (تاکہ آپ مخالفین کو جواب دے سکیں۔ یہ بظاہر بیان اُس تقویتِ قلب کا ہے جسکا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہوا ہے کہ بتدریج نازل کرنے میں ایک حکمت آپ کی دلجمعی اور تقویتِ قلب ہے کہ جب کفار کیطرف سے کوئی اعتراض آئے تو اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب نازل کر دیا جائے) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف لیجائے جاویں گے (یعنی گھسیٹ کر) یہ لوگ جگہ میں بھی بدتر ہیں اور طریقہ میں بھی بہت گمراہ ہیں۔ (یہاں تک انکارِ رسالت پر وعید اور قرآن پر اعتراضات کے جواب تھے، آگے اسکی تائید میں زمانہ ماضی کے بعض واقعات نقل کئے گئے ہیں جن میں منکرینِ رسالت کا انجام اور عبرت انگیز حالات مذکور ہیں اور اسمیں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور تقویتِ قلب کا سامان ہے کہ پچھلے انبیاء کی اللہ تعالیٰ نے جس طرح مدد فرمائی اور دشمنوں پر غالب فرمایا وہ آپکے لئے بھی ہونے والا ہے اس میں پہلا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کہ) اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی تورات) دی تھی اور (اس کتاب ملنے سے پہلے) ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (اُن کا) معین (و مددگار) بنایا تھا پھر ہمنے (دونوں کو) حکم دیا کہ دونوں آدمی اُن لوگوں کے پاس (ہدایت کرنے کے لئے) جاؤ جنھوں نے ہماری (توحید کی) دلیلوں کو جھٹلایا ہے (مُراد اس سے فرعون اور اسکی قوم ہے چنانچہ یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور سمجھایا مگر اُنھوں نے نہ مانا) سو ہم نے اُن کو (اپنے قہر سے) بالکل ہی غارت کر دیا (یعنی دریا میں غرق کئے گئے)۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا، اس میں قوم فرعون کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اُنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ اسوقت تک تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس تکذیب سے آیات تورات کی تکذیب تو مُراد نہیں ہو سکتی، بلکہ مراد آیات سے یا توحید کے دلائل عقلیہ ہیں

جو ہر انسان کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ میں آسکتے ہیں اُن میں غور نہ کرنے کو تکذیب آیات فرمایا اور یا یہ کہ انبیاء سابقین کی روایات جو کچھ نہ کچھ ہر قوم میں نقل ہوتی آئی ہیں اُن کا انکار مُراد ہے جیسے قرآن کریم میں فرمایا وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ ، اس میں انبیاء سابقین کی تعلیم کا ان لوگوں تک منقول چلا آنا بتلایا گیا ہے۔ (بیان القرآن)

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً

اور نوح کی قوم کو جب اُنھوں نے جھٹلایا پیغام لانے والوں کو ہم نے انکو ڈبا دیا اور کیا اُن کو لوگوں کے حق میں نشانی

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے گنہگاروں کے واسطے عذاب دردناک اور عاد کو اور ثمود کو اور کنوئیں

الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَ

والوں کو اور اسکے بیچ میں بہت سی جماعتوں کو اور سب کو کہہ سُنائیں ہم نے مثالیں اور

كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ

سب کو کھود یا ہم نے غارت کر کر اور یہ لوگ ہو آئے ہیں اُس بستی کے پاس جن پر برسا بُرا

السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَاِذَا

برساؤ کیا دیکھتے نہ تھے اس کو ، نہیں پر اُمید نہیں رکھتے جی اُٹھنے کی اور جہاں

رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

تجھ کو دیکھیں کچھ کام نہیں اُن کو تجھ سے مگر ٹھٹھے کرنے کیا یہی ہے جس کو بھیجا اللہ نے پیغام دے کر

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

یہ تو ہم کو بچلا ہی دیتا ہمارے معبودوں سے اگر ہم نہ جمے رہتے اُن پر اور آگے جان لیں گے

حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ

جس وقت دیکھیں گے عذاب کو کہ کون بہت بچلا ہوا ہے راہ سے بھلا دیکھ تو اس شخص کو جس نے پوجنا اختیار کیا

هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ

اپنی خواہش کا ، کہیں تو لے سکتا ہے اسکا ذمہ یا تو خیال رکھتا ہے کہ بہت سے ان میں سُنتے

اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾ ع

یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اور قوم نوح کو بھی (ان کے زمانہ میں) ہم ہلاک کر چکے ہیں (جن کی ہلاکت اور سبب ہلاکت کا بیان

یہ ہے کہ) جب اُنھوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (طوفان سے) غرق کر دیا اور ہم نے ان (کے واقعہ) کو لوگوں (کی عبرت) کے لئے نشان بنا دیا (یہ تو دُنیا میں سزا ہوئی) اور (آخرت میں) ہمنے (اُن) ظالموں کے لئے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور اُن کے بیچ بیچ میں بہت سی اُمتوں کو ہلاک کیا اور ہم نے (اُمم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی مؤثر اور بلیغ) مضامین بیان کئے اور (جب نہ مانا تو) ہم نے سب کو بالکل ہی برباد کر دیا۔ اور یہ (کفار ملک شام کے سفر میں) اس بستی پر ہو کر گزرتے ہیں جس پر بُری طرح پتھر برسائے گئے تھے (مراد قریہ قوم لوط کا ہے) سو کیا یہ لوگ اسکو دیکھتے نہیں رہتے (پھر بھی عبرت نہیں پکڑتے کہ کفر و تکذیب کو چھوڑ دیں جس کی بدولت قوم لوط کو سزا ہوئی سو بات یہ ہے کہ عبرت نہ پکڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس قریہ کو دیکھتے نہ ہوں) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ مرکر جی اُٹھنے کا احتمال ہی نہیں رکھتے (یعنی آخرت کے منکر ہیں اس لئے کفر کو موجب سزا ہی قرار نہیں دیتے اور اسلئے اُن کی ہلاکت کو کفر کا وبال نہیں سمجھتے بلکہ اُمور اتفاقیہ میں سے سمجھتے ہیں یہ وجہ عبرت نہ پکڑنے کی ہے) اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ کیا یہی (بزرگ) ہیں جنکو خدا تعالیٰ نے رسُول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا غریب آدمی رسُول نہ ہونا چاہیئے۔ اگر رسالت کوئی چیز ہے تو کوئی رئیس مالدار ہونا چاہیئے تھا پس یہ رسُول نہیں البتہ) اس شخص (کی جادو بیانی اس غضب کی ہے کہ اس) نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم اُن پر (مضبوطی سے) قائم نہ رہتے (یعنی ہم تو ہدایت پر ہیں اور یہ ہم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اللہ تعالیٰ اُن کی تردید کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ ظالم اب تو اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ہمارے پیغمبر کو گمراہ تبلا رہے ہیں) اور (مرنے کے بعد) جلدی ہی ان کو معلوم ہو جاویگا جب عذاب کا معائنہ کریں گے کہ کون شخص گمراہ تھا (آیا وہ خود یا نعوذ باللہ پیغمبر، اسمیں اُن کے بیہودہ اعتراض کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نبوت اور مالداری میں کوئی جوڑ نہیں مالدار نہ ہونیکے سبب نبوت سے انکار جہالت و گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دُنیا میں جو چاہیں خیال پکالیں مگر قیامت میں سب حقیقت کھُل جاوے گی) اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اُس کی نگرانی کر سکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سُنتے یا سمجھتے ہیں (مطلب یہ کہ آپ ان کی ہدایت نہ ہونے سے مغموم نہ ہو جیئے کیونکہ آپ ان پر مسلط نہیں کہ خواہی نخواہی ان کو راہ پر لا دیں اور نہ ہدایت کی ان سے توقع کیجئے کیونکہ نہ یہ حق بات کو سُنتے ہیں نہ عقل ہے کہ غور کریں) یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو نہ سُنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ یہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ وہ احکام دین کے مکلف نہیں تو ان کا نہ سمجھنا مذموم نہیں اور یہ مکلف ہیں پھر بھی نہیں سمجھتے پھر یہ کہ وہ اگر معتقد ان ضروریات دین کے نہیں ہیں تو منکر بھی تو نہیں اور یہ تو منکر ہیں اور اذ اتبعت میں ان کی گمراہی کا منشا بھی بیان کر دیا کہ کسی شبہ و دلیل سے ان کو اشتباہ نہیں ہوا بلکہ اتباع ہویٰ اسکا سبب ہے

معارف و مسائل

قوم نوح علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد کہ اُنھوں نے رسُولوں کو جھٹلایا حالانکہ پہلے رسُول نہ اُن کے زمانے میں تھے نہ اُنھوں نے جھٹلایا، تو منشا اسکا یہ ہے کہ اُنھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا اور چونکہ اُصولِ دین سب انبیاء کے مشترک ہیں اسلئے ایک کو جھٹلانا سبھی کے جھٹلانے کے حکم میں ہے۔

اَصۡحٰبَ الرَّسِّ، رس، لغت میں کچے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث میں ان لوگوں کے تفصیلی حالات مذکور نہیں۔ اسرائیلی روایات مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ قوم ثمود کے کچھ باقیماندہ لوگ تھے جو کسی کنوئیں پر آباد تھے (کذا فی القاموس واللہ عن ابن عباسؓ) ان کے عذاب کی کیفیت بھی قرآن میں منصوص اور کسی صحیح حدیث میں بھی مذکور نہیں۔ (بیان القرآن)

خلاف شرع خواہشات کی پیروی ایک قسم کی بُت پرستی ہے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ، اس آیت میں اُس شخص کو جو اسلام شریعت کیخلاف اپنی خواہشات کا پیرو ہو یہ کہا گیا ہے کہ اُس نے اپنی خواہشات کو معبود بنالیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خلاف شرع خواہشاتِ نفسانی بھی ایک بُت ہے جس کی پرستش کیجاتی ہے پھر استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (قرطبی)

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا

تونے نہیں دیکھا اپنے رب کیطرف کیسے دراز کیا سایہ کو اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا پھر ہمنے مقرر کیا

الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ

سورج کو اسکا راہ بتلانے والا پھر کھینچ لیا ہمنے اسکو اپنی طرف سہج سہج سمیٹ کر اور وہی ہے جس نے

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَ

بنادیا تمہارے واسطے رات کو اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن کو بنادیا اُٹھ نکلنے کے لئے اور

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ

وہی ہے جس نے چلائیں ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اسکی رحمت سے آگے اور اُتارا ہم نے

السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ

آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کا کہ زندہ کردیں اُس سے مرے ہوئے دیس کو اور پلائیں اُسکو اپنے پیدا کئے ہوئے

اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ

بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو اور طرح طرح سے تقسیم کیا ہم نے اسکو انکے بیچ میں تا دھیان رکھیں

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ

پھر بھی نہیں رہتے بہت لوگ بدون ناشکری کئے اور اگر ہم چاہتے تو اُٹھاتے ہر بستی میں

نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِيْ

کوئی ڈرانے والا، سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر اُن کا اسکے ساتھ بڑے زور سے اور وہی ہے جس نے

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا

ملے ہوئے چلائے دو دریا یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا اور رکھا ان دونوں کے بیچ پردہ

وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ

اور آڑ روکی ہوئی۔ اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرائے اسکے لئے جد اور سسرال

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿٥٤﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ

اور تیرا رب سب کچھ کرسکتا ہے اور پوجتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ چیز جو نہ بھلا کرے اُن کا نہ بُرا

وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿٥٥﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٥٦﴾ قُلْ

اور ہے کافر اپنے رب کیطرف سے پیٹھ پھیر رہا اور تجھ کو ہم نے بھیجا یہی خوشی اور ڈر سنانے کے لئے تو کہہ

مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٥٧﴾ وَ

میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری مگر جو کوئی چاہے کہ پکڑ لے اپنے رب کی طرف راہ اور

تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ

بھروسہ کر اُس پر اس زندہ کے جو نہیں مرتا اور یاد کر اسکی خوبیاں اور وہ کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے

خَبِيْرَا ﴿٥٨﴾ ۚ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ

خبردار جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ انکے بیچ میں ہے چھ دن میں پھر

اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا

قائم ہوا عرش پر وہ بڑی رحمت والا سو پوچھ اس سے جو اسکی خبر رکھتا ہو اور جب کہیے ان سے سجدہ کرو

لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿٦٠﴾

رحمٰن کو کہیں رحمٰن کیا ہے کیا سجدہ کرنے لگیں ہم جس کو تو فرمائے اور بڑھ جاتا ہے ان کا بدکنا

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾

بڑی برکت ہے اسکی جسنے بنائے آسمان میں برج اور رکھا اس میں چراغ اور چاند اُجالا کرنے والا

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

اور وہی ہے جسنے بنائے رات اور دن بدلتے سدلتے اُس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا

خلاصۂ تفسیر

اے مخاطب کیا تو نے اپنے پروردگار (کی اس قدرت) پر نظر نہیں کی کہ اُسنے (جب آفتاب اُفق

سے طلوع کرتا ہے اسوقت کھڑی ہوئی چیزوں کے) سایہ کو کیونکر (دُور تک) پھیلایا ہے (کیونکہ طلوع کے وقت ہر چیز کا سایہ لمبا ہوتا ہے) اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرا ہوا رکھتا (یعنی آفتاب کے بلند ہونے سے بھی نہ گھٹتا اس طرح پر کہ اتنی دُور تک آفتاب کی شعاعوں کو نہ آنے دیتا کیونکہ آفتاب کی شعاعوں کا زمین کے حصّوں پر پہنچنا بارادۂ حق ہے نہ کہ بالاضطرار مگر ہم نے اپنی حکمت سے اسکو ایک حالت پر نہیں رکھا بلکہ اس کو پھیلا ہوا بنا کر) پھر ہمنے آفتاب کو (یعنی اُسکے اُفق کے قریب ہونے اور پھر اُفق سے بلند ہونے کو) اس (سایہ کی درازی و کوتاہی) پر (ایک ظاہری) علامت مقرر کیا (مطلب یہ کہ اگرچہ روشنی اور سایہ اور انکے گھٹنے بڑھنے کی اصل علت حق تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے، آفتاب یا کوئی دوسری چیز مؤثر حقیقی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے کچھ ظاہری اسباب بنا دیئے ہیں اور اسباب کیساتھ اُن کے مسببات کا ایسا رابطہ قایم کر دیا کہ سبب کے تغیر سے مسبب میں تغیر ہوتا ہے) پھر (اس تعلق ظاہری کی وجہ سے) ہمنے اس (سایہ) کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا (یعنی جوں جوں آفتاب اونچا ہوا وہ سایہ زائل اور معدوم ہوتا گیا اور چونکہ اسکا غائب ہونا محض قدرتِ الٰہیہ سے بلا شرکتِ غیرے ہے اور عام لوگوں کی رؤیت سے غائب ہونے کے باوجود علمِ الٰہی سے غائب نہیں ہے اسلئے یہ فرمایا گیا کہ اپنی طرف سمیٹ لیا) اور وہ ایسا ہے جس نے تمھارے لئے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو (اس اعتبار سے کہ سونا مشابہ موت کے ہے اور دن کا وقت جاگنے کا ہے گویا) زندہ ہونیکا وقت بنایا اور وہ ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی اُمید دلاکر دل کو) خوش کر دیتی ہیں اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین میں جان ڈالدیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چارپایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں اور ہم اُس (پانی) کو (بقدرِ مصلحت) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ لوگ غور کریں (کہ یہ تصرفات کسی بڑے قادر کے ہیں کہ وہی مستحقِ عبادت ہے) سو (چاہیئے تھا کہ غور کر کے اسکا حق ادا کرتے لیکن) اکثر لوگ بغیر ناشکری کئے نہ رہے (جس میں سب سے بڑھ کر کفر و شرک ہی لیکن آپ ان کی اور بالخصوص اکثر کی ناشکری سُنکر یا دیکھ کر سعی فی التبلیغ سے ہمت نہ ہاریئے کہ میں تنہا ان سب سے کیسے عہدہ برآ ہونگا بلکہ آپ تنہا ہی اپنا کام کئے جایئے کیونکہ آپ کو تنہا ہی نبی بنانے سے خود ہمارا مقصود یہ ہے کہ آپ کا اجر اور قرب بڑھے) اور اگر ہم چاہتے تو (آپ کے علاوہ اسی زمانہ میں) ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیجدیتے (اور تنہا آپ پر تمام کام نہ ڈالتے لیکن چونکہ آپ کا اجر بڑھانا مقصود ہے اسلئے ہم نے ایسا نہیں کیا تو اس طور پر اتنا کام آپکے سپرد کرنا خدا تعالےٰ کی نعمت ہے) سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے (یعنی کافر تو

اس سے خوش ہونگے کہ تبلیغ نہ ہو یا کمی ہو جائے اور ان کی آزادی سے تعرض نہ کیا جاوے) اور قرآن (میں جو دلائل حق کے مذکور ہیں جیسا اسی مقام پر دلائل توحید کے ارشاد ہوئے ہیں اُن) سے اُن کا زور شور سے مقابلہ کیجئے (یعنی عام اور مکمل دعوت و تبلیغ کیجئے، یعنی سب سے کہئے اور بار بار کہئے اور ہمت قوی رکھئے جیسا اب تک آپ کرتے رہے ہیں اس پر قائم رہئے۔ آگے پھر بیان ہے دلائل توحید کا) اور وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا جن میں ایک (کا پانی) تو شیریں تسکین بخش ہے اور ایک (کا پانی) شور تلخ ہے اور (باوجود اختلاط صوری کے حقیقۃً) اُن کے درمیان میں (اپنی قدرت سے) ایک حجاب اور (اختلاط حقیقی سے) ایک مانع قوی رکھدیا (جو خود خفی غیر محسوس ہے مگر اُس کا اثر یعنی امتیاز دونوں پانی کے مزہ میں محسوس اور مشاہد ہے۔ مراد ان دو دریاؤں سے وہ مواقع ہیں جہاں شیریں ندیاں اور نہریں بہتے بہتے سمندر میں آگرگری ہیں وہاں باوجود اسکے کہ اوپر سے دونوں کا سطح ایک معلوم ہوتا ہے لیکن قدرتِ الٰہیہ سے ان میں ایک ایسی حدِ فاصل ہے کہ ملتقیٰ کے ایک جانب سے پانی لیا جاوے تو شیریں اور دوسری جانب سے جو کہ جانبِ اوّل سے بالکل قریب ہے پانی لیا جائے تو تلخ۔ دُنیا میں جہاں جس جگہ شیریں پانی کی نہریں چشمے سمندر کے پانی میں گرتے ہیں وہاں اسکا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ میلوں دُور تک میٹھا اور کھاری پانی الگ الگ چلتے ہیں، دائیں طرف میٹھا بائیں طرف تلخ کھاری یا اوپر نیچے شیریں اور تلخ پانی الگ الگ پائے جاتے ہیں (حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علماء کی شہادت نقل کی ہے کہ ارکان سے چاٹگام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبین بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں ایک کا پانی سفید ہے اور ایک کا سیاہ، سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم اور تموج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن ہوتا ہے کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقیٰ ہے لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا۔ اھ۔ اور مجھ سے باریسال کے بعض طلباء نے بیان کیا کہ ضلع باریسال میں دو ندیاں ہیں جو ایک ہی دریا سے نکلی ہیں، ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف جس جگہ آجکل مقیم ہے (ڈابھیل سملک ضلع سورت) سمندر وہاں سے تقریباً دس۱۰ بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ادھر کی ندیوں میں برابر مدوجزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اسوقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے۔ اوپر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا، جزر کے وقت اوپر سے کھاری اُتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں میٹھا باقی رہ جاتا ہے واللہ اعلم، ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں ملجانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے

سے ممتاز رہتے ہیں) اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا (چنانچہ باپ دادا وغیرہ شرعی خاندان اور ماں، نانی وغیرہ عرفی خاندان ہیں جن سے پیدائش کے ساتھ ہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں پھر شادی کے بعد سسرالی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں یہ دلیل قدرت بھی ہے کہ نطفہ کیا چیز تھا پھر اس کو کیسا بنا دیا کہ وہ اتنی جلد خون والا ہو گیا اور نعمت بھی ہے کہ ان تعلقات پر تمدن اور امداد باہمی کی تعمیر قائم ہے) اور (اے مخاطب) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے اور (باوجود اسکے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں ایسا کامل ہے جیسا بیان ہوا اور یہ کمالات مقتضی ہیں کہ اسی کی عبادت کی جاوے مگر) یہ (مشرک) لوگ (ایسے) خدا کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں (جو عبادت کرنے پر) نہ اُن کو کچھ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ (درصورت عبادت نہ کرنے کے) اُن کو کچھ ضرر پہنچا سکتی ہیں اور کافر تو اپنے رب کا مخالف ہے (کہ اُس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے اور کفار کی مخالفت معلوم کر کے آپ نہ تو اُن کے ایمان نہ لانے سے غمگین ہوں کیونکہ) ہم نے آپ کو صرف اسلئے بھیجا ہے کہ (ایمان والوں کو جنت کی) خوشخبری سنائیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں۔ (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا کیا نقصان ہے، پھر آپ کیوں غم کریں اور نہ آپ اُس مخالفت کو معلوم کر کے فکر میں پڑیں کہ جب یہ حق تعالیٰ کے مخالف ہیں تو میں جو حق تعالیٰ کیطرف دعوت کرتا ہوں اس دعوت کو یہ لوگ خیر خواہی کب سمجھیں گے بلکہ میری خود غرضی پر محمول کر کے التفات بھی نہ کریں گے تو اُن کے گمان کی کیونکر اصلاح کیجاوے تاکہ مانع مرتفع ہو سو اگر آپ کو اُن کا یہ خیال قرینہ سے یا زبانی گفتگو سے معلوم ہو تو) آپ (جواب میں اتنا) کہدیجئے (اور بفکر ہو جائیے) کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مالی یا جاہی) نہیں مانگتا ہاں جو شخص یوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کرلے (تو البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں چاہے اس کو معاوضہ کہو یا نہ کہو) اور (نہ اُس مخالفت کفار کو دریافت کر کے اُن کی ضرر رسانی سے اندیشہ کیجئے بلکہ تبلیغ میں) اُس حی لایموت پر توکل رکھئے اور (اطمینان کے ساتھ) اُس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہئیے اور (نہ مخالفت سُن کر تعجیل عقوبت کی اس خیال سے تمنا کیجئے کہ ان کا ضرر دوسروں کو نہ پہنچ جاوے کیونکہ) وہ (خدا) اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی (طور پر) خبردار ہے (وہ جب مناسب سمجھے گا سزا دیدیگا۔ پس ان جملوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حزن و فکر اور خوف کو زائل فرمایا ہے آگے پھر توحید کا بیان ہے) وہ ایسا ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اُس کی شان کے لائق ہے جسکا بیان سورۂ اعراف کے رکوع ہفتم کے شروع آیت میں گزر چکا) وہ بڑا مہربان ہے سو اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہئیے (کہ وہ کیسا ہے کافر مشرک کیا

جانیں اور اس معرفت صحیحہ کے نہ ہونے سے شرک کرتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ وما قدروا اللہ حق قدرہ) اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو (بوجہ جہل و عناد کے) کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے (جس کے سامنے ہم کو سجدہ کرنے کو کہتے ہو) کیا ہم اُس کو سجدہ کرنے لگیں گے جس کو تم سجدہ کرنے کے لئے ہم کو کہو گے اور اس سے اُن کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے (لفظ رحمٰن ان میں کم مشہور تھا مگر یہ نہیں کہ جانتے نہ ہوں مگر اسلامی تعلیم سے جو مخالفت بڑھی ہوئی تھی تو محاورات اور بول چال میں بھی مخالفت کو نباہتے تھے۔ قرآن میں جو یہ لفظ بکثرت آیا وہ اس کی بھی مخالفت کر بیٹھے) وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور ان ستاروں میں سے دو بڑے نورانی اور فائدہ بخش ستارے بنائے یعنی) اُس (آسمان) میں ایک چراغ (یعنی آفتاب) اور نورانی چاند بنایا (شاید آفتاب کو سراج بوجہ تیزی کے کہا) اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ سب کچھ جو دلائل توحید اور اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے) اُس شخص کے (سمجھنے کے) لئے (ہیں) جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے (کہ اس میں سمجھنے والے کی نظر میں استدلالات ہیں اور شکرگزاری کرنے والے کی نظر میں انعامات ہیں) ورنہ ۔

اگر صد باب حکمت پیش ناداں ❊ بخوانی آیدش بازیچہ در گوش

معارف و مسائل

مخلوقاتِ الٰہیہ میں اسباب و مسببات کا رشتہ اور ان سب کا قدرتِ حق کا تابع ہونا

مذکور الصدر آیات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور بندوں پر اسکے انعامات و احسانات کا ذکر ہے جس سے حق تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت میں اُسکے ساتھ کسی کا شریک نہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ، دھوپ اور چھاؤں دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ اُن کے بغیر انسانی زندگی اور اسکے کاروبار نہیں چل سکتے۔ ہر وقت ہر جگہ دھوپ ہی دھوپ ہو جائے تو انسان اور ہر جاندار کے لئے کیسی مصیبت ہو جائے یہ تو ظاہر ہے اور سایہ کا بھی یہی حال ہے کہ اگر ہر جگہ ہر وقت سایہ ہی رہے کبھی دھوپ نہ آوے تو انسان کی صحت و تندرستی نہیں رہ سکتی، اور بھی ہزاروں کاموں میں خلل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمائیں اور انسانوں کے لئے ان کو موجب راحت و سکون بنایا۔ لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے اس دنیا میں پیدا ہونے والی تمام اشیاء کو خاص خاص اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے کہ جب وہ اسباب موجود ہوتے ہیں تو یہ چیزیں موجود ہو جاتی ہیں جب نہیں ہوتے تو یہ چیزیں بھی نہیں رہتیں۔ اسباب قوی یا زیادہ ہوتے ہیں تو اُن کے مسببات کا وجود قوی اور زیادہ ہو جاتا ہے، وہ کمزور یا کم ہوتے ہیں تو

مُسببات بھی کمزور یا کم ہو جاتے ہیں۔ غلّہ اور گھاس اُگانے کا سبب زمین اور پانی اور ہوا کو بنا رکھا ہے روشنی کا سبب آفتاب ماہتاب کو بنا رکھا ہے۔ بارش کا سبب بادل اور ہواؤں کو بنا رکھا ہے۔ اور ان اسباب اور اُن پر مرتب ہونے والے اثرات میں ایسا مستحکم اور مضبوط ربط قایم فرما دیا ہے کہ ہزاروں سال سے بغیر کسی ادنیٰ فرق کے چل رہے ہیں۔ آفتاب اور اس کی حرکت اور اس سے پیدا ہونے والے دن رات اور دھوپ چھاؤں پر نظر ڈالو تو ایسا مستحکم نظام ہے کہ صدیوں بلکہ ہزاروں سال میں ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ نہ کبھی آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی مشینری میں کوئی کمزوری آتی ہے، نہ کبھی ان کو اصلاح و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے جب سے دُنیا وجود میں آئی ایک انداز ایک رفتار سے چل رہے ہیں حساب لگا کر ہزار سال بعد تک کی چیزوں کا وقت بتلایا جا سکتا ہے۔

سبب اور مُسبّب کا یہ مستحکم نظام جو حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا عجیب و غریب شاہکار اور اُس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی بُرہان قطعی ہے اسکے استحکام ہی نے لوگوں کو غفلت میں ڈالدیا کہ اُن کی نظروں میں صرف یہ اسبابِ ظاہرہ ہی رہ گئے اور انہی اسباب کو تمام چیزوں اور تاثیرات کا خالق و مالک سمجھنے لگے۔ مسبب الاسباب کی اصلی قوت جو ان اسباب کی پیدا کرنے والی ہے وہ اسباب کے پردوں میں مستور ہو گئی۔ اسلئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں انسان کو بار بار اس پر تنبیہ کرتی ہیں کہ ذرا نظر کو بلند اور تیز کرو، اسباب کے پردوں کے پیچھے دیکھو کون اس نظام کو چلا رہا ہے تاکہ حقیقت تک راہ پاؤ۔ اسی سلسلے کے یہ ارشادات ہیں جو آیات مذکورہ میں آئے۔ آیت اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ میں غافل انسان کو اس پر تنبیہ کیا گیا ہے کہ تو روزانہ دیکھتا ہے کہ صبح کو ہر چیز کا سایہ جانبِ غرب دراز ہوتا ہے، پھر وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ نصف النہار کے وقت معدوم یا کالعدم ہو جاتا ہے پھر زوال کے بعد یہی سایہ اسی تدریجی رفتار کے ساتھ مشرق کی جانب میں پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ ہر انسان اس دھوپ اور چھاؤں کے فوائد ہر روز حاصل کرتا ہے اور اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع ہونے پھر بلند ہونے پھر غروب کی طرف مائل ہونے کے لازمی نتائج و ثمرات ہیں، لیکن آفتاب کے کرہ کی تخلیق پھر اُسکے ایک خاص نظام کے تحت باقی رکھنے کا کام کس نے کیا، یہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا اس کیلئے دل کی آنکھیں اور بصیرت درکار ہے۔

آیتِ مذکورہ میں یہی بصیرت انسان کو دینا مقصود ہے کہ یہ سایوں کا بڑھنا گھٹنا اگرچہ تمہاری نظروں میں آفتاب سے متعلق ہے مگر اس پر بھی تو غور کرو کہ آفتاب کو اس شان کیساتھ کس نے پیدا کیا اور اسکی حرکت کو ایک خاص نظام کے اندر کس نے باقی رکھا جس کی قدرتِ کاملہ نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ ہی درحقیقت اس دھوپ چھاؤں کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اگر وہ

چاہتا تو اس دھوپ چھاؤں کو ایک حالت پر قائم کر دیتا جہاں دھوپ ہے وہاں ہمیشہ دھوپ رہتی، جہاں چھاؤں ہے ہمیشہ چھاؤں رہتی مگر اس کی حکمت نے انسانی ضروریات و فوائد پر نظر کر کے ایسا نہیں کیا وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا کا یہی مطلب ہے۔

انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے سایہ کے واپس لوٹنے اور گھٹنے کو آیتِ مذکورہ میں اس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے کہ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا، یعنی پھر سایہ کو ہم نے اپنی طرف سمیٹ لیا، یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسمانیت اور جہت اور سمت سے بالاتر ہے، اسکی طرف سایہ کا سمٹنا، اسکا مفہوم یہی ہے کہ اُس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سب کام ہوا۔

رات میں نیند اور دن میں کام کی تخصیص بھی بڑی حکمت پر مبنی ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا، اس آیت میں رات کو لباس کے لفظ سے تعبیر فرمایا کہ جس طرح لباس انسان کے پورے بدن کا ساتر ہے اسی طرح رات ایک قدرتی پردہ کی چادر ہے جو پوری کائنات پر ڈالدی جاتی ہے۔ سُبَاتًا، سبت سے مشتق ہے جس کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں۔ سُبَات وہ چیز ہے جس سے کسی دوسری چیز کو قطع کیا جائے۔

نیند کو اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ دن بھر کی محنتوں کا تکان اور کمزوری اس سے قطع ہو جاتی ہے۔ افکار و خیالات منقطع ہو کر دماغ کو آرام ملتا ہے اسلئے سُبَات کا ترجمہ راحت کا کیا جاتا ہے۔ معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ ہم نے رات کو ایک چھپانے والی چیز بنایا پھر اُسمیں انسان اور سارے جانداروں پر نیند مسلط کر دی جو اُن کے آرام و راحت کا سامان ہے۔

یہاں کئی چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ نیند کا راحت ہونا بلکہ راحت کی جان ہونا تو ہر شخص جانتا ہے مگر انسانی فطرت یہ ہے کہ روشنی میں نیند آنا مشکل ہوتا ہے اور آ بھی جائے تو جلد آنکھ کھل جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے نیند کے مناسب رات کو تاریک بھی بنایا اور ٹھنڈا بھی۔ اسیطرح رات خود ایک نعمت ہے اور نیند دوسری نعمت، اور تیسری نعمت یہ ہے کہ سارے جہان کے انسانوں جانوروں کی نیند ایک ہی وقت رات میں جبری کر دی۔ ورنہ اگر ہر انسان کی نیند کے اوقات دوسرے انسان سے مختلف ہوتے تو جس وقت کچھ لوگ سونا چاہتے دوسرے لوگ کاموں میں مصروف اور شور شغب کا سبب بنے رہتے۔ اسی طرح جب دوسروں کے سونے کی باری آتی تو اس وقت کام کرنے والے چلنے پھرنے والے ان کی نیند میں خلل انداز ہوتے۔ اس کے علاوہ ہر انسان کی ہزاروں حاجتیں دوسرے انسانوں سے وابستہ ہوتی ہیں باہمی تعاون و تناصر اور کاموں میں بھی شدید حرج ہوتا کہ جس شخص سے آپ کو کام ہے اُسکے سونے کا وقت ہے اور جب اُسکے جاگنے کا وقت آئیگا تو آپکا سونے کا وقت ہوگا۔

اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بین الاقوامی معاہدہ سے کام لیا جاتا کہ سب لوگ اپنے سونے کا

وقت ایک ہی مقرر کرلیں، اوّل تو ایسا معاہدہ اربوں کروڑوں انسانوں میں ہونا آسان نہ تھا پھر اُس پر کاربند رکھنے کے لئے ہزاروں محکمے کھولنے پڑتے اس کے باوجود عام قانونی اور معاہداتی طریقوں سے طے ہونیوالی چیزوں میں جو خلل ہر جگہ رشوت، رعایت وغیرہ کے سبب پایا جاتا ہے وہ پھر بھی باقی رہتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی قدرت کاملہ سے نیند کا ایک وقت جبری طور پر مقرر کردیا ہے کہ ہر انسان اور ہر جانور کو اُسی وقت نیند آتی ہے کبھی کسی ضرورت سے جاگنا بھی چاہے تو اُس کے لئے مشکل سے انتظام کرپاتا ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين۔

اسی طرح وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا، میں دن کو نشور یعنی زندگی فرمایا کیونکہ اسکا مقابل یعنی نیند ایک قسم کی موت ہے اور اس زندگی کے وقت کو بھی سارے انسانوں میں جبری طور پر ایک کردیا ہے ورنہ کچھ کارخانے اور دُکانیں دن کو بند رہتیں، رات کو کُھلتیں، اور جب وہ کُھلتیں تو دوسری بند ہوجاتیں۔ اس لحاظ سے دونوں میں کاروباری مشکلات پیش آتیں۔

جس طرح رات کو نیند کے لئے مخصوص فرماکر ایک بڑا انعام حق تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح دوسری ضروریاتِ زندگی جو باہم اشتراک چاہتی ہیں اُن کے لئے بھی تقریبی طور پر ایسے ہی متحد اور مشترک وقت مقرر کردیئے۔ مثلاً بھوک اور کھانے کی ضرورت صبح شام ایک امر مشترک ہے سب کو ان اوقات میں اسکی فکر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں سب ضروریات کی فراہمی ہر ایک کے لئے آسان ہوجاتی ہے کھانے کے ہوٹل اور دُکانیں ان وقتوں میں تیار کھانے سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر گھر میں یہ اوقات کھانے کی مصروفیت کے لئے متعین ہیں۔ یہ تعیین کی بڑی نعمت ہے جو حق تعالیٰ ہی کی حکمت بالغہ نے فطری طور پر انسان کی طبیعت میں رکھدی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا، طہور کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ طہور اُس کو کہا جاتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیزوں کو بھی اُس سے پاک کیا جاسکے۔ حق تعالیٰ نے پانی کو یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جیسے وہ خود پاک ہے اُس سے دوسری ہر قسم کی نجاست حقیقی و معنوی کو بھی دُور کیا جاسکتا ہے۔ اور جس پانی کو آدمی استعمال کرتے ہیں وہ عموماً وہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے کبھی بارش کی صورت میں کبھی برف اور اولے کی صورت میں پھر وہ ہی پانی پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ قدرتی پایپ لائن کی صورت میں ساری زمین پر پھیلتا ہے جو کہیں خود بخود چشموں کی صورت میں نِکل کر زمین پر بہنے لگتا ہے۔ کہیں زمین کھود کر کنویں کی صورت میں نِکالا جاتا ہے یہ سب پانی اپنی ذات سے پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنیوالا ہے اس پر قرآن و سُنت کی نصوص بھی ناطق ہیں اور اُمت کا اجماع بھی۔

یہ پانی جب تک کثیر مقدار میں ہو، جیسے تالاب، حوض، نہر کا پانی اس میں کوئی نجاست بھی گرجائے

تو ناپاک نہیں ہوتا اس پر بھی سب کا اتفاق ہے بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہو اور اسکا رنگ ذائقہ، بُو متغیر نہو، لیکن تھوڑا پانی ہو اور اسمیں نجاست گر جائے تو اسکا کیا حکم ہے؟ اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے اسی طرح پانی کی کثیر و قلیل کی مقدار معین کرنے میں اقوال مختلف ہیں تفسیر مظہری اور قرطبی میں اس جگہ پانی سے متعلق تمام مسائل تفصیل کیساتھ لکھے ہیں اور یہ مسائل عام کتب فقہ میں بھی مذکور ہیں اس لیے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا، اناسی، انسی کی جمع ہے اور بعض نے فرمایا کہ انسان کی جمع ہے۔ آیت میں یہ بتلایا ہے کہ آسمان سے نازل کردہ پانی سے اللہ تعالیٰ زمین کو بھی سیراب کرتا ہے اور جانوروں کو بھی اور بہت سے انسانوں کو بھی۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جس طرح جانور سب کے سب اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی سبھی اس پانی سے فائدہ اُٹھاتے اور سیراب ہوتے ہیں پھر اس میں یہ تخصیص کہ بہت سے انسانوں کو سیراب کیا اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ بہت سے انسان اس سیرابی سے محروم اور الگ ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں بہت سے انسانوں سے وہ جنگل کے رہنے والے لوگ مراد ہیں جنکا عموماً گزارہ بارش کے پانی پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی والے تو نہروں کے کناروں پر کنوؤں کے قریب آباد ہوتے ہیں بارش کے منتظر نہیں رہتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ، مطلب آیت کا یہ ہے کہ بارش کو ہم بدلتے اور پھیرتے رہتے ہیں کبھی ایک شہر میں کبھی دوسرے میں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جو لوگوں میں شہرت ہوتی ہے کہ اس سال بارش زیادہ ہے اس سال کم ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں بلکہ بارش کا پانی تو ہر سال اللہ تعالیٰ کیطرف سے یکساں نازل ہوتا ہے البتہ بحکم الٰہی یہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کی مقدار کسی شہر بستی میں زیادہ کر دی کسی میں کم کر دی۔ بعض اوقات کمی کر کے کسی بستی کے لوگوں کو سزا دینا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادتی بھی عذاب بن جاتی ہے۔ تو یہی پانی جو خالص رحمت ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کرتے ہیں اُن کے لئے اسی کو عذاب اور سزا بنا دیا جاتا ہے۔

جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہاد کبیر ہے

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا، یہ آیت مکی ہے جبکہ احکام کفار سے قتال و جنگ کے نازل نہیں ہوئے تھے اسی لئے یہاں جہاد کو بِهٖ کے ساتھ مقید کیا گیا۔ بِهٖ کی ضمیر قرآن کیطرف راجع ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد، قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اسکے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے اس سب کو یہاں جہاد کبیر فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا، لفظ مَرَجَ آزاد چھوڑ دینے کے معنے میں آتا ہے اسی وجہ سے مَرَج چراگاہ

کو کہتے ہیں جہاں جانور آزادی سے چلیں پھریں اور چریں ۔ عَذْب میٹھے پانی کو کہا جاتا ہے ۔ فُرَات خوش ذائقہ اور خوشگوار مِلْح نمکین اُجَاج تیز و تلخ ۔

حق تعالیٰ نے اپنے فضل اور حکمتِ بالغہ سے دنیا میں دو طرح کے دریا پیدا فرمائے ہیں ۔ ایک سب سے بڑا بحرِ محیط جس کو سمندر کہتے ہیں اور زمین کے سب اطراف اسی میں گھرے ہوئے ہیں ایک چوتھائی کے قریب حصہ ہے جو اس سے کھلا ہوا ہے اسی میں ساری دُنیا آباد ہے ۔ یہ سب سے بڑا دریا بتقاضائے حکمت سخت نمکین تلخ اور بدمزہ ہے ۔ زمین کے آباد حصے پر آسمان سے اُتارے ہوئے پانی کے چشمے، ندیاں نہریں اور بڑے بڑے دریا ہیں یہ سب میٹھے خوشگوار اور خوش ذائقہ ہیں ۔ انسان کو اپنے پینے اور پیاس بجھانے اور روزمرہ کے استعمال میں ایسے ہی شیریں پانی کی ضرورت ہے جو حق تعالیٰ نے زمین کے آباد حصہ میں مختلف صورتوں میں مہیا فرما دیا ہے ۔ لیکن بحرِ محیط سمندر اگر میٹھا ہوتا تو میٹھے پانی کا خاصہ ہے کہ بہت جلد سڑ جاتا ہے ۔ خصوصاً سمندر جس میں خشکی کی آبادی سے زیادہ دریائی انسانوں جانوروں کی آبادی بھی ہے جو اسی میں مرتے ہیں وہیں سڑتے اور مٹی ہو جاتے ہیں اور پوری زمین کے پانی اور اس میں بہنے والی ساری گندگیاں بھی بالآخر سمندر میں جا کر پڑتی ہیں ۔ اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو دو چار دن میں ہی سڑ جاتا، اور یہ سڑتا تو اس کی بدبو سے زمین والوں کو زمین پر رہنا مصیبت ہو جاتا ۔ اسلئے حکمتِ خداوندی نے اس کو اتنا سخت نمکین اور کڑوا اور تیز بنا دیا کہ دُنیا بھر کی گندگیاں اسی میں جا کر بھسم ہو جاتی ہیں اور خود اسی میں رہنے والی مخلوق بھی جو اسی میں مرتی ہے وہ بھی سڑنے نہیں پاتی ۔

آیتِ مذکورہ میں ایک تو اس انعام و احسان کا ذکر ہے کہ انسان کی ضرورت کا لحاظ فرما کر دو قسم کے دریا پیدا فرمائے ۔ دوسرے اس قدرتِ کاملہ کا کہ جس جگہ میٹھے پانی کا دریا یا نہر سمندر میں جا کر گرتے ہیں اور میٹھا اور کڑوا دونوں پانی یکجا ہو جاتے ہیں وہاں یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دونوں پانی میلوں دُور تک اسطرح ساتھ لگے ہوئے چلتے ہیں کہ ایک طرف میٹھا، دوسری طرف کڑوا اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی آڑ حائل نہیں ہوتی ۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ، نسب اس رشتہ اور قرابت کو کہا جاتا ہے جو باپ یا ماں کیطرف سے ہو، اور صہر وہ رشتہ و تعلق ہے جو بیوی کیطرف سے ہو جس کو عرف میں سسرال بولتے ہیں ۔ یہ سب تعلقات اور قرابتیں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی خوشگوار زندگی کے لئے لازمی ہیں، اکیلا آدمی کوئی کام بھی نہیں کر سکتا ۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ، یعنی تمہیں ایمان کی دعوت اور اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے اور دُنیا و آخرت میں تمہارے لئے فلاح کی کوشش کرنے میں میرا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں ۔ میں اپنی اس محنت کا تم سے کوئی اجر و معاوضہ

نہیں مانگتا، میرا فائدہ اسکے سوا نہیں کہ جسکا جی چاہے اللہ کا راستہ اختیار کرلے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص راہ پر آجاوے تو فائدہ اُسی کا ہے اس کو اپنا فائدہ قرار دینا پیغمبرانہ شفقت کیطرف اشارہ ہے کہ میں تمھارے فائدہ ہی کو اپنا فائدہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی بوڑھا ضعیف باپ اولاد کو کہے کہ تم کھاؤ پیو اور خوش رہو، یہی میرا کھانا پینا اور خوش رہنا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسکو اپنا فائدہ اس لحاظ سے فرمایا ہو کہ اسکا ثواب آپ کو ملے گا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ جو شخص کسی کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا ہے اور وہ اسکے کہنے کے مطابق نیک عمل کرے تو اسکے عمل کا ثواب خود کرنے والے کو بھی پورا پورا ملے گا اور اتنا ہی ثواب ہدایت کرنے والے شخص کو بھی ملے گا (مظہری)

فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا، یعنی آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنا پھر اپنی شان کے مطابق اُن پر جلوہ افروز ہونا سب اللہ رحمٰن کا کام ہے اس کی تصدیق و تحقیق مطلوب ہو تو کسی باخبر سے پوچھیے۔ باخبر سے مراد حق تعالیٰ یا جبرئیل امین ہیں اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مُراد کتبِ سابقہ کے علماء ہوں جن کو اپنے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس معاملہ کی اطلاع ملی ہے۔ (مظہری)

قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ لفظ رحمٰن عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی سب عرب جانتے تھے مگر یہ لفظ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ بولتے تھے اسی لئے یہاں یہ سوال کیا کہ رحمٰن کون اور کیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝

مقصود ان آیات سے انسان کو یہ بتلانا ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے اور شمس و قمر اور انکے ذریعہ رات دن کا انقلاب اور انکی تاریکی اور روشنی اور زمین و آسمان کی تمام کائنات اسلئے پیدا کئے ہیں کہ غور و فکر کرنیوالے کو اسمیں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور توحید کے دلائل فراہم ہوں۔ اور شکرگزار کے لئے شکر کے مواقع ملیں تو جس شخص کا وقت دُنیا میں ان دونوں چیزوں سے خالی گزر گیا اسکا وقت ضائع ہوگیا اور اسکا راس المال بھی فنا ہوگیا اللّٰھم اجعلنا من الذاکرین الشاکرین۔

ابن عربی فرماتے ہیں کہ میں نے شہید اکبر سے سُنا ہے کہ بڑے غبن اور خسارہ میں ہے وہ آدمی جسکی عمر ساٹھ سال ہوئی۔ اسمیں سے آدھا وقت تیس سال رات کو سونے میں گزر گئے اور چھٹا حصہ یعنی دس سال دن کو آرام کرنے میں گزر گیا تو ساٹھ میں سے صرف بیس سال کام میں لگے۔ قرآن حکیم نے اس جگہ بڑے بڑے ستاروں اور سیاروں اور فلکیات کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن ان چیزوں کا ذکر بار بار اسلئے کرتا ہے کہ تم ان کی تخلیق اور ان کی حرکات اُن سے پیدا ہونے والے آثار میں غور کرکے اُن کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے کو پہچانو اور شکرگزاری کیساتھ اُسے یاد کرتے رہو۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اجرام سماویہ اور فلکیات کی حقیقت اور ہیئت کیا ہے یہ آسمانوں کے جرم کے اندر سمائے ہوئے ہیں یا اُن سے باہر کی فضائی آسمانی میں ہیں۔ انسان کے معاش یا معاد کا کوئی مسئلہ اس سے وابستہ نہیں اور ان کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے

لئے آسان بھی نہیں۔ جن لوگوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کی ہیں انکے اقرار سے ثابت ہے کہ وہ بھی کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں کرسکے اور جو فیصلے کئے وہ بھی خود دوسرے حکماء کی مخالف تحقیقات نے مخدوش مجروح کردیئے، اس لئے تفسیر قرآن میں اس سے زیادہ کسی بحث میں پڑنا بھی کوئی قرآن کی ضروری خدمت نہیں۔ لیکن اس زمانے کے ماہرین سائنس نے مصنوعی سیارات اُڑانے اور چاند تک پہنچ جانے اور وہاں کی مٹی پتھر، غاروں، پہاڑوں کے فوٹو فراہم کرنے میں بلاشبہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے مگر افسوس ہے کہ قرآن حکیم ان چیزوں سے انسان کو جس حقیقت شناسی کا سبق دینا چاہتا ہے یہ لوگ اپنی تحقیقی کاوشوں کے غرور میں مست ہوکر اُس سے اور زیادہ دُور ہوگئے اور عام لوگوں کے ذہنوں کو بھی بُری طرح اُلجھا دیا، کوئی ان چیزوں کو قرآن کے خلاف سمجھ کر مشاہدات کا ہی انکار کردیتا ہے کوئی قرآن کریم میں تاویلات کرنے لگتا ہے اسلئے ضروری معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو واضح کردیا جائے۔ سُورَۃ حجر کی آیت وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا کے تحت اسکا وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ سُوْرَۃ فرقان میں اسکی تفصیل لکھی جاویگی وہ حسب ذیل ہے وَاللّٰہُ الموفق

قدیم وجدید علم ہیئت کے نظریات اور قرآن کریم کے ارشادات جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا کے الفاظ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بُروج یعنی سیارے آسمانوں کے اندر ہیں کیونکہ حرف فی ظرفیت کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح سُوْرَۃ نوح میں ہے اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا اسمیں فِيْهِنَّ کی ضمیر سبع سماوات کی طرف راجع ہے جس سے ظاہراً یہی مفہوم ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں کے اندر ہے۔ لیکن یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ قرآن کریم میں لفظ سماء جس طرح اس عظیم الشان اور وہم و گمان سے زائد وسعت رکھنے والی مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے جسمیں قرآن کی تصریحات کے مطابق دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کے پہرے ہیں جو خاص خاص اوقات میں کھولے جاتے ہیں اور جن کی تعداد قرآن کریم نے سات بتلائی ہے اسی طرح یہ لفظ سماء ہر بلند چیز جو آسمان کی طرف ہو اُس پر بھی بولا جاتا ہے۔ آسمان زمین کے درمیان کی فضاء اور اُس سے آگے جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا بولتے ہیں یہ سب دوسرے معنی کے اعتبار سے لفظ سماء کے مفہوم میں داخل ہیں۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً طَهُوْرًا ، اور اسیطرح کی دوسری آیتیں جنمیں آسمان سے پانی برسانے کا ذکر ہے ان کو اکثر مفسرین نے اسی دوسرے معنی پر محمول فرمایا ہے کیونکہ عام مشاہدات سے بھی یہ ثابت ہے کہ بارش ان بادلوں سے برستی ہے جو آسمان کی بلندی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اور خود قرآن کریم نے بھی دوسری آیات میں بادلوں سے پانی برسانے کی تصریح فرمائی ہے ارشاد ہے ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ اسمیں مزن، مزنۃ کی جمع ہے جس کے معنی سفید بادل کے آتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ کیا بارش کو سفید بادلوں

سے تم نے اُتارا ہے یا ہم نے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا، اس میں معصرات کے معنی پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے ہی پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا۔ قرآن مجید کی ان واضح تصریحات اور عام مشاہدات کی بنا پر جن آیاتِ قرآن میں بارش کا آسمان سے برسانا مذکور ہے اُن میں بھی اکثر مفسرین نے لفظ سماء کے یہی دوسرے معنی لئے ہیں یعنی فضاء آسمانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم اور لغت کی تصریحات کیمطابق لفظ سماء فضائے آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خود جرم آسمان کیلئے بھی۔ تو ایسی صورتیں جن آیات میں کواکب اور سیارات کیلئے فِی السَّمَآءِ کا لفظ استعمال ہوا ہے اُسکے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں۔ اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کیطرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا اُن سے باہر فضائے آسمانی میں۔ بلکہ الفاظِ قرآن کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ کائنات کی تحقیقات اور تجربے اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہو جائے قرآن کی کوئی تصریح اسکے منافی نہیں ہے۔

حقائقِ کونیہ اور قرآن یہاں ایک بات اُصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جسکا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اسکے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور اُنکے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے اُنمیں غور و فکر کیطرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائقِ کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اسکے عقیدے اور نظریے کی درستی سے ہو یا اسکے دینی اور دنیوی منافع اُن سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآنِ کریم نے آسمان و زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور اُن کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب و غریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہوگئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحبِ قدرت و قوت ہے۔ اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں، سیاروں کے مادے کی حقیقت اور اُن کی اصلی ہیئت و صورت اور اُن کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اسکے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جسکو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس و قمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب و غریب نظام سے جسمیں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا ان سب اُمور سے

ایک ادنیٰ عقل و بصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا کوئی اسکو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اسکی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اُسی حد تک ان چیزوں میں غور و فکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسُولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام سماویہ کی ہیئتیں دریافت کرنیکا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیاتِ کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا یہ مطلب ہوتا کہ اُنکے حقائق اور ہیئات اور اُن کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکا اہتمام نہ فرماتے، خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ دُنیا میں اُسوقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے فیثا غورس کا اور اُسکے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دُنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور اُس زمانے کے حالات کے مناسب آلاتِ رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے مگر جس ذاتِ قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابۂ کرام نے بلا واسطہ آپ سے ان کو پڑھا اُنھوں نے کبھی اسطرف التفات تک نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیاتِ کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا وہ منشا ہرگز نہ تھا جو آجکل کے بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اور اُس کی تحقیقات سے متأثر ہو کر اختیار کیا ہے کہ خلائی سفر، چاند اور مریخ و زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کیطرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ اُن سے بحث کرتا ہے اور نہ اُن کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول اسلوب کائنات و مخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اُسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جسقدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے۔ فلسفیانہ دور دراز کا بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں اُلجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزلِ مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات و مخلوقات سے آگے اپنے خالق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائقِ کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پُورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے

اکتشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جاسکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضاء، ابر و باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم و فنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں سے قرآن حکیم صرف اُن کی رُوح اور مشاہداتی حصہ کو اسقدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دُنیوی ضرورت متعلق ہے، دور از کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت بھی پائی جاتی ہے۔

تفسیر قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار

علماءِ اہلِ حق قدیم و جدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآنِ کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے، اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اُس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں، اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا، البتہ جن مسائل میں قرآن کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں الفاظ قرآنی میں دونوں معنے کی گنجائش ہے وہاں اگر مشاہدات اور تجربے سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیتِ قرآن کو بھی اُسی معنی پر محمول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسے اسی آیت جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا میں ہے کہ قرآن کریم نے اس بارہ میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا کہ ستارے آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضائے آسمانی میں ہیں۔ آجکل جبکہ خلائی تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان سیارات تک پہنچا جاسکتا ہے تو اس سے فیثاغورسی نظریہ کی تائید ہوگئی کہ ستارے آسمانوں میں پیوست نہیں کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صریحہ کی تصریحات کی رُو سے آسمان ایک ایسا حصار ہے جسمیں دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے اُن میں ہر شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ اس مشاہدے اور تجربے کی بناء پر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا جائیگا کہ کواکب کو فضائے آسمانی میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ دو مفہوم میں سے ایک کی تعیین ہے۔

لیکن اگر کوئی سرے سے آسمانوں کے وجود کا انکار کرے جیسے بعض ہیئتِ جدید والے کہتے ہیں یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ راکٹوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ آسمانوں کے اندر داخلہ ہو سکتا ہے تو از روئے قرآن اُس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا کیونکہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں یہ بات واضح طور پر بتلائی ہے کہ آسمانوں میں دروازے ہیں اور وہ دروازے خاص خاص حالات میں کھولے جاتے ہیں ان دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ مسلط ہے۔ آسمانوں میں داخلہ ہر شخص کا جب چاہے نہیں ہو سکتا، اس دعوے کی وجہ سے اُن آیات میں کوئی تاویل نہیں کیجائیگی اور اس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح جبکہ قرآن کریم کی آیت كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملہ میں بطلیموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائیگا جس کی رُو سے ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع اُن کی حرکت ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قدیم مفسرین میں سے بعض لوگ جو فلکیات کے متعلق بطلیموسی نظریہ کے معتقد تھے اُنھوں نے اُن آیاتِ قرآنی میں تاویلات سے کام لیا جن سے بطلیموسی نظریہ کیخلاف کوئی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح آج کے بعض مصنفین جن آیات کو جدید ہیئت کے نظریات سے مختلف سمجھتے ہیں انہیں تاویلات کر کے اُسکے مطابق بنانے کی فکر کرتے ہیں یہ دونوں صورتیں درست نہیں سلف صالحین کے طریقے کیخلاف اور قابلِ تردید ہے۔ البتہ واقعہ یہی ہے کہ اسوقت تک ہیئتِ جدید نے جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں اُن میں آسمانوں کے انکار کے سوا کوئی بھی قرآن و سُنت کیخلاف نہیں، بعض لوگ اپنے قصورِ علم سے اُن کو قرآن یا سنت کیخلاف سمجھ کر تاویلات کے درپے ہو جاتے ہیں۔

زمانۂ حال کے سب سے بڑے مفسر قرآن سید محمود آلوسی بغدادی جن کی تفسیر روح المعانی علماءِ سلف کی تفاسیر کا بہترین خلاصہ اور عرب عجم مشرق و مغرب میں مقبول و مستند تفسیر ہے۔ موصوف جسطرح قرآن و سُنت کے متبحر عالم ہیں اسی طرح فلسفہ و ہیئت قدیم و جدید کے بھی بڑے عالم ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تفسیر میں تحقیقاتِ فلسفیہ کے متعلق یہی اُصول قرار دیا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے پوتے علامہ سید محمود شکری آلوسی نے ان مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے ما دل علیہ القرآن مما یعضد الھیئۃ الجدیدۃ القویمۃ البرھان جسمیں ہیئت جدیدہ کے نظریات کی تائید قرآن کریم کی روشنی میں کی گئی ہے مگر دوسرے تجدد پسند علماء کی طرح قرآنی آیات میں کسی قسم کی تاویل کو روا نہیں رکھا۔ اُن کے چند جملے اس جگہ نقل کر دینا کافی ہیں جو ہیئتِ جدیدہ کی تائید میں لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں:

رأیت کثیرا من قواعدھا لا یعارض النصوص الواردۃ فی الکتاب والسنۃ علی انھا لو خالفت شیئا من ذلک لم یلتفت الیھا ولم نؤول النصوص لاجلھا والتاویل فیھا لیس من مذاھب السلف الحریۃ بالقبول بل لا بد ان نقول ان المخالف لھا مشتمل علی خلل فیہ فان العقل الصریح لا یخالف النقل الصحیح بل کل منھما یصدق الأخر ویؤیدہ (ما دل علیہ القرآن)	میں نے ہیئتِ جدیدہ کے بہت سے قواعد کو دیکھا ہے وہ قرآن و سنت کی نصوص کیخلاف نہیں۔ اور اسکے باوجود اگر وہ قرآن و سُنت کی کسی نص کیخلاف ہو تو ہم اسکی طرف رُخ نہ کرینگے اور قرآن و سنت کی نصوص میں اس کیوجہ سے تاویل نہ کریں گے کیونکہ ایسی تاویل سلف صالحین کے مذہب مقبول میں نہیں ہے بلکہ ہم اُسوقت یہ کہیں گے کہ جو نظریہ قرآن و سنت کیخلاف ہے اس میں ہی کوئی خلل ہے کیونکہ عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فلکیات اور ستاروں، سیاروں کی حرکات اور ہیئات کے متعلق بحث و تحقیق کوئی نیا فن نہیں، ہزاروں سال پہلے سے ان مسائل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ مصر، شام، ہند

چین وغیرہ میں ان فنون کا چرچا قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے اس فن کا بڑا معلّم فیثاغورس گزرا ہے جو اطالیہ کے مدرسہ کروتونا میں باقاعدہ اس کی تعلیم دیتا تھا، اس کے بعد میلاد مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایکسو چالیس سال پہلے اس فن کا دوسرا محقق بطلیموس رومی آیا اور اسی زمانے میں ایک دوسرے فلاسفر ہیپرخوس کی شہرت ہوئی جسنے زاویئے ناپنے کے آلات ایجاد کئے۔

فیثاغورس اور بطلیموس کے نظریات ہیئتِ افلاک کے متعلق بالکل ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ بطلیموس کو اپنے زمانے کی حکومت اور عوام کا تعاون حاصل ہوا۔ اسکا نظریہ اتنا پھیلا کہ فیثاغورس کا نظریہ گوشۂ گمنامی میں جا پڑا۔ اور جب یونانی فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو یہی بطلیموسی نظریہ ان کتابوں میں منتقل ہوا اور اہل علم میں عام طور سے یہی نظریہ جانا پہچانا گیا۔ بہت سے مفسرین نے آیات قرآنیہ کی تفسیر میں بھی یہی نظریہ سامنے رکھکر کلام کیا۔ گیارہویں صدی ہجری اور پندرہویں صدی عیسوی جسمیں اقوام یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا اور یوروپین محققین نے ان مسائل پر کام کرنا شروع کیا جن میں سب سے پہلے کوپرنک پھر جرمنی میں کیپلر اور اطالیہ میں گلیلیو وغیرہ کے نام آتے ہیں انہوں نے ازسرنو ان مباحث کا جائزہ لیا، یہ سب اس پر متفق ہو گئے کہ ہیئت افلاک کے متعلق بطلیموسی نظریہ غلط اور فیثاغورس کا نظریہ صحیح ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری میں اسحٰق نیوٹن کی شہرت ہوئی۔ اس کی تحقیقات و ایجادات نے اس کو مزید تقویت پہنچائی۔ اس نے یہ تحقیق کی کہ وزنی چیزیں اگر ہوا میں چھوڑی جائیں تو اُنکے زمین پر آگرنے کا سبب وہ نہیں جو بطلیموسی نظریہ میں بتلایا گیا ہے کہ زمین کے وسط میں مرکزِ عالم ہے اور تمام وزنی چیزیں مرکز کی طرف فطرۃً رجوع کرتی ہیں بلکہ اُسنے بتلایا کہ جتنے ستارے اور سیارات ہیں سب میں ایک جذب وکشش کا مادہ ہے زمین بھی اسی طرح کا ایک سیارہ ہے اسمیں بھی کشش ہے۔ جس حد تک، زمین کی کشش کا اثر رہتا ہے وہاں سے ہر وزنی چیز زمین پر آویگی لیکن اگر کوئی چیز اسکی کشش کے دائرہ سے باہر نکل جائے تو وہ پھر نیچے نہیں آئے گی۔

حال میں روسی اور امریکی ماہرین نے قدیم اسلامی فلاسفر ابوریحان بیرونی کی تحقیقات کی امداد سے راکٹ وغیرہ ایجاد کر کے اسکا عملی تجربہ اور مشاہدہ کر لیا کہ راکٹ جب اپنی شدید قوت اور تیز رفتاری کے سبب زمین کی کشش کو توڑ کر اسکے دائرہ سے باہر نکل گیا تو پھر یہ نیچے نہیں آتا بلکہ ایک مصنوعی سیارے کی صورت اختیار کر لیتا اور اپنے مدار پر چکّر لگاتا ہے۔ پھر ان مصنوعی سیاروں کا تجربہ کرتے کرتے اسکے ماہرین نے سیارات تک پہنچنے کی تدبیریں شروع کیں اور بالآخر چاند پر پہنچ گئے جس کی تصدیق اس زمانے کے تمام ماہرین فن موافق و مخالف نے کی اور ابتک چاند پر بار بار جانے، وہاں کے پتھر، خاک وغیرہ لانے اور اسکے فوٹو مہیا کرنیکا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے سیارات تک

پہنچنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں اور خلا نوردی خلا پیمائی کی مشقیں جاری ہیں۔

ان میں سے امریکن خلا نورد جان گلین جو کامیابی کے ساتھ خلا کا سفر کر کے واپس آیا اور اسکی کامیابی پر اسکے موافق و مخالف سبھی نے اعتماد کیا، اسکا ایک بیان امریکہ کے مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ میں اور اسکا اُردو ترجمہ امریکہ کے اُردو ماہنامہ سیربین میں مفصل شائع ہوا ہے، یہاں اسکے اہم اقتباسات ماہنامہ سیربین سے نقل کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے زیر بحث مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے

جان گلین نے اپنے طویل مقالہ میں خلا کے عجائب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہی وہ ایک واحد شئی ہے جو خلا میں خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اور یہ کہ کوئی طاقت ہے جو ان سب کو مرکز و محور سے وابستہ رکھتی ہے۔"

آگے لکھا ہے کہ:

"اس کے باوجود خلا میں پہلے ہی سے جو عمل جاری ہے اسکو دیکھتے ہوئے ہماری کوششیں انتہائی حقیر ہیں۔ سائنسی اصطلاحات و پیمانوں میں خلائی پیمائش ناممکن ہے۔"

آگے ہوائی جہاز کی مشینی قوت کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ:

"لیکن ایک یقینی اور غیر محسوس قوت کے بغیر اسکا استعمال بھی محدود اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اسلئے کہ جہاز کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تعیینِ رُخ کی حاجت ہوتی ہے اور یہ کام قطب نما سے لیا جاتا ہے۔ وہ قوت جو قطب نما کو متحرک رکھتی ہے ہمارے تمام حواسِ خمسہ کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں نہ چکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں حالانکہ نتائج کا ظہور اسپر واضح دلالت کر رہا ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پوشیدہ قوت ضرور موجود ہے۔"

آگے سب سیر و سفر کے نتیجہ کے طور پر لکھتا ہے:

"عیسائیت کے اُصول و نظریات کی حقیقت بھی ٹھیک یہی کچھ ہے۔ اگر ہم ان کو اپنا رہنما بنائیں تو باوجودیکہ ہمارے حواس ان کے ادراک سے عاجز ہوتے ہیں لیکن اس رہنما قوت کے نتائج و تاثرات اپنے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی زندگیوں میں کھلی آنکھوں دیکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور اس بنا پر کہتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک رہنما قوت موجود ہے۔"

یہ ہیں خلاء کے مسافروں اور سیارات پر کمند پھینکنے والوں کی کمائی کے حاصلات جو آپ نے امریکی خلا نورد کے بیان میں پڑھ لیں کہ اس تمام تگ و دَو کے نتیجہ میں رازِ کائنات اور اس کی حقیقت تک رسائی تو کیا ہوتی بے حد و بے حساب سیارات و نجوم کی گردشوں کا ادراک ہو کر اور حیرانی بڑھ گئی۔

سائنسی آلات سے اُنکی پیمائش کے ناممکن ہونے اور اپنی سب کوششوں کی اس کے مقابلہ میں حقارت کا اقرار و اعتراف کرنا پڑا۔ بس حاصل اتنی بات ہوئی کہ یہ سب نظامِ کائنات اور نجوم و سیارات خود بخود نہیں، بلکہ کسی عظیم اور غیر محسوس طاقت کے زیر فرمان چل رہے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جسکو انبیاء علیہم السلام نے پہلے قدم پر عام انسانوں کو بتلا دیا تھا اور قرآن کریم کی بیشمار آیات میں اسی چیز کا یقین دلانے کے لئے آسمان و زمین، نجوم و سیارات وغیرہ کے حالات پر غور و فکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ جس طرح زمین میں بیٹھ کر آسمانی فضاؤں اور نجوم و سیارات کی تحقیقات و ہیئات پر فلسفیانہ بحثیں کرنے والے ان چیزوں کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے اور بالآخر اپنے عجز و بے بسی کا اعتراف کیا۔ اسی طرح یہ زمین سے لاکھوں میل اُوپر کا سفر کرنیوالے اور چاند کے پتھر اور مٹی اور وہاں کے فوٹو لانے والے بھی حقیقت شناسی کے میدان میں کچھ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ان تحقیقات نے انسان اور انسانیت کو کیا بخشا جہانتک انسانی جد و جہد اور فکری ارتقاء اور اسکی اعجوبہ کاری اور حیرت انگیز انکشافات کا معاملہ ہے وہ اپنی جگہ درست اور عام نظروں کے اعتبار سے قابلِ تحسین بھی ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ بے مصرف شعبدہ گری اور تماشبینی جس سے انسان اور انسانیت کا کوئی معتدبہ فائدہ نہ ہو وہ حکماء و عقلاء کا کام نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس پچاس سال کی جد و جہد اور اربوں کھربوں روپیہ جو بہت سے انسانوں کے مصائب دُور کرنے کے لئے کافی ہوتا اُس کو آگ کی نذر کر دینے اور چاند تک پہنچ کر وہاں کی خاک اور پتھر سمیٹ لانے سے انسان اور انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا۔ انسان کی بڑی بھاری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بھوک سے مرتے ہیں اُن کو لباس اور سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں، کیا اس جد و جہد نے انکے افلاس و مصیبت کا کوئی حل نکالا، یا انکے امراض و آفات سے صحت و عافیت کا کوئی انتظام کیا یا انکے لئے قلبی سکون و راحت کا کوئی سامان فراہم کیا؟ تو یقین ہے کہ کسی کے پاس اسکا جواب بجز نفی کے نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و سُنت انسان کو ایسے لایعنی مشغلے میں مبتلا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور کائناتِ عالم میں غور و فکر اور تدبیر کی دعوت صرف دو حیثیتوں سے دیتے ہیں۔ پہلی حیثیت جو اصل مقصود ہے یہ ہے کہ ان آثار عجیبہ کو دیکھ کر مؤثر حقیقی اور اُس غیر محسوس قوت کا یقین کرلیں جو اس سارے نظام کو چلا رہی ہے، اُسی کا نام خدا ہے۔ دوسرے ان زمینی اور آسمانی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لئے ہر ضرورت کی چیز ودیعت فرما دی ہے انسان کا کام یہ ہے کہ اپنی عقل و شعور اور جد و جہد سے کام لیکر اُن چیزوں کو زمین کے خزائن سے نکالنے اور استعمال کرنے کے طریقے سیکھ لے۔ پہلی حیثیت اصل مقصود ہے اور دوسری حیثیت ثانوی

رفع ضرورت کے لئے ہے اس لئے ضرورت سے زائد اسمیں انہماک پسندیدہ نہیں اور کائناتِ عالم میں غور و فکر اور تدبر کی دونوں حیثیتیں انسان کے لئے آسان بھی ہیں نتیجہ خیز بھی ۔ اور ان دونوں حیثیتوں کے نتائج میں قدیم و جدید فلاسفہ کا کوئی اختلاف بھی نہیں ۔ ان کے سب اختلافات افلاک اور سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہیں جن کو قرآن نے بے ضرورت اور ناقابلِ حصول قرار دیکر نظر انداز کر دیا ہے ۔ علامہ بخیت مفتئ مصر نے اپنی کتاب توفیق الرحمٰن میں علم ہیئت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ وصفی ہے جو اجرام سماویہ کی حرکات اور حسابات سے متعلق ہے ۔ دوسرا عملی جو ان حسابات کو معلوم کرنے کے لئے آلاتِ قدیمہ وجدیدہ سے متعلق ہے ۔ تیسرا طبعی، جو افلاک و سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہے اور لکھا ہے کہ پہلی دونوں قسموں میں ماہرین قدیم وجدید میں اختلاف کالعدم ہے ۔ آلات ادراک میں بہت بڑا اختلاف ہونے کے باوجود نتائج پر اکثر امور میں سب کا اتفاق ہے ان کا شدید اختلاف صرف تیسری قسم میں ہے ۔

غور کیجئے تو انسانی ضرورت کے متعلق بھی یہی پہلی دو قسمیں ہیں ۔ تیسری قسم دوراز کار بھی ہے اور مشکل بھی ۔ اسی لئے قرآن و سنت اور عام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات نے انسان کو اس تیسری بحث میں نہیں اُلجھایا، اور بزرگانِ سلف نے یہ نصیحت فرمائی ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو ❊ نینگیختن علت از کارِ تو

مہندس بسے جوید از رازِ شاں ❊ نداند کہ چوں کردی آغازِ شاں

صوفیائے کرام جو نظر کشفی سے ان چیزوں کو دیکھتے ہیں ان کا فیصلہ بھی انجام کار وہی ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم ❊ کہ حیرت گرفت آستینم کہ قُم

حافظ شیرازی نے اپنی لَے میں فرمایا ؎

سخن از مطرب و می گوی راز دہر کمتر جو ❊ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک و فضاء اور کائنات ارضی میں غور و فکر اس حیثیت سے کہ اُن سے پیدا کرنے والے کے وجود اور توحید اور اس کی بے مثال علم و قدرت پر استدلال کیا جاسکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جابجا اسکی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشاء قرآنی ہے اور قرآن اسکی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کیساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دیکر اسمیں انہماک نہ کرے بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کیطرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اسکے مطابق اسمیں مشغول ہو ۔ اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اسکا حصول بھی

مشکل ہے اُس میں عمرِ عزیز صرف کرنے سے گریز کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات و تحقیقات کو عین منشار قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیساکہ بعض تجدد پسند علمار نے لکھا ہے اور قرآن کو اُن کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیساکہ بعض قدامت پسند علمار نے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اسکا موضوعِ بحث ہے نہ انسان کے لئے اُن کا حاصل کرنا آسان ہے نہ انسانی ضروریات سے اسکا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے، تجربات و مشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہوجائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اُٹھانا وغیرہ سب اسمیں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہوجائے تو اسکے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہو خواہ مخواہ اسکے تصورات باندھنا اور اسمیں عمرِ عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ واللہ سُبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عِبَادُ الرَّحْمٰنِ[1]

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

اور بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں اور جب بات کرنے لگیں

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾

اُن سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ میں اور کھڑے

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا

اور وہ لوگ کہ کہتے ہیں اے رب ہٹا ہم سے دوزخ کا عذاب بیشک اسکا عذاب

كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ

چمٹنے والا ہے وہ بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور بُری جگہ رہنے کی اور وہ لوگ کہ جب

اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَ

خرچ کرنے لگیں نہ بیجا اُڑائیں اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ ایک سیدھی گزران اور

الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ

وہ لوگ کہ نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ دوسرے حاکم کو اور نہیں خون کرتے جان کا جو منع کردی

اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ

اللہ نے مگر جہاں چاہیئے اور بدکاری نہیں کرتے اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں دونا ہوگا

[1] یہاں یہ عنوان اس لئے قائم کر دیا گیا ہے کہ اس کو مستقل رسالہ کی صورت میں اس نام سے شائع کیا جاسکتا ہے اور جب ایسا کیا جائے تو اسکے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھدی جاوے ۱۲ محمد شفیع

لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ

اس کو عذاب قیامت کے دن اور پڑا رہے گا اس میں خوار ہو کر مگر جس نے توبہ کی اور

اٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ

یقین لایا اور کیا کچھ کام نیک سو اُن کو بدل دیگا اللہ برائیوں کی جگہ بھلائیاں

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ

اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان اور جو کوئی توبہ کرے اور کرے کام نیک سو وہ

يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا

پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں

بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا

کھیل کی باتوں پر نکل جائیں بزرگانہ اور وہ لوگ کہ جب اُن کو سمجھائیے ان کے رب کی باتیں نہ پڑیں

عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا

اُن پر بہرے اندھے ہو کر اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب دے ہم کو ہماری عورتوں کی طرف سے

وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ

اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک اور کر ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا ان کو بدلہ ملے گا

الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ

کوٹھوں کے جھروکے اسلئے کہ وہ ثابت قدم رہے اور لینے آئیں گے ان کو وہاں دعا اور سلام کہتے ہوئے سدا رہا کریں

فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ

اُن میں خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ رہنے کی تو کہہ پرواہ نہیں رکھتا میرا رب تمہاری

لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

اگر تم اس کو نہ پکارا کرو سو تم تو جھٹلا چکے اب آگے کو ہوتی ہے مٹھ بھیڑ

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں (مطلب یہ کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے تمام اُمور میں، اور اسی کا اثر چلنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور خاص چال کی ہیئت بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ دماغ داری کے ساتھ نرم رفتاری موجب مدح نہیں اور یہ تواضع تو ان کا طرز خاص اپنے اعمال میں ہے) اور (دوسروں کے ساتھ ان کا طرز یہ ہے کہ) جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات (چیت) کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں

(مطلب یہ کہ اپنے نفس کے لئے انتقام قولی یا فعلی نہیں لیتے اور جو خشونت تادیب و اصلاح و سیاستِ شرعیہ یا اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے ہو اس کی نفی مقصود نہیں) اور جو (اللہ کے ساتھ اپنا یہ طرز رکھتے ہیں کہ) راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں اور جو (باوجود ادائے حقوق اللہ و حقوق العباد کے اللہ تعالیٰ سے اسقدر ڈرتے ہیں کہ) دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کے عذاب کو دور رکھئے کیونکہ اسکا عذاب پوری تباہی ہے، بیشک وہ جہنم برا ٹھکانا اور برا مقام ہے (یہ تو ان کی حالت طاعاتِ بدنیہ میں ہے) اور (طاعاتِ مالیہ میں انکا یہ طریقہ ہے کہ) وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں (کہ معصیت میں صرف کرنے لگیں) اور نہ تنگی کرتے ہیں (کہ طاعتِ ضروریہ میں بھی خرچ کی کوتاہی کریں، اور اسراف میں وہ خرچ بھی آگیا کہ بلا ضرورت استطاعت سے زیادہ مباحات میں یا طاعاتِ غیر ضروریہ میں خرچ کریں جسکا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنیتی ہو کیونکہ یہ امورِ معصیت ہیں اور جو چیز معصیت کا سبب بنے وہ بھی معصیت ہے اس لئے وہ بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا انجام کار ہو گیا۔ اسی طرح طاعاتِ ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کرنے کی مذمت لَمْ يَقْتُرُوْا سے مفہوم ہو گئی کیونکہ جب خرچ میں کمی کرنا جائز نہیں تو عدم انفاق تو بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہو گا پس یہ شبہ نہ رہا کہ خرچ میں کمی کرنے کی تو نفی اور نہی ہو گئی لیکن عدم الانفاق بالکلیہ کی نفی اور نہی نہ ہوئی۔ غرض وہ انفاق میں افراط و تفریط دونوں سے مبرا ہیں) اور ان کا خرچ کرنا اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (اور یہ حالتِ مذکورہ تو طاعات کی ادائیگی سے متعلق تھی) اور جو (گناہ سے بچنے میں یہ شان رکھتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے (جو معصیت متعلق عقائد کے ہے) اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے (قواعد شرعیہ کی رو سے) حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر (یعنی جب قتل کے وجوب یا اباحت کا کوئی سبب شرعی پایا جاوے اسوقت اور بات ہے) اور وہ زنا نہیں کرتے (کہ یہ قتل و زنا اعمال کے متعلقہ گناہوں میں سے ہیں) اور جو شخص ایسے کام کریگا (کہ شرک کرے یا شرک کیساتھ قتل ناحق بھی کرے یا زنا بھی کرے جیسے مشرکین مکہ تھے) تو سزا سے اس کو سابقہ پڑیگا کہ قیامت کے روز اسکا عذاب بڑھتا چلا جائیگا (جیسا کفار کے حق میں دوسری آیات میں آیا ہے زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ) اور وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل (و خوار) ہو کر رہے گا (تاکہ عذاب جسمانی کے ساتھ ذلت کا عذابِ روحانی بھی ہو اور شدتِ عذاب یعنی تضاعف کیساتھ مقدار کی زیادتی یعنی خلود بھی ہو اور مراد اس وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ سے کفار و مشرکین ہیں بقرینۂ يُضٰعَفْ وَيَخْلُدْ وَ اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ کیونکہ مؤمن گناہگار کے لئے عذاب میں زیادتی اور خلود نہ ہو گا بلکہ اسکا عذاب اس کو پاک صاف کرنے کے لئے ہو گا نہ کہ اہانت کے لئے، اور اس کے لئے تجدید ایمان کی ضرورت نہیں صرف توبہ

کافی ہے جسکا آگے بیان ہے وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ الخ نیز قرائن مذکورہ کے سوا صحیحین میں ابن عباسؓ سے شانِ نزول بھی اسکا یہی منقول ہے کہ مشرکین کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی) مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ کرلے اور (اس توبہ کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ) ایمان (بھی) لے آوے اور نیک کام کرتا رہے (یعنی ضروری طاعات کو بجالاتا رہے) تو (اس کو جہنم میں خلود تو کیا ہوتا جہنم سے ذرا بھی مس نہ ہوگا بلکہ) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں (کو محو کرکے ان) کی جگہ (آئندہ) نیکیاں عنایت فرمائیگا (یعنی چونکہ گزشتہ کفر و گناہ زمانہ کفر کے بعد اسلام کی برکت سے معاف ہو جاویں گے اور آئندہ بوجہ اعمال صالحہ کے حسنات لکھی جاتی رہیں گی اور ان پر ثواب ملیگا اس لئے جہنم سے ان کا کچھ تعلق نہ ہوگا، پس اِلَّا استثناء منقطع ہے اور مَنْ تَابَ کی خبر فَاُولٰٓئِكَ الخ ہے اور مقصود بالحکم تبدیل سیئات بالحسنات ہے جو مجموعۂ ایمان و توبہ و عمل صالح پر مرتب ہے اور جہنم کی آگ سے محفوظ رہنا اسکا لازمی اثر ہے اور جہنم میں دخول ہی نہیں تو خلود نہ ہونا ظاہر ہے، یا استثناء متصل ہو اور عدم خلود کے لئے مجموعۂ ایمان و توبہ و عمل صالح شرط نہ ہو مگر مجموعہ کے ساتھ عدم خلود کا پایا جانا اس آیت میں مذکور ہوا اور صرف ایمان پر عدم خلود کا مرتب ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہو) اور (یہ محو سیئات و ثبت حسنات اسلئے ہوا کہ) اللہ تعالیٰ غفور ہے (اسلئے سیئات کو محو کردیا اور) رحیم ہے (اسلئے حسنات کو قایم فرمایا۔ یہ تو تائب عن الکفر کا بیان تھا) اور (آگے اُس مؤمن کا ذکر ہے جو گناہ سے توبہ کرے تاکہ مضمون توبہ کا پورا ہوجائے و نیز مقبول بندوں کے بقیہ اوصاف کا بیان ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ طاعات کے پابند اور سیئات سے پرہیز کے عادی رہتے ہیں لیکن اگر احیاناً صدورِ معصیت ہوجائے تو توبہ کرلیتے ہیں اس لئے تائبین کا حال ارشاد فرمایا یعنی) جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (یعنی آئندہ معصیت سے بچتا ہے) تو وہ (بھی عذاب سے بچا رہیگا کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کیطرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہے (یعنی خوف و اخلاص کیساتھ کہ شرط توبہ ہے آگے پھر عباد الرحمٰن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں یعنی) اور (ان میں یہ بات ہے کہ) وہ بیہودہ باتوں میں (جیسے لہو و لعب خلاف شرع) شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً بلا قصد) بیہودہ مشغلوں کے پاس کو ہو کر گزریں تو سنجیدگی (و شرافت) کے ساتھ گزر جاتے ہیں (یعنی نہ اس کی طرف مشغول ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار سے گناہگاروں کی تحقیر اور اپنا ترفع اور تکبر ظاہر ہوتا ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو ان (احکام) پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (جس طرح کافر قرآن پر ایک نئی بات سمجھ کر تماشے کے طور پر اور نیز اسپر اعتراضات پیدا کرنے کے لئے اسکے حقائق و معارف سے اندھے بہرے ہو کر اندھا دھند بے ترتیب ہجوم کرلیتے تھے جیساکہ دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (علیٰ بعض التفاسیر) سو عباد مذکورین ایسا نہیں کرتے، بلکہ عقل و فہم کے ساتھ قرآن پر متوجہ اور اُس کیطرف دوڑتے ہیں جسکا ثمرہ زیادہ ایمان

وعمل بالاحکام ہے پس مقصود آیت میں اندھے بہرے ہونے کی نفی کرنا ہے نہ کہ قرآن کیطرف شوق کے ساتھ متوجہ ہونے اُس پر گرنے کی، کیونکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اور اس سے کفار کے لئے بھی قرآن پر گرنا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ مخالفت اور مزاحمت کے طور پر اور اندھے بہروں کی طرح تھا اسلئے وہ مذموم ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ (خود جیسے دین کے عاشق ہیں اسی طرح اپنے اہل وعیال کے لئے بھی اسکے ساعی اور داعی ہیں، چنانچہ عملی کوشش کے ساتھ حق تعالیٰ سے بھی) دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) عطا فرما (یعنی ان کو دیندار بنادے اور ہم کو ہماری اس سعی دینداری میں کامیاب فرماکہ ان کو دینداری کی حالت میں دیکھکر راحت اور سرور رہو) اور (تونے ہم کو ہمارے خاندان کا افسر تو بنایا ہی ہے مگر ہماری دُعا یہ ہے کہ ان سب کو متقی کرکے) ہم کو متقیوں کا افسر بنادے (تو اصل مقصود افسری مانگنا نہیں ہے گو اسمیں بھی قباحت نہیں مگر مقام دلالت نہیں کرتا بلکہ اصل مقصود اپنے خاندان کے متقی ہونے کی درخواست ہے یعنی بجائے اس کے کہ ہم صرف خاندان کے افسر ہیں ہمکو متقی خاندان کا افسر بنا دیجئے، یہانتک عباد رحمان کے اوصاف کا بیان تھا آگے ان کی جزا ہے یعنی) ایسے لوگوں کو (بہشت میں رہنے کو) بالاخانے ملیں گے بوجہ انکے (دین وطاعت پر) ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس (بہشت) میں (فرشتوں کی جانب سے) بقاء کی دُعا اور سلام ملیگا (اور) اس (بہشت) میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہی (جیسا جہنم کے بارے میں ساءت مستقراً ومقاماً فرمایا ہے، اے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم) آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہدیجئے کہ میرا رب تمھاری ذرا بھی پرواہ نہ کریگا اگر تم عبادت نہ کروگے سو (اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اے کفار) تم تو (احکام الٰہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب یہ (جھوٹا سمجھنا تمھارے لئے) وبالِ (جان) ہو (کر رہے) گا، (خواہ دُنیا میں جیسے واقعہ بدر میں کفار پر مصیبت آئی یا آخرت میں اور وہ ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

سُورۂ فرقان کے بیشتر مضامین رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے ثبوت اور کفار و مشرکین جو اس پر اعتراض کرتے تھے اُنکے جوابات پر مشتمل تھے اور اسمیں کفار و مشرکین اور احکام کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب و سزا کا بھی ذکر تھا۔ آخر سورت میں اپنے اُن مخصوص اور مقبول بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جنکا رسالت پر ایمان بھی مکمل ہے اور اُن کے عقائد، اعمال، اخلاق، عادات سب اللہ و رسُول کی مرضی کے تابع اور احکام شرعیہ کے مطابق ہیں۔

قرآن کریم نے ایسے مخصوص بندوں کو عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کا لقب عطا فرمایا جو اُن کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یُوں تو ساری ہی مخلوق تکوینی اور جبری طور پر اللہ کی بندگی اور اسکی مشیت وارادہ

کے تابع ہے اُسکے ارادے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں بندگی سے مُراد تشریعی اور اختیاری بندگی ہے یعنی اپنے اختیار سے اپنے وجود اور اپنی تمام خواہشات اور تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنا دینا ایسے مخصوص بندے جن کو حق تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہہ کر عزت بخشی ہے اُنکے اوصاف آخر سورت تک بیان کئے گئے ہیں درمیان میں کفر و معصیت سے توبہ اور اسکے اثرات کا ذکر آیا ہے۔

یہاں ان مخصوص بندوں کو اپنا بندہ فرما کر انکو اعزازی لقب دینا تھا مگر اپنی طرف نسبت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سب اسماءِ حسنیٰ اور صفاتِ کمال میں سے اس جگہ لفظ رحمٰن کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا کہ مقبولین کی عادات و صفات اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی ترجمان اور مظہر ہونا چاہئیں اس کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی مخصوص صفات و علامات

آیات مذکورہ میں اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی تیرہ صفات و علامات کا ذکر آیا ہے جن میں عقائد کی درستی اور اپنے ذاتی اعمال ہیں خواہ وہ بدن سے متعلق ہوں یا مال سے، سب میں اللہ و رسول کے احکام اور مرضی کی پابندی۔ دوسرے انسان کے ساتھ معاشرت اور تعلقات کی نوعیت، رات دن کی عبادت گزاری کے ساتھ خوفِ خدا۔ تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور اپنے ساتھ اپنی اولاد و ازواج کی اصلاح کی فکر وغیرہ شامل ہیں۔

ان کا سب سے پہلا وصف عباد ہونا ہے۔ عباد عبد کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ جو اپنے آقا کا مملوک ہو، اسکا وجود اور اسکے تمام اختیارات و اعمال آقا کے حکم و مرضی پر دائر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے عقائد و خیالات کو اور اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت و سکون کو اپنے رب کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے ہر وقت گوش برآواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجا لاؤں۔

دوسری صفت: يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا، یعنی چلتے ہیں وہ زمین پر تواضع کیساتھ لفظ ہَوْن کا مفہوم اس جگہ سکینت و وقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے بہت آہستہ چلنا مُراد نہیں کیونکہ وہ بلا ضرورت ہو تو خلافِ سنت ہے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائلِ نبویہ میں منقول ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چلنا بہت آہستہ نہیں بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حدیث میں ہے کانما الارض تطوی لہٗ، یعنی آپ ایسا چلتے تھے کہ گویا زمین آپکے لئے سمٹتی ہے (ابن کثیر) اسی لئے سلف صالحین نے بتکلف مریضوں کی طرح آہستہ چلنے کو علامتِ تکبر و تصنع ہونے کے سبب مکروہ قرار دیا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے، پُوچھا: کیا تم بیمار ہو۔ اُسنے کہا نہیں، تو آپ نے اُس پر دُرّہ اُٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کیساتھ چلا کرو۔ (ابن کثیر)

حضرت حسن بصریؒ نے اس آیت یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا، کی تفسیر میں فرمایا کہ مومنین مخلصین کے تمام اعضاء و جوارح آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب اللہ کے سامنے ذلیل و عاجز ہوتے ہیں۔ ناواقف اُن کو دیکھ کر معذور عاجز سمجھتا ہے حالانکہ نہ وہ بیمار ہیں نہ معذور بلکہ تندرست قوی ہیں مگر اُن پر حق تعالیٰ کا خوف ایسا طاری ہے جو دوسروں پر نہیں ہے۔ اُن کو دُنیا کے دھندوں سے آخرت کی فکر نے روکا ہوا ہے۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اسکی ساری فکر دُنیا ہی کے کاموں میں لگی رہتی ہے تو وہ ہمیشہ حسرت ہی حسرت میں رہتا ہے (کہ دُنیا تو ساری ملتی نہیں اُور آخرت میں اُسنے حصہ نہیں لیا) اور جس شخص نے اللہ کی نعمت صرف کھانے پینے کی ہی چیزوں کو سمجھا اور اعلیٰ اخلاق کی طرف دھیان نہیں دیا، اُس کا علم بہت تھوڑا ہے اور عذاب اُس کیلئے تیار ہے۔ (از ابن کثیر ملخصاً)

تیسری صفت: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، یعنی جب جہالت والے اُن سے خطاب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، سلام۔ یہاں جاہلون کا ترجمہ جہالت والوں سے کر کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مُراد اس سے بے علم آدمی نہیں بلکہ وہ جو جہالت کے کام اور جاہلانہ باتیں کرے خواہ واقع میں وہ ذی علم بھی ہو۔ اور لفظ سلام سے مراد یہاں عرفی سلام نہیں بلکہ سلامتی کی بات ہے۔ قرطبی نے نحاس سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ سلام تسلیم سے مشتق نہیں بلکہ تَسَلُّم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سلامت رہنا۔ مُراد یہ ہے کہ جاہلوں کے جواب میں وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں جس سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے اور یہ گناہگار نہ ہو۔ یہی تفسیر حضرت مجاہد، مقاتل وغیرہ سے منقول ہے۔ (مظہری)

حاصل یہ ہے کہ بے وقوف جاہلانہ باتیں کرنے والوں سے یہ حضرات انتقامی معاملہ نہیں کرتے بلکہ اُن سے درگزر کرتے ہیں۔

چوتھی صفت: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا، یعنی وہ رات گزارتے ہیں اپنے رب کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے۔ عبادت میں شب بیداری کا ذکر خصوصیت سے اسلئے کیا گیا کہ یہ وقت سونے آرام کرنے کا ہے اسمیں نماز و عبادت کے لئے کھڑا ہونا خاص مشقت بھی ہے اور اسمیں ریا و نمود کے خطرات بھی نہیں ہیں۔ منشاء یہ ہے کہ ان کا لیل و نہار اللہ کی طاعت میں مشغول ہے دن کو تعلیم و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے کام ہیں رات کو اللہ کے سامنے عبادت گزاری کرنا ہے۔ تہجد کی نماز کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیام اللّیل، تہجد کی پابندی کرو کیونکہ وہ تم سے پہلے بھی سب نیک بندوں کی عادت رہی ہے اور وہ اللہ تعالٰے سے تم کو قریب کرنے والی اور سیئات کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے والی چیز ہے۔ (مظہری)

حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کے بعد دو یا زیادہ رکعتیں پڑھ لیں وہ بھی اس حکم میں داخل ہے کہ بات للّٰہ ساجدا وقائما (مظہری از بغوی) اور حضرت عثمانِ غنی رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کیساتھ ادا کرلی تو آدھی رات عبادت میں گزارنے کے حکم میں ہوگیا اور جس نے صبح کی نماز جماعت سے ادا کرلی وہ باقی آدھی رات بھی عبادت میں گزارنے والا سمجھا جائیگا (رواہ احمد ومسلم فی صحیحہ از مظہری)

پانچویں صفت: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ الآیہ یعنی یہ مقبولین بارگاہ شب و روز عبادت وطاعت میں مصروف رہنے کے باوجود بے خوف ہو کر نہیں بیٹھ رہتے بلکہ ہر وقت خدا کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہیں جس کے لئے عملی کوشش بھی جاری رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دُعائیں بھی۔

چھٹی صفت: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا الآیۃ، یعنی اللہ کے مقبول بندے مال خرچ کرنے کے وقت نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل و کوتاہی، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ آیت میں اسراف اور اسکے بالمقابل اِقتار کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اسراف کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں حضرت ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، ابن جریجؒ کے نزدیک اللہ کی معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے اگرچہ ایک پیسہ ہی ہو، اور بعض حضرات نے فرمایا، جائز اور مُباح کاموں میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا جو تبذیر یعنی فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے وہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کیونکہ تبذیر یعنی فضول خرچی بنصِ قرآن حرام و معصیت ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ اس لحاظ سے اس تفسیر کا حاصل بھی حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی مذکورہ تفسیر ہوگیا، یعنی معصیت و گناہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔ (مظہری)

اور اِقتار کے معنے خرچ میں تنگی اور بخل کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں اسکے معنے یہ ہیں کہ جن کاموں میں اللہ و رسُول نے خرچ کرنیکا حکم دیا ہے اُن میں خرچ کرنے میں تنگی برتنا (اور بالکل خرچ نہ کرنا بدرجہ اولیٰ اسمیں داخل ہے)۔ یہ تفسیر بھی حضرت ابن عباسؓ، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے (مظہری) آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کے مقبول بندوں کی صفت مال خرچ کرنے میں یہ ہوتی ہے کہ اسراف اور اقتار کے درمیان اعتدال اور میانہ روی پر عمل کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهٗ فِيْ مَعِيْشَتِهٖ، یعنی انسان کی دانشمندی کی علامت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنے (نہ اسراف میں مبتلا ہو نہ بخل میں)۔ (رواہ الامام احمد عن ابی الدرداء - ابن کثیر)

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما عال من اقتصد، یعنی جو شخص خرچ میں میانہ روی اور اعتدال پر قائم رہتا ہے وہ کبھی فقیر و محتاج نہیں ہوتا۔ (رواہ الامام احمد - ابن کثیر)

ساتویں صفت: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، پہلی چھ صفات میں طاعت و فرمانبرداری کے اُصول آگئے ہیں اب معصیت و نافرمانی کے اُصولِ مہمہ کا بیان ہے جنمیں پہلی چیز عقیدہ سے متعلق ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو عبادت میں شریک نہیں کرتے جس سے شرک کا سب سے بڑا گناہ ہونا معلوم ہوا۔

آٹھویں اور نویں صفت: لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الآیہ، یہ عملی گناہوں میں سے بڑے بڑے اور سخت گناہوں کا بیان ہے کہ اللہ کے مقبول بندے ان کے پاس نہیں جاتے، کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا کے پاس نہیں جاتے۔ یہ تین عقیدہ اور عمل کے بڑے گناہ بیان فرمانے کے بعد آیت میں ارشاد ہے وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا، یعنی جو شخص ان مذکورہ گناہوں کا مرتکب ہوگا وہ اسکی سزا پائے گا۔ ابوعبیدہ نے اس جگہ لفظ اثام کی تفسیر سزائے گناہ سے کی ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جو سخت و شدید عذابوں سے پُر ہے۔ بعض روایاتِ حدیث بھی اسکی شہادت میں لکھی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

آگے اُس عذاب کا بیان ہے جو جرائم مذکورہ کے کرنے والوں پر ہوگا اور آیات کے سباق و سیاق سے یہ بات متعین ہے کہ یہ عذاب کفار کے لئے مخصوص ہے جنھوں نے شرک و کفر بھی کیا اور اسکے ساتھ قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے۔ کیونکہ اوّل تو يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ کے الفاظ مسلمان گناہگاروں کے لئے نہیں ہوسکتے کیونکہ اُنکے ایک گناہ پر ایک ہی سزا کا وعدہ قرآن و سُنت میں منصوص ہے۔ سزا میں تضاعف یعنی کیفیت یا کمیت میں زیادتی مؤمنین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ کفار کی خصوصیت ہے کہ کفر پر جو عذاب ہونا تھا اگر کفر کے ساتھ اور گناہ بھی کئے تو عذاب دوہرا ہو جاویگا۔ دوسرے اس عذاب میں یہ بھی مذکور ہے وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا، یعنی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس عذاب میں ذلیل و خوار ہو کر۔ کوئی مؤمن ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں نہیں رہے گا، کتنا ہی بڑا گناہگار ہو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جاویگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ شرک و کفر میں بھی مبتلا ہوئے اور قتل و زنا میں بھی، اُن کا عذاب مضاعف یعنی دوہرا، شدید بھی ہوگا اور پھر یہ عذاب دائمی بھی رہے گا۔ آگے یہ بیان ہے کہ ایسے سخت مجرم جنکا عذاب یہاں مذکور ہوا ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ اُنکے سیئات کو حسنات سے یعنی بُرائیوں کو بھلائیوں سے تبدیل کردیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس توبہ کے بعد انکے اعمال نامہ میں حسنات ہی حسنات رہ جائیں گی کیونکہ شرک و کفر سے توبہ کرنے پر

اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ بحالتِ شرک و کفر جتنے گناہ کئے ہوں اسلام و ایمان قبول کر لینے سے وہ پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اسلئے پچھلے زمانے میں جو ان کا نامۂ اعمال سیئات اور معاصی ہی سے لبریز تھا اب ایمان لانے سے وہ تو سب معاف ہو گئے آگے ان معاصی اور سیئات کی جگہ ایمان اور اُسکے بعد کے اعمالِ صالحہ نے لے لی۔ سیئات کو حسنات میں تبدیل کرنے کی یہ تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، مجاہد وغیرہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے (مظہری)

ابنِ کثیرؒ نے اسکی ایک دوسری تفسیر یہ بھی نقل کی ہے کہ اُنھوں نے جتنے گناہ زمانۂ کفر و جاہلیت میں کئے تھے، ایمان لانے کے بعد اُن سب گناہوں کے بجائے نیکیاں لکھدی جاویں گی۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب کبھی ان لوگوں کو اپنے پچھلے گناہ یاد آویں گے تو اُن پر نادم ہوں گے اور توبہ کی تجدید کریں گے ان کے اس عمل سے وہ گناہ نیکیوں میں تبدیل ہو جاویں گے، اس کی دلیل میں بعض روایاتِ حدیث بھی پیش فرمائی ہیں۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا، بظاہر یہ اسی مضمون کا تکرار ہے جو اس سے پہلے آیت میں آیا ہے اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا۔ اور قرطبی نے قفال سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ توبہ پہلی توبہ سے مختلف اور الگ ہی کیونکہ پہلا معاملہ کفار و مشرکین کا تھا جو قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے تھے، پھر ایمان لے آئے تو اُن کی سیئات حسنات سے بدل دی گئیں۔ اور یہاں مسلمان گناہگاروں کی توبہ کا ذکر ہے اسی لئے پہلی توبہ کے ساتھ وَاٰمَنَ یعنی اسکے ایمان لانے کا ذکر تھا، اس دوسری توبہ میں وہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توبہ اُن لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو پہلے سے مؤمن ہی تھے مگر غفلت سے قتل و زنا میں مبتلا ہو گئے تو انکے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسے لوگ اگر توبہ کر لینے کے بعد صرف زبانی توبہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ آئندہ کے لئے اپنے عمل کو بھی صالح اور درست بنالیں تو اُن کا توبہ کرنا صحیح اور درست سمجھا جائیگا۔ اسی لئے بطور شرط کے توبہ کر لینے کے ابتدائی حال ذکر کرنے کے بعد اسکی جزا میں پھر یتوب کا ذکر کرنا صحیح ہو گیا کیونکہ شرط میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ صرف زبانی توبہ ہے اور جزاء میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ عمل صالح پر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہو گیا کہ جس نے توبہ کر لی پھر اپنے عمل سے بھی اُس توبہ کا ثبوت دیا تو وہ صحیح طور پر اللہ کیطرف رجوع کرنے والا سمجھا جائیگا بخلاف اُسکے جس نے پچھلے گناہ سے توبہ تو کی مگر آئندہ عمل میں اسکا کوئی ثبوت نہ فراہم کیا تو اُس کی توبہ گویا توبہ ہی نہیں۔ خلاصۂ مضمون اس آیت کا یہ ہو گیا کہ جو مسلمان غفلت سے گناہ میں مبتلا ہو گیا پھر توبہ کر لی اور اس توبہ کے بعد اپنے عمل کی بھی ایسی اصلاح کر لی کہ اسکے عمل سے توبہ کا ثبوت ملنے لگا تو یہ توبہ بھی عند اللہ مقبول ہو گی اور بظاہر اسکا فائدہ بھی وہی ہو گا جو پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ اسکے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔

اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی خاص صفات کا بیان اوپر سے ہو رہا تھا، درمیان میں گناہ کے بعد توبہ کر لینے کے احکام کا بیان آیا اسکے بعد باقی صفات کا بیان ہے۔

دسویں صفت: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ، یعنی یہ لوگ جھوٹ اور باطل کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے۔ سب سے بڑا جھوٹ اور باطل تو شرک و کفر ہے اُسکے بعد عام جھوٹ اور گناہ کے کام ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ایسی مجلسوں میں شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد مشرکین کی عیدیں اور میلے ٹھیلے ہیں۔ حضرت مجاہد اور محمد بن حنفیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ عمرو بن قیس نے فرمایا کہ بے حیائی اور ناچ رنگ کی محفلیں مُراد ہیں۔ زہری، امام مالک نے فرمایا کہ شراب پینے پلانے کی مجلسیں مراد ہیں (ابن کثیر) اور حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ساری ہی مجلسیں مجلسِ زُوْر کی مصداق ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں ہی سے پرہیز کرنا چاہیئے کیونکہ لغو و باطل کا بالقصد دیکھنا بھی اس کی شرکت کے حکم میں ہے (مظہری) اور بعض حضرات مفسرین نے لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں یشہدون کو شہادت بمعنے گواہی سے لیا ہے اور معنی آیت کے یہ قرار دیئے کہ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی کا گناہِ کبیرہ اور وبالِ عظیم ہونا قرآن و سنت میں معروف و مشہور ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اُسنے جھوٹی شہادت دی ہے تو اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جائے اور اسکا منھ کالا کرکے بازار میں پھرایا جائے اور رُسوا کیا جائے پھر طویل زمانے تک قید میں رکھا جائے۔ (رواہ ابن ابی شیبہ عبدالرزاق۔ مظہری)

گیارھویں صفت: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا، یعنی اگر لغو اور بیہودہ مجلسوں پر کبھی ان کا گزر اتفاقاً ہو جائے تو وہ سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں یہ لوگ جس طرح بقصد و ارادہ شریک نہیں ہوتے اسی طرح اگر کہیں اتفاقی طور پر ان کا کسی ایسی مجلس پر گزر ہو جاوے تو اس فسق و فجور اور گناہ کی مجلس پر سے شرافت کیساتھ گزر ے چلے جاتے ہیں۔ یعنی اُن کے اس فعل کو بُرا اور قابلِ نفرت جانتے ہوئے، نہ گناہوں میں مبتلا لوگوں کی تحقیر کرتے ہیں اور نہ خود اپنے آپ کو اُن سے افضل و بہتر سمجھ کر تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا اتفاق سے ایک روز کسی بیہودہ لغو مجلس پر گزر ہو گیا تو وہاں ٹھہرے نہیں گزرے چلے گئے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ابن مسعود کریم ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی جسمیں بیہودہ مجلس سے کریموں شریفوں کی طرح گزر جانے کا حکم ہے (ابن کثیر)

بارھویں صفت: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا

یعنی ان مقبول بندوں کی یہ شان ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات اور آخرت کی یاد دلائی جاتی ہے تو وہ ان آیات کیطرف اندھے بہروں کی طرح متوجہ نہیں ہوتے بلکہ سمیع و بصیر انسان کی طرح ان میں غور کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ غافل اور مغفل لوگوں کی طرح ایسا معاملہ نہیں کرتے کہ اُنھوں نے سُنا ہی نہیں یا دیکھا ہی نہیں۔ اس آیت میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک آیاتِ الٰہیہ پر گر پڑنا یعنی اہتمام کے ساتھ متوجہ ہونا یہ تو امر محمود و مقصود اور بہت بڑی نیکی ہے۔ دوسرے اندھے بہروں کی طرح گرنا کہ قرآن کی آیات پر توجہ تو دیں مگر یا تو اُس پر عمل کرنے میں معاملہ ایسا کریں کہ گویا انھوں نے سُنا اور دیکھا ہی نہیں اور یا آیاتِ قرآن پر عمل بھی کریں مگر اُن کو اُصولِ صحیحہ اور تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ کے خلاف اپنی رائے یا سُنی سُنائی باتوں کے تابع کر کے غلط عمل کریں یہ بھی ایک طرح سے اندھے بہرے ہو کر ہی گرنے کے حکم میں ہے۔

احکامِ دین کا صرف مطالعہ کافی نہیں بلکہ اسلاف کی تفسیر کے مُطابق سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے

آیاتِ مذکورہ میں جس طرح اس امر کی سخت مذمت ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ ہی نہ دیں، اندھے بہروں کا سا معاملہ کریں، اسی طرح اسکی بھی مذمت ہے کہ توجہ تو دیں اور عمل بھی کریں مگر بے سمجھے بے بصیرتی کیساتھ اپنی رائے سے جس طرح چاہیں عمل کرنے لگیں۔ ابن کثیرؒ نے ابن عون سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت شعبیؒ سے پُوچھا کہ اگر میں کسی مجلس میں پہنچوں جہاں لوگ سجدہ میں پڑے ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کیسا سجدہ ہے تو کیا میں بھی اُنکے ساتھ سجدہ میں شریک ہو جاؤں۔ حضرت شعبیؒ نے فرمایا نہیں۔ مومن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے بلکہ اُس پر لازم ہے کہ بصیرت کیساتھ عمل کرے۔ جب تم نے وہ آیتِ سجدہ نہیں سُنی جس کی بنا پر یہ لوگ سجدہ کر رہے ہیں اور تمھیں اُنکے سجدہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں تو اس طرح اُنکے ساتھ سجدہ میں شریک ہونا جائز نہیں۔

اس زمانے میں یہ بات تو قابلِ شکر ہے کہ نوجوان اور نو تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور اسکے سمجھنے کی طرف کچھ توجہ پیدا ہوئی ہے اور اسکے تحت وہ بطور خود قرآن کا ترجمہ یا کسی کی تفسیر دیکھ کر قرآن کو خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہ کوشش بالکل بے اُصول ہے اسلئے قرآن کو صحیح سمجھنے کے بجائے بہت سے مغالطوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اُصول کی بات یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی معمولی سے معمولی فن بھی نری کتاب کے مطالعہ سے کسی کو معتدبہ نہیں حاصل ہو سکتا جبتک اسکو کسی استاد سے نہ پڑھے معلوم نہیں قرآن اور علوم قرآن ہی کو کیوں ایسا سمجھ لیا گیا ہے کہ جسکا جی چاہے خود ترجمہ دیکھکر جو چاہے اسکی مُراد متعین کرلے۔ یہ بے اصول مطالعہ جسمیں کسی ماہر استاد کی رہنمائی شامل نہو یہ بھی آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرنے کے مفہوم میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم

کی توفیق بخشیں۔

تیرھویں صفت : وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ، اس میں اپنی اولاد اور ازواج کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ اُن کو میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے سے مراد حضرت حسن بصریؒ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ اُن کو اللہ کی طاعت میں مشغول دیکھے یہی ایک انسان کیلئے آنکھوں کی اصلی ٹھنڈک ہے اور اگر اولاد و ازواج کی ظاہری صحت و عافیت اور خوشحالی بھی اسمیں شامل کیجائے تو وہ بھی درست ہے۔

یہاں اس دُعا سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے صرف اپنے نفس کی اصلاح اور اعمالِ صالحہ پر قناعت نہیں کرلیتے بلکہ اپنی اولاد اور بیبیوں کی بھی اصلاحِ اعمال و اخلاق کی فکر کرتے ہیں اور اسکے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی کوشش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کی صلاحیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتا رہے۔ اس آیت کے اگلے جملے میں دُعا کا یہ جز بھی ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ، یعنی ہمیں متقی لوگوں کا امام اور پیشوا بنادے ، اسمیں بظاہر اپنے لئے جاہ و منصب اور بڑائی حاصل کرنے کی دُعا ہے جو دوسری نصوصِ قرآن کی رُو سے ممنوع ہے جیسے قرآن کا ارشاد ہے تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ، یعنی ہم نے دارِ آخرت کو مخصوص کر رکھا ہے اُن لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنا عُلُو اور بڑائی نہیں چاہتے اور نہ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر شخص اپنے اہل و عیال کا قدرتی طور پر امام و پیشوا ہوتا ہی ہے اسلئے اس دُعا کا حاصل یہ ہوگیا کہ ہمارے اولاد اور اہل و عیال کو متقی بنادیجئے اور جب وہ متقی ہوجاویں گے تو طبعی طور پر یہ شخص متقین کا امام و پیشوا کہلائیگا۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کی دُعا نہیں بلکہ اولاد و ازواج کے متقی بنانے کی دُعا ہے۔ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ اس دُعا میں اپنے لئے کوئی ریاست و امامت اور پیشوائی طلب کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود اس دُعا کا یہ ہے کہ ہمیں ایسا بنادیجئے کہ لوگ دین و عمل میں ہماری اقتدار کیا کریں اور ہمارے علم و عمل سے اُن کو نفع پہنچے تاکہ اسکا ثواب ہمیں حاصل ہو۔ اور حضرت مکحول شامیؒ نے فرمایا کہ دُعا کا مقصود اپنے لئے تقویٰ کا ایسا اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ دُنیا کے متقی لوگوں کو بھی ہمارے عمل سے فائدہ پہنچے۔ قرطبی نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ریاست و امامت کی طلب جو دین کے لئے اور آخرت کے فائدہ کے لئے ہو وہ مذموم نہیں بلکہ جائز ہے۔ اور آیت لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا میں اس ریاست و اقتدار کی خواہش کی مذمت ہے جو دُنیوی عزت و جاہ کے لئے ہو۔ واللہ اعلم۔ یہاں تک عِبَادُ الرَّحْمٰنِ ، یعنی مؤمنین کاملین کی اہم صفات کا بیان پورا ہوگیا، آگے اُن کی جزا اور آخرت کے درجات کا ذکر ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ ، غرفہ کے لغوی معنی بالاخانہ کے ہیں۔ جنت میں مقربین خاص کے لئے ایسے غرفات ہونگے جو عام اہل جنت کو ایسے نظر آئیں گے جیسے زمین والے ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ (رواہ البخاری ومسلم وغیرھما۔ مظہری) مسند احمد، بیہقی، ترمذی، حاکم میں حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایسے غرفے ہونگے جنکا اندرونی حصہ باہر سے اور بیرونی حصہ اندر سے نظر آتا ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ، یہ غرفے کن لوگوں کے لئے ہیں، آپؐ نے فرمایا، جو شخص اپنے کلام کو نرم اور پاک رکھے اور ہر مسلمان کو سلام کرے اور لوگوں کو کھانا کھلائے، اور رات کو اسوقت تہجد کی نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں (مظہری)

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ، یعنی جنت کی دوسری نعمتوں کے ساتھ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ فرشتے اُن کو مبارکباد دیں گے اور سلام کریں گے۔ یہاں تک مومنین مخلصین کی خصوصی عادات و اعمال اور اُن کی جزاء و ثواب کا ذکر تھا، آخری آیت میں پھر کفار و مشرکین کو عذاب سے ڈراکر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ، اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں زیادہ واضح اور سہل وہ ہے جسکو خلاصہ تفسیر میں اوپر لکھا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمھاری کوئی وقعت و حیثیت نہ ہوتی اگر تمھاری طرف سے اللہ کو پکارنا اور اسکی عبادت کرنا نہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا منشا ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے جیسے دوسری آیت میں ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ، یعنی میں نے انسان اور جن کو اور کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا بجز اسکے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ تو ایک عام ضابطہ بیان ہوا کہ بغیر عبادت کے انسان کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت و حیثیت نہیں ہے اسکے بعد کفار و مشرکین جو رسالت اور عبادت ہی کے منکر ہیں اُن کو خطاب ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ، یعنی تم نے تو سب چیزوں کو جھٹلا ہی دیا ہے اب تمھاری کوئی وقعت اللہ کے نزدیک نہیں فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ، یعنی اب یہ تکذیب و کفر تمھارے گلے کا ہار بن چکے ہیں اور تمھارے ساتھ لگے رہیں گے یہاں تک کہ جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کر کے چھوڑیں گے۔ ونعوذ باللہ من حال اہل النار۔

تم بحمد اللہ سبحانہ تفسیر سورۃ الفرقان یوم الاحد لثالث عشر من صفر المظفر سنہ ۱۳۹۱ھ و باتمامہ تم بعون اللہ وکرمہ الحزب الرابع من الاحزاب السبعۃ القرآنیۃ واللہ سبحانہ وتعالیٰ ارجو واسأل اتمام الباقی وما ذٰلک علی اللہ بعزیز ۔

سُورَةُ الشُّعَرَآءِ

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَّسَبْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاِحْدٰى عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ شعراء مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی دو سو ستائیس آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان اس

اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ

بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے اگر ہم چاہیں اُتاریں اُن پر آسمان سے ایک

اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ④ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ

نشانی پھر رہ جائیں اُن کی گردنیں اُسکے آگے نیچی اور نہیں پہنچتی انکے پاس کوئی نصیحت

مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ⑤ فَقَدْ كَذَّبُوْا

رحمٰن سے نئی جس سے منہ نہیں موڑتے سو یہ تو جھٹلا چکے

فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑥ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى

اب پہنچے گی اُن پر حقیقت اس بات کی جس پر ٹھٹھے کرتے تھے کیا نہیں دیکھتے وہ

الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑦ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

زمین کو کتنی اُگائیں ہم نے اسمیں ہر ایک قسم کی خاصی چیزیں اس میں البتہ نشانی ہے

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ⑧ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ⑨ ع ۵

اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمّٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر نازل ہوتے ہیں) کتاب

واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (اور یہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے تو آپ اتنا غم کیوں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ) شاید آپ اُن کے ایمان نہ لانے پر (تاسف کرتے کرتے) اپنی جان دے دینگے (اصل یہ ہے کہ یہ عالمِ ابتلار ہے اس میں حق کے اثبات پر وہی دلائل قائم کئے جاتے ہیں جن کے بعد بھی ایمان لانا بندہ کے اختیار میں رہتا ہے ورنہ) اگر ہم (جبراً واضطراراً ان کو مومن کرنا) چاہیں تو اُن پر آسمان سے ایک (ایسی) بڑی نشانی نازل کر دیں (کہ ان کا اختیار ہی بالکل سلب ہو جاوے) پھر اُن کی گردنیں اس نشانی (کے آنے) سے پست ہو جادیں (اور بالاضطرار مومن بنجاویں لیکن ایسا کرنے سے آزمایش باقی نہ رہے گی اسلئے ایسا نہیں کیا جاتا اور معاملہ جبر واختیار کے درمیان رہتا ہی اور (اُن کی یہ حالت ہے کہ) اُن کے پاس کوئی تازہ فہمائش (حضرت) رحمان (جل شانہٗ) کیطرف سے ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رُخی نہ کرتے ہوں سو (اس بے رُخی کی یہانتک نوبت پہنچی کہ) انھوں نے (دینِ حق کو) جھوٹا بتلا دیا (جو اعراض کا انتہائی درجہ ہے اور صرف اسکے ابتدائی درجہ یعنی بے التفاتی پر اکتفاء نہیں کیا اور پھر تکذیب بھی خالی نہیں بلکہ استہزار کے ساتھ) سو اب عنقریب انکو اس بات کی حقیقت معلوم ہو جاویگی جس کے ساتھ یہ استہزار کیا کرتے تھے (یعنی جب عذابِ الٰہی کا موت کے وقت یا قیامت میں معائنہ ہوگا، اسوقت قرآن کے اور مافی القرآن یعنی عذاب وغیرہ کے حق ہونیکا انکشاف ہو جاویگا) کیا انھوں نے زمین کو نہیں دیکھا (جو اُن سے بہت قریب اور ہر وقت پیشِ نظر ہے) کہ ہمنے اس میں کسقدر عمدہ عمدہ قسم قسم کی بُوٹیاں اُگائی ہیں (جو مثل جمیع مصنوعات کے اپنے بنانے والے کے وجود اور اُس کی یکتائی اور کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہیں کہ) اس میں (توحید ذاتی وصفاتی وافعالی کی) ایک بڑی نشانی (عقلی) ہے (اور یہ مسئلہ بھی عقلی ہے کہ خدائی کے لئے کمالِ ذاتی وصفاتی شرط ہے اور کمال مذکور کے لوازم میں سے ہے کہ وہ خدائی میں اکیلا ہو) اور (باوجود اسکے) ان میں کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (اور شرک کرتے ہیں، غرض شرک کرنا انکارِ نبوت سے بھی بڑھ کر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے عناد نے ان کی فطرت کو بالکل مختل کر دیا پھر ایسوں کے پیچھے کیوں جان کھوئی جاوے) اور (اگر ان کو شرک کے مذموم عنداللہ ہونے میں یہ شبہ ہو کہ ہم پر عذاب فوراً کیوں نہیں آجاتا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ آپ کا رب (باوجود اس کے کہ) غالب (اور کامل القدرت) ہے (مگر اسکے ساتھ ہی) رحیم (بھی) ہے (اور اسکی رحمتِ عامہ دنیا میں کفار سے بھی متعلق ہے اسکا اثر یہ ہے کہ ان کو مہلت دے رکھی ہے ورنہ کفر یقیناً مذموم اور عذاب کا مقتضی ہی)

معارف و مسائل

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الآیۃ، باخِعٌ بَخَعٌ سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذبح کرتے کرتے

بخاع تک پہنچ جائے جو گردن کی ایک رگ ہے۔ اور اس جگہ باخعٌ سے مُراد اپنے آپ کو تکلیف اور مشقت میں ڈالنا ہے۔ علامہ عسکری نے فرمایا کہ اس جیسے مقامات میں اگرچہ صورت جملہ خبریہ کی ہے مگر حقیقۃً اس سے مُراد نہی اور ممانعت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر، اپنی قوم کے کفر اور اسلام سے انحراف کے سبب اتنا رنج نہ کیجئے کہ جان گھُلنے لگے۔ اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کسی کافر کے بارے میں اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اس کی تقدیر میں ایمان لانا نہیں ہے تب بھی اس کو تبلیغ کرنے سے رُکنا نہیں چاہیئے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ مشقت میں اعتدال چاہیئے اور جو شخص ہدایت نہ پائے اُس پر زیادہ حزن و غم نہ کیا جائے۔

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ، علامہ زمخشری نے فرمایا کہ اصل کلام فظلّوا لھا خاضعین ہے۔ یعنی کفار اس بڑی نشانی کو دیکھ کر تابع ہو جاویں اور جھک جائیں لیکن یہاں اعناق کا لفظ یہ ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ موضع خضوع ظاہر ہو جائے کیونکہ جھکنا وغیرہ اور عاجزی کرنا سب سے پہلے گردن پر ظاہر ہوتا ہے۔ مضمون اس آیت کا یہ ہے کہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ اپنی توحید اور قدرتِ کاملہ کی کوئی نشانی ظاہر کر دیں جس سے احکام شرعیہ اور حقائقِ الٰہیہ بدیہی ہو کر سامنے آجائیں اور کسی کو مجال انکار نہ رہے مگر حکمت کا مقتضا یہ ہے کہ یہ احکام و معارف بدیہی نہ ہوں بلکہ نظری رہیں کہ غور و فکر پر موقوف رہیں اور یہی غور و فکر انسان کی آزمایش ہے اسی پر ثواب و عذاب مرتب ہے۔ بدیہی چیزوں کا اقرار تو ایک طبعی اور ضروری امر ہے اسمیں تعبّد اور اطاعت کی شان نہیں (قرطبی)

زَوْجٍ كَرِيْمٍ، زَوْج کے لفظی معنے جوڑے کے ہیں اسی لئے مرد و عورت، نر و مادہ کو زوج کہا جاتا ہے بہت سے درختوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں اُن کو اس مناسبت سے بھی زوج کہا جا سکتا ہے اور کبھی لفظ زَوج ایک خاص نوع اور صنف کے معنی میں بھی آتا ہے اس معنے کے لحاظ سے درختوں کی ہر نوع کو زوج کہا جا سکتا ہے اور کریم کے معنی ہیں عمدہ اور پسندیدہ چیز۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس قوم فرعون کے پاس

اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيْقُ

کیا وہ ڈرتے نہیں بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رُک جاتا ہے

صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ

میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو اور اُن کو مجھ پر ہے

ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا

ایک گناہ کا دعویٰ، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں فرمایا کبھی نہیں تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم

مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

ساتھ تمہارے سنتے ہیں سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا

یہ کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا

وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ

اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس اور کر گیا تو اپنی وہ کرتوت جو

فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

کر گیا اور تو ہے ناشکر کہا کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں تھا چوکنے والا

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ

پھر بھاگا میں تم سے جب تمہارا ڈر دیکھا پھر بخشا مجھ کو میرے رب نے حکم اور ٹھہرایا مجھ کو پیغام

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ

پہنچانے والا اور کیا وہ احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ غلام بنایا تو نے بنی

اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ

اسرائیل کو بولا فرعون کیا معنی پروردگار عالم کا کہا پروردگار آسمان اور

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ

زمین کا اور جو کچھ انکے بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو بولا اپنے گرد والوں سے

اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ

کیا تم نہیں سنتے ہو کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا بولا

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ

تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے کہا پروردگار

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ

مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ انکے بیچ میں ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو بولا

لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ

اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوائے تو مقرر ڈالوں گا تجھ کو قید میں کہا

اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ

اور اگر لیکر آیا ہوں تیرے پاس ایک چیز کھول دینے والی بولا تو وہ چیز لا اگر تو

الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ

سچ کہتا ہے پھر ڈال دیا اپنا عصا، سو اسی وقت وہ اژدہا ہو گیا صریح اور اندر سے

يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

نکالا اپنا ہاتھ، سو اسی وقت وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے سامنے

خلاصۂ تفسیر

اور (ان لوگوں سے اسوقت کا قصہ ذکر کیجئے) جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ دیکھو) کیا یہ لوگ (ہمارے غضب سے) نہیں ڈرتے (یعنی ان کی حالت عجیب اور شنیع ہے اسلئے ان کی طرف تم کو بھیجا جاتا ہے) انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار، (میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں لیکن اس خدمت کی تکمیل کے لئے ایک مددگار چاہتا ہوں کیونکہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو (اپنی پوری بات کہنے سے پہلے ہی) جھٹلانے لگیں اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون کے پاس (بھی وحی) بھیج دیجئے (اور ان کو نبوت عطا فرما دیجئے کہ اگر میری تکذیب کی جاوے تو وہ تصدیق کرنے لگیں تاکہ دل شگفتہ اور زبان رواں رہے اور اگر میری زبان کسی وقت بند ہو جاوے تو وہ تقریر کرنے لگیں اور ہرچند کہ یہ غرض ویسے بھی ہارون علیہ السلام کو بلا نبوت عطا ہوئے ساتھ رکھنے سے حاصل ہو سکتی تھی مگر عطائے نبوت میں اور زیادہ باکمل وجوہ پوری ہوئی) اور (ایک امر یہ قابلِ عرض ہے کہ) میرے ذمہ اُن لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی قتل ہو گیا تھا جسکا قصہ سورۃ قصص میں آویگا) سو (اسلئے) مجھ کو (ایک) یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو (قبل تبلیغ رسالت) قتل کر ڈالیں (تب بھی تبلیغ نہ کر سکوں گا تو اس کی بھی کوئی تدبیر فرما دیجئے) ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے (جو ایسا کر سکیں اور ہم نے ہارون کو بھی پیغمبری دی، اب تبلیغ کے دونوں مانع مرتفع ہو گئے) سو (اب) تم دونوں میرے احکام لے کر جاؤ (کہ ہارون بھی نبی ہو گئے اور) ہم (نصرت و امداد سے) تمھارے ساتھ ہیں (اور جو گفتگو تمھاری اور ان لوگوں کی ہو گی اُس کو) سُنتے ہیں سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس) سے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت الی التوحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تو بنی اسرائیل کو (اپنے بیگار اور ظلم سے رہائی دے کر ان کے اصلی وطن ملک شام کیطرف) ہمارے ساتھ جانے دے (خلاصہ اس دعوت کا حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و تعدی کا ترک کرنا ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات گئے اور فرعون سے سب مضامین کہدیئے) فرعون (یہ سب باتیں سُن کر اوّل موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کو پہچان کر متوجہ ہوا اور) کہنے لگا کہ (آہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم اپنی (اس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا کئے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے ناسپاس ہو (کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور

پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، چاہیئے تو یہ تھا کہ تم میرے سامنے دب کر رہتے) موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ (واقعی) اسوقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہو گئی تھی (یعنی عمداً میں نے قتل نہیں کیا، اُس کی ظالمانہ رَوِش سے اس کو روکنا مقصود تھا اتفاق سے وہ مرگیا) پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمھارے ہاں سے مفرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کر دیا (اور وہ دانشمندی اسی نبوت کے لوازم سے ہے۔ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ میں پیغمبری کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دبنے کی کوئی وجہ نہیں اور پیغمبری اس واقعہ قتلِ خطار کے منافی نہیں کیونکہ یہ قتل خطاءً صادر ہوا تھا جو نبوت کی اہلیت وصلاحیت کے منافی نہیں۔ یہ تو جواب ہے اعتراضِ قتل کا) اور (رہا احسان جتلانا پرورش کا سو) وہ یہ نعمت ہے جسکا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت (اور ظلم) میں ڈال رکھا تھا (کہ اُنکے لڑکوں کو قتل کرتا تھا جس کے خوف سے میں صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا گیا اور تیرے ہاتھ لگ گیا اور تیری پرورش میں رہا تو اس پرورش کی اصلی وجہ تو تیرا ظلم ہی ہے تو ایسی پرورش کا کیا احسان جتلاتا ہے بلکہ اس سے تو تجھے اپنی ناشائستہ حرکات کو یاد کر کے شرمانا چاہیئے) فرعون (اس بات پر لاجواب ہوا اور گفتگو کا پہلو بدل کر اُس) نے کہا کہ (جس کو تم) رَبُّ العالمین (کہتے ہو لقولہٖ تعالیٰ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس) کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ (مخلوقات) اُن کے درمیان میں ہے اس (سب) کا اگر تم کو یقین (حاصل) کرنا ہو (تو یہ پتہ بہت ہے، مطلب یہ کہ اس کی حقیقت کا ادراک انسان نہیں کر سکتا اس لئے جب ان کا سوال ہوگا صفات سے ہی جواب ملیگا) فرعون نے اپنے اردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ (کچھ) سُنتے ہو (کہ سوال کچھ جواب کچھ) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا (اس جواب میں مکرر تنبیہ ہے اس مطلب پر مگر) فرعون (نہ سمجھا اور) کہنے لگا کہ یہ تمھارا رسول جو (بزعم خود) تمھاری طرف رسول ہو کر آیا ہے مجنون (معلوم ہوتا) ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اسکا بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے مان لو) فرعون (آخر مجبور ہو کر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیجدوں گا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا اگر کوئی میں صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانے گا) فرعون نے کہا اچھا تو وہ دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو، تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈالدی تو دفعۃً ایک نمایاں اژدہا بن گیا (اور دوسرا معجزہ دکھلانے کے لئے) اپنا ہاتھ (گریبان میں دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی سب نے نظرِ حسّی سے دیکھا)۔

معارف و مسائل

اطاعت کے لئے معاون اسباب کی طلب بہانہ جوئی نہیں

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ○ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ○ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ○ ان آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ کسی حکم کے بجالانے میں کچھ ایسی چیزوں کی درخواست کرنا جو تعمیلِ حکم میں مددگار ثابت ہوں کوئی بہانہ جوئی نہیں ہے بلکہ جائز ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ خداوندی پا کر اُس کی بجا آوری کو سہل اور مفید بنانے کے لئے خدائے ذوالجلال سے درخواست کی۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ خداوندی کو بلا توقف بسر و چشم قبول کیوں نہ کیا؟ اور توقف کیوں فرمایا؟ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ تعمیلِ حکم ہی کے سلسلہ میں کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ ضلال کا مفہوم

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۔ فرعون کے اس سوال پر کہ تم نے اے موسیٰ ایک قبطی کو قتل کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا کہ ہاں میں نے قتل ضرور کیا تھا لیکن وہ قتل ارادۃً اور قصداً نہ تھا بلکہ اُس قبطی کو اُس کی خطا پر متنبہ کرنے کے لئے گھونسہ مارا جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ نبوت کے منافی قتل عمد ہے اور یہ قتل بلا ارادہ ہوا تھا جو منافی نبوت نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ یہاں "ضلال" کا مطلب "بے خبری" ہے اور اس سے مراد قبطی کا بلا ارادہ قتل ہو جانا ہے۔ اس معنی کی تائید حضرت قتادہؒ اور ابن زیدؒ کی روایات سے بھی ہوتی ہے کہ دراصل عربی میں ضلال کے کئی معنی آتے ہیں، اور ہر جگہ اسکا مطلب گمراہی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی اسکا ترجمہ "گمراہ" کرنا درست نہیں۔

خدائے ذوالجلال کی ذات و حقیقت کا علم انسان کے لئے ناممکن ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ، اس آیتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ خدائے ذوالجلال کی کنہ و حقیقت کا جاننا ممکن نہیں کیونکہ فرعون کا سوال خدا تعالیٰ کی حقیقت، ماہیت کے متعلق تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجائے ماہیتِ باری تعالیٰ بتلانے کے خدا تعالیٰ کے اوصاف بیان فرمائے جس سے اشارہ فرمادیا کہ خدا تعالیٰ کی کُنہ اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور ایسا سوال ہی کرنا بیجا ہے۔ (کذا فی الروح)

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ، بنی اسرائیل ملک شام کے باشندے تھے، وہاں جانا چاہتے تو فرعون ان کو جانے نہ دیتا تھا اس طرح چار سو سال سے وہ اسکی قید میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی تعداد اسوقت چھ لاکھ تیس ہزار تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پیغامِ حق پہنچانے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر جو ظلم اُس نے کر رکھا تھا اُس سے باز آنے اور اُن کو آزاد چھوڑ دینے کی ہدایت فرمائی۔ (قرطبی)

پیغمبرانہ مناظرہ کا ایک نمونہ مناظرے کے مؤثر آداب

دو مختلف الخیال شخصوں اور جماعتوں میں نظریاتی بحث و مباحثہ جسکو اصطلاح میں مناظرہ کہا جاتا ہے، زمانہ قدیم سے رائج ہے مگر عام طور پر مناظرہ ایک ہار جیت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگوں کی نظر میں مناظرہ کا حاصل اتنا ہی ہے کہ اپنی بات اونچی ہو، چاہے اس کی غلطی خود بھی معلوم ہو چکی ہو، اُس کو صحیح اور قوی ثابت کرنے کیلئے دلائل اور ذہانت کا سارا زور خرچ کیا جائے۔ اسی طرح مخالف کی کوئی بات سچی اور صحیح بھی ہو تو بہر حال رَد ہی کرنا اور اسکی تردید میں پوری توانائی صرف کرنا ہے۔ اسلام ہی نے اس کام میں خاص اعتدال پیدا کیا ہے اُسکے اصول و قواعد اور حدود متعین کر کے اسکو ایک مفید و مؤثر آلۂ تبلیغ و اصلاح بنایا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں اسکا ایک مختصر سا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جب فرعون جیسے جبّار خُدائی کے مدعی کو اُس کے دربار میں دعوتِ حق پہنچائی تو اُسنے مخالفانہ بحث کا آغاز اوّل دو ایسی باتوں سے کیا جنکا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے تھا۔ جیسا ہوشیار مخالف عموماً جب اصل بات کے جواب پر قادر نہیں ہوتا تو مخاطب کی ذاتی کمزوریاں ڈھونڈا اور بیان کیا کرتا ہے تاکہ وہ کچھ شرمندہ ہو جائے اور لوگوں میں اُس کی ہوا اُکھڑ جائے، یہاں بھی فرعون نے دو[۲] باتیں کہیں۔ **اوّل** تو یہ کہ تم ہمارے پَروردہ ہمارے گھر میں پلکر جوان ہوئے ہو۔ ہم نے تم پر احسانات کئے ہیں۔ تمہاری کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے بولو۔ **دوسری** بات یہ ہے کہ تم نے ایک قبطی شخص کو بلا وجہ قتل کر ڈالا ہے جو علاوہ ظلم کے حق ناشناسی اور ناشکری بھی ہے کہ جس قوم میں پلے اور جوان ہوئے اُسی کے آدمی کو مار ڈالا۔ اسکے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا پیغمبرانہ جواب دیکھئے کہ اوّل تو جواب میں سوال کی ترتیب کو بدلا یعنی قبطی کے قتل کا قصّہ جو فرعون نے بعد میں بیان کیا تھا اُسکا جواب پہلے آیا۔ اور خانہ پروردہ ہونے کے احسان کا ذکر جو پہلے کیا تھا اُسکا جواب بعد میں۔ اس ترتیب بدلنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ واقعہ قبطی میں ایک اپنی کمزوری ضرور واقع ہوئی تھی آجکل کے مناظروں کے طرز پر تو ایسی چیز کے ذکر ہی کو رَلا بلا دیا جاتا ہے اور دوسری باتوں کی طرف توجہ پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے رسُول نے اُسی کے جواب کو اولیت دی۔ اور جواب بھی فی الجملہ اعترافِ کمزوری کے ساتھ دیا۔ اسکی قطعاً پروا نہ کی کہ مخالف لوگ کہیں گے کہ انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہار مان لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اسکے جواب میں اسکا تو اعتراف کر لیا کہ اس قتل میں مجھ سے غلطی اور خطا ہو گئی مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ یہ غلطی قصداً نہیں تھی ایک صحیح اقدام تھا جو اتفاقاً غلط انجام پر پہنچ گیا کہ مقصد تو قبطی کو اسرائیلی شخص پر ظلم سے روکنا تھا اسی قصد سے اُس کو ایک ضرب لگائی تھی اتفاقاً وہ اسی سے مر گیا اسلئے یہ فعل خطا ہونے کے باوجود ہمارے اصل معاملہ یعنی نبوت کے دعوے اور اُس کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ مجھے اس غلطی پر تنبہ ہوا اور قانونی گرفت

کے خوف سے شہر سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر کرم فرمایا اور نبوت و رسالت سے سرفراز فرما دیا۔

غور کیجئے کہ اسوقت دشمن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کا سیدھا صاف جواب یہ تھا کہ مقتول قبطی کو واجب القتل ثابت کرتے، اسپر ایسے الزامات لگاتے جس سے اُسکا واجب القتل ہونا ثابت ہوتا۔ کوئی دوسرا آدمی تکذیب کرنے والا بھی وہاں موجود نہ تھا جس سے تردید کا اندیشہ ہوتا، اور اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اسکا جواب اسکے سوا کچھ نہ ہوتا مگر وہاں تو خدا تعالیٰ کا ایک اولوالعزم رسول صدق مجسم تھا جو حق و صدق اور حقیقت کے اظہار ہی کو اپنی فتح سمجھتا تھا۔ دشمن کے بھرے دربار میں اپنی خطا کا اعتراف بھی کر لیا اور اُس سے جو نبوت و رسالت پر شبہہ ہو سکتا تھا اسکا جواب بھی دیدیا۔ اسکے بعد پہلی بات یعنی خانہ پروردہ ہونیکے احسان جتلانے کے جواب کیطرف توجہ فرمائی تو اسکے اس ظاہری احسان کی اصل حقیقت کیطرف توجہ دلا دی کہ ذرا سوچو، میں کہاں اور دربار فرعون کہاں؟ میری پرورش تمہارے گھر میں ہونیکے سبب پر غور کرو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ تم جو پوری قوم بنی اسرائیل پر یہ خلاف انسانیت ظلم توڑ رہے تھے کہ انکے بے گناہ معصوم لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے، بظاہر تو تمہارے اس ظلم و ستم سے بچنے کے لئے میری والدہ نے مجھے دریا میں ڈالا اور تمنے اتفاقی طور پر میرا تابوت دریا سے نکال کر گھر میں رکھ لیا اور حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ انتظام اور تمہارے ظلم کی غیبی سزا تھی کہ جس بچے کے خطرہ سے بچنے کے لئے تم نے ہزاروں بچے قتل کر ڈالے تھے قدرت نے اُس بچے کو تمہارے ہی ہاتھوں پلوایا۔ اب سوچو کہ یہ میری پرورش تمہارا کیا احسان تھا۔ اسی پیغمبرانہ طرز جواب کا یہ اثر تو طبعی اور عقلی طور پر حاضرین پر ہونا ہی تھا کہ یہ بزرگ کوئی بات بنانے والے نہیں، سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے، اسکے بعد جب معجزات دیکھے تو اور زیادہ انکی تصدیق ہوگئی۔ اور گو اقرار نہیں کیا مگر مرعوب اتنا ہوگیا کہ یہ صرف دو آدمی جن کے آگے پیچھے کوئی تیسرا مددگار نہیں، دربار سارا اُسکا، شہر اور مُلک اُسکا، مگر یہ خوف اس پر طاری ہے کہ یہ دو آدمی ہمیں اپنے اس ملک و مملکت سے نکال دیں گے۔

یہ ہوتا ہے خداداد رُعب اور صدق و حق اور سچائی کی ہیبت۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے مجادلات و مناظرات بھی صدق و سچائی اور مخاطب کی دینی خیر خواہی کے جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ وہی دلوں میں گھر کرتے ہیں اور بڑے بڑے سرکشوں کو رام کر لیتے ہیں۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ

بولا اپنے گرد کے سرداروں سے یہ تو کوئی جادوگر ہے پڑھا ہوا　　چاہتا ہے کہ نکالدے تم کو تمہارے

مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ

دیس سے اپنے جادو کے زور سے، سو اب کیا حکم دیتے ہو　　بولے ڈھیل دے اسکو اور اسکے بھائی کو

وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَأْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

اور بھیجدے شہروں میں نقیب لے آئیں تیرے پاس جو بڑا جادوگر ہو پڑھا ہوا

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ

پھر اکٹھے کئے جادوگر وعدہ پر ایک مقرر دن کے اور کہدیا لوگوں کو کیا تم بھی

مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا

اکٹھے ہوگے شاید ہم راہ قبول کرلیں جادوگروں کی اگر ہو اُن کو غلبہ پھر جب

جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

آئے جادوگر کہنے لگے فرعون سے بھلا کچھ ہمارا حق بھی ہے اگر ہو ہم کو غلبہ

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا

بولا البتہ اور تم اس وقت مقربوں میں ہوگے کہا اُن کو موسیٰ نے ڈالو جو

مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ

تم ڈالتے ہو پھر ڈالیں اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں اور بولے فرعون کے اقبال سے

اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا

ہماری ہی فتح ہے پھر ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا پھر تبھی وہ نگلنے لگا جو سانگ انھوں

يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

نے بنایا تھا پھر اوندھے گرے جادوگر سجدہ میں بولے ہم نے مان لیا جہان کے رب کو

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ

جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا بولا تم نے اُس کو مان لیا ابھی میں نے حکم نہیں دیا تم کو،

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۚ لَاُقَطِّعَنَّ

مقرر وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھلایا جادو سو اب معلوم کرلوگے البتہ کاٹوں گا

اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں اور سُولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۖ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا

بولے کچھ ڈر نہیں ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے ہم غرض رکھتے ہیں کہ بخشدے ہمکو رب

رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

ہمارا تقصیریں ہماری اسواسطے کہ ہم ہوئے پہلے قبول کرنے والے

ع ۳

خُلاصۂ تفسیر

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات ظاہر ہوئے تو) فرعون نے اہل دربار سے جو اسکے آس پاس (بیٹھے) تھے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے اسکا (اصل) مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے (خود رئیس ہو جاوے اور) تم کو تمھاری زمین سے باہر کر دے (تاکہ بلا مزاحمت غیرے اپنی قوم کو لے کر ریاست کرے) سو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا کہ آپ انکو اور ان کے بھائی کو (چندے) مہلت دیجئے اور (اپنے ملک کے حدود کے) شہروں میں (گرداوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکمنامے دیکر) بھیجد بیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کرکے) آپ کے پاس لاکر حاضر کردیں، غرض وہ جادوگر ایک معین دن کے خاص وقت پر جمع کرلئے گئے (معین دن سے مراد یوم الزینت ہے اور خاص وقت سے مراد وقت چاشت ہے جیسے سورۂ طٰہٰ کے شروع رکوع سوم میں مذکور ہے، یعنی اسوقت کے قریب تک سب لوگ جمع کرلئے گئے اور فرعون کو جمع ہونے کی اطلاع دیدی گئی) اور (فرعون کی جانب سے بطور اعلان عام کے) لوگوں کو یہ اشتہار دیا گیا کہ کیا تم لوگ (فلاں موقع پر واقعہ دیکھنے کے لئے) جمع ہوگے (یعنی جمع ہو جاؤ) تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں (جیسا کہ غالب توقع ہے) تو ہم انہیں کی راہ پر رہیں (یعنی وہی راہ جس پر فرعون تھا اور دوسروں کو بھی اس پر رکھنا چاہتا تھا۔ مطلب یہ کہ جمع ہو کر دیکھو، امید ہے کہ جادوگر غالب رہیں گے تو ہم لوگوں کے طریق کا حق ہونا حجت سے ثابت ہو جائے گا) پھر جب وہ جادوگر (فرعون کی بیٹھی میں) آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر (موسیٰ علیہ السلام) پر ہم غالب آگئے تو کیا ہمکو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا ہاں (انعام مالی بھی بڑا ملیگا) اور (مزید برآں یہ مرتبہ ملیگا کہ) تم اس صورت میں (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض اس گفتگو کے بعد عین موقعۂ مقابلہ پر آئے اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور مقابلہ شروع ہوا اور ساحروں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اپنا عصا پہلے ڈالئے گا یا ہم ڈالیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا (منظور) ہو (میدان میں) ڈالو، سو اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں (جو جادو کے اثر سے سانپ معلوم ہوتے تھے) اور کہنے لگے کہ فرعون کے نصیب کی قسم بے شک ہم ہی غالب آدیں گے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے (بحکم خداوندی) اپنا عصا ڈالا، ڈالنے کیساتھ ہی (اژدہا بن کر) اُنکے تمام تر بنے بنائے دھندے کو نگلنا شروع کر دیا سو (یہ دیکھ کر) جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سب سجدہ میں گر پڑے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے ربّ العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے، (فرعون بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہو کہ ساری

رعایا ہی مسلمان ہوجاوے تو ایک مضمون گھڑ کر بصورتِ عتاب ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ
پر ایمان لے آئے بغیر اسکے کہ میں تم کو اجازت دوں ضرور (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جادو میں) تم سب کا
اُستاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے (اور تم اسکے شاگرد ہو اسلئے باہم خفیہ سازش کرلی ہے کہ تم یُوں
کرنا ہم یُوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے تاکہ قبطیوں سے سلطنت لیکر بفراغِ خاطر
خود ریاست کرو کقولہ تعالیٰ (اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا)
سو اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری
طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سُولی پر ٹانگ دُونگا (تاکہ اوروں کو عبرت ہو) اُنھوں نے جواب دیا
کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے (جہاں ہر طرح امن وراحت ہے پھر ایسے مرنے
سے نقصان ہی کیا اور) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کردے اسوجہ سے
کہ ہم (اس موقع پر حاضرین میں سے) سب سے پہلے ایمان لائے (پس اس پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ ان
سے پہلے بعضے ایمان لاچکے تھے جیسے آسیہ اور مومنِ آلِ فرعون اور بنی اسرائیل)

معارف و مسائل

اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہا کہ آپ جو کچھ
جادو دکھانا چاہتے ہو وہ دکھاؤ۔ اس پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
اُن کو جادو کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کی طرف سے جادو دکھانے کا حکم نہیں تھا بلکہ جو کچھ وہ کرنے والے تھے اسکا ابطال مقصود تھا لیکن اسکا
باطل ہونا بغیر اسکے ظاہر کرنے کے ناممکن تھا اسلئے آپ نے ان کو اظہار جادو کا حکم دیا جیسے کہ ایک
زندیق کو کہا جائے کہ تم اپنے زندقہ اور بے دینی کے دلائل پیش کرو تاکہ میں ان کو باطل ثابت کرسکوں
ظاہر ہے کہ اسے کفر پر رضامندی نہیں کہا جاسکتا۔

بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ، یہ کلمہ ان جادوگروں کے لئے بمنزلہ قسم ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی۔
افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اب ایسی قسمیں رائج ہوگئی ہیں جو اس سے زیادہ شنیع اور قبیح ہیں مثلاً
بادشاہ کی قسم، تیرے سر کی قسم، تیری ڈاڑھی کی قسم یا تیرے باپ کی قبر کی قسم، اس قسم کی قسمیں کھانا شرعاً
جائز نہیں، بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے میں جو گناہِ عظیم ہے
ان ناموں کی سچی قسم بھی گناہ میں اُس سے کم نہیں (کما فی الشامی)

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ، یعنی جب فرعون نے جادوگروں کو قبولِ ایمان پر
قتل کی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سُولی چڑھانے کی دھمکی دی تو جادوگروں نے بڑی بے پروائی سے یہ جواب

دیا کہ تم جو کچھ کرسکتے ہو کرلو۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم قتل بھی ہونگے تو اپنے رب کے پاس چلے جائینگے جہاں آرام ہی آرام ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ جادوگر جو عمر بھر جادوگری کے کفر میں مبتلا، اُس پر مزید فرعون کے دعوائے خدائی کو ماننے والے اور اس کی پرستش کرنے والے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھکر اپنی پوری قوم کے خلاف، فرعون جیسے ظالم جابر بادشاہ کے خلاف ایمان کا اعلان کردیں یہی ایک حیرت انگیز چیز تھی مگر یہاں تو صرف ایمان کا اعلان ہی نہیں بلکہ ایمان کا وہ گہرا رنگ چڑھ جانے کا مظاہرہ ہے کہ قیامت و آخرت گویا انکے سامنے نظر آنے لگی۔ آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہونے لگا ہے جس کے مقابلے میں دُنیا کی ہر سزا اور مصیبت سے بے نیاز ہوکر (فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ) کہدیا یعنی جو تیرا جی چاہے کرلے ہم تو ایمان سے پھرنے والے نہیں۔ یہ بھی درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کا معجزہ ہے جو معجزۂ عصا اور ید بیضاء سے کم نہیں، اسی طرح کے بہت سے واقعات ہمارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ہیں کہ ایک منٹ میں ستر برس کے کافر میں ایسا انقلاب آگیا کہ صرف مؤمن ہی نہیں ہوگیا بلکہ غازی بن کر شہید ہونے کی تمنا کرنے لگا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ

پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے

قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

تھوڑی سی اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں اور ہم سارے اُن سے خطرہ رکھتے ہیں

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾

پھر نکال باہر کیا ہم نے اُن کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے

كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾

اسی طرح اور ہاتھ لگادیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے اُنکے سورج نکلنے کے وقت

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ

پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ کے لوگ ہم تو پکڑے گئے کہا

كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ

ہرگز نہیں، میرے ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتلائیگا پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ مار اپنے

بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ وَ

عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہوگئی ہر پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور

أَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾ وَأَنجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٦٥﴾

پاس پہنچا دیا ہم نے اُسی جگہ دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے اسکے ساتھ سب کو

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ﴿٦٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم

پھر ڈبا دیا ہم نے اُن دوسروں کو اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے بہت لوگ اُن میں

مُّؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦٨﴾

ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون کو اس واقعہ سے بھی ہدایت نہ ہوئی اور اُس نے بنی اسرائیل کی آزار دہی نہ چھوڑی تو) ہمنے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم بھیجا کہ میرے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) شبا شب (مصر سے باہر) نکال لے جاؤ (اور فرعون کی جانب سے) تم لوگوں کا تعاقب (بھی) کیا جاویگا (چنانچہ وہ موافق حکم کے بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلدیئے صبح یہ خبر مشہور ہوئی تو) فرعون نے (تعاقب کی تدبیر کرنے کیلئے جا بجا آس پاس کے) شہروں میں چپراسی دوڑا دیئے (اور یہ کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل ہماری نسبت) تھوڑی سی جماعت ہے (ان کے مقابلہ سے کوئی اندیشہ نہ کرے) اور اُنھوں نے (اپنی کاروائی سے) ہم کو بہت غصہ دلایا ہے (وہ کاروائی یہ ہے کہ خفیہ چالاکی سے نکل گئے یا یہ کہ زیور بھی ہمارا بہت سا عاریت کے بہانے سے لے گئے غرض ہم کو احمق بنا کر گئے ضرور ان کا تدارک کرنا چاہیئے) اور ہم سب ایک مسلح جماعت (اور باقاعدہ فوج) ہیں، غرض (دو چار روز میں جب سامان اور فوج سے درست ہوگیا تو لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا اور یہ خبر نہ تھی کہ اب لوٹنا نصیب نہ ہوگا تو اس حساب سے گویا) ہم نے اُن کو باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے نکال باہر کیا (ہم نے انکے ساتھ تو) یُوں کیا اور اُن کے بعد بنی اسرائیل کو اُن کا مالک بنا دیا (یہ جملہ معترضہ تھا آگے قصہ ہے) غرض (ایک روز) سُورج نکلنے کے وقت اُن کو پیچھے سے جالیا (یعنی قریب پہنچ گئے اسوقت بنی اسرائیل دریائے قلزم سے اُترنے کی فکر میں تھے کہ کیا سامان کریں) پھر جب دونوں جماعتیں (باہم ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے کہ (اے موسیٰ) بس ہم تو اُن کے ہاتھ آگئے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی (دریا سے نکلنے کا) رستہ بتلا دیگا (کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو

روانگی کے وقت ہی کہدیا گیا تھا کہ سمندر میں خشک راستہ پیدا ہو جائیگا، فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ، گو خشک ہونیکی کیفیت اسوقت نہ بتلائی تھی، پس موسیٰ علیہ السلام اس وعدہ پر مطمئن تھے اور بنی اسرائیل کیفیت معلوم نہ ہونیسے مضطرب تھے) پھر ہمنے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو، چنانچہ (انھوں نے اس پر عصا مارا جس سے) وہ (دریا) پھٹ (کر کئی حصے ہو) گیا (یعنی پانی کئی جگہ سے اِدھر اُدھر ہٹکر بیچ میں متعدد سڑکیں کھل گئیں) اور ہر حصہ اتنا (بڑا) تھا جیسا بڑا پہاڑ (یہ لوگ دریا میں امن و اطمینان سے پار ہو گئے) اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس موقع کے قریب پہنچا دیا (یعنی فرعون اور فرعونی بھی دریا کے نزدیک پہنچے اور موافق پیشینگوئی سابق وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ، دریا اُسوقت تک اسی حال پر ٹھہرا ہوا تھا، اسلئے کھلے رستہ کو غنیمت سمجھا اور آگا پیچھا کچھ سوچا نہیں سارا لشکر اندر گھس گیا، اور چاروں طرف سے پانی سمٹنا شروع ہوا اور سارے لشکر کا کام تمام ہوا) اور (انجام قصہ کا یہ ہوا کہ) ہمنے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور انکے ساتھ والوں سبکو (غرق ہونیسے) بچالیا، پھر دوسروں کو (یعنی انکے مخالفوں کو) غرق کر دیا (اور) اس واقعہ میں بھی بڑی عبرت ہے (یعنی اس قابل ہے کہ کفار اس سے استدلال کریں کہ مخالفت احکام و رسل موجب عذاب خداوندی ہے اور اس کو سمجھ کر مخالفت سے بچیں) اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور آپ کا رب بڑا زبردست ہے (اگر چاہتا دنیا میں ہی انکو عذاب دیتا لیکن) بڑا مہربان (بھی) ہے (اسلئے اپنی رحمت عامہ سے عذاب کی مہلت مقرر کر دی ہے، پس تعجیل عذاب سے بیفکر نہ ہونا چاہیے)۔

معارف و مسائل

وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ[1] ، اس آیت میں بظاہر یہ تصریح ہے کہ قوم فرعون کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائداد، باغات و خزائن کا مالک غرقِ فرعون کے بعد بنی اسرائیل کو بنا دیا گیا۔ لیکن اسمیں ایک تاریخی اشکال یہ ہے کہ خود قرآن کی متعدد آیات اسپر شاہد ہیں کہ قوم فرعون کی ہلاکت کے بعد بنی اسرائیل مصر کیطرف نہیں لوٹے بلکہ اپنے اصلی وطن ارض مقدس شام کیطرف روانہ ہوئے، وہیں انکو ایک کافر قوم سے جہاد کر کے انکے شہر کو فتح کرنیکا حکم ملا جسکی تعمیل سے بنی اسرائیل نے انکار کر دیا، اسپر بطور عذاب کے اس کھلے میدان میں جسمیں بنی اسرائیل موجود تھے ایک قدرتی جیلخانہ بنا دیا گیا، کہ وہ اس میدان سے نکل نہیں سکتے تھے، اسی حال میں چالیس سال گزرے اور اسی وادی تیہ میں انکے دونوں پیغمبر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی وفات ہو گئی۔ اسکے بعد بھی کتب تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسیوقت بنی اسرائیل اجتماعی اور قومی صورت سے مصر میں داخل ہوئے ہوں کہ قوم فرعون کی جائداد و خزائن پر ان کا قبضہ ہوا ہو ——— تفسیر روح المعانی میں سورۂ شعراء کی اسی آیت کے تحت اسکے دو جواب ائمہ تفسیر حضرت حسنؒ و قتادہؒ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں، حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ آیت مذکورہ میں بنی اسرائیل کو فرعونی متروکہ جائیداد کا وارث بنانے کا ذکر ہے مگر یہ کہیں مذکور نہیں کہ یہ واقعہ ہلاک فرعون کے فوراً بعد ہو جائیگا، وادی تیہ کے واقعہ اور چالیس پچاس سال کے بعد بھی اگر وہ مصر میں داخل ہوئے ہوں تو آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رہا یہ امر کہ تاریخ سے انکا اجتماعی دخول مصر ثابت نہیں، تو یہ اعتراض اسلئے قابل التفات نہیں ہے کہ اُس زمانہ کی تاریخ یہود و نصاریٰ کی لکھی ہوئی اکاذیب سے بھرپور ہے جو کسی طرح قابل اعتماد نہیں، اسکی وجہ سے آیت قرآن میں کوئی تاویل کرنیکی ضرورت نہیں ——— حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اس واقعہ کیمتعلق جتنی آیات قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں آئی ہیں مثلاً سورۂ اعراف آیت ۱۳۶ و ۱۳۷ اور سورۂ قصص آیت ۵ اور سورۂ دخان کی آیات ۲۵ تا ۲۸ اور سورۂ شعراء کی آیت مذکورہ ۵۹ ان سب کے ظاہر سے اگرچہ ذہن اسطرف جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو خاص انہیں باغات اور جائداد کا مالک بنایا گیا تھا جو قوم فرعون نے ارض مصر میں چھوڑی تھیں جس کیلئے بنی اسرائیل کا مصر کیطرف لوٹنا ضروری ہے۔ لیکن ان سب آیتوں کے الفاظ میں اسکی بھی واضح گنجائش موجود ہے کہ مراد ان سے یہ ہو کہ بنی اسرائیل کو اسی طرح کے خزائن اور باغات وغیرہ کا مالک بنا دیا گیا جسطرح کے باغات قوم فرعون کے پاس تھے۔ جس کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ارض مصر ہی میں پہنچکر حاصل ہوں بلکہ ارض شام میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں،

[1] یہ مضمون پہلی اشاعت میں لکھنے سے رہ گیا تھا طبع جدید کیوقت آج ۱۲ شعبان ۱۳۹۵ھ میں لکھا گیا، جبکہ احقر کی عمر اسّی سال پورے ہو نے میں صرف آٹھ دن باقی ہیں، ۱۲ منہ

اور سورۂ اعراف کی آیت میں اَلَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا کے الفاظ سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارضِ شام مراد ہے، کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں بٰرَکْنَا وغیرہ کے الفاظ اکثر ارضِ شام ہی کے بارے میں آئے ہیں اس لئے حضرت قتادہؒ کا قول یہ ہے کہ بلا ضرورت آیاتِ قرآن کو ایسے محمل پر محمول کرنا جو تاریخ عام سے متصادم ہو درست نہیں ——— خلاصہ یہ ہے کہ اگر واقعات سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہلاکِ فرعون کے بعد کسی وقت بھی بنی اسرائیل اجتماعی صورت سے مصر پر قابض نہیں ہوئے تو حضرت قتادہؒ کی تفسیر کے مطابق ان تمام آیات میں ارضِ شام اور اس کے باغات و خزائن کا وارث ہونا مراد لیا جا سکتا ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ○ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ○ اسوقت جبکہ فرعونی لشکر جو انکے تعاقب میں تھا جب بالکل سامنے آگیا تو پوری قوم بنی اسرائیل چلا اٹھی کہ ہم تو پکڑے گئے اور پکڑے جانیمیں شبہ اور دیر ہی کیا تھی کہ پیچھے یہ لشکر جرار اور آگے دریا حائل یہ صورت حال موسیٰ علیہ السلام سے بھی غائب نہ تھی مگر وہ کوہِ استقامت اللہ کے وعدہ پر یقین کئے ہوئے اسوقت بھی بڑے زور سے کہتے ہیں کَلَّا ہرگز نہیں پکڑے جاسکتے اور وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ، میرے ساتھ میرا پروردگار ہے جو مجھے راستہ دیگا۔ ایمان کا امتحان ایسے ہی مواقع میں ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ذرا ہراس نہیں تھا، وہ گویا راستہ بچنے کا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسیطرح کا بعینہ واقعہ ہجرت کیوقت غارِ ثور میں چھپنے کیوقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا تھا کہ دشمن جو آپکے تعاقب میں تھے اس غار کے دہانے پر آکھڑے ہوئے، ذرا نیچے نظر کریں تو آپ انکے سامنے آجائیں، اسوقت صدیق اکبرؓ کو گھبراہٹ ہوئی تو آپ نے بعینہ یہی جواب دیا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے، ان دونوں واقعات میں ایک بات یہ بھی قابل نظر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دینے کیلئے کہا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ "میرے ساتھ میرا رب ہے" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مَعَنَا فرمایا کہ ہم دونوں کیساتھ ہمارا رب ہے، یہ امت محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ اسکے افراد بھی اپنے رسولؐ کیساتھ معیتِ الٰہیہ سے سرفراز ہیں۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا

اور سنادے ان کو خبر ابراہیم کی جب کہا اپنے باپ کو اور اسکی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو وہ بولے

نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾

ہم پوجتے ہیں مورتوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو،

اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ

یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا ، بولے نہیں، پر ہمنے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے

﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادے اگلے

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ

سو وہ میرے غنیم ہیں مگر جہان کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ جو مجھ کو

هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ

کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھ کو مار یگا اور

ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ

پھر جلائیگا اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن اے میرے رب

هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي

دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں اور رکھ میرا بول سچا

الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِأَبِيْ إِنَّهٗ كَانَ

پچھلوں میں اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ تھا

مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾

راہ بھولے ہوؤں میں اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ بیٹے

إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ

مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر دل چنگا اور پاس لائیں بہشت کو واسطے ڈر والوں کے اور نکالیں دوزخ

الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

کو سامنے بے راہوں کے اور کہیں اُن کو کہاں ہیں جن کو تم پوجتے تھے اللہ کے سوائے

هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ أَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ

کیا کچھ مدد کرتے ہیں تمہاری یا بدلہ لے سکتے ہیں پھر اوندھے ڈالیں اُس میں ان کو اور سب بے راہوں کو، اور ابلیس

إِبْلِيْسَ أَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ إِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ

کے لشکر کو سبھوں کو کہیں گے جب وہ وہاں باہم جھگڑنے لگیں قسم اللہ کی ہم تھے صریح غلطی

مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ إِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾

میں جب ہم تم کو برابر کرتے تھے پروردگار عالم کے اور ہم کو راہ سے بہکایا سو ان گنہگاروں نے

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً

پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والے اور نہ کوئی دوست محبت کرنے والا سو کسی طرح ہم کو پھر جانا ملے

فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ

تو ہم ہوں ایمان والوں میں اس بات میں نشانی ہے اور بہت لوگ اُن میں

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ ع

نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۵ ۹

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان لوگوں کے سامنے ابراہیم علیہ السلام) کا قصہ بیان کیجئے (تاکہ انکو شرک کی مذمت کے دلائل معلوم ہوں، خصوص ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہو کر، کیونکہ یہ مشرکین عرب اپنے کو ملتِ ابراہیمیہ پر بتلاتے ہیں اور وہ قصہ اسوقت ہوا تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو، انھوں نے کہا ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم انہی (کی عبادت)

پر جمے بیٹھے رہتے ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انکو (اپنی عرض حاجت کیوقت)
پکارا کرتے ہو یا (تم جو ان کی عبادت کرتے ہو تو کیا) یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں یا (اگر تم انکی عبادت ترک کردو تو
کیا) یہ تمکو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں (یعنی استحقاق الوہیت کیلئے علم اور قدرت کاملہ تو ضروری ہے) ان لوگوں نے کہا نہیں
(یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ کچھ سنتے ہوں یا نفع و ضرر پہنچا سکتے ہوں اور انکی عبادت کرنیکی یہ وجہ نہیں) بلکہ ہمنے اپنے بڑوں کو
اسیطرح کرتے دیکھا ہے (اس لئے ہم بھی ویسی کرتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا تمنے ان (کی حالت) کو (غور
سے) دیکھا بھی جنکی تم عبادت کیا کرتے ہو تم بھی اور تمہارے پرانے بڑے بھی کہ یہ (معبودین) میرے (یعنی تمہارے لئے)
باعث ضرر ہیں (یعنی اگر انکی عبادت کیجاوے، خواہ نعوذ باللہ میں کروں یا تم کرو تو بجز ضرر کے اور کوئی نتیجہ نہیں) مگر ہاں
رب العالمین (ایسا ہے کہ وہ اپنے عابدین کا دوست ہے اور اسکی عبادت سراسر نافع ہے) جسنے مجھکو (اور اسیطرح سب کو)
پیدا کیا، پھر وہی مجھکو (میری مصلحتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (یعنی عقل و فہم دیتا ہے جس سے نفع و ضرر کو سمجھتا ہوں) اور جو
مجھکو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں (جسکے بعد شفا ہوجاتی ہے) تو وہی مجھکو شفا دیتا ہے اور جو مجھکو (وقت پر)
موت دیگا پھر (قیامت کے روز) مجھکو زندہ کریگا اور جس سے مجھ کو یہ امید ہے کہ میری غلط کاری کو قیامت کے روز معاف
کردیگا (یہ تمام صفات اسلئے سنائیں کہ قوم کو خدا تعالیٰ کی عبادت کی رغبت ہو پھر صفات کمال بیان فرماتے فرماتے غلبۂ حضور
سے حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے کہ) اے میرے پروردگار مجھکو حکمت (یعنی جامعیت بین العلم والعمل میں زیادہ کمال) عطا
فرما (کیونکہ نفس حکمت تو وقت دعا کے بھی حاصل ہے) اور (مراتب قرب میں) مجھکو (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ
شامل فرما (مراد انبیاء عالیشان ہیں) اور میرا ذکر آئندہ آنیوالوں میں جاری رکھ (تاکہ میرے طریقہ پر چلیں جس میں
مجھ کو زیادہ ثواب ملے) اور مجھ کو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر اور میرے باپ (کو توفیق ایمان کی دیکر
اُس) کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے اور جس روز سب زندہ ہوکر اُٹھیں گے اُس روز مجھ کو رُسوا نہ
کرنا (آگے اس دن کے بعض واقعات ہائلہ کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ قوم سُنے اور ڈرے یعنی وہ ایسا دن
ہوگا) جس دن میں کہ (نجات کے لئے) نہ مال کام آدیگا نہ اولاد مگر ہاں (اسکو نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس
(کفر و شرک سے) پاک دل لے کر آویگا اور (اس روز) خدا ترسوں (یعنی ایمان والوں) کے لئے جنت
نزدیک کردیجاویگی (کہ اس کو دیکھیں اور یہ معلوم کرکے کہ ہم اسمیں جاویں گے خوش ہوں) اور ان گمراہوں
(یعنی کافروں) کے لئے دوزخ سامنے ظاہر کیجاویگی (کہ اُس کو دیکھ کر غمزدہ ہوں کہ ہم اسمیں جاوینگے)
اور (اس روز) ان (گمراہوں) سے کہا جاویگا کہ وہ معبود کہاں گئے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا
کرتے تھے کیا (اسوقت) وہ تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں یا اپنا ہی بچاؤ کرسکتے ہیں پھر (یہ کہہ کر) وہ
(عابدین) اور گمراہ لوگ اور ابلیس کا لشکر سب کے سب دوزخ میں اوندھے منھ ڈالدیئے جاویگے
(بس وہ بُت اور شیاطین نہ اپنے کو بچا سکے نہ اپنے عابدین کو) وہ کفار اس دوزخ میں گفتگو کرتے
ہوئے (ان معبودین سے) کہیں گے کہ بخدا بے شک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو (عبادت میں)

رب العالمین کے برابر کرتے تھے اور ہم کو تو بس ان بڑے مجرموں نے (جو کہ بانیٔ ضلالت تھے) گمراہ کیا سو (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے (کہ چھڑالے) اور نہ کوئی مخلص دوست (کہ خالی دلسوزی ہی کرلے) سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو (دنیا میں) پھر واپس جانا ملتا کہ ہم مسلمان ہوجاتے (یہاں تک ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہوگئی آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) بیشک اس واقعہ (مناظرہ ابراہیمیہ نیز واقعہ قیامت) میں (بھی طالبانِ حق اور انجام اندیشوں کے لئے) ایک عبرت ہے (کہ مضامین مناظرہ میں غور کرکے توحید کا اعتقاد کریں اور واقعاتِ قیامت سے ڈریں اور ایمان لادیں) اور (باوجود اس کے) ان (مشرکینِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے بےشک آپکا رب بڑا زبردست رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

قیامت تک انسانوں میں ذکرِ خیر رکھنے کی دعا | وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ، اس آیۃ مبارکہ میں "لسان" سے مراد ذکر ہے اور "لی" کا لام نفع کے لئے ہے آیۃ کے معنی یہ ہوئے کہ اے خدایا مجھے ایسے پسندیدہ طریقے اور عمدہ نشانیاں عطا فرما جس کی دوسرے لوگ قیامت تک پیروی کریں، اور مجھے ذکر خیر اور عمدہ صفت سے یاد کیا کریں (ابن کثیر و روح المعانی) خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمائی۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ تک ملۃ ابراہیمی سے محبت و الفت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگرچہ ان کا طریقہ ملتِ ابراہیمی کے خلاف کفر و شرک ہے مگر وہ دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور اُمتِ محمدیہ تو بجا طور پر بھی ملتِ ابراہیمی پر ہونے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہے۔

حُبِّ جاہ مذموم مگر چند شرائط کیساتھ جائز ہے | حُبِّ جاہ یعنی لوگوں سے اپنی عزت کرنے اور مدح کرنیکی خواہش شرعاً مذموم ہے قرآن کریم نے دارِ آخرت کی نعمتوں کو حُبِّ جاہ کے ترک پر موقوف قرار دیا ہے (قال تعالیٰ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا) اسجگہ آیت (وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا کہ آنیوالی نسلوں میں میری تعریف و ثنا ہوا کرے بظاہر حبِّ جاہ میں داخل معلوم ہوتی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ اس دعا کا اصل مقصد حبِّ جاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے اسکی دعا ہے کہ ایسے نیک اعمال کی توفیق بخشیں جو میری آخرت کا سامان بنیں اور اس کو دیکھکر دوسرے لوگوں کو بھی اعمالِ صالحہ کی رغبت ہو اور میرے بعد بھی لوگ اعمالِ صالحہ میں میری پیروی کرتے رہیں۔ جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے کوئی وجاہت کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہی نہیں،

جس کو حُبِّ جاہ کہا جا سکے۔ قرآن و حدیث میں جہاں طلب جاہ کو ممنوع اور مذموم قرار دیا ہے اُسکی مراد وہی دُنیوی وجاہت اور اُس سے دُنیوی منافع حاصل کرنا ہے۔

امام ترمذی و نسائی نے حضرت کعبؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے گلّے میں چھوڑ دیئے جاویں وہ بکریوں کے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا دو خصلتیں انسان کے دین کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ایک مال کی محبت دوسرے اپنی عزت و جاہ کی طلب (ورواہ الطبرانی عن ابی سعید الخدریؓ والبزار عن ابی ھریرۃؓ) اور حضرت ابن عباسؓ سے بسند ضعیف دیلمی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہ و ثنا کی محبت انسان کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ ان تمام روایات سے مراد وہ حُبِّ جاہ اور طلبِ ثناء ہے جو دُنیوی مقاصد کے لئے مطلوب ہو یا جس کی خاطر دین میں مداہنت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے اور جب یہ صورت نہ ہو تو طلبِ جاہ مذموم نہیں۔ حدیث میں خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا منقول ہے (اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا) یعنی یا اللہ مجھے خود اپنی نگاہ میں تو چھوٹا اور حقیر بنا دیجئے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا دیجئے۔ یہاں بھی لوگوں کی نظر میں بڑا بنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ نیک اعمال میں میری پیروی کریں۔ اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص واقع میں صالح اور نیک ہو، لوگوں کی نظر میں نیک بننے کے لئے ریاکاری نہ کرے اسکے لئے لوگوں کیطرف سے مدح و ثنا کی محبت مذموم نہیں۔

ابن عربی نے فرمایا کہ آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ جس نیک عمل سے لوگوں میں تعریف ہوتی ہو اُس نیک عمل کی طلب خواہش جائز ہے۔ اور امام غزالی رہ نے فرمایا کہ دُنیا میں عزت و جاہ کی محبت تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ اوّل یہ کہ اس سے مقصود اپنے آپ کو بڑا اور اُسکے بالمقابل دوسرے کو چھوٹا یا حقیر قرار دینا نہ ہو بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے ہو کہ لوگ میرے معتقد ہو کر نیک اعمال میں میرا اتباع کریں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹی ثنا خوانی مقصود نہ ہو کہ جو صفت اپنے اندر نہیں ہے لوگوں سے اسکی خواہش رکھے کہ وہ اس صفت میں اُسکی تعریف کریں۔ تیسرے یہ کہ اسکے حاصل کرنے کے لئے کسی گناہ یا دین کے معاملے میں مُداہنت اختیار نہ کرنی پڑے۔

مشرکین کے لئے دُعائے مغفرت جائز نہیں وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ، قرآن مجید کے اس فرمان کے بعد (مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ) اب کسی ایسے شخص کے لئے جسکا کفر پر مرنا یقینی ہو استغفار اور دُعائے مغفرت طلب کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ آیتِ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ کسی نبی اور ایمانداروں کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں خواہ وہ اسکے رشتہ دار اور قریبی ہی کیوں نہ ہوں جبکہ اُن کا جہنمی ہونا بالکل واضح ہو چکا ہو۔

ایک سوال و جواب اب یہاں یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ اس نہی اور ممانعت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لئے کیوں دعائے مغفرت مانگی۔ اسکا جواب خود اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں دیدیا کہ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ)

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے انکی زندگی میں استغفار اس نیت اور خیال سے کی تھی کہ اللہ رب العزت ان کو ایمان لانے کی توفیق دے جس کے بعد مغفرت یقینی ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خیال تھا کہ میرا باپ خفیہ طور پر ایمان لے آیا ہے اگرچہ اسکا اظہار اور اعلان نہیں کیا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہوگیا کہ میرا باپ تو کفر پر مرا ہے تو انھوں نے اپنی پوری بیزاری اور براءۃ کا اظہار فرمایا۔ (فائدہ) اس بات کی تحقیق کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ کا کفر اور شرک اپنے باپ کی زندگی میں معلوم ہوگیا تھا یا مرنے کے بعد یا قیامت کے روز ہوگا، اس کی پوری تفصیل سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ یعنی قیامت کے اُس دن میں جس میں نہ کوئی مال کسی کو فائدہ دیگا نہ اُس کی نرینہ اولاد بجز اُس شخص کے جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لیکر پہنچے۔ اس آیت کی تفسیر بعض حضرات نے استثناء کو استثنائے منقطع قرار دیکر یہ کی ہے کہ اُس روز کسی کو نہ اسکا مال کام آویگا نہ اولاد، ہاں کام آئیگا تو صرف اپنا قلبِ سلیم جس میں شرک و کفر نہ ہو۔ اور اس جملے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص زید کے متعلق کسی سے پوچھے کہ کیا زید کے پاس مال اور اولاد بھی ہے وہ اسکے جواب میں کہے اسکا مال و اولاد تو اسکا قلبِ سلیم ہے۔ جسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مال و اولاد تو کچھ نہیں مگر ان سب کے بدلے اسکے پاس اپنا قلبِ سلیم موجود ہے۔ خلاصہ مضمون آیت کا اس تفسیر پر یہ ہوتا ہے کہ مال یا اولاد تو اُس روز کچھ کام نہ آئیں گے، کام صرف اپنا ایمان اور عمل صالح آئیگا جس کو قلبِ سلیم سے تعبیر کردیا گیا ہے۔ اور مشہور تفسیر اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ استثناء متصل ہے اور معنے یہ ہیں کہ مال اور اولاد قیامت کے روز کسی شخص کے کام نہ آئیں گے بجز اُس شخص کے جسکا قلب سلیم ہے یعنی وہ مومن ہے اسکا حاصل یہ ہوا کہ یہ سب چیزیں قیامت میں بھی مفید و نافع ہوسکتی ہیں مگر صرف مومن کے لئے نفع بخش ہونگی کافر کو کچھ نفع نہ دیں گی۔ یہاں ایک بات یہ قابلِ نظر ہے کہ اس جگہ قرآن کریم نے وَلَا بَنُوْنَ فرمایا جس کے معنے نرینہ اولاد کے ہیں عام اولاد کا ذکر غالباً اس لئے نہیں کیا کہ آڑے وقت میں کام آنے کی توقع دنیا میں بھی نرینہ اولاد یعنی لڑکوں ہی سے ہوسکتی ہے لڑکیوں سے کسی مصیبت کے وقت امداد ملنے کا تو یہاں بھی احتمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اسلئے قیامت میں بالتخصیص لڑکوں کے غیر نافع ہونیکا ذکر کیا گیا جن سے دنیا میں توقع نفع کی رکھی جاتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قلبِ سلیم کے لفظی معنے تندرست دل کے ہیں۔ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ قلب ہے جو کلمۂ توحید کی گواہی دے اور شرک سے پاک ہو، یہی مضمون مجاہد حسن بصری سعید بن مسیب سے بعنوان مختلف منقول ہے۔ سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ تندرست دل صرف مومن کا ہو سکتا ہے کافر کا دل بیمار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

مال، اولاد اور خاندانی تعلقات آخرت میں بھی بشرطِ ایمان نفع پہنچا سکتے ہیں۔

آیتِ مذکورہ کی مشہور تفسیر کے مطابق معلوم ہوا کہ انسان کا مال قیامت کے روز بھی اُسکے کام آسکتا ہے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جس شخص نے دُنیا میں اپنا مال اللہ کی راہ اور نیک کاموں میں خرچ کیا تھا یا کوئی صدقہ جاریہ کر کے چھوڑا تھا، اگر اُسکا خاتمہ ایمان پر ہوا محشر میں مؤمنین کی فہرست میں داخل ہوا تو یہاں کا خرچ کیا ہوا مال اور صدقۂ جاریہ کا ثواب اس کو میدانِ حشر اور میزانِ حساب میں بھی کام آویگا۔ اور اگر یہ شخص مسلمان نہیں تھا یا خدانخواستہ مرنے سے پہلے ایمان سے نکل گیا تو اب دُنیا میں کیا ہوا کوئی نیک عمل اسکے کام نہ آویگا اور اولاد کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اگر یہ شخص مسلمان ہے تو آخرت میں بھی اس کو اولاد کا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس طرح سے کہ اسکے بعد اس کی اولاد اسکے لئے دُعائے مغفرت کرے یا ایصالِ ثواب کرے، اور اس طرح بھی کہ اُسنے اولاد کو نیک بنانے کی کوشش کی تھی اسلئے اُن کے نیک عمل کا ثواب اس کو بھی خود بخود ملتا رہا اور اسکے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہا۔ اور اس طرح بھی کہ اولاد محشر میں اسکی شفاعت کر کے بخشوالے جیسا کہ بعض روایات حدیث میں ایسی شفاعت کرنا اور اسکا قبول ہونا ثابت ہے خصوصاً نابالغ اولاد کا۔ اسی طرح اولاد کو ماں باپ سے بھی آخرت میں بشرطِ ایمان یہ نفع پہنچے گا کہ اگر یہ مسلمان ہوئے مگر اُن کے اعمالِ صالحہ ماں باپ کے درجے کو نہیں پہنچے تو اللہ تعالیٰ اُن کے باپ دادا کی رعایت کر کے ان کو بھی اُسی مقامِ بلند میں پہنچا دیں گے جو اُن کے باپ دادا کا مقام ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح اس طرح مذکور ہے وَاَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، یعنی ہم ملا دیں گے اپنے نیک بندوں کے ساتھ اُن کی ذرّیت کو بھی۔ اس آیت کی مذکورالصدر مشہور تفسیر سے معلوم ہوا کہ قرآن حدیث میں جہاں کہیں یہ مذکور ہے کہ قیامت میں خاندانی تعلق کچھ کام نہ آویگا اس کی مُراد یہ ہے کہ غیر مومن کو کام نہ آوے گا، یہاں تک کہ پیغمبر کی اولاد اور بیوی بھی اگر مؤمن نہیں تو ان کی پیغمبری سے ان کو قیامت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور لوط علیہ السلام کی بیوی اور ابراہیم علیہ السلام کے والد کا معاملہ ہے۔ آیاتِ قرآن فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ اور يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ) اور لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ) ان سب آیات کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا
جھٹلایا نوح کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُنکے بھائی نوح نے کیا تم کو

تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾
ڈر نہیں میں تمھارے واسطے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٩﴾
اور مانگتا نہیں میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١١٠﴾ قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ﴿١١١﴾
سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں کمینے

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي
کہا مجھ کو کیا جاننا ہے اسکا جو کام وہ کرتے ہیں ان کا حساب پوچھنا میرے رب کا ہی کام ہے

لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ
اگر تم سمجھ رکھتے ہو اور میں ہانکنے والا نہیں ایمان لانے والوں کو میں تو بس یہی ڈر سنا دینے والا

مُبِينٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿١١٦﴾
ہوں کھول کر بولے اگر تو نہ چھوڑے گا اے نوح تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَ
کہا اے رب میری قوم نے تو مجھ کو جھٹلایا سو فیصلہ کر دے میرے انکے بیچ میں کسی طرح کا فیصلہ اور

نَجِّنِي وَمَنْ مَعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي
بچا لے مجھ کو اور جو میرے ساتھ ہیں ایمان والے پھر بچا دیا ہم نے اسکو اور جو اسکے ساتھ تھے

الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ﴿١٢٠﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
اس لدی ہوئی کشتی میں پھر ڈبا دیا اسکے پیچھے ان باقی رہے ہوؤں کو البتہ اس بات میں

لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٢١﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٢﴾
نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

النصف

ع ۱۰ / ۶

خلاصۂ تفسیر

قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب سے سب کی تکذیب لازم آتی ہے) جبکہ اُن سے اُنکی برادری کے بھائی نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے؟ میں تمھارا امانت دار پیغمبر ہوں (کہ بعینہٖ پیغامِ خداوندی بلا کمی بیشی پہنچا دیتا ہوں) سو

(اسکا مقتضیٰ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور (نیز) میں تم سے کوئی (دُنیوی) صلہ (بھی) نہیں مانگتا میرا صلہ تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے سو (میری اس بے غرضی کا مقتضیٰ بھی یہ ہے کہ) تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم تم کو مانیں گے، حالانکہ رذیل لوگ تمہارے ساتھ ہولئے ہیں (جن کی موافقت سے شرفاء کو عار آتی ہے اور نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کا مقصد کسی کے ساتھ لگنے سے کچھ مال یا جاہ حاصل کرنا ہوتا ہے، ان کا دعوائے ایمان بھی قابلِ اعتبار نہیں۔) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اُنکے (پیشہ وارانہ) کام سے مجھ کو کیا بحث (خواہ شریف ہوں یا رذیل ہوں دین میں اس تفاوت کا کیا اثر رہا؟ یہ احتمال کہ اُنکا ایمان دل سے نہیں سو اس پر) ان سے حساب کتاب لینا بس خدا کا کام ہے۔ کیا خوب ہو کہ تم اس کو سمجھو اور (رذالت پیشہ لوگوں کو اپنے ایمان کا مانع قرار دینے سے جو اشارۃً یہ درخواست نکلتی ہے کہ میں ان کو اپنے پاس سے دُور کر دوں تو) میں ایمانداروں کو دُور کرنے والا نہیں ہوں (خواہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صاف طور پر ایک ڈرانے والا ہوں (اور تبلیغ سے میرا فرضِ منصبی پُورا ہو جاتا ہے، آگے اپنا نفع و نقصان تم لوگ دیکھ لو) وہ لوگ کہنے لگے اگر تم (اس کہنے سُننے سے) اے نوح باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے (غرض جب سالہا سال اسطرح گزر گئے تب) نوح (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار میری قوم مجھ کو (برابر) جھٹلا رہی ہے سو آپ میرے اور ان کے درمیان ایک (عملی) فیصلہ کر دیجئے (یعنی ان کو ہلاک کر دیجئے) اور مجھ کو اور جو ایماندار میرے ساتھ ہیں ان کو (اس ہلاکت سے) نجات دیجئے تو ہم نے (ان کی دُعا قبول کی اور) ان کو اور جو اُن کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے اُن کو نجات دی پھر اسکے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، بیشک آپ کا رب زبردست (اور) مہربان ہے (کہ باوجود عذاب پر قادر ہونے کے اُن کو مہلت دیئے ہوئے ہے)۔

معارف و مسائل

طاعات پر اُجرت لینے کا حکم | وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبلیغ پر اُجرت لینا درست نہیں ہے اسلئے سلف صالحین نے اُجرت لینے کو حرام کہا ہے لیکن متاخرین نے اس کو بحالتِ مجبوری جائز قرار دیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل آیت لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کے تحت میں بیان ہو چکی ہے۔

فائدہ - اس جگہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ کی آیت دو دفعہ تاکید کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے

لائی گئی ہے کہ اطاعتِ رسُول اور خدا تعالیٰ سے ڈرنے کے لئے صرف رسُول کی امانت و دیانت یا صرف تبلیغ و تعلیم پر اُجرت نہ طلب کرنا ہی کافی تھا لیکن جس رسُول میں یہ سب صفتیں پائی جائیں اسکی اطاعت اور اسکے خدا سے ڈرنا تو اور لازمی ہو جاتا ہے۔

شرافت ورذالت اعمال واخلاق سے ہے نہ کہ خاندان اور جاہ وحشم سے قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اس آیت میں اوّل مشرکین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ آپکے ماننے والے سارے رذیل لوگ ہیں ہم عزت دار شریف اُن میں کیسے ملجائیں؟ نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ مجھے انکے اعمال کا حال معلوم نہیں۔ اسمیں اشارہ فرمادیا کہ تم لوگ جو خاندانی شرافت یا مال و دولت اور عزت وجاہ کو شرافت کی بنیاد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ مدارِ عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا دراصل اعمال و اخلاق پر ہے۔ تم نے جن پر یہ حکم لگا دیا کہ یہ سب رذیل ہیں، یہ تمھاری جہالت ہے چونکہ ہم ہر شخص کے اعمال واخلاق کی حقیقت سے واقف نہیں، اسلئے ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ حقیقۃً کون رذیل ہے کون شریف۔ (قرطبی)

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۲۳ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۲۴

جھٹلایا عاد نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی ہُود نے کیا تم کو ڈر نہیں

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝۱۲۵ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۱۲۶ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ

میں تمھارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۲۷ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ

سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے مالک پر کیا بناتے ہو ہر اونچی

رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝۱۲۸ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝۱۲۹

زمین پر ایک نشان کھیلنے کو اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝۱۳۰ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۱۳۱ وَ

اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظالم سے سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور

اتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۲ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝۱۳۳

ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے

وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۱۳۴ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۳۵ قَالُوْا

اور باغ اور چشمے میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے بولے

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ

ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ بنے تو نصیحت کرنے والا اور کچھ نہیں

اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ

یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی اور ہم پر آفت نہیں آنے والی پھر اس کو جھٹلانے

فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

لگے تو ہمنے ان کو غارت کر دیا، اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کی (برادری کے) بھائی ہود (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا تم (خدا سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے، کیا تم (علاوہ شرک کے تکبر و تفاخر میں بھی اس درجہ مصروف ہو کہ) ہر اُونچے مقام پر ایک یادگار (کے طور پر عمارت) بناتے ہو (تاکہ خوب اُونچی نظر آوے) جس کو محض فضول (بلا ضرورت) بناتے ہو اور (اسکے علاوہ جو رہنے کے مکان ہیں جن کی ایک درجہ ضرورت بھی ہے اُن میں بھی یہ غلو ہے) کہ بڑے بڑے محل بناتے ہو (حالانکہ اس سے کم میں آرام مل سکتا ہے) جیسے دُنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے (یعنی توسیع مکانات اور ایسے بلند محل اور ایسی مضبوطی اور ایسی یادگار تعمیرات اُسوقت مناسب تھیں جبکہ دنیا میں ہمیشہ رہنا ہوتا، تو یہ خیال ہوتا کہ فراخ مکان بناؤ تاکہ آئندہ نسل میں تنگی نہ ہو کیونکہ ہم بھی رہیں گے اور وہ بھی رہیں گے اور بلند بھی بناؤ تاکہ نیچے جگہ نہ رہے تو ادھر رہنے لگیں گے اور مضبوط بناؤ تاکہ ہماری عمر طویل کے لئے کافی ہو اور یادگاریں بناؤ تاکہ ہمارے زندہ رہنے سے ہمارا ذکر زندہ رہے اور اب تو سب فضول ہے۔ بڑی بڑی یادگاریں بنی ہیں اور بنانیوالے کا نام تک نہیں موت نے سب کا نام مٹا دیا کسی کا جلدی اور کسی کا دیر میں) اور (اس تکبر کے سبب طبیعت میں سختی اور بے رحمی اس درجہ رکھتے ہو کہ) جب کسی پر دار و گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر (اور ظالم) بن کر دار و گیر کرتے ہو (ان بُرے اخلاق کا اسلئے بیان کیا گیا کہ یہ بُرے اخلاق اکثر ایمان اور اطاعت کی راہ میں رُکاوٹ بنتے ہیں) سو (چونکہ شرک اور گزشتہ بُرے اخلاق خدا تعالیٰ کی ناخوشی اور عذاب کا سبب ہیں اسلئے) تم (کو چاہیئے کہ) اللہ سے ڈرو اور (چونکہ میں رسول ہوں اسلئے) میری اطاعت کرو اور اس (اللہ) سے ڈرو (یعنی جس سے ڈرنے کو میں کہتا ہوں وہ

ایسا ہے) جس نے تمہاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) چوپائے اور بیٹوں اور باغوں اور چشموں سے تمہاری امداد کی (تو منعم ہونے کا تقتضایہ ہے کہ اسکے احکام کی بالکل مخالفت نہ کی جاوے) مجھ کو تمھارے حق میں (اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ ترہیب ہے اور اَمَدَّكُم بِأَنۡعَامٍ الخ میں ترغیب تھی) وہ لوگ بولے کہ ہمارے نزدیک تو دونوں باتیں برابر ہیں خواہ تم نصیحت کرو اور خواہ ناصح نہ بنو (یعنی ہم دونوں حالتوں میں اپنے کردار سے باز نہ آوینگے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو) یہ تو بس اگلے لوگوں کی ایک (معمولی) عادت (ہے اور رسم) ہے (کہ ہر زمانہ میں لوگ مدعی نبوت ہو کر لوگوں کو یُوں ہی کہتے سُنتے رہے) اور (تم جو ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو تو) ہم کو ہرگز عذاب نہ ہوگا غرض ان لوگوں نے ہود (علیہ السلام) کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (سخت آندھی کے عذاب سے) ہلاک کر دیا، بیشک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے (کہ احکام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا) اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب زبردست اور مہربان ہے (کہ عذاب دینے پر قادر بھی ہے اور رحمت سے مہلت بھی دے رکھی ہے)

معارف و مسائل

چند مشکل الفاظ کی تشریح أَتَبۡنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ ءَايَةً تَعۡبَثُونَ ○ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُونَ ○ (الرِّيع) ابن جریر نے حضرت مجاہدؒ سے نقل فرمایا ہے کہ رِیعٌ دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے اور جمہور سے منقول ہے کہ ریع بلند جگہ کو کہتے ہیں اور اسی سے ریع النبات نکلا ہے یعنی بڑھنے اور چڑھنے والی نباتات، (اٰیَةً) اسکے اصل معنی علامت کے ہیں اس جگہ بلند محل مُراد ہے۔ (تَعۡبَثُونَ) یہ عبث سے ہے اور عبث اس کو کہتے ہیں جس میں نہ حقیقۃً کوئی فائدہ ہو اور نہ حکماً۔ اس جگہ معنی یہ ہونگے کہ وہ بیفائدہ بلند بلند محلات بناتے تھے جن کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی صرف فخریہ بناتے تھے۔ (مَصَانِع) مصنع کی جمع ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ مصانع سے پانی کے حوض مراد ہیں لیکن حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اس سے مضبوط محل مراد ہیں۔ (لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُونَ) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں بیان فرمایا کہ اس آیت میں لَعَلَّ تشبیہ کے لئے ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ یہ فرمایا کَاَنَّکُمۡ تَخۡلُدُونَ، یعنی گویا تم ہمیشہ رہوگے (کمافی الروح)۔

بلاضرورت عمارت بنانا مذموم ہے اس آیت سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کے مکان بنانا اور تعمیرات کرنا شرعاً بُرا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے جو امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ النفقۃ کلھا فی سبیل اللہ الا البناء فلا خیر فیہ، یعنی وہ عمارت جو ضرورت سے زائد بنائی گئی ہو اس میں کوئی بہتری اور بھلائی نہیں۔ اور اس معنی کی تصدیق حضرت انسؓ کی دوسری

روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ان کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا' الا مالا یعنی الا مالا بد منہ (ابوداؤد)
یعنی ہر تعمیر صاحبِ تعمیر کے لئے مصیبت ہے مگر وہ عمارت جو ضروری ہو وہ وبال نہیں ہے روح المعانی میں
فرمایا کہ بغیر غرض صحیح کے بلند عمارت بنانا شریعتِ محمدیہ میں بھی مذموم اور بُرا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٤١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا
جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے کیا

تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾
تم ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٤٥﴾
اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے پالنے والے پر

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ﴿١٤٦﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ
کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے کھٹکے باغوں میں اور چشموں میں اور کھیتوں میں

وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ﴿١٤٩﴾
اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾
سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ
جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے بولے تجھ پر تو کسی

مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٥٣﴾ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ۚ فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ
نے جادو کیا ہے تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم سو لے آ کچھ نشانی

كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٥٤﴾ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ
اگر تو سچا ہے کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے لئے

يَوْمٍ مَعْلُومٍ ﴿١٥٥﴾ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ
باری ایک دن کی مقرر اور مت چھیڑیو اس کو بری طرح سے پھر پکڑے تم کو آفت ایک بڑے

عَظِيمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿١٥٧﴾ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۗ
دن کی پھر کاٹ ڈالا اس اونٹنی کو پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے پھر آ پکڑا ان کو عذاب نے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٥٨﴾ وَإِنَّ
البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٥٩﴾

رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا

خلاصۂ تفسیر

قوم ثمود نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے، میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کچھ صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے (اور تم جو خوشحالی کیوجہ سے اس درجہ اللہ سے غافل ہو تو) کیا تم کو ان ہی چیزوں میں بفکری سے رہنے دیا جاوے گا جو یہاں (دُنیا میں) موجود ہیں، یعنی باغوں میں اور چشموں میں اور ان کھجوروں میں جن کے گپھے خوب گوندھے ہوئے ہیں (یعنی ان کھجوروں میں خوب کثرت سے پھل آتا ہے) اور کیا (اسی غفلت کیوجہ سے) تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (اور فخر کرتے) ہوئے مکانات بناتے ہو سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور اُن حدود (بندگی) سے نکل جانے والوں کا کہنا مت مانو جو سرزمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور (کبھی) اصلاح (کی بات) نہیں کرتے (مراد رؤسار کفار ہیں جو گمراہی پر لوگوں کو آمادہ کرتے تھے اور فساد اور عدم اصلاح سے یہی مُراد ہے) ان لوگوں نے کہا کہ تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل میں خرابی آگئی ہے کہ نبوت کا دعوی کرتے ہو حالانکہ) تم بس ہماری طرح کے ایک (معمولی) آدمی ہو۔ (اور آدمی نبی ہوتا نہیں) سو کوئی معجزہ پیش کرو اگر تم (دعوئ نبوت میں) سچے ہو، صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ ایک اونٹنی ہے (جو بوجہ خلافِ عادت پیدا ہونے کے معجزہ ہے جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ختم کے قریب گزرا اور علاوہ اسکے کہ یہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اسکے بھی کچھ حقوق ہیں چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ) پانی پینے کے لئے ایک باری اسکی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری (یعنی تمہارے مواشی کی) اور (ایک یہ ہے کہ) اس کو بُرائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو ایک بھاری دن کا عذاب آپکڑے سو انھوں نے (نہ رسالت کی تصدیق کی نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو مار ڈالا، پھر (جب عذاب کے نشان ظاہر ہوئے تو اپنی حرکت پر) پشیمان ہوئے (مگر اوّل تو عذاب دیکھ لینے کے وقت پشیمانی بیکار، دوسرے خالی طبعی پشیمانی سے کیا ہوتا ہے جب تک اختیاری تدارک یعنی توبہ وایمان نہ ہو) پھر (آخر) عذاب نے ان کو آلیا، بیشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رب بڑا زبردست بہت مہربان ہے (کہ باوجود قدرت کے مہلت دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ، حضرت ابن عباسؓ سے فارہین کی تفسیر بطرین منقول ہے یعنی اترانے اور تکبر کرنے والے، لیکن ابو صالح نے فرمایا، اور یہی امام راغب نے تفسیر کی ہے کہ فارہین کے معنی حاذقین ہے یعنی ماہرین کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ نعمت فرمائی کہ تم کو ایسی صنعت کاری سکھلا دی کہ پہاڑوں کو مکانات بنانا تمھارے لئے آسان کر دیا۔ حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرو اور زمین پر فساد نہ کرو۔

مفید پیشے خدائی انعامات ہیں بشرطیکہ اُن کو بُرے کاموں میں استعمال نہ کریں | اس آیت سے ثابت ہوا کہ عمدہ پیشے خدا تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ان سے نفع اُٹھانا جائز ہے لیکن اگر اُن سے کوئی گناہ یا حرام فعل یا بلا ضرورت اُن میں انہماک لازم آتا ہو تو پھر وہ پیشہ اختیار کرنا ناجائز ہے جیسے کہ ابھی اس سے پہلی آیتوں میں بلا ضرورت عمارت کی بلندی کی مذمت گزری ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا

جھٹلایا لُوط کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی لُوط نے کیا تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾

ڈرتے نہیں میں تمھارے لئے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اُسی پروردگار عالم پر

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ

کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مردوں پر اور چھوڑتے ہو جو تمھارے واسطے بنادی ہیں

رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ

تمھارے رب نے تمھاری جورُوئیں بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے بولے اگر نہ چھوڑے گا

تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّىْ لِعَمَلِكُمْ

تو اے لُوط تو تُو نکال دیا جائے گا کہا میں تمھارے کام سے

مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِىْ وَاَهْلِىْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ

البتہ بیزار ہوں اے رب خلاص کر مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں پھر بچا دیا ہم نے

وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا

اسکو اور اسکے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں پھر اُٹھا مارا ہم نے

الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾

اُن دوسروں کو اور برسایا اُن پر ایک برساؤ سو کیا بُرا برساؤ تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ

البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے اور تیرا

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ ع

رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۹ ۱۴

خلاصۂ تفسیر

قوم لُوط نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے ان کے بھائی لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے، کیا تمام دُنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مَردوں سے بدفعلی کرتے ہو اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے بیبیاں پیدا کی ہیں ان کو نظرانداز کئے رہتے ہو (یعنی اور کوئی آدمی تمہارے سوا یہ حرکت نہیں کرتا اور یہ نہیں ہے کہ اس کے قبیح ہونے میں کچھ شبہ ہے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم حد (انسانیت) سے گزر جانے والے لوگ ہو، وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لُوط، اگر تم (ہمارے کہنے سُننے سے) باز نہیں آؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے، لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں اس دھمکی پر اپنے کہنے سے نہ رکونگا کیونکہ) میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں (تو کہنا کیسے چھوڑ دونگا، جب کسی طرح اُن لوگوں نے نہ مانا اور عذاب آتا ہوا معلوم ہوا تو) لُوط (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے رب مجھ کو اور میرے (خاص) متعلقین کو ان کے اس کام (کے وبال) سے (جو اُن پر آنیوالا ہے) نجات دے، سو ہم نے ان کو اور انکے متعلقین کو سب کو نجات دی سوائے ایک بڑھیا کے (مُراد اس سے زوجہ ہے لُوط علیہ السلام کی) کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہمنے اور سب کو (جو لُوطؑ اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا (یعنی پتھروں کا) مینہ برسایا، سو کیا بُرا مینہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو (عذاب الٰہی سے) ڈرایا گیا تھا بے شک اس (واقعہ) میں (بھی) عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اور بے شک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا تھا مگر ابھی نہیں دیا)۔

معارف و مسائل

غیر فطری فعل اپنی بیوی سے بھی حرام ہے وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ، لفظ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ میں حرف مِنْ اصطلاحی الفاظ میں بیانیہ بھی ہوسکتا ہے جسکا حاصل یہ ہوگا کہ تمھاری خواہشِ نفسانی کے لئے جو اللہ نے بیویاں پیدا فرمائی ہیں تم اُن کو چھوڑ کر اپنے ہم جنس مردوں کو اپنی شہوتِ نفس کا نشانہ بناتے ہو جو خباثتِ نفس کی دلیل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حرفِ مِنْ کو تبعیض کے لئے قرار دیں تو اشارہ اسطرف ہوگا کہ تمھاری بیبیوں کا جو مقام تمھارے لئے بنایا گیا اور جو امر فطری ہے اسکو چھوڑ کر بیویوں سے خلافِ فطرت عمل کرتے ہو جو کہ قطعاً حرام ہے۔ غرض اس دوسرے معنے کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ اپنی زوجہ سے خلافِ فطرت عمل حرام ہے، حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے نعوذ باللہ منہ (کذا فی الروح)

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ، عجوز سے مراد حضرت لُوط علیہ السلام کی بیوی ہے جو کہ قوم لُوط کے اس فعل سے راضی تھی اور کافرہ تھی۔ لُوط علیہ السلام کی یہ کافر بیوی اگر واقع میں بڑھیا تھی تو اسکے لئے لفظ عجوز استعمال کرنا ظاہر ہی ہے اور اگر یہ عمر کے لحاظ سے بڑھیا نہ تھی تو اس کو عجوز کے لفظ سے شاید اسلئے تعبیر کیا گیا کہ پیغمبر کی بیوی اُمت کے لئے ماں کی جگہ ہوتی ہے جو عورت کثیر الاولاد ہو اُس کو بڑھیا کہدینا کچھ مستبعد نہیں۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ، اس آیت سے ثابت ہوا کہ لوطی پر دیوار گرانے یا بلند مقام سے نیچے پھینکنے کی تعزیر جائز ہے جیسے حنفیہ کا مسلک ہے کیونکہ قوم لُوط اسی طرح ہلاک کی گئی تھی کہ ان کی بستیوں کو اوپر اُٹھا کر اُلٹا زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ (شامی کتاب الحدود)

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

جھٹلایا بَن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو شعیب نے کیا تم ڈرتے نہیں

اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ

میں تم کو پیغام پہنچانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ

تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر پورا بھر کر دو ماپ

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾

اور مت ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۱۸۳﴾
اور مت گھٹا دو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور مت دوڑو ملک میں خرابی ڈالتے ہوئے

وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ
اور ڈرو اُس سے جس نے بنایا تم کو اور اگلی خلقت کو بولے تجھ پر تو کسی نے

الْمُسَحَّرِينَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۱۸۶﴾
جادو کر دیا ہے اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم اور ہمارے خیال میں تو تُو جھوٹا ہے

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ
سو گرا دے ہم پر کوئی ٹکڑا آسمان کا اگر تو سچا ہے کہا

رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ
میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو پھر اسکو جھٹلایا پھر پکڑ لیا اُن کو آفت نے سائبان والے دن کی

إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۸۹﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ
بیشک وہ تھا عذاب بڑے دن کا البتہ اس بات میں نشانی ہے اور اُن میں بہت

أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۹۰﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۹۱﴾
لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

اُصحابُ الأیکہ نے (بھی جن کا ذکر سورۂ حجر کے اخیر میں گزر چکا ہے) پیغمبروں کو جھٹلایا، جبکہ اُن سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحب حق کا) نقصان مت کیا کرو اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) سیدھی ترازو سے تولا کرو (یعنی ڈنڈی نہ مارا کرو نہ باٹوں میں فرق کیا کرو) اور لوگوں کا اُن کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور سرزمین میں فساد مت مچایا کرو اور اس (خدائے قادر) سے ڈرو جس نے تم کو اور تمام اگلی مخلوقات کو پیدا کیا وہ لوگ کہنے لگے کہ بس تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل مختل ہوگئی اور نبوت کا دعوی کرنے لگے) اور تم تو محض ہماری طرح (کے) ایک (معمولی) آدمی ہو اور ہم تو تم کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں، سو اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو (تاکہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ واقعی تم نبی تھے تمہاری تکذیب سے ہم کو یہ سزا ہوئی) شعیب (علیہ السلام) بولے کہ (میں عذاب کا لانے والا یا اسکی کیفیت کی تعیین کرنے والا کون ہوں) تمہارے اعمال کو میرا رب (ہی)

خوب جانتا ہے (اور اس عمل کا جو مقتضاء ہے کہ کیا عذاب ہو اور کب ہو اس کو بھی وہی جانتا ہے اسکو اختیار ہے) سو وہ لوگ (برابر) اُن کو جھٹلاتے گئے پھر ان کو سائبان کے واقعہ عذاب نے آپکڑا بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا اور اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب نازل کرسکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ، قسطاس کو بعض حضرات نے رومی لفظ قرار دیا جس کے معنے عدل وانصاف کے ہیں، بعض نے عربی لفظ قسط سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ قسط کے معنے بھی انصاف کے ہیں مراد یہ ہے کہ ترازو اور اسی طرح دوسرے ناپنے تولنے کے وسائل کو مستقیم اور سیدھے طور پر استعمال کرو جس میں کمی کا خطرہ نہ رہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ، یعنی نہ کمی کرو لوگوں کی اپنی چیزوں میں۔ مُراد یہ ہے کہ معاہدہ کے مطابق جتنا کسی کا حق ہے اُس سے کمی کرنا حرام ہے خواہ وہ ناپنے تولنے کی چیز ہو یا کوئی دوسری۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ملازم مزدور اگر اپنے مقررہ وقت میں چوری کرتا ہے وقت کم لگاتا ہے وہ بھی اس وعید میں داخل ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز عصر میں شریک نہیں ہوا، وجہ پوچھی تو اس نے کچھ عذر کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا طففت یعنی تو نے تولنے میں کمی کردی، چونکہ نماز کوئی تولنے کی چیز نہیں اسلئے یہ حدیث نقل فرما کر امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وفاء و تطفیف یعنی حق کے مطابق کرنا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یعنی صرف ناپ تول ہی کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ کسی کے حق میں کمی کرنا خواہ کسی صورت سے ہو وہ تطفیف میں داخل ہے جس کا حرام ہونا وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

خدا کا مجرم اپنے پاؤں چلکر آتا ہے اُسے وارنٹ کی ضرورت نہیں

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ، عذاب یوم الظلہ، جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اسکا واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن کی قوم پر سخت گرمی مسلط فرمائی کہ نہ مکان کے اندر چین آتا نہ باہر، پھر اُنکے قریبی جنگل میں ایک گہرا بادل بھیجدیا جسکے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی، ساری قوم گرمی سے پریشان تھی سب دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوگئے جب ساری قوم بادل کے نیچے آگئی تو اس بادل نے ان پر پانی کے بجائے آگ برسادی جس سے سب بھسم ہو کر رہ گئے۔ (کذا روی عن ابن عباس۔ روح)

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى

اور یہ قرآن ہے اُتارا ہوا پروردگار عالم کا لے کر اُترا ہے اس کو فرشتہ معتبر تیرے

قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾ وَ

دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں اور

إِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ أَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ آيَةً أَنْ يَّعْلَمَهُ عُلَمٰٓؤُا

یہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں کیا ان کے واسطے نشانی نہیں یہ بات کہ اس کی خبر رکھتے ہیں

بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿١٩٧﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ﴿١٩٨﴾ فَقَرَأَهُ

پڑھے لوگ بنی اسرائیل کے اور اگر اُتارتے ہم یہ کتاب کسی اوپری زبان والے پر اور وہ اسکو

عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١٩٩﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِي قُلُوبِ

پڑھ کر سناتا تو بھی اس پر یقین نہ لاتے اسی طرح گھسا دیا ہم نے اس انکار کو گنہگاروں

الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٠٠﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٢٠١﴾

کے دل میں وہ نہ مانیں گے اسکو جب تک نہ دیکھ لیں گے عذاب دردناک

فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ

پھر آئے ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو پھر کہنے لگیں کچھ بھی ہم کو

مُنْظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾ أَفَرَءَيْتَ إِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ

فرصت ملے گی کیا ہمارے عذاب کو جلد مانگتے ہیں بھلا دیکھ تو اگر فائدہ پہنچاتے رہیں ہم

سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ

ان کو برسوں پھر پہنچے ان پر جس چیز کا ان سے وعدہ تھا تو کیا کام آئے گا ان کے

مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾ وَمَآ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ﴿٢٠٨﴾

جو کچھ فائدہ اٹھاتے رہے اور کوئی بستی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لئے نہیں تھے ڈر سنا دینے والے

ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِينَ ﴿٢٠٩﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِينُ ﴿٢١٠﴾ وَمَا

یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں ظلم کرنا اور اس قرآن کو نہیں لے کر اُترے شیطان اور نہ

يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٢١١﴾ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ﴿٢١٢﴾ فَلَا

ان سے بن آئے اور نہ وہ کر سکیں ان کو تو سننے کی جگہ سے دور کر دیا ہے سو

تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ﴿٢١٣﴾ وَأَنْذِرْ

تو مت پکار اللہ کے ساتھ دوسرا معبود پھر تو پڑے عذاب میں اور ڈر سنا دے

عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ

اپنے قریب کے رشتہ داروں کو اور اپنے بازو نیچے رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

ایمان والے۔ پھر اگر تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں بیزار ہوں تمہارے کام سے

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ

اور بھروسہ کر اس زبردست رحم والے پر جو دیکھتا ہے تجھ کو جب اٹھتا ہے اور

تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى

تیرا پھرنا نمازیوں میں بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا میں بتلاؤں تم کو کس پر

مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ

اترتے ہیں شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر لا ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات

وَأَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ أَلَمْ تَرَ

اور بہت ان میں جھوٹے ہیں اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں تو نے نہیں دیکھا

أَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾

کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے

إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ

مگر وہ لوگ جو یقین لائے اور کام کئے اچھے اور یاد کی اللہ کی بہت اور بدلہ لیا اس کے

بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

پیچھے کہ ان پر ظلم ہوا اور اب معلوم کرلیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں

ع ۱۱ / ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہو جاویں (یعنی جس طرح اور پیغمبروں نے اپنی امت کو احکام الٰہیہ پہنچائے آپ بھی پہنچائیں) اور اس (قرآن) کا ذکر پہلی امتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے (کہ ایک ایسی شان کا پیغمبر ہوگا اور اس پر ایسا کلام نازل ہوگا چنانچہ تفسیر حقانی کے اس مقام کے حواشی میں چند بشارتیں کتب سابقہ تورات و انجیل کی نقل کی ہیں۔ آگے اس مضمون وَإِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْأَوَّلِيْنَ کی توضیح ہے یعنی) کیا ان لوگوں کے لئے (اس پر) یہ بات دلیل نہیں ہے کہ اس (پیشین گوئی) کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں (چنانچہ ان میں جو لوگ اسلام لے آئے ہیں وہ تو علی الاعلان اس کا اعتراف کرتے ہیں اور جو اسلام نہیں لائے وہ بھی خاص خاص لوگوں کے سامنے اس کا اقرار کرتے تھے جیسے کہ پارہ اول کے ربع پر آیت أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کی تفسیر میں اس کا بیان آچکا ہے اور ان

اقرار کرنے والوں کی تعداد اور کثرت اس وقت اگر خبر واحد تک بھی مان لیجاوے تاہم قرائن کی وجہ سے معنوی تواتر حاصل تھا، اور یہ دلیل قائم کرنا اَن پڑھ عربیوں کے لئے ہے ورنہ لکھے پڑھے لوگ خود اصل کتاب سے دیکھ سکتے تھے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کتبِ سابقہ میں تحریف نہیں ہوئی، کیونکہ باوجود تحریف کے ایسے مضامین کا باقی رہ جانا اور زیادہ حجت ہے اور یہ احتمال کہ یہ مضامین ہی تحریف کا نتیجہ ہوں اسلئے غلط ہے کہ اپنے نقصان کے لئے کوئی تحریف نہیں کیا کرتا۔ یہ مضامین تو تحریف کرنے والوں کے لئے نقصان دِہ ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہاں تک تو دعویٰ وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ کی دو نقلی دلیلیں بیان فرمائی ہیں یعنی پہلی کتابوں میں ذکر اور بنی اسرائیل کا جاننا کہ ان میں بھی ثانی اوّل کی دلیل ہے اور آگے انکار کرنے والوں کے عناد کے بیان کے ضمن میں اسی دعوٰی کی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے یعنی اعجازِ قرآن، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے معاند ہیں کہ) اگر (بالفرض) ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی (غیر عربی) پر نازل کر دیتے پھر وہ (عجمی) ان کے سامنے اُس کو پڑھ بھی دیتا (اسکا معجزہ ہونا اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جس پر نازل ہوا اس کو عربی زبان پر بالکل قدرت نہ ہوتی، لیکن) یہ لوگ (بوجہ انتہائی ضد کے) تب بھی اس کو نہ مانتے (آگے حضور کی تسلّی کے واسطے ان کے ایمان لانے سے نااُمیدی دلاتے ہیں یعنی) ہمنے اسی طرح (شدت و اصرار کے ساتھ) اس ایمان نہ لانے کو ان نافرمانوں کے دِلوں میں ڈال رکھا ہے (یعنی کفر میں، اور اس پر مُصر ہیں اور اس شدت و اصرار کیوجہ سے) یہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ سخت عذاب کو (مرنے کے وقت یا برزخ میں یا آخرت میں) نہ دیکھ لیں گے جو اچانک ان کے سامنے آکھڑا ہوگا اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہوگی پھر (اسوقت جان کو بنے گی تو) کہیں گے کہ کیا (کسی طور پر) ہم کو (کچھ) مہلت مل سکتی ہے (لیکن وہ وقت نہ مہلت کا ہے نہ قبول ایمان کا اور وہ کفار ایسے مضامین وعید و عذاب کے سُنکر براہِ انکار عذاب کا تقاضا کیا کرتے تھے مثلاً کہتے تھے رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا اور وَاِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً، یعنی اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا اور مہلت کو، جو درحقیقت ڈھیل ہی عذاب نہ واقع ہونے کی دلیل ٹھہراتے تھے، آگے اسکا جواب ہے کہ) کیا (ہماری وعیدوں کو سنکر) یہ لوگ ہمارے عذاب کی تعجیل چاہتے ہیں (جسکا منشار انکار ہے یعنی باوجود قیام دلیل یعنی ایک سچے بزرگ کی خبر کے پھر بھی انکار کرتے ہیں؟ رہا مہلت کو بناءِ انکار قرار دینا سو یہ سخت غلطی ہے کیونکہ) اے مخاطب ذرا بتلاؤ تو اگر ہم ان کو (چند سال تک) عیش میں رہنے دیں پھر جس (عذاب) کا اُن سے وعدہ ہے وہ ان کے سر آپڑے تو ان کا وہ عیش کس کام آسکتا ہے (یعنی یہ عیش کی جو مہلت دی گئی اس سے انکے عذاب میں کوئی خفت یا کمی نہیں ہو سکتی) اور (مہلت دینا حکمت کی وجہ سے چند روز تک خواہ کم یا زیادہ کچھ ان ہی کیساتھ خاص نہیں بلکہ اُمم سابقہ کو بھی مہلتیں ملی ہیں چنانچہ) جتنی بستیاں

(منکرین کی) ہم نے (عذاب سے) غارت کی ہیں سب میں نصیحت کے واسطے ڈرانے والے (پیغمبر) آئے۔ (جب نہ مانے تو عذاب نازل ہوا) اور ہم (صورۃً بھی) ظالم نہیں ہیں (مطلب یہ کہ مہلت دینے سے جو مقصود ہے یعنی حجت پورا کرنا اور عذر کو ختم کرنا وہ سب کے لئے رہا، پیغمبروں کا آنا سمجھانا خود یہ بھی ایک مہلت ہی دینا ہے مگر پھر بھی ہلاکت کا عذاب آکر رہا۔ ان واقعات سے مہلت دینے کی حکمت بھی معلوم ہوگئی اور مہلت دینے اور عذاب میں تضاد نہ ہونا بھی ثابت ہوگیا اور صورۃً اس لئے کہا گیا کہ حقیقۃً تو کسی حالت میں بھی ظلم نہ ہوتا۔ آگے پھر مقصود اوّل یعنی مضمون وَاِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ الخ کی طرف رجوع ہے۔ اور درمیان میں یہ مضامین منکرین کی حالت کے مناسب ہونے کیوجہ سے مذکور ہوئے تھے اور حاصل مضمون آئندہ آیات کا ان شبہات کا دفع کرنا ہے جو قرآن کی حقانیت کے متعلق تھے پس ایک شبہ تو قرآن کے اللہ کا کلام اور اسکی طرف سے بھیجا ہوا ماننے پر اسلئے تھا کہ عرب میں پہلے سے کاہن ہوتے آئے تھے وہ بھی کچھ مختلف قسم کے جملے بولا کرتے تھے نعوذ باللہ آپ کی نسبت بھی بعضے کفار یہی کہتے تھے (کما فی الدر عن ابن زید) اور بخاری میں ایک عورت کا قول نقل کیا ہے جس زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے میں کچھ دیر ہوئی تو اس عورت نے کہا کہ آپ کو آپکے شیطان نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ کاہنوں کو شیطان ہی کی تعلیم وتلقین سے کچھ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اسکا جواب ہے کہ یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے) اور اسکو شیاطین (جو کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے) لے کر نہیں آئے (کیونکہ اسکے دو مانع قوی موجود ہیں ایک اسکی صنعت شیطنت جس کے سبب) یہ (قرآن) ان (کی حالت) کے مناسب ہی نہیں (کیونکہ قرآن سب کا سب ہدایت اور شیطان سب کا سب گمراہی ہے نہ ان کو ایسے مضامین کی آمد ہوسکتی ہے اور نہ ایسے مضامین شائع کرنے سے ان کی غرض یعنی مخلوق کو گمراہ کرنا پورا ہوسکتا ہے ایک مانع تو یہ ہوا) اور (دوسرا مانع یہ کہ وہ) اس پر قادر بھی نہیں کیونکہ وہ شیاطین (وحی آسمانی) سننے سے روک دیئے گئے ہیں (چنانچہ کاہنوں اور شسرکوں سے اسکے جنات نے اپنی ناکامی کا خود اعتراف کیا جس کی انھوں نے اوروں کو بھی خبر دی۔ چنانچہ بخاری میں ایسے قصے باب اسلام عمرؓ میں مذکور ہیں پس شیطانوں کی تلقین کا کسی طرح احتمال نہ رہا۔ اور اس جواب کا پورا ہونا اور ایک دوسرے شبہ کا جواب ختم سورت کے قریب آویگا۔ درمیان میں تنزیل من اللہ ہونے پر بطور تفریع کے ایک مضمون ہے یعنی جب اسکا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو اس کی تعلیم واجب العمل ہوئی اور منجملہ اُس کے اہم امر اور اعظم توحید ہے) سو (اے پیغمبر ہم اسکے وجوب کی ایک خاص طریق سے تاکید کرتے ہیں کہ ہم آپ کو مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ) تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کبھی تم کو سزا ہونے لگے (حالانکہ آپ میں نعوذ باللہ نہ احتمال شرک کا ہی نہ تعذیب کا مگر لوگوں کو یہ بات جتلانا مقصود ہے کہ جب غیر اللہ کی عبادت پر آپ کے لئے بھی سزا کا حکم ہے تو اور بیچارے تو کس شمار میں ہیں؟ شرک سے ان کو کیسے منع نہ کیا جاوے اور شرک کرکے عذاب سے کیونکر بچیں گے) اور

(اسی مضمون سے) آپ (سب سے پہلے) اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرائیے (چنانچہ آپ نے سب کو پکار کر جمع کیا اور شرک پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا جیسا حدیثوں میں ہے) اور (آگے انذار یعنی دعوتِ نبوت کو قبول کرنے والے اور رَد کرنے والوں کے ساتھ معاملہ کا طرز بتلاتے ہیں یعنی) ان لوگوں کے ساتھ (تو مشفقانہ) فروتنی سے پیش آئیے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں (خواہ کنبہ کے ہوں یا غیر کنبہ کے) اور اگر یہ لوگ (جن کو آپ نے ڈرایا ہے) آپ کا کہنا نہ مانیں (اور کفر پر اڑے رہیں) تو آپ (صاف) کہدیجئے کہ میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں (ان دونوں امر یعنی اِخفِض و قُل الخ میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی پوری تعلیم ہے اور کبھی ان مخالفین کیطرف سے ایذا اور نقصان دینے کا خطرہ نہ لائیے) اور خدائے رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو جس وقت کہ آپ (نماز کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں اور (نیز نماز شروع کرنے کے بعد) نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہے (اور نماز کے علاوہ بھی وہ دیکھتا بھالتا ہے کیونکہ) وہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (پس جب اسکو علم بھی کامل ہے جیسے یراکؕ اور سمیع، علیم اس پر دال ہیں اور وہ آپ پر مہربان بھی ہے، جیسا الرحیم اس پر دال ہے اور اس کو سب قدرت ہے جیسا العزیز سے مفہوم ہوتا ہے تو ضرور وہ لائق توکل ہے وہ آپ کو ضرر حقیقی سے بچا دیگا اور جو متوکل کو ضرر پہنچتا ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ضرر ہوتا ہے جس کے تحت میں ہزاروں منافع ہوتے ہیں جن کا کبھی دُنیا میں کبھی آخرت میں ظہور ہوتا ہے آگے کہانت کے شبہ کے جواب کا تتمہ ہے کہ اے پیغمبر لوگوں سے کہدیجئے کہ) کیا میں تم کو بتلاؤں کس پر شیطان اُترا کرتے ہیں (سنو) ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو (پہلے سے) دروغ گفتار بڑے بدکردار ہوں اور جو (اخبار شیاطین کے وقت اُن شیطانوں کیطرف) کان لگا دیتے ہیں اور (لوگوں سے اُن چیزوں کے بیان کرنے کے وقت) وہ بکثرت جھوٹ بولتے ہیں (چنانچہ سفلی عاملوں کو اب بھی اسی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ فائدہ لینے والے اور فائدہ دینے والے کے درمیان مناسبت ضروری ہے تو شیطان کا شاگرد بھی وہ ہوگا جو جھوٹا اور گنہگار ہوگا، نیز شیطان کیطرف قلب سے متوجہ بھی ہو کہ بغیر توجہ سے استفادہ نہیں ہوتا اور چونکہ اکثر یہ علوم شیطانی ناتمام ہوتے ہیں اس لئے ان کو رنگین اور باوقعت کرنے کیلئے کچھ حاشیہ بھی ظن و تخمین سے چڑھانا پڑتا ہے جو کہ کہانت کے لئے عادۃً ضروری ہیں اور یہ ساری باتیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں ہونیکا کوئی دُور کا بھی احتمال نہیں کیونکہ آپؐ کا سچا ہونا سب کو معلوم ہے۔ آپؐ کا پرہیز گار ہونا اور شیاطین سے بغض رکھنے والا ہونا دشمن کو بھی مسلّم تھا اور مشہور و معروف تھا تو پھر کہانت کا احتمال کہاں رہا) اور (آگے شبہ شاعریت کا جواب ہے کہ آپ شاعر بھی نہیں ہیں جیسا کفار کہتے تھے بَلْ هُوَ شَاعِرٌ یعنی ان کے مضامین خیالی غیر واقعی ہیں گو منظوم نہ ہوں سو یہ احتمال اسلئے غلط ہے کہ) شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں (مراد راہ سے شعر گوئی ہے

یعنی مضامین خیالی شاعرانہ نثر میں یا نظم میں کہنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو مسلک تحقیق سے دُور ہوں آگے اس دعویٰ کی وضاحت ہے کہ) اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر، لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران (ٹکریں مارتے تلاشِ مضامین میں) پھرا کرتے ہیں اور (جب مضمون مل جاتا ہے تو چونکہ اکثر خلافِ واقعہ ہوتا ہے اسلئے) زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں (چنانچہ شاعروں کی گپوں کا ایک نمونہ لکھا جاتا ہے ؎

اے رشکِ مسیحا تری رفتار کے قرباں ✧ ٹھوکر سے مری لاش کئی بار جِلا دی

اے بادِ صبا ہم تجھے کیا یاد کریں گے ✧ اُس گُل کی خبر تو نے کبھی ہم کو نہ لا دی

؎ صبا نے اسکے کوچہ سے اُڑا کر ✧ خدا جانے ہماری خاک کیا کی، وغیرہ وغیرہ، حتیٰ کہ کبھی کفریات بکنے لگتے ہیں۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ مضامین شعریہ کے لئے خیالی اور غیر متحقق ہونا لازمی ہے اور مضامین قرآنیہ جس باب سے بھی متعلق ہیں سب کے سب تحقیقی، غیر خیالی ہیں اسلئے آپ کو شاعر کہنا سوائے جنونِ شاعرانہ کے اور کیا ہے، حتیٰ کہ اکثر چونکہ نظم میں ایسے ہی مضامین ہوا کرتے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نظم پر قدرت بھی نہیں دی اور اوپر چونکہ شعراء کی مذمت ارشاد ہوئی ہے جس کے عموم میں بظاہر سب نظم کہنے والے آگئے، گو ان کے مضامین عینِ حکمت اور تحقیق ہوں اسلئے آگے ان کا استثناء فرماتے ہیں کہ) ہاں مگر جو لوگ (ان شاعروں میں سے) ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کئے (یعنی شرع کیخلاف نہ ان کا قول ہے نہ فعل، یعنی اُن کے اشعار میں بیہودہ مضامین نہیں ہیں) اور اُنھوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا (یعنی تائیدِ دین اور اشاعتِ علم میں ان کے اشعار ہیں کہ یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں) اور (اگر کسی شعر میں بظاہر کوئی نامناسب مضمون بھی ہے جیسے کسی کی ہجو اور مذمت جو بظاہر اخلاقِ حسنہ کے خلاف ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ) اُنھوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے (اسکا) بدلہ لیا (ہے یعنی کفار یا فساق نے اول ان کو زبانی تکلیف پہنچائی، مثلاً ان کی ہجو کی یا دین کی توہین کی جو اپنی ہجو سے بھی بڑھ کر تکلیف کا سبب ہے، یا ان کے مال کو یا جان کو ضرر پہنچایا، یعنی یہ لوگ مستثنیٰ ہیں کیونکہ انتقامی طور پر جو شعر کہے گئے ہیں اُن میں بعض تو مُباح ہیں اور بعضے اطاعت و کارِ ثواب ہیں) اور (یہاں تک رسالت کے متعلق شبہات کے جوابات پورے ہوئے اور اس سے پہلے رسالت دلائل سے ثابت ہو چکی تھی اب آگے ان لوگوں کی وعید ہے جو اس کے باوجود منکرِ نبوت رہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے ہیں یعنی) عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جاوے گا جنھوں نے (حقوق اللہ، حقوق الرسول یا حقوق العباد میں) ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی (بُری اور مصیبت کی) جگہ انکو لوٹ کر جانا ہے (مُراد اس سے جہنم ہے)۔

معارف و مسائل

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ○

قرآن اُسکے الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام ہے

آیاتِ مذکورہ میں بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وہی ہے جو عربی زبان میں ہو، کسی مضمون قرآن کا ترجمہ خواہ کسی زبان میں ہو وہ قرآن نہیں کہلائے گا، اور اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ کے الفاظ سے بظاہر اسکے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بھی ہوں وہ بھی قرآن ہیں، کیونکہ اِنَّهٗ کی ضمیر ظاہر یہ ہے کہ قرآن کیطرف راجع ہے اور زُبُر، زبور کی جمع ہے جس کے معنے ہیں کتاب ۔ معنے آیت کے یہ ہوئے کہ قرآن کریم سابقہ کتابوں میں بھی ہے اور یہ ظاہر ہے پچھلی کتابیں تورات انجیل زبور وغیرہ عربی زبان میں نہیں تھیں تو صرف معانی قرآن کے انہیں مذکور ہونے کو اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی ہے ۔ اور حقیقت جس پر جمہور اُمت کا عقیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صرف مضامینِ قرآن کو بھی بعض اوقات توسعاً قرآن کہدیا جاتا ہے کیونکہ اصل مقصود کسی کتاب کا اسکے مضامین ہی ہوتے ہیں ۔ کتب اولین میں قرآن کا مذکور ہونا بھی اسی حیثیت سے ہے کہ بعض مضامینِ قرآنیہ اُن میں بھی مذکور ہیں، اسکی تائید بہت سی روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے ۔

مستدرک حاکم میں حضرت معقل بن یسار رضؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورۂ بقرہ ذکر اول سے دی گئی ہے اور سورۂ طٰہٰ اور طواسین یعنی جتنی سورتیں طٰس سے شروع ہوتی ہیں اور حوامیم یعنی جو سورتیں حٰم سے شروع ہیں یہ سب سُورتیں الواحِ موسیٰ میں سے دی گئی ہیں اور سورۂ فاتحہ مجھے تحت عرش سے دی گئی ہے ۔ اور طبرانی، حاکم، بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت کیا ہے کہ سورۂ ملک تورات میں موجود ہے ۔ الحدیث، اور سورۂ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى میں تو خود قرآن کی تصریح یہ ہے اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى، یعنی یہ مضامین سورت حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی ہیں، لیکن تمام آیات و روایات کا حاصل یہی ہے کہ بہت سے مضامینِ قرآن کتب سابقہ میں بھی موجود تھے ۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان مضامین کی وجہ سے کتبِ سابقہ کے اُن حصوں کو جن میں یہ مضامینِ قرآن آئے ہیں قرآن کا نام دیدیا جائے ۔ نہ اُمت میں کوئی اسکا قائل ہے کہ اُن صحیفوں اور کتابوں کو جن میں مضامین قرآن مذکور ہیں قرآن کہا جائے ۔ بلکہ عقیدہ جمہورِ اُمت کا یہی ہے کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآن کا نام ہے نہ صرف معانی قرآن کا ۔ اگر کوئی شخص قرآن ہی کے الفاظ مختلف جگہوں سے چُن کر ایک عبارت بنادے مثلاً کوئی یہ عبارت بنالے الحمد للہ العزیز الرحیم ۔ الذی لہٗ ملک السمٰوٰت وھو رب العٰلمین خالق کل شیءٍ وھو المستعان

یہ سارے الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر اس عبارت کو کوئی قرآن نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح صرف معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بیان کئے جائیں وہ بھی قرآن نہیں۔

نماز میں ترجمہ قرآن پڑھنا باجماع اُمت ناجائز ہے

اسی وجہ سے اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز میں فرض تلاوت کی جگہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کسی زبان فارسی، اُردو، انگریزی میں پڑھ لینا بدون اضطرار کے کافی نہیں۔ بعض ائمہ سے جو اسمیں توسع کا قول منقول ہے اُن سے بھی اپنے اس قول سے رجوع ثابت ہے۔

قرآن کے اُردو ترجمہ کو اُردو قرآن کہنا جائز نہیں

اسی طرح قرآن کا صرف ترجمہ کسی زبان میں بغیر عربی متن کے لکھا جائے تو اسکو اس زبان کا قرآن کہنا جائز نہیں۔ جیسے آجکل بہت سے لوگ صرف اُردو ترجمہ قرآن کو اُردو کا قرآن اور انگریزی کو انگریزی کا قرآن کہدیتے ہیں یہ ناجائز اور بے ادبی ہے۔ قرآن کو بغیر متن عربی کے کسی دوسری زبان میں بنام قرآن شائع کرنا اور اسکی خرید و فروخت سب ناجائز ہے اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ "تحذیر الاخوان عن تغییر رسم القرآن" میں مذکور ہے۔

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ، اس آیت میں اشارہ ہے کہ دُنیا میں کسی کو عمر دراز ملنا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے لیکن جو لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں ایمان نہ لائیں اُن کو عمر دراز کی عافیت و مہلت کچھ کام نہ آئے گی۔ امام زہری رہ نے نقل فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رہ روز صبح کو اپنی داڑھی پکڑ کر اپنے نفس کو خطاب کر کے یہ آیت پڑھا کرتے تھے اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ الآیۃ اسکے بعد ان پر گریہ طاری ہو جاتا اور یہ اشعار پڑھتے تھے، نھارك يامغرور سھو وغفلة، وليلك نوم والردیٰ لك لازم۔ فلا انت فی الایقاظ یقظان حازم، ولا انت فی النوم ناج وسالم۔ وتسعیٰ الیٰ ما سوف تکرہ غبۃ، کذلك فی الدنیا تعیش البھائم (ترجمہ) اے فریب خوردہ تیرا سارا دن غفلت میں اور رات نیند میں صرف ہوتی ہے حالانکہ موت تیرے لئے لازمی ہے۔ نہ تو بیدار لوگوں میں ہوشیار و بیدار ہے اور نہ سونے والوں میں اپنی نجات پر مطمئن ہے۔ تیری کوشش ایسے کاموں میں رہتی ہے جسکا انجام عنقریب ناگوار صورت میں سامنے آئیگا، دُنیا میں چوپائے جانور ایسے ہی جیا کرتے ہیں۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ، عشیرہ کے معنے کنبہ اور خاندان اقربین کی قید سے انمیں سے بھی قریبی رشتہ دار مُراد ہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ رسالت اور انذار پوری اُمت کے لئے فرض ہے اس جگہ خاندان کے لوگوں کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟ غور کیا جائے تو اسمیں تبلیغ و دعوت کے آسان اور مؤثر بنانے کا ایک خاص طریقہ بتلایا گیا ہے جس کے آثار دُور رس ہیں۔ وہ یہ کہ اپنے کنبہ اور خاندان کے لوگ اپنے سے قریب ہونے کی بناء پر اسکے حقدار بھی ہیں

کہ ہر خیر اور اچھے کام میں اُن کو دوسروں سے مقدم کیا جائے اور باہمی تعلقات اور ذاتی واقفیت کی بناء پر ان میں کوئی جھوٹا دعویدار نہیں کھپ سکتا اور جس کی سچائی اور اخلاقی برتری خاندان کے لوگوں میں معروف ہے اسکی سچی دعوت قبول کرلینا انکے لئے آسان بھی ہے۔ اور قریبی رشتہ دار جب کسی اچھی تحریک کے حامی بن گئے تو ان کی اخوت و امداد بھی پختہ بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ خاندانی حمیت کے اعتبار سے بھی انکی تائید و اخوت پر مجبور ہوتے ہیں اور جب قریبی رشتہ داروں، عزیزوں کا ایک ماحول حق و صداقت کی بنیادوں پر تیار ہو گیا تو روزمرہ کی زندگی میں ہر ایک کو دین کے احکام پر عمل کرنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے اور پھر ایک مختصر سی طاقت تیار ہو کر دوسروں تک دعوت و تبلیغ کے پہنچانے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا، یعنی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اس میں اہل و عیال کے جہنم سے بچانے کی ذمہ داری خاندان کے ہر ہر فرد پر ڈالدی گئی ہے جو اصلاحِ اعمال و اخلاق میں کا آسان اور سیدھا راستہ ہے اور غور کیا جائے تو کسی انسان کا خود اعمال و اخلاقِ صالحہ کا پابند ہونا اور پھر اس پر قائم رہنا اسوقت تک عادۃً ممکن نہیں ہوتا جبتک اسکا ماحول اسکے لئے سازگار نہ ہو۔ سارے گھر میں اگر ایک آدمی نماز کی پوری پابندی کرنا چاہے تو اس بیچارے نمازی کو بھی اپنے حق کی ادائیگی میں مشکلات حائل ہونگی۔ آجکل جو حرام چیزوں سے بچنا دشوار ہوگیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ فی الواقع اسکا چھوڑنا کوئی بڑا مشکل کام ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ سارا ماحول ساری برادری جب ایک گناہ میں مبتلا ہے تو اکیلے ایک آدمی کو بچنا دشوار ہو جاتا ہے۔
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے تمام خاندان کے لوگوں کو جمع فرما کر پیغامِ حق سنایا اسوقت اگرچہ لوگوں نے قبولِ حق سے انکار کیا مگر رفتہ رفتہ خاندان کے لوگوں میں اسلام و ایمان داخل ہونا شروع ہوگیا اور آپکے چچا حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے سے اسلام کو ایک بڑی قوت حاصل ہوگئی۔

شعر کی تعریف | وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، اصل لغت میں شعر ہر اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں محض خیالی اور غیر تحقیقی مضامین بیان کئے گئے ہوں جس میں کوئی بحر، وزن، ردیف اور قافیہ کچھ شرط نہیں، فنِ منطق میں بھی ایسے ہی مضامین کو ادلہ شعریہ اور قضایا شعریہ کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی شعر و غزل میں بھی چونکہ عموماً خیالات کا ہی غلبہ ہوتا ہے اسلئے اصطلاحِ شعراء میں کلام موزوں مقفّٰی کو شعر کہنے لگے۔ بعض مفسرین نے آیاتِ قرآن بَلْ هُوَ شَاعِرٌ، شَاعِرٌ مَّجْنُوْنٌ، شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ وغیرہ میں شعر اصطلاحی کے معنی میں مراد لے کر کہا کہ کفار مکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وزن دار، قافیہ دار کلام لانے والے کہتے تھے لیکن بعض نے کہا کہ کفار کا مقصد یہ نہ تھا، اسلئے کہ وہ شعر کے طرز و طریق سے واقف تھے، اور ظاہر ہے کہ قرآن اشعار کا مجموعہ نہیں اسکا قائل تو ایک عجمی بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ فصیح و بلیغ عرب، بلکہ کفار آپ کو شاعر شعر کے اصلی معنے یعنی خیالی مضامین کے لحاظ سے کہتے تھے مقصد ان کا دراصل آپکو نعوذ باللہ جھوٹا کہنا تھا کیونکہ شعر بمعنی کذب بھی استعمال ہوتا ہے اور شاعر کاذب کو کہا جاتا ہے ہاسلئے ادلہ کاذبہ

کو ادلۂ شعریہ کہا جاتا ہے خلاصہ یہ کہ جیسے موزوں اور مقفّٰی کلام کو شعر کہتے ہیں اسی طرح ظنی اور تخمینی کلام کو بھی شعر کہتے ہیں جو اہل منطق کی اصطلاح ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ، اس آیت میں شعر کے اصطلاحی اور معروف معنے ہی مراد ہیں۔ یعنی موزوں و مقفّٰی کلام کہنے والے اس کی تائید فتح الباری کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رَوَاحَہؓ، حسان بن ثابتؓ اور کعب بن مالکؓ جو شعراء صحابہ میں مشہور ہیں روتے ہوئے سرکار دوعالم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدائے ذوالجلال نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور ہم بھی شعر کہتے ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آیت کے آخری حصّہ کو پڑھو، مقصد یہ تھا کہ تمہارے اشعار بیہودہ اور غلط مقصد کے لئے نہیں ہوتے اسلئے تم اس استثناء میں داخل ہو جو آخر آیت میں مذکور ہے اسلئے مفسرینؒ نے فرمایا کہ ابتدائی آیت میں مشرکین شعراء مراد ہیں کیونکہ گمراہ لوگ سرکش شیطان اور نافرمان جن ان ہی کے اشعار کی اتباع کرتے تھے اور روایت کرتے تھے (کما فی فتح الباری)

شریعت اسلام میں شعر و شاعری کا درجہ آیاتِ مذکورہ کے شروع سے شعر و شاعری کی سخت مذمت اور اسکا عنداللہ مبغوض ہونا معلوم ہوتا ہے مگر آخر سورت میں جو استثناء مذکور ہے اس سے ثابت ہوا کہ شعر مطلقاً بُرا نہیں بلکہ جب جس شعر میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی یا اللہ کے ذکر سے روکنا یا جھوٹ ناحق کسی انسان کی مذمت اور توہین ہو یا فحش کلام اور فواحش کے لئے محرک ہو وہ مذموم و مکروہ ہے۔ اور جو اشعار ان معاصی اور مکروہات سے پاک ہوں اُن کو اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیۃ کے ذریعہ مستثنیٰ فرما دیا ہے اور بعض اشعار تو حکیمانہ مضامین اور وعظ و نصیحت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے طاعت و ثواب میں داخل ہیں جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ اِنّ من الشعر حکمۃ، یعنی بعض شعر حکمت ہوتے ہیں (رواہ البخاری) حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد سچی بات ہے جو حق کے مطابق ہو۔ ابن بطال نے فرمایا جس شعر میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت، اسکا ذکر، اسلام سے اُلفت کا بیان ہو وہ شعر مرغوب و محمود ہے اور حدیث مذکور میں ایسا ہی شعر مراد ہے اور جس شعر میں جھوٹ اور فحش بیان ہو وہ مذموم ہے اس کی مزید تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے (۱) عمر بن الشرید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجھ سے اُمیہ بن ابی الصلت کے سَو قافیہ تک اشعار سُنے۔ (۲) مطرف فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ سے بصرہ تک حضرت عمران بن حصینؓ کے ساتھ سفر کیا اور ہر منزل پر وہ شعر سُناتے تھے۔ (۳) طبری نے کبارِ صحابہ اور کبار تابعین کے متعلق کہا کہ وہ شعر کہتے تھے سنتے تھے اور سُناتے تھے۔ (۴) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ شعر کہا کرتی تھیں۔ (۵) ابو یعلی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ شعر ایک کلام ہے اگر اسکا مضمون اچھا اور مفید ہے تو شعر اچھا ہے اور مضمون بُرا یا گناہ کا ہے تو شعر بُرا ہے۔ (فتح الباری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ مدینہ منورہ کے فقہاء عشرہ جو اپنے علم و فضل میں معروف ہیں اُن میں سے عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود رضؓ مشہور قادر کلام شاعر تھے اور قاضی زبیر بن بکار کے اشعار ایک مستقل کتاب میں جمع تھے۔ پھر قرطبی نے لکھا کہ ابو عمر رضؓ نے فرمایا ہے کہ اچھے مضامین پر مشتمل اشعار کو اہلِ علم اور اہلِ عقل میں سے کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اکابر صحابہ جو دین کے مقتدا ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے خود شعر نہ کہے ہوں یا دوسروں کے اشعار نہ پڑھے یا سُنے ہوں اور پسند کیا ہو۔

جن روایات میں شعر شاعری کی مذمت مذکور ہے ان سے مقصود یہ ہے کہ شعر میں اتنا مصروف و منہمک ہو جائے کہ ذکر اللہ عبادت اور قرآن سے غافل ہو جائے۔ امام بخاری نے اسکو ایک مستقل باب میں بیان فرمایا ہے اور اس باب میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ لَاَنْ يَّمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا يَرِيْهِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَّمْتَلِئَ شِعْرًا، یعنی کوئی آدمی پیپ سے اپنا پیٹ بھرے یہ اس سے بہتر ہے کہ اشعار سے پیٹ بھرے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسکے معنی یہ ہیں کہ شعر جب ذکر اللہ اور قرآن اور علم کے اشتغال پر غالب آجائے۔ اور اگر شعر مغلوب ہے تو پھر بُرا نہیں ہے اسی طرح وہ اشعار جو فحش مضامین یا لوگوں پر طعن و تشنیع یا دوسرے خلاف شرع مضامین پر مشتمل ہوں وہ باجماعِ اُمّت حرام و ناجائز ہیں اور یہ کچھ شعر کیساتھ مخصوص نہیں جو نثر کلام ایسا ہو اسکا بھی یہی حکم ہے۔ (قرطبی)

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے گورنر عدی بن نضلہ کو اُن کے عہدہ سے اسلئے برخاست کر دیا کہ وہ فحش اشعار کہتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عمرو بن ربیعہ اور ابو الاحوص کو اسی جرم میں جلا وطن کرنے کا حکم دیا۔ عمرو بن ربیعہ نے توبہ کرلی وہ قبول کی گئی۔ (قرطبی)

خدا و آخرت سے غافل کر دینے والا ہر علم و فن مذموم ہے

ابن ابی جمرہ نے فرمایا کہ بہت قافیہ بازی اور ہر ایسا علم و فن جو دلوں کو سخت کر دے اور خدا تعالیٰ کے ذکر سے انحراف و اعراض کا سبب بنے اور اعتقادات میں شکوک و شبہات اور رُوحانی بیماریاں پیدا کرے اسکا بھی وہی حکم ہے جو مذموم اشعار کا حکم ہے۔

اکثر اتباع کرنے والوں کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت ہوتی ہے

اَلشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، اس آیت میں شعراء پر یہ عیب لگایا گیا ہے کہ اُنکے متبعین گمراہ ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گمراہ تو ہوئے متبعین اُن کے فعل کا الزام متبوعین یعنی شعراء پر کیسے عائد ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ عموماً اتباع کرنے والوں کی گمراہی علامت اور نشانی ہوتی ہے متبوع کی گمراہی کی لیکن سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حکم اسوقت ہے جب تابع کی گمراہی میں اس متبوع کے اتباع کا دخل ہو مثلاً متبوع کو جھوٹ اور غیبت سے بچنے بچانے کا اہتمام نہیں ہے اس کی مجلس میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں وہ روک ٹوک نہیں کرتا اس سے تابع کو بھی جھوٹ اور غیبت کی عادت پڑ گئی تو یہ تابع کا گناہ خود متبوع کے گناہ کی علامت قرار دیا جائیگا لیکن اگر گمراہی متبوع کی ایک وجہ

سے اور اتباع کسی دوسری وجہ سے ہو تو یہ تابع کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص عقائد و مسائل میں کسی عالم کا اتباع کرتا ہے اور اُن میں کوئی گمراہی نہیں، اعمال و اخلاق میں اس عالم کا اتباع نہیں کرتا انھیں میں یہ گمراہ ہے تو اس کی عملی اور اخلاقی گمراہی اس عالم کی گمراہی پر دلیل نہیں ہوگی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم ؞

تمت سورۃ الشعراء بعون اللہ وفضلہ لنصف الربیع الثانی ۱۳۹۱ھ

یوم الخمیس ویتلوھا انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ النمل

سُوْرَةُ النَّمْلِ

سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ نمل مکہ میں اُتری اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝١ هُدًى وَّبُشْرٰى

یہ آیتیں ہیں قرآن اور کھلی کتاب کی ہدایت اور خوشخبری

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

ایمان والوں کے واسطے جو قائم رکھتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اُن کو

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٣ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

آخرت پر یقین ہے جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو

زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝٤ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ

اچھے دکھلائے ہم نے انکی نظروں میں انکے کام سو وہ بہکے پھرتے ہیں وہی ہیں جن کے واسطے بُری

سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝٥ وَاِنَّكَ

طرح کا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں خراب اور تجھ کو تو

لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝٦

قرآن پہنچتا ہے ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے

الثالثة

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (آیتیں جو آپ پر نازل کی جاتی ہیں) آیتیں ہیں قرآن کی اور ایک واضح کتاب کی (یعنی اس میں دو صفتیں ہیں قرآن ہونا اور کتاب مبین ہونا) یہ آیتیں ایمان والوں کے لئے (موجب) ہدایت اور (اس ہدایت پر جزائے نیک کا) مژدہ سُنانے والی ہیں جو (مسلمان) ایسے ہیں کہ (عملاً بھی ہدایت پر چلتے ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں (جو کہ عبادات بدنیہ میں سب سے بڑی ہی

اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ عباداتِ مالیہ میں سب سے بڑی ہے) اور (عقیدہ کے لحاظ سے بھی ہدایت یافتہ ہیں چنانچہ) وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں (یہ تو ایمان والوں کی صفت ہے اور) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم نے اُن کے اعمال (بد) اُنکی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں سو وہ (اپنے جہلِ مرکب میں حق سے دُور) بھٹکتے پھرتے ہیں (چنانچہ نہ اُنکے عقائد درست ہیں نہ اعمال اسلئے وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے توجیسے قرآن اہلِ ایمان کو بشارت سُناتا تھا منکروں کو وعید بھی سُناتا ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے (دُنیا میں مرنے کے وقت بھی) سخت عذاب (ہونیوالا) ہے اور وہ لوگ آخرت میں (بھی) سخت خسارہ میں ہیں (کہ کبھی نجات ہی نہ ہوگی) اور (گو یہ منکر قرآن کو نہ مانیں مگر) آپکو بالیقین ایک بڑی حکمت والے علم والے کیطرف سے قرآن دیا جارہا ہے (آپ اس نعمت کے سرور میں ان کے انکار سے غمگین نہ ہو جیئے)۔

معارف ومسائل

زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے انکے اعمالِ بد انکی نظروں میں مزین کر دیئے ہیں۔ اسلئے وہ انہی کو بہتر سمجھ کر گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں اور بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اعمالھم سے مراد نیک اعمال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک اعمال کو مزین کر کے انکے سامنے رکھدیا تھا مگر ان ظالموں نے اُنکی طرف التفات نہ کیا بلکہ کفر و شرک میں مبتلا رہے اس لئے گمراہی میں بھٹکنے لگے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے، اول تو اسلئے کہ مزین کرنے کے الفاظ عموماً اعمالِ بد کے لئے استعمال ہوئے ہیں جیسے زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ، زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا، زَیَّنَ لِكَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ الخ اور اچھے اعمال کے لئے اس لفظ کا استعمال بہت کم ہے جیسے حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ الآیۃ دوسرے آیت میں اعمالھم (ان کے اعمال) کا لفظ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مراد اعمالِ بد ہیں نہ کہ اعمالِ صالحہ۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں

اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ

سے کچھ خبر یا لاتا ہوں انگارا سُلگا کر شاید تم سینکو پھر جب پہنچا اسکے پاس آواز ہوئی

اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸﴾

کہ برکت ہے اس پر جو کوئی کہ آگ میں ہے اور جو اسکے آس پاس ہے اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب سارے جہان کا

یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۹﴾ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا

اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب

رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫

دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی شکل لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا اے موسٰی مت ڈر

اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا

میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں نیکی کی

بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ

برائی کے پیچھے تو میں بخشنے والا مہربان ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے

بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا

سفید ہو کر نہ کسی برائی سے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لیکر جا فرعون اور اسکی قوم کیطرف بیشک وہ تھے

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۱۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۳

لوگ نافرمان پھر جب پہنچیں انکے پاس ہماری نشانیاں سجھانے کو بولے یہ جادو ہے صریح

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ

اور اُن کا انکار کیا اور ان کا یقین کر چکے تھے اپنے جی میں بے انصافی اور غرور سے، سو دیکھ لے کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۴ ع

انجام خرابی کرنے والوں کا

ع ۱ / ۱۴ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

(اسوقت کا قصہ ذکر کیجیئے) جبکہ (مدین سے آتے ہوئے کوہِ طور کے قریب رات کو سردی کے وقت پہنچے اور مصر کی راہ بھی بھول گئے تھے تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے (طُور کی طرف) آگ دیکھی ہے میں ابھی (جاکر) وہاں سے (یا تو راستہ کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس (وہاں سے) آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں تاکہ تم سینک لو سو جب اُس (آگ) کے پاس پہنچے تو ان کو (منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہیں (یعنی فرشتے) اُن پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس ہے (یعنی موسیٰ) اس پر بھی (برکت ہو، یہ دُعا بطور تحیۃ وسلام کے ہے جیسے ملاقاتی آپس میں سلام کرتے ہیں۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام جانتے نہ تھے کہ یہ نور انوار الٰہیہ سے ہے اسلئے خود سلام نہیں کرسکے تو منجانب اللہ ان کے اُنس کے لئے سلام ارشاد ہوا اور فرشتوں کو ملا لینا شاید اس لئے ہو کہ جس طرح فرشتوں کو سلام حق تعالیٰ کے قرب خاص کی علامت ہوتی ہے یہ سلام بھی موسیٰ علیہ السلام کو قرب خاص کی بشارت ہوگیا) اور (اس امر کے بتلانے کے لئے کہ یہ نور جو بشکل نار ہے خود حق تعالیٰ کی ذات نہیں ارشاد فرمادیا کہ) اللہ رب العالمین (رنگ،

جہات، مقدار اور حدبندی وغیرہ سے) پاک ہے (اور اس نور میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، پس یہ نور ذاتِ خداوندی نہیں اور موسیٰ علیہ السلام اگر اس مسئلہ سے خالی الذہن ہوں تو اسکی تعلیم ہے اور اگر دلائلِ عقلیہ اور فطرتِ صحیحہ کی بنا پر ان کو پہلے سے معلوم ہو تو زیادہ سمجھانا ہے اسکے بعد ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ بات یہ ہے کہ میں (جو کہ بے کیف کلام کر رہا ہوں) اللہ ہوں زبردست حکمت والا اور (اے موسیٰ) تم اپنا عصا (زمین پر) ڈالدو (چنانچہ انھوں نے ڈالدیا تو وہ اژدہا بن کر لہرانے لگا) سو جب انھوں نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا (ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ ڈرو نہیں (کیونکہ ہم نے تم کو پیغمبری دی ہے) اور ہمارے حضور میں (یعنی پیغمبری کا اعزاز عطا ہونے کے وقت) پیغمبر (ایسی چیزوں سے جو کہ خود اسکی پیغمبری کی دلیل یعنی معجزات ہوں) نہیں ڈرا کرتے (یعنی تم کو بھی ڈرنا نہ چاہیئے) ہاں مگر جس سے کوئی قصور (لغزش سرزد) ہو جاوے (اور وہ اس لغزش کو یاد کرکے ڈرے تو مضائقہ نہیں لیکن اس کی نسبت بھی یہ قاعدہ ہے کہ اگر قصور ہو جاوے اور) پھر برائی (ہو جانے) کے بعد برائی کی جگہ نیک کام کرے (توبہ کرے) تو میں (اسکو بھی معاف کر دیتا ہوں کیونکہ میں) مغفرت والا رحمت والا ہوں (یہ اسلئے فرمایا کہ عصا کے معجزہ سے مطمئن ہو جانے کے بعد کبھی اپنا قصہ قبطی کو قتل کرنے کا یاد کرکے پریشان ہوں اس لئے اس سے بھی مطمئن فرما دیا تاکہ وحشت جاتی رہے) اور (اے موسیٰ اس معجزۂ عصا کے سوا ایک معجزہ اور بھی عطا ہوتا ہے وہ یہ کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر لے جاؤ (اور پھر نکالو تو) وہ بلا کسی عیب کے (یعنی بغیر کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا (اور یہ دونوں معجزے اُن) نو معجزوں میں (سے ہیں جن کے ساتھ تم کو) فرعون اور اسکی قوم کی طرف (بھیجا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے حد سے نکل جانے والے لوگ ہیں غرض جب اُن لوگوں کے پاس ہمارے (دیئے ہوئے) معجزے پہنچے (جو نہایت واضح تھے (یعنی ابتدائے دعوت میں دو معجزے دکھلائے گئے پھر وقتاً فوقتاً باقی دکھلائے جاتے رہے) تو وہ لوگ (ان سب کو دیکھ کر بھی) بولے یہ صریح جادو ہے اور (غضب تو یہ تھا کہ ظلم) اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے (بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ (اندر سے) انکے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا سو دیکھئے کیسا (برا) انجام ہوا ان مفسدوں کا (دُنیا میں غرق ہوئے اور آخرت میں جلنے کی سزا پائی)

معارف و مسائل

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ

انسان کو اپنی ضروریات کے لئے اسبابِ طبعیہ کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس جگہ دو ضرورتیں پیش آئیں ایک راستہ پوچھنا جو آپ بھول گئے تھے، دوسرا آگ سے گرمی

حاصل کرنا کہ سردی کی رات تھی اس کے لئے آپ نے کوہِ طور کی طرف جانے کی سعی و کوشش کی لیکن اسکے ساتھ ہی اس مقصد میں کامیابی پر یقین اور دعوی کرنے کے بجائے ایسے الفاظ اختیار فرمائے جس میں اپنی بندگی اور حق تعالیٰ سے اُمید ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ضروریات کے حصول کے لئے جد و جہد توکل کے منافی نہیں۔ لیکن بھروسہ اپنی کوشش کے بجائے اللہ پر ہونا چاہیئے اور آگ آپ کو دکھلائے جانے میں بھی شاید یہی حکمت ہو کہ اس سے آپ کے دونوں مقصود پورے ہو سکتے تھے، راستہ کا مل جانا اور آگ سے گرمی حاصل کرنا۔ (کما فی الروح)

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٰتِیْکُمْ اور تَصْطَلُوْنَ جمع کے صیغے بولے حالانکہ آپکے ساتھ صرف آپ کی بیوی یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں انکے لئے لفظ جمع استعمال فرمانا بطور اکرام کے ہوا جیسے معزز لوگوں میں کسی ایک فرد سے بھی خطاب ہوتا ہے تو صیغہ جمع کا استعمال کیا جاتا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنی ازواج مطہرات کے لئے صیغۂ جمع استعمال فرمانا روایاتِ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

تخصیص کیساتھ بیوی کا ذکر عام مجالس میں نہ کرنا بلکہ کنایہ سے کام لینا بہتر ہے۔ آیتِ مذکورہ میں قَالَ مُوْسٰی لِاَھْلِہٖٓ فرمایا گیا ہے لفظ اھل عام ہے جس میں بیوی اور گھر کے دوسرے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس مقام میں اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تنہا اہلیہ محترمہ ہی تھیں، کوئی دوسرا نہ تھا مگر تعبیر میں یہ عام لفظ استعمال کرنے سے اسطرف اشارہ پایا گیا کہ مجالس میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا ذکر کرے تو عام لفظوں سے کرنا بہتر ہے جیسے ہمارے عرف میں کہا جاتا ہے میرے گھر والوں نے یہ کہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگ دیکھنے اور آگ کے اندر سے ایک ندا سننے کی تحقیق۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت سی سورتوں میں مختلف عنوانات کے ساتھ آیا ہے۔ سورۂ نمل کی مذکورہ آیات میں اس سلسلے کے دو جملے غور طلب ہیں۔ اول (بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ) دوسرا (اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ) اور سورۂ طٰہٰ میں جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے اس واقعہ سے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں (اِذْ رَاٰ نَارًا ۔ الیٰ قولہ تعالیٰ نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ) ان ایات میں بھی دو جملے خاص طور سے غور طلب ہیں (اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ) اور (اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ الخ) اور سورۂ قصص میں اس واقعہ کے یہ الفاظ ہیں (نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی

إِنِّيٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ) ان تینوں مواقع میں عنوانِ تعبیر اگرچہ مختلف ہے مگر مضمون تقریباً ایک ہی ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس رات میں کسی وجہ سے آگ کی ضرورت تھی حق تعالیٰ نے انکو کوہِ طور کے ایک درخت پر آگ دکھلائی۔ اُس آگ یا درخت سے یہ آواز سُنی گئی إِنِّيٓ أَنَا رَبُّكَ ، إِنَّهٗٓ أَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ، إِنَّنِيْٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا ، إِنِّيٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ، یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ندا، بار بار ہوئی ہو کبھی ایک لفظ سے کبھی دوسرے لفظ سے ۔ اور آواز سُننے کی جو کیفیت تفسیر بحر محیط میں ابوحیان نے اور روح المعانی میں آلوسی نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آواز اس طرح سُنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی جس کی کوئی جہت متعین نہیں ہوسکتی تھی ۔ اور سُننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کان نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں وغیرہ تمام اعضائے بدن اسکو سُن رہے تھے جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

یہ ایک غیبی آواز تھی جو بلا کیف و بلا سمت سنی جارہی تھی لیکن مبدا اسکا وہ آگ یا درخت تھا جس سے آگ کی شکل اُن کو دکھائی گئی ۔ ایسے ہی مواقع عام طور پر لوگوں کے لئے مغالطے اور بُت پرستی کا سبب بنجاتے ہیں اسلئے ہر عنوان میں مضمون توحید کیطرف ہدایت اور تنبیہ ساتھ ساتھ کی گئی ہے زیرِ بحث آیت میں لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ اسی تنبیہ کے لئے بڑھایا گیا ۔ سورۂ طٰہٰ میں لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا اور سورۂ قصص میں أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اسی مضمون کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے ۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ آگ کی شکل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسلئے دکھلائی گئی تھی کہ وہ اسوقت آگ اور روشنی کے حاجتمند تھے ورنہ اس کلامِ ربانی اور ذاتِ ربانی کا آگ سے یا شجرۂ طور سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ آگ اللہ تعالیٰ کی عام مخلوقات کی طرح ایک مخلوق تھی اسی لئے زیر بحث آیات میں جو یہ ارشاد ہے أَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ، یعنی مبارک ہے وہ جو آگ کے اندر ہے اور وہ جو اسکے آس پاس ہے ۔ اسکی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں جسکی تفصیل تفسیر روح المعانی میں ہے ۔ ایک قول حضرت ابنِ عباسؓ مجاہد، عکرمہ سے منقول ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں کیونکہ آگ کوئی حقیقی آگ تو تھی نہیں جس بقعہ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے تھے وہ دور سے پورا آگ معلوم ہوتا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے اندر ہوئے اور مَنْ حَوْلَهَا سے مراد فرشتے ہیں جو آس پاس وہاں موجود تھے اور بعض حضرات نے اسکے برعکس یہ فرمایا کہ مَنْ فِي النَّارِ سے فرشتے اور مَنْ حَوْلَهَا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں ۔ تفسیر بیان القرآن کے خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے ۔ آیاتِ مذکورہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے ۔

حضرت ابن عباسؓ اور حسن بصری کی ایک روایت اور اُس کی تحقیق

یہاں ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ حضرت حسن بصری اور سعید بن جُبیرؓ سے مَنْ فِي النَّارِ کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے خود ذات حق سُبحانہٗ وتعالیٰ مراد ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ

آگ ایک مخلوق ہے اور کسی مخلوق میں خالق کا حلول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس روایت کا یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا کہ ذاتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے آگ کے اندر حلول فرمایا تھا جیسا کہ بہت سے بُت پرست مشرکین بتوں کے وجود میں ذاتِ حق کے حلول کے قائل ہیں اور یہ توحید کے قطعاً خلاف ہے بلکہ مراد ظہور ہے جیسا آئینہ میں جس چیز کو دیکھا جاتا ہے وہ آئینہ میں حلول کئے ہوئے نہیں ہوتی اس سے الگ اور خارج ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ظہور جس کو تجلّی بھی کہا جاتا ہے خود ذاتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی تجلی نہیں تھی ورنہ اگر ذاتِ حق تعالیٰ کا مشاہدہ موسیٰ علیہ السلام نے کرلیا ہوتا تو بعد میں انکے اس سوال کی کوئی وجہ نہیں رہتی رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (یعنی اے میرے پروردگار مجھے اپنی ذات پاک دکھا کہ میں دیکھ سکوں) اور اسکے جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے لَنۡ تَرٰىنِیۡ کا ارشاد بھی پھر کوئی معنے نہ رکھتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کا ظہور مراد ہے یعنی تجلّی جو آگ کی صورت میں ہوئی یہ جس طرح حلول نہیں تھا اسی طرح تجلّی ذات بھی نہیں تھی بلکہ لَنۡ تَرٰىنِیۡ الآیۃ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالمِ دُنیا میں تجلّی ذاتی کا کوئی شخص مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس ظہور و تجلّی کا کیا مفہوم ہوگا اسکا جواب یہ ہے کہ یہ تجلی مثالی تھی جو حضرات صوفیہ کرام میں معروف ہے اس کی حقیقت کا سمجھنا تو انسان کے لئے مشکل ہے۔ بقدر ضرورت تقریب الی الفہم کے لئے احقر نے اپنی کتاب احکام القرآن بزبان عربی سورۂ قصص میں اسکی کچھ تفصیل لکھی ہے اہلِ علم اسمیں دیکھ سکتے ہیں عوام کی ضرورت کی چیز نہیں۔

اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ، اس سے پہلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا کا ذکر ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عصا جب سانپ بن گیا تو موسیٰؑ خود بھی اُس سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ آگے بھی موسیٰ علیہ السلام کے دُوسرے معجزہ ید بیضاء کا بیان ہے درمیان میں اس استثناء کا ذکر کس لئے کیا گیا اور یہ استثناء منقطع ہے یا متصل؟ اسمیں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں بعض حضرات نے استثناء کو منقطع قرار دیا ہے تو مضمون آیت کا یہ ہوگا کہ پہلی آیت میں انبیاء علیہم السّلام پر خوف نہ ہونیکا ذکر تھا بسبیلِ تذکرہ اُن لوگوں کا بھی ذکر کر دیا جن پر خوف طاری ہونا چاہیئے، یعنی وہ لوگ جن سے کوئی خطا سرزد ہوئی پھر توبہ کر کے نیک عمل اختیار کر لئے ایسے حضرات کی اگرچہ اللہ تعالیٰ خطا معاف کر دیتے ہیں مگر معافی کے بعد بھی گناہ کے بعض آثار باقی رہنے کا احتمال ہے اس سے یہ حضرات ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اور اس استثناء کو متصل قرار دیں تو معنے آیت کے یہ ہونگے کہ اللہ کے رسُول ڈرا نہیں کرتے بجز اُن کے جن سے کوئی خطا یعنی گناہ صغیرہ سرزد ہو گیا ہو پھر اُس سے بھی توبہ کر لی ہو، تو اس توبہ سے یہ صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا ہے اور صحیح تر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ درحقیقت گناہ ہی نہ تھے نہ صغیرہ نہ کبیرہ، البتہ صورت گناہ کی تھی اور درحقیقت وہ اجتہادی خطائیں ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں اشارہ اس طرف پایا گیا کہ حضرت موسیٰؑ

سے جو ایک لغزش قبطی کے قتل کی ہوگئی وہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے معاف کردی مگر اسکا یہ اثر اب بھی رہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہوگیا، اگر یہ لغزش نہ ہوتی تو یہ وقتی خوف بھی نہ ہوتا۔ (قرطبی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

اور ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو ایک علم اور بولے شکر اللہ کا جس نے ہم کو

فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ

بزرگی دی اپنے بہت سے بندوں ایمان والوں پر اور قائم مقام ہوا سلیمان

دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ

داؤد کا اور بولا اے لوگو ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی اور دیا ہم کو ہر چیز

كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ

میں سے بیشک یہی ہے فضیلت صریح اور جمع کئے گئے سلیمان کے پاس

جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓي اِذَآ

اس کے لشکر جن اور انسان اور اڑتے جانور پھر ان کی جماعتیں بنائی جاتیں یہاں تک کہ جب

اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا

پہنچے چیونٹیوں کے میدان پر کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو گھس جاؤ اپنے

مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

گھروں میں نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اسکی فوجیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ

پھر مسکرا کر ہنس پڑا اس کی بات سے اور بولا اے میرے رب میری قسمت میں دے کہ شکر

نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا

کروں تیرے احسان کا جو تو نے کیا مجھ پر اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں کام نیک

تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

جو تو پسند کرے اور ملالے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) کو (شریعت اور حکمرانی کا) علم عطا فرمایا اور ان دونوں نے (ادائے شکر کے لئے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہیں جس نے ہم کو

اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے (یعنی ان کو سلطنت وغیرہ ملی) اور انھوں نے (اظہار شکر کیلئے) کہا کہ اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے (جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں) اور ہم کو (سامانِ سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں (جیسے فوج، لشکر، مال، اور آلاتِ جنگ وغیرہ) واقعی یہ (اللہ تعالیٰ کا) کھلا ہوا فضل ہے اور سلیمان (علیہ السلام کے پاس سامانِ سلطنت بھی عجیب وغریب تھا چنانچہ ان) کے لئے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے تابع نہیں ہوتے) اور (پھر تھے بھی اس کثرت سے کہ) ان کو (چلنے کے وقت) روکا جا (یا کر) تا تھا (تاکہ متفرق نہ ہو جاویں پیچھے والے بھی پہنچ جاویں یہ بات عادۃً نہایت کثرت میں ہوتی ہے کیونکہ تھوڑے مجمع میں تو اگلا آدمی خود ہی ایسے وقت رُک جاتا ہے اور بڑے مجمع میں اگلوں کو پچھلوں کی خبر بھی نہیں ہوتی اسلئے اسکا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایکبار اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لئے جاتے تھے) یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا کہ اے چیونٹیو، اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تم کو سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے سو سلیمان (علیہ السلام نے اس کی بات سنی اور اُس کی بات سے (متعجب ہو کر کہ اس چھوٹے وجود پر یہ ہوشیاری اور احتیاط) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور (یہ دیکھ کر کہ میں اس کی بولی سمجھ گیا جو کہ معجزہ ہونے کی وجہ سے ایک نعمت عظیمہ ہے اور نعمتیں بھی یاد آگئیں اور) کہنے لگے کہ اے میرے رب مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (یعنی ایمان اور علم سب کو اور نبوت خود کو اور اپنے والد داؤد علیہ السلام کو) اور (اُس پر بھی ہمیشگی دیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں (یعنی عمل مقبول ہو کیونکہ اگر حقیقت میں عمل نیک ہو اور آداب و شرائط کی کمی کیوجہ سے مقبول نہ ہو وہ مقصود نہیں ہے) اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجہ کے) نیک بندوں (انبیاء) میں داخل رکھئے (یعنی قرب کو بُعد میں تبدیل نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد علومِ انبیاء ہیں جو نبوت و رسالت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسکے عموم میں دوسرے علوم و فنون بھی شامل ہوں تو بعید نہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی گئی تھی۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام زمرۂ انبیاء میں ایک خاص امتیاز یہ رکھتے ہیں کہ ان کو نبوت و رسالت کے ساتھ سلطنت بھی دی گئی تھی اور سلطنت

بھی ایسی بے نظیر کہ صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنات اور جانوروں پر بھی ان کی حکمرانی تھی ان سب عظیم الشان نعمتوں سے پہلے حق تعالیٰ کے نعمتِ علم کا ذکر فرمانے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نعمتِ علم تمام دوسری نعمتوں سے فائق اور بالاتر ہے۔ (قرطبی)

انبیاء میں مال کی وراثت نہیں ہوتی | وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ، وَرِثَ سے وراثتِ علم اور نبوت مراد ہے وراثتِ مال نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ) یعنی انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ مورث، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے۔ العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، لیکن انبیاء میں وراثت علم اور نبوت کی ہوتی ہے مال کی نہیں ہوتی۔ حضرت ابوعبداللہ (جعفر صادق) کی روایت اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور سرور دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ (روح عن الکلینی) عقلی طور پر بھی یہاں وراثت مال مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے وقت آپ کی اولاد میں اُنیس بیٹوں کا ذکر آتا ہے اگر وراثتِ مال مراد ہو تو یہ بیٹے سب کے سب وارث ٹھہریں گے پھر وراثت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وراثت وہ مُراد ہے جس میں بھائی شریک نہ تھے بلکہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام وارث بنے اور وہ صرف علم اور نبوت کی وراثت ہی ہو سکتی ہے اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ملک و سلطنت بھی حضرت سلیمان کو عطا فرما دیا اور اسمیں مزید اضافہ اسکا کر دیا کہ آپ کی حکومت جنات اور وحوش و طیور تک عام کر دی، ہوا کو آپکے لئے مسخر کر دیا۔ ان دلائل کے بعد طبرسی کی وہ روایت غلط ہو جائیگی جس میں انھوں نے بعض ائمہ اہلِ بیت کے حوالے سے مال کی وراثت مراد لی ہے۔ (روح)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا فاصلہ ہے اور یہود یہ فاصلہ ایک ہزار چار سو سال کا بتلاتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر ہوئی ہے۔ (قرطبی)

اپنے لئے جمع کا صیغہ بولنا جائز ہے بشرطیکہ تکبراً نہو | عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا الخ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے باوجود خود اکیلے ہونے کے اپنے لئے جمع کا صیغہ شاہانہ محاورہ کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ رعایا پر رُعب پڑے اور رعایا اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ سلیمان علیہ السلام میں سُستی نہ کریں۔ اسی طرح امراء، حکام اور افسران کو اپنی رعایا کی موجودگی میں اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں جبکہ وہ سیاستہً اور اظہارِ نعمت کی غرض سے ہو تکبر و تعلّی کے لئے نہ ہو۔

پرندوں اور چوپاؤں میں بھی عقل و شعور ہے | اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ پرندے، چرندے اور تمام حیوانات

میں بھی عقل وشعور کسی درجہ میں موجود ہے۔ البتہ ان کی عقول اس درجہ کی نہیں کہ ان کو احکام شرع کا مکلف بنایا جاتا اور انسان اور جنات کو عقل وشعور کا وہ کامل درجہ عطا ہوا ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہو سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کبوتر سب پرندوں میں زیادہ عقلمند ہے۔ ابن عطیہ نے فرمایا کہ چیونٹی ذہین عقلمند جانور ہے اس کی قوت شامہ بڑی تیز ہے جو کوئی دانہ اسکے قبضہ میں آتا ہی اسکے دو ٹکڑے کر دیتی ہے تاکہ آگے نہیں اور سردی کے زمانے کے لئے اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرتی ہے۔ (قرطبی)

فائدہ :۔ آیت میں منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولی کی تخصیص ہُدہُد کے واقعہ کی وجہ سے ہے جو پرندہ ہے ورنہ حضرت سلیمانؑ کو پرندے، چرندے اور تمام حشرات الارض کی بولیاں سکھائی گئی تھیں جیسا کہ اگلی آیت میں چیونٹی کی بولی سمجھنے کا ذکر موجود ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس مقام پر مختلف پرندوں کی بولیاں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اُس پر یہ فرمانا کہ یہ پرندہ یہ بات کہہ رہا ہے تفصیل سے نقل کیا ہے اور تقریباً ہر پرندہ کی بولی کوئی نصیحت کا جملہ ہے۔

وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ، لفظ کُل اصل لغت کے اعتبار سے تمام افرادِ جنس کو عام ہوتا ہی مگر بسا اوقات عموم کُلّی مُراد نہیں ہوتا بلکہ کسی خاص مقصد کی حد تک عموم مُراد ہوتا ہے جیسا یہاں مراد اُن اشیاء کا عموم ہے جن کی سلطنت و حکومت میں ضرورت ہوتی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز، موٹر، ریل وغیرہ اُن کے پاس نہ تھے رَبِّ أَوْزِعْنِي، وزع سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے روکنے کے ہیں۔ مطلب اس جگہ یہ ہے کہ مجھے اس کی توفیق دیدیجئے کہ میں شکرِ نعمت کو ہر وقت ساتھ رکھوں اُس سے کسی وقت جُدا نہوں، جسکا حاصل مداومت اور پابندی ہے۔ اس سے پہلی آیت میں فَهُمْ يُوزَعُونَ اسی معنی میں آیا ہے کہ لشکر کو کثرت کی وجہ سے انتشار سے بچانے کے لئے روکا جاتا تھا۔

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ، یہاں رضا بمعنے قبول ہے۔ معنے یہ ہیں کہ یا اللہ مجھے ایسے عمل صالح کی توفیق دیجئے جو آپکے نزدیک مقبول ہو۔ روح المعانی میں اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عمل صالح کے لئے قبولیت لازم نہیں ہے بلکہ قبولیت کچھ شرائط پر موقوف ہوتی ہے، اور فرمایا کہ صالح اور مقبول ہونے میں نہ عقلاً کوئی لزوم ہے نہ شرعاً۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے کہ اپنے اعمالِ صالحہ کے مقبول ہونے کی بھی دُعا کرتے تھے جیسے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت دُعا فرمائی، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل نیک ہے صرف اُس کو کر کے بے فکر ہونا نہیں چاہیئے، اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دُعا کرے کہ اس کو قبول فرمادے۔

عمل صالح اور مقبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا بغیر فضلِ خداوندی کے نہیں ہوگا

وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ، عمل صالح اور اسکے قبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا خدا تعالیٰ کے فضل وکرم ہی سے ہوگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے بھروسہ

پر جنت میں داخل نہیں ہوگا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ بھی، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی، لیکن مجھے میرے خدا کی رحمت اور فضل گھیرے ہوئے ہے۔ (روح المعانی)

حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ان کلمات میں دخولِ جنت کے لئے فضلِ ربی کی دُعا فرما رہے ہیں یعنی اے اللہ، مجھے وہ فضل بھی عطا فرما جس سے جنت کا مستحق ہو جاؤں۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ

اور خبر لی اُڑتے جانوروں کی تو کہا کیا ہے، جو میں نہیں دیکھتا ہُدہُد کو یا ہے وہ

الْغَآئِبِينَ ﴿٢٠﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَاذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي

غائب اس کو سزا دوں گا سخت سزا یا ذبح کر ڈالوں گا یا لائے میرے پاس

بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِۦ وَ

کوئی سند صریح پھر بہت دیر نہ کی کہ آکر کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ تجھ کو اسکی

جِئْتُكَ مِن سَبَإٍۭ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ﴿٢٢﴾ إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَ

خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لیکر تحقیقی میں نے پایا ایک عورت کو جوان پر بادشاہی کرتی ہے

أُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا

اور اس کو ہر ایک چیز ملی ہے اور اس کا ایک تخت ہے بڑا میں نے پایا کہ وہ اور اسکی قوم

يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ

سجدہ کرتے ہیں سُورج کو اللہ کے سوائے اور بھلے دکھلا رکھے ہیں ان کو شیطان نے انکے کام

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٢٤﴾ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ

پھر روک دیا ہے اُن کو رستہ سے سو وہ راہ نہیں پاتے کیوں نہ سجدہ کریں اللہ کو

الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَ

جو نکالتا ہے چھپی ہوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو چھپاتے ہو اور

مَا تُعْلِنُونَ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۩ ﴿٢٦﴾ قَالَ

ظاہر کرتے ہو اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اسکے سوائے پروردگار تخت بڑے کا سلیمان نے کہا

سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَٰذِبِينَ ﴿٢٧﴾ اذْهَب بِّكِتَٰبِي

ہم اب دیکھتے ہیں تو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے لے جا میرا یہ خط

هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ﴿٢٨﴾

اور ڈال دے اُن کی طرف پھر اُن کے پاس سے ہٹ آ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں

السجدۃ

خلاصۂ تفسیر

(اور ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کی حاضری لی تو (ہُدہُد کو نہ دیکھا) فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہو گیا ہے (اور جب معلوم ہوا کہ واقع میں غائب ہے تو فرمانے لگے کہ) میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف دلیل (اور غیر حاضری کا عذر) میرے سامنے پیش کرے (تو خیر چھوڑ دونگا) تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور سُلیمان (علیہ السلام سے) کہنے لگا کہ ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور (اجمالی بیان اسکا یہ ہے کہ) میں آپکے پاس قبیلہ سبا کی ایک پختہ خبر لایا ہوں (جسکا تفصیلی بیان یہ ہے کہ) میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ان لوگوں پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو (بادشاہی کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان حاصل ہے اور اسکے پاس ایک بڑا تخت ہے (اور مذہبی حالت اُنکی یہ ہے کہ) میں نے اس (عورت) کو اور اُسکی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے اُن کے (ان) اعمال (کفر) کو اُنکی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے (اور ان اعمالِ بد کو مزین کرنے کے سبب) انکو راہ (حق) سے روک رکھا ہے اسلئے وہ راہِ (حق) پر نہیں چلتے کہ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قدرت والا ہے کہ) آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو (جن میں سے بارش اور زمین کی نباتات بھی ہیں) باہر لاتا ہے اور (ایسا جاننے والا ہے کہ) تم لوگ (یعنی تمام مخلوق) جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو اور جو کچھ (زبان اور جسم کے اعضاء سے) ظاہر کرتے ہو وہ سب کو جانتا ہے (اسلئے) اللہ ہی ایسا ہے کہ اسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے سلیمان (علیہ السلام) نے (یہ سُن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے (اچھا) میرا یہ خط لے جا اور اسکو اُن کے پاس ڈال دینا پھر (ذرا وہاں سے) ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال و جواب کرتے ہیں (پھر تو یہاں چلے آنا وہ لوگ جو کچھ کارروائی کریں گے اُس سے تیرا سچ جھوٹ معلوم ہو جاوے گا)۔

معارف و مسائل

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ، تَفَقَّدَ کے لفظی معنے کسی مجمع کے متعلق حاضر و غیر حاضر کی تحقیق کرنے کے ہیں، اسلئے اسکا ترجمہ خبر گیری اور نگہبانی سے کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے علاوہ جنات اور وحوش و طیور پر حکومت عطا فرمائی تھی اور جیسا کہ حکمرانی کا اُصول ہے رعایا کے ہر طبقہ کی نگرانی اور خبر گیری حاکم کے فرائض میں سے ہے اسکے مطابق اس آیت میں بیان فرمایا تَفَقَّدَ الطَّيْرَ یعنی سلیمان علیہ السلام نے اپنی رعایا کے طیور کا معائنہ فرمایا اور یہ دیکھا کہ ان میں کون حاضر ہے کون

غیر حاضر۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام کے حالات سے باخبر رہنے کا اہتمام فرماتے تھے جو شخص غیر حاضر ہوتا اگر بیمار ہے تو عیادت کے لئے تشریف لیجاتے تھے تیمارداری کرتے اور کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اسکے لئے تدبیر فرماتے تھے۔

حاکم کو اپنی رعیت کی اور مشائخ کو اپنے شاگردوں اور مریدوں کی خبر گیری ضروری ہے آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایا کے ہر طبقہ پر نظر رکھتے اور انکے حالات سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ ہُدہُد جو طیور میں چھوٹا اور کمزور بھی ہے اور اس کی تعداد بھی دنیا میں بہ نسبت دوسرے طیور کے کم ہے وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا، بلکہ خاص ہُدہُد کے متعلق جو سوال آپنے فرمایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ زمرۂ طیور میں کم تعداد اور کمزور ہے، اسلئے اپنی رعیت کے کمزوروں پر نظر رکھنے کا زیادہ اہتمام فرمایا۔ صحابۂ کرام میں حضرت فاروقِ اعظم رضؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس سُنتِ انبیاء کو پوری طرح جاری کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرتے تھے کہ سب لوگوں کے حالات سے باخبر رہیں۔ جس شخص کو کسی مصیبت و تکلیف میں گرفتار پاتے اُس کی امداد فرماتے تھے جس کے بہت سے واقعات اُنکی سیرت میں مذکور ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر دریائے فرات کے کنارہ پر کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کے بچّے کو پھاڑ ڈالا تو اسکا بھی عمرؓ سے سوال ہوگا۔ (قرطبی)

یہ تھے وہ اصولِ جہانبانی و حکمرانی جو انبیاء علیہم السّلام نے لوگوں کو سکھائے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُن کو عملاً جاری کرکے دکھلایا اور جس کے نتیجہ میں پوری مُسلم و غیر مُسلم رعایا امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی، اور اُن کے بعد زمین و آسمان نے ایسے عدل و انصاف اور عام دُنیا کے امن و سکون اور اطمینان کا یہ منظر نہیں دیکھا۔

مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ، سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں ہُدہُد کو مجمع میں نہیں دیکھتا۔

اپنے نفس کا محاسبہ یہاں موقع تو یہ فرمانے کا تھا کہ ہُدہُد کو کیا ہو گیا کہ وہ مجمع میں حاضر نہیں عنوان شاید اسلئے بدلا کہ ہُدہُد اور تمام طیور کا مسخر ہونا حق تعالیٰ کا ایک انعام خاص تھا۔ ہُدہُد کی غیر حاضری پر ابتداء میں یہ خوف دل میں پیدا ہوا کہ شاید میرے کسی قصور سے اس نعمت میں کمی آئی کہ ایک صنفِ طیور کی یعنی ہُدہُد غائب ہو گیا اسلئے اپنے نفس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جیسا کہ مشائخِ صوفیہ کا معمول ہے کہ جب اُن کو کسی نعمت میں کمی آئے یا کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہو تو وہ اسکے ازالہ کیلئے مادّی اسباب کیطرف توجّہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کے حقِ شکر میں کونسی کوتاہی ہوئی جس کے سبب یہ نعمت ہم سے لے لی گئی۔ قرطبی نے اس جگہ بحوالہ ابن عربی ان بزرگوں کا یہ حال نقل کیا ہے۔

اذا فقدوا ما لھم تفقدوا اعمالھم | یعنی ان حضرات کو جب اپنی مراد میں کامیابی نہیں ہوتی تو یہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم سے کیا قصور سرزد ہوا۔

اس ابتدائی محاسبۂ نفس اور غور و فکر کے بعد فرمایا اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ اس جگہ حرف اَمْ بمعنے بَلْ ہے (قرطبی) معنے یہ ہیں کہ یہ بات نہیں کہ ہُدہُد کے دیکھنے میں میری نظر نے خطاء کی بلکہ وہ حاضر ہی نہیں۔

طیور میں سے ہُدہُد کی تخصیص کی وجہ اور ایک اہم عبرت

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ تمام پرندوں میں ہدہد کی تفتیش کی کیا وجہ پیش آئی تو آپ نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کسی ایسے مقام میں قیام فرمایا جہاں پانی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہُدہُد کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ ہدہد سے یہ معلوم کریں کہ اس میدان میں پانی کتنی گہرائی میں ہے اور کس جگہ زمین کھودنے سے پانی کافی مل سکتا ہے۔ ہُدہُد کی اس نشاندہی کے بعد وہ جنات کو حکم دیدیتے کہ اس زمین کو کھود کر پانی نکالو وہ بڑی جلد کھود کر پانی نکال لیتے تھے۔ ہُدہُد اپنی تیز نظر اور بصیرت کے باوجود شکاری کے جال میں پھنس جاتا ہے اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

قف یا وقاف کیف یری الھدھد باطن الارض وھو لا یری الفخ حین یقع فیہ (قرطبی) | جاننے والو اس حقیقت کو پہچانو کہ ہدہد زمین کی گہرائی کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے مگر زمین کے اوپر پھیلا ہوا جال اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں پھنس جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو امر تکلیف یا راحت کا کسی کے لئے مقدر کر دیا ہے تو تقدیرِ الٰہی نافذ ہو کر رہتی ہے کوئی شخص اپنی فہم و بصیرت یا زور و زر کی طاقت کے ذریعہ اُس سے نہیں بچ سکتا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗ، ابتدائی غور و فکر کے بعد یہ حاکمانہ سیاست کا مظاہرہ ہے کہ غیر حاضر رہنے والے کو سزا دی جائے۔

جو جانور کام میں سستی کرے اسکو معتدل سزا دینا جائز ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے حق تعالیٰ نے جانوروں کو ایسی سزائیں دینا حلال کر دیا تھا جیسا عام اُمتوں کے لئے جانوروں کو ذبح کر کے اُنکے گوشت پوست وغیرہ سے فائدہ اُٹھانا اب بھی حلال ہے۔ اسی طرح پالتو جانور گائے بیل، گدھا گھوڑا، اونٹ وغیرہ اپنے کام میں سستی کرے اُس کو تادیب کے لئے بقدرِ ضرورت مارنے کی معتدل سزا اب بھی جائز ہے۔ دوسرے جانوروں کو سزا دینا ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ (قرطبی)

اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ، یعنی اگر ہُدہُد نے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر واضح پیش کر دیا تو وہ اس سزا سے محفوظ رہے گا۔ اسمیں اشارہ ہے کہ حاکم کو چاہیئے کہ جن لوگوں سے کوئی قصور عمل میں سرزد ہو جائے اُن کو عذر پیش کرنے کا موقع دے، عذر صحیح ثابت ہو تو سزا کو معاف کر دے۔

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ، یعنی ہُدہُد نے اپنا عذر بتلاتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ چیز معلوم ہے جو آپ کو معلوم نہیں، یعنی میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جسکا آپ کو پہلے علم نہیں تھا۔

انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے جس سے اُن کو ہر چیز کا علم ہوسکے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ، سَباء، یمن کا ایک مشہور شہر جسکا ایک نام مَارِب بھی ہے، اُسکے اور یمن کے دارالحکومت صنعاء کے درمیان تین دن کی مسافت تھی۔

کیا چھوٹے آدمی کو یہ حق ہے کہ اپنے بڑوں سے کہے کہ مجھے آپ سے زیادہ علم ہے ہُدہُد کی مذکورہ گفتگو سے بعض لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ کوئی شاگرد اپنے استاد سے یا غیر عالم عالم سے کہہ سکتا ہی کہ اس مسئلہ کا علم مجھے آپ سے زیادہ ہے بشرطیکہ اس کو اس مسئلہ کا واقعی طور پر مکمل علم دوسروں سے زائد ہو۔ مگر روح المعانی میں فرمایا کہ یہ طرز گفتگو اپنے مشائخ اور بڑوں کے سامنے خلافِ ادب ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور ہُدہُد کے قول سے اس پر استدلال اس لئے نہیں ہوسکتا کہ اُسنے یہ بات اپنے آپ کو سزا سے بچانے اور عُذر کے قوی ہونے کے لئے کہی ہے تاکہ اسکی غیر حاضری کا عُذر پوری طرح حضرت سلیمانؑ کے سامنے آجائے ایسی ضرورت میں ادب کی رعایت رکھتے ہوئے کوئی بات کہجائے تو مضائقہ نہیں۔

اِنِّىْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ، یعنی میں نے ایک عورت کو پایا جو قوم سبا کی مالک ہے یعنی اُن پر حکومت کرتی ہی۔ اس عورت یعنی ملکہ سبا کا نام تاریخ میں بلقیس بنت شراحیل بتلایا گیا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کی والدہ جنات میں سے تھی جسکا نام بلعمہ بنت شیصان بتلایا جاتا ہے (رواہ وہیب بن جریر عن الخلیل ابن احمد۔ قرطبی) اور اُن کا دادا ہُداہد پورے ملک یمن کا ایک عظیم الشان بادشاہ تھا جس کی اولاد میں چالیس لڑکے ہوئے سب کے سب مُلوک اور بادشاہ بنے۔ ان کے والد سراح نے ایک جنّیہ عورت سے نکاح کرلیا تھا اُسی کے بطن سے بلقیس پیدا ہوئی۔ جنّیہ سے نکاح کرنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ اپنی حکومت وسلطنت کے غرور میں لوگوں سے کہتا تھا کہ تم میں کوئی میرا کفو نہیں اسلئے میں نکاح ہی نہ کرونگا کیونکہ غیر کفو میں نکاح مجھے پسند نہیں، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اسکا نکاح ایک جنّیہ عورت سے کرادیا (قرطبی) شاید یہ اُسی فخر وغرور کا نتیجہ تھا کہ اسنے انسانوں کو جو درحقیقت کفو تھے حقیر و ذلیل سمجھا اور اپنا کفو تسلیم نہ کیا تو قدرت نے اسکا نکاح ایک ایسی عورت سے مقدر کردیا جو نہ اس کی کفو تھی نہ اس کی جنس و قوم سے تھی۔

کیا انسان کا نکاح جِنّی عورت سے ہوسکتا ہی اس معاملہ میں بعض لوگوں نے تو اس لئے شبہ کیا ہی کہ جنات کو انسان کی طرح توالد و تناسل کا اہل نہیں سمجھا۔ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہ خیال باطل ہے۔ احادیث صحیحہ سے جنات میں توالد و تناسل اور مرد و عورت کی تمام وہ خصوصیات جو انسانوں میں ہیں

جنات میں بھی موجود ہونا ثابت ہے۔

دوسرا سوال شرعی حیثیت سے ہے کہ کیا عورت جنیہ کسی انسان مرد کے لئے نکاح کر کے حلال ہو سکتی ہے؟ اسمیں فقہار کا اختلاف ہے بہت حضرات نے جائز قرار دیا ہے، بعض نے غیر جنس مثل جانوروں کے ہونے کی بنار پر حرام فرمایا ہے اس مسئلہ کی تفصیل "آکام المرجان فی احکام الجان" میں مذکور ہے اسمیں بعض ایسے واقعات بھی ذکر کئے ہیں کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنیہ کا نکاح ہوا اور اُس سے اولاد بھی ہوئی۔ یہاں یہ مسئلہ اسلئے زیادہ قابلِ بحث نہیں کہ نکاح کرنے والا بلقیس کا والد مسلمان ہی نہ تھا اسکے عمل سے کوئی استدلال جواز یا عدم جواز پر نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ شرع اسلام میں اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے اور بلقیس کے والد انسان تھے اسلئے بلقیس انسان ہی قرار پائے گی۔ اسلئے بعض روایات میں جو حضرت سُلیمان علیہ السّلام کا بلقیس سے نکاح کرنا مذکور ہے، اگر وہ روایت صحیح ہو تو بھی اُس سے نکاح جنیہ کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا کیونکہ بلقیس خود جنیہ نہ تھیں اگرچہ اُن کی والدہ جنیہ ہو۔ واللہ اعلم اور نکاح سُلیمان علیہ السّلام کے متعلق مزید بیان آگے آئیگا۔

کیا کسی عورت کا بادشاہ ہونا یا کسی قوم کا امیر و امام ہونا جائز ہے؟ صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے تو آپ نے فرمایا لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً ، یعنی وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا۔ اسی لئے علماء اُمت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت و خلافت یا سلطنت و حکومت سپرد نہیں کیجا سکتی، بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامتِ کبریٰ بھی صرف مَردوں کو سزاوار ہے۔ رہا بلقیس کا ملکۂ سبا ہونا تو اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے خود نکاح کیا اور پھر اسکو حکومت و سلطنت پر برقرار رکھا، اور یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جس پر احکامِ شرعیہ میں اعتماد کیا جاسکے۔

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ، مُراد یہ ہے کہ سب ضروری سامان جو کسی بادشاہ و امیر کو درکار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے مطابق ہو سکتا ہے موجود تھا جو چیزیں اُس زمانے میں ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں اُن کا نہ ہونا اس آیت کے منافی نہیں۔

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ، عرش کے لفظی معنے تختِ سلطنت کے ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ عرشِ بلقیس کا طول اسّی ہاتھ اور عرض چالیس ہاتھ اور بلندی تیس ہاتھ تھی جس پر موتی اور یاقوت احمر زبرجد اخضر کا کام تھا اور اسکے پائے موتیوں اور جواہرات کے تھے اور پردے ریشم اور حریر کے اندر باہر یکے بعد دیگر سات مقفل عمارتوں میں محفوظ تھا۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ، معلوم ہوا کہ اس کی قوم نجوم پرست تھی آفتاب کی عبادت کرتی تھی، بعض نے فرمایا کہ مجوس میں سے تھی جو آگ اور ہر روشنی کی پرستش کرتے ہیں۔ (قرطبی)

اَلَّا يَسْجُدُوْا کا تعلق زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ یا صَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ سے ہے یعنی شیطان نے اُن کے ذہنوں میں یہی بٹھلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں یا یہ کہ اُن کو حق کے راستہ سے اس طرح روک دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں۔

تحریر اور خط بھی عام معاملات میں حجتِ شرعیہ ہے اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے نام خط بھیجنے کو اس پر اتمامِ حجت کے لئے کافی سمجھا اور اسی پر عمل فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ عام معاملات میں تحریر و خط قابلِ اعتبار ثبوت ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے صرف اُن مواقع میں خط کو کافی نہیں سمجھا جہاں شہادت شرعیہ کی ضرورت ہے کیونکہ خط اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ شہادت نہیں لیجا سکتی۔ شہادت کا مدار شاہد کا عدالت کے سامنے آکر بیان دینے پر رکھا گیا جسمیں بڑی حکمتیں مضمر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل بھی دُنیا کی کسی عدالت میں خط اور ٹیلیفون پر شہادت لینے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔

مشرکین کو خط لکھنا اور اُن کے پاس بھیجنا جائز ہے دوسرا مسئلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط سے یہ ثابت ہوا کہ تبلیغ دین اور دعوتِ اسلام کے لئے مشرکین اور کفار کو خطوط لکھنا جائز ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی مختلف کفار کو خطوط بھیجنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

انسانی اخلاق کی رعایت ہر مجلس میں چاہیئے اگرچہ وہ مجلس کفار ہی کی ہو فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے نامہ بری کا کام لیا تو اس کو یہ ادب مجلس بھی سکھایا کہ خط ملکہ سبا کو پہنچا کر وہیں سر پر سوار نہ رہے بلکہ وہاں سے ذرا ہٹ جائے جو عام شاہی مجلسوں کا طریقہ ہے۔ اسمیں آدابِ معاشرت اور انسانی اخلاق کا عام مخلوقات کے ساتھ مطلوب ہونا معلوم ہوا۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ

کہنے لگی اے دربار والو میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزت کا وہ خط ہے سلیمان

سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ

کی طرف سے اور وہ یہ ہے شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے کہ زور نہ کرو میرے مقابلہ میں

وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ

اور چلے آؤ میرے سامنے حکمبردار ہو کر کہنے لگی اے دربار والو مشورہ دو مجھ کو میرے کام میں

مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ

میں طے نہیں کرتی کوئی کام تمہارے حاضر ہونے تک وہ بولے ہم لوگ زور آور ہیں

وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ﴀ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ ﴿۳۳﴾

اور سخت لڑائی والے اور کام تیرے اختیار میں ہے سو تو دیکھ لے جو حکم کرے

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ

کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں

اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ

کے سرداروں کو بے عزت اور ایسا ہی کچھ کریں گے اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف کچھ تحفہ

فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ

پھر دیکھتی ہوں کیا جواب لے کر پھرتے ہیں بھیجے ہوئے پھر جب پہنچا سلیمان کے پاس بولا کیا تم میری اعانت

بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾

کرتے ہو مال سے، سو جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے بہتر ہے اس سے جو تم کو دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش رہو

اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ

پھر جا ان کے پاس اب ہم پہنچتے ہیں ان پر ساتھ لشکروں کے جن کا مقابلہ نہ ہو سکے ان سے اور نکال دیں گے انکو وہاں سے

اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

بے عزت کر کر اور وہ خوار ہوں گے

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے یہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جسکا مضمون آگے قرآن میں مذکور ہے اور ہُدہُد کے حوالہ کیا وہ اسکو چونچ میں لیکر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈالدیا) بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور) کہا کہ اے اہلِ دربار میرے پاس ایک خط (جسکا مضمون نہایت) باوقعت (اور عظیم الشان ہی) ڈالا گیا ہے (باوقعت اسلئے کہا کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اختصار کے اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کیطرف سے ہے اور اسمیں یہ (مضمون) ہے (اوّل) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اور اسکے بعد یہ کہ) تم لوگ (یعنی بلقیس اور سب ارکانِ بادشاہت جن کے ساتھ عوام بھی وابستہ ہیں) میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر چلے آؤ۔ (مقصود تمام کو دعوت دینا ہے اور یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کا یا تو پہلے حال سُن چکے ہونگے گو سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کو نہ جانتے ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہی کہ بڑے چھوٹوں کو نہیں جانتے اور چھوٹے بڑوں کو جانا کرتے ہیں اور یا خط آنے کے بعد تحقیق کر لیا ہوگا اور خط کے مضمون کی اطلاع دینے کے بعد) بلقیس نے (یہ) کہا کہ اے اہلِ دربار تم مجھ کو میرے

اس معاملہ میں رائے دو (کہ مجھ کو سلیمان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیئے) اور میں (کبھی) کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور اس میں شریک و مشیر نہ ہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم (اپنی ذات سے ہر طرح سے حاضر ہیں، اگر مقابلہ اور لڑنا مصلحت سمجھا جاوے تو ہم) بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (اور آگے) اختیار تم کو ہے سو تم ہی (مصلحت) دیکھ لو جو کچھ (تجویز کرکے) حکم دینا ہو۔ بلقیس کہنے لگی کہ (میرے نزدیک لڑنا تو مصلحت نہیں کیونکہ سلیمان بادشاہ ہیں اور) بادشاہوں (کا قاعدہ ہے کہ وہ) جب کسی بستی میں (مخالفانہ طور پر) داخل ہوتے ہیں تو اس کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اسکے رہنے والوں میں جو عزت دار ہیں ان کو (ان کا زور گھٹانے کیلئے) ذلیل (و خوار) کیا کرتے ہیں اور (اُن سے لڑائی کیجاوے تو ممکن ہے کہ ان ہی کو غلبہ ہو تو پھر) یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے (تو بے ضرورت پریشانی میں پڑنا خلاف مصلحت ہے لہٰذا جنگ کو تو ابھی ملتوی کیا جاوے) اور (سر دست یوں مناسب ہے کہ) میں ان لوگوں کے پاس کچھ ہدیہ (کسی آدمی کے ہاتھ بھیجتی ہوں) پھر دیکھوں گی کہ وہ بھیجے ہوئے (وہاں سے) کیا (جواب) لے کر آتے ہیں (اسوقت دوبارہ غور کیا جاویگا۔ چنانچہ ہدیوں اور تحفوں کا سامان درست ہوا اور قاصد اسکو لیکر روانہ ہوا) جب وہ قاصد سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تمام ہدیے پیش کئے) تو سلیمان (علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس اور بلقیس والے) مال سے میری امداد کر (ناچاہ) تے ہو (اسلئے ہدیئے لائے ہو) سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے (کیونکہ تمھارے پاس صرف دُنیا ہے اور میرے پاس دین بھی اور دُنیا بھی تم سے زیادہ، لہٰذا میں تو ان چیزوں کا حریص نہیں ہوں) ہاں تم ہی اپنے ہدیئے پر فخر کرتے ہوگے (لہٰذا یہ ہدیئے ہم نہ لیں گے) تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ (اگر وہ اب بھی ایمان لے آویں تو درست ورنہ) ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ (ذلت کیساتھ ہمیشہ کے لئے) ماتحت (اور رعایا) ہو جاویں گے (یہ نہیں کہ نکالنے کے بعد آزادی سے چھوڑ دیئے جاویں کہ جہاں چاہیں چلے جاویں بلکہ ہمیشہ کی ذلت ان کے لئے لازمی ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ، کریم کے لفظی معنی معزز مکرم کے ہیں اور محاورہ میں کسی خط کو معزز مکرم جب کہا جاتا ہے جبکہ اُس پر مہر لگائی گئی ہو۔ اسی لئے اس آیت میں كِتٰبٌ كَرِيْمٌ کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، زہیرؒ وغیرہ نے کتاب مختوم سے کی ہے جس

سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط پر اپنی مہر ثبت فرمائی تھی۔ ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو جب ملوکِ عجم کی یہ عادت معلوم ہوئی کہ جس خط پر مہر نہ ہو اُس کو نہیں پڑھتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کے خطوط کے لئے مہر بنوائی اور قیصر و کسریٰ وغیرہ کو جو خطوط تحریر فرمائے اُن پر مہر ثبت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خط پر مہر لگانا مکتوب الیہ کا بھی اکرام ہے اور اپنے خط کا بھی۔ آجکل عادت خط کو لفافہ میں بند کر کے بھیجنے کی ہو گئی ہے یہ بھی مہر کے قائم مقام ہے۔ جس جگہ مکتوب الیہ کا اکرام منظور ہو، کھُلا خط بھیجنے کے بجائے لفافہ میں بند کر کے بھیجنا اقرب الی السنۃ ہے۔

حضرت سُلیمان علیہ السلام کا خط کس زبان میں تھا حضرت سلیمان علیہ السلام گو عربی نہ تھے لیکن عربی زبان جاننا اور سمجھنا آپ سے کوئی بعید بھی نہیں۔ جبکہ آپ پرندوں تک کی زبان جانتے تھے اور عربی زبان تو تمام زبانوں سے افضل و اشرف ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط عربی زبان میں لکھا ہو کیونکہ مکتوب الیہ (بلقیس) عربی النسل بھی اس نے خط کو پڑھا بھی اور سمجھا بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط اپنی ہی زبان میں تحریر فرمایا ہو اور بلقیس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان کا ترجمان ہو جس نے پڑھ کر خط سنایا اور سمجھایا ہو۔ (روح)

خط نویسی کے چند آداب اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایات نہ دی ہوں۔ خط و کتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت و شنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے۔ اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سبا (بلقیس) پُورا کا پُورا نقل فرمایا گیا۔ یہ ایک پیغمبر و رسول کا خط ہے اور قرآن کریم نے اس کو بطور استحسان کے نقل کیا ہے اسلئے اس خط میں جو ہدایات خط و کتابت کے معاملے میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اتباع ہیں۔

کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا سب سے پہلی ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا، مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا قرآن کریم کے الفاظ میں وہ مذکور نہیں۔ مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لئے سُنتِ انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اُسی ماحول میں خط کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے مخاطب کو یہ تکلیف نہ اُٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے کہاں سے آیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں اُن سب میں بھی آپ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ (من محمد عبد اللہ ورسولہ) سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے اسمیں تو اپنے

نام کی تقدیم پر کوئی اشکال نہیں، لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، اُستاد، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے اُسمیں اپنے نام کو مقدم کرنا کیا اسکے ادب کے خلاف نہ ہوگا اور اس کو ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اس معاملے میں حضرات صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے اکثر حضرات نے تو اتباعِ سُنّتِ نبوی کو ادب پر مقدم رکھکر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط لکھے اُن میں بھی اپنے نام کو مقدم لکھا ہے۔ رُوح المعانی میں بحر محیط کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما کان احد اعظم حرمۃ من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وکان اصحابہ اذا کتبوا الیہ کتابا بدأوا بانفسھم قلت وکتاب علاء الحضرمی رض یشھد لہ علی ما روی

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی انسان قابلِ تعظیم نہیں، مگر صحابہ کرام جب آپ کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے اور حضرت علائی حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

البتہ روح المعانی میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کلام افضلیت میں ہے جواز میں نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے اخیر میں لکھدے تو یہ بھی جائز ہے۔ فقیہ ابو اللیث کی بُستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام سے شروع کردے تو اسکے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ اُمّت میں یہ طریقہ بھی چلا آرہا ہے اس پر نکیر نہیں کی گئی (رُوح المعانی و قرطبی)

خط کا جواب دینا بھی سُنّتِ انبیاء ہے تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اُس کے لئے مناسب ہے کہ اُسکا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے! اسی لئے حضرت ابنِ عباس رض سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جوابِ سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے (قرطبی)

خطوط میں بسم اللہ لکھنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے نیز رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا سنتِ انبیاء ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم، اسکے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے۔ اور قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے اسکے ظاہر سے جواز اسکا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ من سلیمان بن داؤد الی بلقیس ابنۃ ذی شرح وقومھا۔ ان لا تعلوا الخ بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سُنایا تو اُسنے قوم کی آگاہی کے لئے سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کردیا، قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ مقدم تھی یا سلیمان علیہ السلام کا نام۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

سلیمان علیہ السلام کا نام لفافہ کے اُوپر لکھا ہوا اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو، بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سُنایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔

مسئلہ: خط نویسی کی اصل سُنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے، لیکن قرآن و سُنت کے نصوص و اشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اُس جگہ اُس کاغذ کے بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔ آجکل جو عموماً ایک دوسرے کو خطوط لکھے جاتے ہیں انکا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سُنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔

ایسی تحریر جس میں کوئی آیتِ قرآنی لکھی ہو، کیا کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے

یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اسوقت بھیجا ہے جبکہ وہ مُسلمان نہیں تھیں حالانکہ اس خط میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوکِ عجم کو لکھے ہیں اور وہ مشرک تھے، اُن میں بھی بعض آیاتِ قرآن لکھی ہیں۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون کے ضمن میں کوئی آیت آگئی ہے وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اسلئے اسکا حکم بھی قرآن کا حکم نہیں ہوگا وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ میں بھی (عالمگیری کتاب الحظر والاباحۃ)

خط مختصر، جامع، بلیغ اور مؤثر انداز میں لکھنا چاہیئے

حضرت سُلیمان علیہ السلام کے اس والا نامہ کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم اور ضروری مضامین بھی جمع کر دیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے۔ کافر کے مقابلے میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے۔ اسکے ساتھ حق تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا بیان اور اسلام کی طرف دعوت بھی، اور ترفّع و تکبر کی مذمت بھی۔ درحقیقت یہ خط بھی اعجازِ قرآنی کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سنّت بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں۔ (روح المعانی)

اہم اُمور میں مشورہ کرنا سُنت ہے اسمیں دوسروں کی رائے سے فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور لوگوں کی دلجوئی بھی ہوتی ہے

قَالَتۡ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۚ مَا کُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰی تَشۡهَدُوۡنِ، افتونی، فتوٰی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی خاص مسئلہ کا جواب دینا۔ یہاں مشورہ دینا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا مُراد ہے۔ ملکہ بلقیس کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پہنچا تو اُسنے اپنے ارکانِ حکومت کو جمع کر کے اس واقعہ کا اظہار کیا اور اُن سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے کیا کرنا

چاہیئے۔ اس نے ان کی رائے دریافت کرنے سے پہلے اُن کی دلجوئی اور ہمت افزائی کے لئے یہ بھی کہا کہ "میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمھارے بغیر نہیں کرتی" اسی کا نتیجہ تھا کہ فوج اور وزراء نے اسکے جواب میں اپنی مستعدی کے ساتھ تعمیلِ حکم کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کردی (نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ) حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ہم سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ بلقیس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان تین سو تیرہ تھے اور انمیں سے ہر ایک آدمی دس ہزار آدمیوں کا امیر اور نمائندہ تھا۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ اہم اُمور میں مشورہ لینے کا دستور پرانا ہے۔ اسلام نے مشورہ کو خاص اہمیت دی اور عمالِ حکومت کو مشورہ کا پابند کیا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو وحیِ الٰہی کے مورد تھے۔ اور آسمانی ہدایات آپ کو ملتی تھیں اس کی وجہ سے آپ کو کسی رائے مشورہ کی درحقیقت ضرورت نہ تھی، مگر اُمت کے لئے سُنت قائم کرنے کے واسطے آپ کو بھی حکم دیا گیا (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ) یعنی آپ اہم اُمور میں صحابۂ کرام سے مشورہ لیا کریں۔ اسمیں صحابۂ کرام کی دلجوئی اور عزت افزائی بھی ہے اور آئندہ آنے والے عمالِ حکومت کو اسکی تاکید بھی کہ مشورہ سے کام کیا کریں۔

مکتوبِ سلیمانی کے جواب میں ملکہ بلقیس کا ردِ عمل

اربابِ حکومت کو مشورہ میں شریک کرکے ان کا تعاون حاصل کرلینے کے بعد ملکہ بلقیس نے خود ہی ایک رائے قائم کی جسکا حاصل یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کا امتحان لے اور تحقیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور جو کچھ حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کے احکام کی تعمیل ہے یا وہ ایک ملک گیری کے خواہشمند بادشاہ ہیں، اس امتحان سے اسکا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعی وہ نبی و رسول ہیں تو انکے حکم کا اتباع کیا جائے اور مخالفت کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے اور اگر بادشاہ ہیں اور ملک گیری کی ہوس میں ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں تو پھر غور کیا جائیگا کہ انکا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس امتحان کا طریقہ اُس نے یہ تجویز کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس کچھ ہدیئے تحفے بھیجے اگر وہ ہدیئے تحفے لیکر راضی ہوگئے تو علامت اس کی ہوگی کہ وہ ایک بادشاہ ہی ہیں، اور اگر وہ واقع میں نبی و رسول ہیں تو وہ اسلام و ایمان کے بغیر کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے، یہ مضمون ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، ابن جُریجؒ، ابن وہبؒ سے نقل کیا ہے اسی کا بیان اس آیت میں ہے۔

وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ، یعنی میں حضرت سلیمان اور اُن کے ارکان دولت کے پاس ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ جو قاصد یہ ہدیہ لیکر جائیں گے وہ واپس آکر کیا صورتِ حال بیان کرتے ہیں۔

بلقیس کے قاصدوں کی دربارِ سلیمانی میں حاضری

تاریخی اسرائیلی روایات میں بلقیس کی طرف سے آنیوالے قاصدوں اور تحفوں کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔ اتنی بات پر سب روایات متفق ہیں کہ تحفہ میں

کچھ سونے کی اینٹیں تھیں کچھ جواہرات اور ایک سو غلام اور ایک سو کنیزیں تھیں مگر کنیزوں کو مردانہ لباس میں اور غلاموں کو زنانہ لباس میں بھیجا تھا اور ساتھ ہی بلقیس کا ایک خط بھی تھا جس میں سلیمانؑ کے امتحان کے لئے کچھ سوالات بھی تھے، تحفوں کے انتخاب میں بھی ان کا امتحان مطلوب تھا۔ حضرت سلیمانؑ کو حق تعالیٰ نے اسکے تحفوں کی تفصیلات اُن کے پہنچنے سے پہلے بتلا دی تھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے جنّات کو حکم دیا کہ دربار سے نو فرسخ تقریباً تیس میل کی مسافت میں سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش کر دیا جائے اور راستہ میں دو طرفہ عجیب الخلقت جانوروں کو کھڑا کر دیا جائے جن کا بول و براز بھی سونے چاندی کے فرش پر ہو۔ اسی طرح اپنے دربار کو خاص اہتمام سے مزیّن فرمایا، دائیں بائیں چار چار ہزار سونے کی کرسیاں ایک طرف علماء کے لئے، دوسری طرف وزراء اور عمالِ سلطنت کے لئے بچھائی گئیں۔ جواہرات سے پورا ہال مزین کیا گیا۔ بلقیس کے قاصدوں نے جب سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو کھڑا دیکھا تو اپنے تحفہ سے شرما گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سونے کی اینٹیں وہیں ڈالدیں، پھر جُوں جُوں آگے بڑھتے گئے دو طرفہ وُحوش و طیور کی صفیں دیکھیں، پھر جنّات کی صفیں دیکھیں تو بیحد مرعوب ہو گئے مگر جب دربار تک پہنچے اور حضرت سلیمانؑ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ خندہ پیشانی سے پیش آئے، اُن کی مہمانی کا اکرام کیا مگر اُن کے تحفے واپس کر دیئے اور بلقیس کے سب سوالات کے جوابات دیئے۔ (ملخصاً از تفسیر قرطبی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدیۂ بلقیس کی واپسی

قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ، یعنی جب بلقیس کے قاصد اس کے ہدایا اور تحفے لیکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے قاصدوں ہی سے فرمایا کہ کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اللہ نے جو مال و دولت دیا ہے وہ تمہارے مال و سامان سے کہیں زیادہ بہتر ہے اسلئے میں یہ مال کا ہدیہ قبول نہیں کرتا اس کو واپس لیجاؤ اور اپنے ہدیہ پر تم ہی خوش رہو۔

کسی کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے یا نہیں اس کی تفصیل و تحقیق

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں یا بہتر نہیں۔ اور تحقیق اس مسئلے میں یہ ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنے میں اگر اپنی یا مسلمانوں کی کسی مصلحت میں خلل آتا ہو یا انکے حق میں رائے کی کمزوری پیدا ہوتی ہو تو انکا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں۔ (روح المعانی) ہاں اگر کوئی دینی مصلحت اس ہدیہ کے قبول کرنے کی داعی ہو، مثلاً اسکے ذریعہ کافر کے مانوس ہو کر اسلام سے قریب آنے پھر مسلمان ہو سکنے کی اُمید ہو یا اُسکے کسی شر و فساد کو اس کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہو تو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملے میں یہی رہی ہے کہ بعض کفار کا ہدیہ قبول فرمالیا، بعض کا رد کر دیا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب الہبۃ میں اور شرح سیر کبیر میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ براء کا بھائی عامر بن ملک مدینہ طیبہ میں کسی ضرورت سے پہنچا

جبکہ وہ مشرک کافر تھا، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو گھوڑے اور دو جوڑے کپڑے کا ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے اسکا ہدیہ یہ فرما کر واپس کر دیا کہ ہم مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔ اور عیاض بن حمار مجاشعی نے آپ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اُس سے سوال کیا کہ تم مسلمان ہو؟ اُسنے کہا کہ نہیں آپنے ان کا ہدیہ بھی یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے عطایا لینے سے منع فرمایا ہے اس کے بالمقابل یہ روایات بھی موجود ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین کے ہدایا قبول فرمائے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابو سفیان نے بحالتِ شرک آپ کو ایک چمڑا ہدیہ میں بھیجا آپنے قبول فرمالیا اور ایک نصرانی نے ایک ریشمی حریر کا بہت چمکتا ہوا کپڑا ہدیہ میں پیش کیا، آپنے قبول فرمالیا۔

شمس الائمہ رحؒ اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کا ہدیہ رد کر دینے میں اُسکے اسلام کی طرف مائل ہونیکی اُمید تھی وہاں رد کر دیا اور بعض کا ہدیہ قبول کرنے میں اسکے مسلمان ہوجانے کی اُمید تھی تو قبول کرلیا۔ (از عمدۃ القاری کتاب الہبۃ)

اور بلقیس نے جو رد ہدیہ کو نبی ہونے کی علامت قرار دیا اسکا سبب یہ نہ تھا کہ نبی کے لئے ہدیہ قبول کرنا مشرک کا جائز نہیں بلکہ سبب یہ تھا کہ اُسنے اپنا ہدیہ درحقیقت ایک رشوت کی حیثیت سے بھیجا تھا کہ اسکے ذریعہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حملے سے محفوظ رہے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

بولا اے دربار والو تم میں کوئی ہے کہ لے آوے میرے پاس اسکا تخت پہلے اس سے کہ وہ آئیں میرے پاس حکمبردار ہوکر

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ

بولا ایک دیو جنوں میں سے میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے کہ تو اُٹھے اپنی جگہ سے

وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ

اور میں اس پر زور آور ہوں معتبر بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا

میں لائے دیتا ہوں تیرے پاس اسکو پہلے اس سے کہ پھر آئے تیری طرف تیری آنکھ، پھر جب دیکھا اُسکو دھرا ہوا

عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڗ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ

اپنے پاس کہا یہ میرے رب کا فضل ہے میرے جانچنے کو کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو

شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ

کوئی شکر کرے سو شکر کرے اپنے واسطے اور جو کوئی ناشکری کرے سو میرا رب بے پرواہ ہے کرم والا کہا

نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے اسکے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں

خُلاصۂ تفسیر

(غرض وہ قاصد اپنے ہدایا لے کر واپس گیا اور سارا قصہ بلقیس سے بیان کیا تو حالات سے اسکو حضرت سُلیمان علیہ السلام کے علم اور نبوت کے کمالات کا یقین ہوگیا اور حاضر ہونے کے ارادہ سے اپنے ملک سے چلی) سلیمان (علیہ السلام کو وحی سے یا اور کسی پرندے وغیرہ کے ذریعہ اسکا چلنا معلوم ہوا تو انھوں) نے (اپنے درباروالوں سے) فرمایا کہ اے دربار والو تم میں کوئی ایسا ہے جو اُس (بلقیس) کا تخت پہلے اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہو کر آویں حاضر کر دے (مسلمین کی قید اظہار واقعہ کے لئے ہے کیونکہ وہ لوگ اسی قصد سے آرہے تھے تخت کا منگانا غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ میرا معجزہ بھی دیکھ لیں کیونکہ اتنا بڑا تخت اور پھر اسکا ایسے سخت پہروں میں اس طور پر اچانک آجانا کہ اطلاع تک نہ ہو عادتِ بشریہ سے باہر ہے اگر جنوں کی تسخیر یعنی تابع ہونے سے ہو تب بھی جنوں کا خود بخود تابع ہو جانا بھی ایک معجزہ ہی ہے اور اگر کسی ولیِ اُمت کی کرامت کے ذریعہ ہے تو ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور اگر بغیر کسی واسطہ کے ہے تو پھر معجزہ ہونا ظاہر ہے۔ بہرحال ہر طور پر یہ معجزہ اور نبوت کی دلیل ہے لہٰذا مقصود یہ ہوگا کہ اندرونی کمالات کیساتھ ساتھ یہ معجزہ کے کمالات بھی دیکھ لیں تاکہ ایمان واطمینان زیادہ ہو) ایک قوی ہیکل جن نے جواب (میں) عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا پہلے اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اُٹھیں اور (گو وہ بہت بھاری ہے مگر) میں اس (کے لانے) پر طاقت رکھتا ہوں (اور گو بڑا قیمتی اور موتیوں سے مزیّن ہے مگر میں) امانت دار (بھی) ہوں (اس میں کوئی خیانت نہ کرونگا) جسکے پاس کتاب (الٰہی یعنی تورات کا یا اور وحی کی ہوئی کسی کتاب کا جس میں اللہ کے ناموں کی تاثیرات ہوں اُس) کا علم تھا (اقرب یہ ہے کہ اس سے خود سلیمان علیہ السلام مُراد ہیں غرض) اُس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ (بس تجھ میں تو اتنی ہی قوت ہے اور) میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لاکھڑا کر سکتا ہوں (کیونکہ معجزہ کی طاقت سے لاؤں گا، چنانچہ آپ نے حق تعالیٰ سے دُعا کی ویسے ہی یا کسی اسمِ الٰہی کے ذریعہ سے اور تخت فوراً سامنے آموجود ہوا) جب سلیمان (علیہ السلام) نے اس کو اپنے روبرو رکھا دیکھا تو (خوش ہو کر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے (کہ میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر کیا) تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے (وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میرا رب غنی ہے کریم ہے (اس کے بعد) سلیمان (علیہ السلام) نے (بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے) حکم دیا کہ اس (کی عقل آزمانے) کے

لئے اسکے تخت کی صورت بدل دو (جس کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں مثلاً موتیوں کی جگہیں بدل دو یا کسی اور طرح) ہم دیکھیں اس کو اسکا پتہ لگتا ہے یا اُسکا اُنھیں میں شمار ہے جن کو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگتا (پہلی صورت میں معلوم ہوگا کہ وہ عقلمند ہے اور عقلمند سے حق بات سمجھنے کی زیادہ اُمید ہے اور اسکے حق کو پہچاننے کا اثر دُور تک بھی پہنچیگا اور دوسری صورت میں اس سے حق پہچاننے کی اُمید کم ہے)۔

معارف و مسائل

بلقیس کی حاضری دربارِ سلیمانی میں قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلقیس کے قاصد خود بھی مرعوب و مبہوت ہو کر واپس ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اعلانِ جنگ سُنا دیا تو بلقیس نے اپنی قوم سے کہا کہ پہلے بھی میرا یہی خیال تھا کہ سلیمان دُنیا کے بادشاہوں کی طرح بادشاہ نہیں بلکہ اللہ کیطرف سے کوئی خاص منصب بھی ان کو ملا ہے اور اللہ کے نبی و رسول سے لڑنا اللہ کا مقابلہ ہے، جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کی تیاری شروع کر دی۔ بارہ ہزار سرداروں کو اپنے ساتھ لیا جن کے تحت ایک ایک لاکھ افواج تھیں[1] حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا کہ اُن کی مجلس میں کوئی ابتداءً گفتگو کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام نے دُور سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا تو حاضرین سے سوال کیا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: اے نبی اللہ! ملکہ بلقیس اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرہی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ اسوقت وہ دربارِ سُلیمانی سے ایک فرسخ یعنی تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اُسوقت حضرت سُلیمان علیہ السلام نے اپنے جنود و عساکر کو مخاطب کرکے فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ أَيُّكُمْ يَأْتِينِى بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَن يَأْتُونِى مُسْلِمِينَ، حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بلقیس ان کی دعوت سے متاثر ہونے کی بناء پر مطیع بن کر آرہی ہے۔ تو ارادہ فرمایا کہ وہ شاہانہ قوت و شوکت کے ساتھ ایک پیغمبرانہ معجزہ بھی دیکھ لے تو اُس کے ایمان لانے کے لئے زیادہ معین ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تسخیرِ جنّات کا عام معجزہ عطا فرمایا ہوا تھا شاید حق تعالیٰ کیطرف سے اشارہ پاکر انھوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ کسی طرح بلقیس کا تختِ شاہی اُسکے یہاں پہنچنے سے پہلے حاضر ہوجائے اسلئے حاضرین کو جن میں جنّات بھی تھے خطاب فرما کر یہ تخت لانے کیلئے فرمادیا اور اسکے تمام اموال و دولت میں تختِ شاہی کا انتخاب بھی شاید اسلئے کیا گیا کہ وہ اسکی سب سے زیادہ محفوظ چیز تھی جس کو سات محلات شاہی کے وسط میں ایک محفوظ محل کے اندر مقفل کرکے رکھا تھا کہ اسکے اپنے آدمیوں کا بھی وہاں تک گزر نہ تھا۔ اُس کا بغیر دروازہ یا قفل توڑے ہوئے منتقل ہوجانا اور اتنی مسافتِ بعیدہ پر پہنچ جانا حق تعالیٰ

[1] حضرت مصنف رحؒ نے پہلے ہی فرمادیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات پ۱۹ ہیں، جن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، خاص طور سے یہ روایت بعید از عقل اور علامہ آلوسیؒ کے فرمانے کے مطابق جھوٹ سے زیادہ قریب ہے۔ محمد تقی۔ ۱/ ۱/ ۲۳ھ

شانہ کی ہی قدرتِ کاملہ سے ہو سکتا ہے یہ اس کو حق تعالیٰ شانہ کی قدرت عظیمہ پر یقین کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتا تھا اُس کیساتھ اس پر بھی یقین لازم تھا کہ سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ ہی کیطرف سے کوئی خاص منصب حاصل ہو کہ انکے ہاتھ پر ایسی فوق العادت چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں (ذکرہ و اختارہ ابن جریر)

قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ، مُسْلِمِیْنَ، مُسْلِمْ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی مطیع و فرمانبردار کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں مؤمن کو مسلم کہا جاتا ہے۔ یہاں بقول ابن عباسؓ اسکے لغوی معنے مراد ہیں، یعنی مطیع و فرمانبردار۔ کیونکہ ملکہ بلقیس کا اسلام لانا اسوقت ثابت نہیں بلکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہونے اور کچھ گفتگو کر لینے کے بعد مسلمان ہوئی ہے جیساکہ خود قرآن کریم کے آنیوالے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ، یعنی کہا اُس شخص نے جس کے پاس علم تھا کتاب میں سے۔ یہ کون شخص تھا؟ اسکے متعلق ایک احتمال تو وہی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم انہیں کو حاصل تھا۔ اس صورت میں یہ سارا معاملہ بطور معجزہ کے ہوا اور یہی مقصود تھا کہ بلقیس کو پیغمبرانہ اعجاز کا مشاہدہ ہو جائے اور کوئی اشکال اس معاملے میں نہ رہے۔ مگر اکثر ائمۂ تفسیر قتادہ وغیرہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے اور قرطبی نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے کہ یہ کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھا۔ ابن اسحٰق نے اسکا نام آصف بن برخیا بتلایا ہے اور یہ کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دوست تھا۔ اور بعض روایات کے اعتبار سے اُن کا خالہ زاد بھائی بھی تھا جس کو اسم اعظم کا علم تھا جسکا خاصہ یہ ہے کہ اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دُعا کیجائے قبول ہوتی ہے اور جو کچھ مانگا جائے اللہ کیطرف سے عطا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسم اعظم کا علم نہیں تھا کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصلحت اسمیں دیکھی ہو کہ یہ عظیم کارنامہ ان کی اُمّت کے کسی آدمی کے ذریعہ ظاہر ہو جس سے بلقیس پر اور زیادہ اثر پڑے اسلئے بجائے خود یہ عمل کرنے کے اپنے اصحاب کو خطاب فرمایا اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ (کذا فی فصوص الحکم) اس صورت میں یہ واقعہ آصف بن برخیا کی کرامت ہوگی۔

معجزہ اور کرامت میں فرق حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جیساکہ قرآن کریم میں فرمایا ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی، اسی طرح کرامت میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارقِ عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے غیر نبی کے ذریعہ اسکا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔ اس واقعہ میں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے آصف

بن برخیا کے ذریعہ ہوا تو یہ اُن کی کرامت کہلائے گی اور ہر ولی کے کمالات چونکہ انکے رسُول و پیغمبر کے کمالات کا عکس اور اُنہی سے مستفاد ہوتے ہیں اسلئے اُمت کے اولیاء اللہ کے ہاتھوں جتنی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے یہ سب رسول کے معجزات میں شمار ہوتے ہیں۔

تخت بلقیس کا واقعہ کرامت تھی یا تصرف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اسکو آصف بن برخیا کا تصرف قرار دیا ہے۔ تصرف اصطلاح میں خیال و نظر کی طاقت استعمال کر کے حیرت انگیز کام صادر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے لئے نبی یا ولی بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، وہ مسمریزم جیسا ایک عمل ہے صوفیائے کرام نے اصلاح مریدین کے لئے کبھی کبھی اس کو استعمال کیا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ تصرف کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اسلئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام آصف بن برخیا سے لیا۔ مگر قرآن کریم نے اس تصرف کو عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کا نتیجہ بتلایا ہے اس سے ترجیح اسکو ہی ہوتی ہے کہ یہ کسی دُعا یا اسم اعظم کا اثر تھا جسکا تصرف سے کوئی واسطہ نہیں، وہ کرامت ہی کے مفہوم میں داخل ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ان کا یہ کہنا کہ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ، یعنی میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے لا دونگا۔ یہ علامت اس کی ہے کہ یہ کام اُن کے قصد و اختیار سے ہوا جو علامت تصرف کی ہے کیونکہ کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی تو اسکا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اطلاع کر دی ہو کہ تم ارادہ کرو گے تو ہم یہ کام اتنی جلدی کر دیں گے۔ یہ تقریر حضرت سیدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو احکام القرآن میں سورۂ نمل کی تفسیر لکھنے کے وقت حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ اور تصرف کی حقیقت اور اُسکے احکام پر حضرتؒ کا ایک مستقل رسالہ بنام التصرف عربی زبان میں تھا جسکا اردو ترجمہ احقر نے لکھا تھا وہ جداگانہ شائع ہوچکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا

پھر جب وہ آپہنچی کسی نے کہا کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت بولی گویا یہ وہی ہے اور ہم کو معلوم

الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ

ہوچکا پہلے سے اور ہم ہوچکے حکم بردار اور روک دیا اس کو ان چیزوں سے جو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا

پوجتی تھی اللہ کے سوائے البتہ وہ تھی منکر لوگوں میں کسی نے کہا اس

ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ

عورت کو اندر چل محل میں پھر جب دیکھا اس کو خیال کیا کہ وہ پانی ہے گہرا اور کھولیں اپنی پنڈلیاں

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ڛ قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ

کہا یہ تو ایک محل ہے جڑے ہوئے ہیں اسمیں شیشے بولی اے رب میں نے بُرا کیا ہے

نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾

اپنی جان کا اور میں حکم بردار ہوئی ساتھ سلیمان کے اللہ کے آگے جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے یہ سب سامان کر رکھا تھا، پھر بلقیس پہنچی) سو جب بلقیس آئی تو اس سے (تخت دکھا کر) کہا گیا (خواہ سلیمان علیہ السلام نے خود کہا ہو یا کسی سے کہلوایا ہو) کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو ویسا ہی (بلقیس سے اس طور پر اسلئے سوال کیا کہ ہیئت تو بدل دی گئی تھی اپنی اصل کے اعتبار سے تو وہی تخت تھا اور صورت وہ نہ تھی۔ اسلئے یوں نہیں کہا کہ کیا یہی تمہارا تخت ہے بلکہ یہ کہا کہ ایسا ہی تمہارا تخت ہے اور بلقیس اسکو پہچان گئی اور اسکے بدل دینے کو بھی سمجھ گئی اسلئے جواب بھی مطابق سوال کے دیا) اور (یہ بھی کہا کہ) ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی (آپ کی نبوت کی) تحقیق ہو چکی ہے اور ہم (اُسی وقت سے دل سے) مطیع ہو چکے ہیں (جب قاصد سے آپ کے کمالات معلوم ہوئے تھے اس معجزہ کی چنداں حاجت نہ تھی) اور (چونکہ اس معجزہ سے قبل تصدیق و اعتقاد کر لینا کمالِ عقل کی دلیل ہے اسلئے اللہ تعالیٰ اسکے عاقل ہونے کی تقریر فرماتے ہیں کہ فی الواقع وہ تھی سمجھدار مگر چند روز تک جو ایمان نہ لائی تو وجہ اسکی یہ ہے کہ) اس کو (ایمان لانے سے) غیر اللہ کی عبادت نے (جکی اس کو عادت تھی) روک رکھا تھا (اور وہ عادت اسلئے پڑ گئی تھی کہ) وہ کافر قوم میں کی تھی (پس جو سب کو دیکھا وہی آپ کرنے لگی اور قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں مگر چونکہ عاقل تھی اسلئے جب تنبیہ کی گئی تو سمجھ گئی۔ اسکے بعد سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ علاوہ اعجاز و شانِ نبوت دکھلانے کے اس کو ظاہری شانِ سلطنت بھی دکھلا دی جائے تاکہ اپنے کو دُنیا کے اعتبار سے بھی عظیم نہ سمجھے اسلئے ایک شیش محل بنوا کر اسکے صحن میں حوض بنوایا اور اس میں پانی اور مچھلیاں بھر کر اسکو شیشہ سے پاٹ دیا۔ اور شیشہ ایسا شفاف تھا کہ ظاہر نظر میں نظر نہ آتا تھا اور وہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اس محل میں جانیوالے کو لامحالہ اُس پر سے عبور کرنا پڑے۔ چنانچہ اس تمام سامان کے بعد) بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (ممکن ہے وہی محل قیام کے لئے تجویز کیا ہو، غرض وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اسکا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (چونکہ قرینہ سے پایاب گمان کیا اس لئے اسکے اندر گھسنے کے لئے دامن اُٹھائے اور) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اُسوقت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے۔ دامن اُٹھانے کی ضرورت نہیں اسوقت) بلقیس (کو معلوم ہو گیا کہ یہاں پر دُنیوی صنعت کاری کے عجائب بھی ایسے ہیں جو آج تک میں نے آنکھ سے نہیں دیکھے تو اُن کے دل میں

ہر طرح سے سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی اور بے ساختہ) کہنے لگی کہ اے میرے پروردگار میں نے (اب تک اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں (اب) سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی ان کے طریق پر) ہو کر رب العالمین پر ایمان لائی۔

معارف و مسائل

کیا بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی تھیں آیاتِ مذکورہ میں بلقیس کا واقعہ اسی پر ختم ہو گیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گئی۔ اسکے بعد کیا حالات پیش آئے؟ قرآن کریم نے اس سے سکوت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے جب عبداللہ ابن عُیَیْنہ سے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ اس کا معاملہ اس پر ختم ہو گیا اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ مطلب یہ تھا کہ قرآن نے یہیں تک اس کا حال بیان کیا ہے اسکے بعد کا حال بتلانا قرآن نے چھوڑ دیا تو ہمیں بھی اسکی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ابن عساکر نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ اسکے بعد بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی اور اسکو اسکے ملک پر برقرار رکھ کر یمن واپس بھیجدیا۔ ہر مہینے حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں تشریف لیجاتے اور تین روز قیام فرماتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسکے لئے یمن میں تین عمدہ محلات ایسے تیار کرا دیئے تھے جس کی مثال و نظیر نہیں تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف اُنکے بھائی صالح کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو

فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ

فرقے ہو کر لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے

الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا

بھلائی سے کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے بولے ہم نے منحوس

بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بُری قسمت اللہ کے پاس ہے، کچھ نہیں تم لوگ جانچے جاتے ہو

وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا

اور تھے اُس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور

يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ

اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اُس پر اور اسکے گھر پر، پھر کہدیں گے

لَوَلِیِّہٖ مَا شَہِدْنَا مَہْلِكَ اَہْلِہٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا

اسکے دعوی کرنے والے کو، ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اسکا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں اور انھوں نے بنایا ایک

وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّہُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَۃُ

فریب اور ہم نے بنایا ایک فریب اور اُن کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام اُن کے

مَكْرِہِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰہُمْ وَقَوْمَہُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُیُوْتُہُمْ

فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے اُن کو اور اُن کی قوم کو سب کو سو یہ پڑے ہیں اُن کے گھر

خَاوِیَۃًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ

ڈھیر ہوئے بسبب اُن کے انکار کے البتہ اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں اور

اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

بچا دیا ہم نے اُن کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس انکے (برادری کے) بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا (یہ پیغام دیکر) کہ تم (شرک کو چھوڑ کر) اللہ کی عبادت کرو (چاہیئے تو یہ تھا کہ سب ایمان لے آتے مگر خلاف توقع) اچانک ان میں دو فریق ہوگئے جو دین کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے (یعنی ایک فرقہ تو ایمان لایا اور ایک نہ لایا اور ان میں جو جھگڑا اور کلام ہوا بعض اس میں کا سورۂ اعراف میں مذکور ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا اور بعض یہیں آگے مذکور ہے قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ الخ اور جب ان لوگوں نے کفر پر اصرار کیا تو صالح علیہ السلام نے موافق عادت انبیاء علیہم السلام کے ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسا سورۂ اعراف میں ہے فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ، تو انھوں نے کہا کہ لاؤ وہ عذاب کہاں ہے جیسا سورۂ اعراف میں ہے قَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اس پر) صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ارے بھائیو تم نیک کام (یعنی توبہ و ایمان) سے پہلے عذاب کیوں جلدی مانگتے ہو (یعنی چاہیئے تو یہ تھا کہ عذاب کی وعید سُن کر ایمان لے آتے نہ یہ کہ ایمان تو نہ لائے اور بالعکس اس عذاب ہی کی درخواست کرنے لگے بڑی بیباکی کی بات ہے۔ بجائے اس استعجالِ عذاب کے) تم لوگ اللہ کے سامنے (کفر سے) معافی کیوں نہیں چاہتے جس سے توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جاوے (یعنی عذاب سے محفوظ رہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو اور تمھارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں (کہ جب سے تم نے یہ مذہب نکالا ہے اور تمھاری یہ جماعت پیدا ہوئی ہے قوم میں نااتفاقی ہوگئی اور نااتفاقی کی جو مضرتیں اور خرابیاں ہوتی ہیں وہ سب مرتب ہونے لگیں پس سبب ان تمام خرابیوں کے تم لوگ ہو) صالح (علیہ السلام)

نے (جواب میں) فرمایا کہ تمہاری (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی تمہارا اعمال کفریہ اللہ کو معلوم ہیں یہ خرابیاں ان ہی اعمال پر مرتب ہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ نا اتفاقی مذموم وہی ہے جو حق کے خلاف کرنے سے ہو تو اسکا الزام ایمان والوں پر نہیں ہو سکتا بلکہ اہل کفر پر ہوگا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ اُن پر قحط ہوا تھا اور تمہارے کفر کی مضرت کچھ ان شرور ہی تک ختم نہیں ہوئی) بلکہ تم وہ لوگ ہو کہ (اس کفر کی بدولت) عذاب میں مبتلا ہو گئے اور (یوں تو کافر اس قوم میں بہت تھے لیکن سرغنہ) اس بستی (یعنی حجر) میں نو شخص تھے جو سرزمین (یعنی بستی سے باہر تک بھی) فساد کیا کرتے تھے اور (ذرا) اصلاح نہ کرتے تھے (یعنی بعضے مفسد ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ فساد کیا کچھ اصلاح کر لی مگر وہ ایسے نہ تھے بلکہ خالص مفسد تھے چنانچہ ایک بار یہ فساد کیا کہ) انھوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ آپس میں سب (اس پر) اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم شب کے وقت صالح اور ان کے متعلقین (یعنی ایمان والوں) کو جا ماریں گے پھر (اگر تحقیق کی نوبت آئی تو) ہم اُن کے وارث سے (جو خون کا دعویٰ کریگا) کہدیں گے کہ ان کے متعلقین کے (اور خود ان کے) مارے جانے میں موجود (بھی) نہ تھے (مارنا تو درکنار) اور (تاکید کے لئے یہ بھی کہدیں گے کہ) ہم بالکل سچے ہیں۔ (اور گواہ کوئی معائنہ کا ہوگا نہیں۔ بس بات دب دبا جاوے گی) اور (یہ مشورہ کر کے) انھوں نے ایک خفیہ تدبیر کی (کہ شب کے وقت اس کارروائی کے لئے چلے) اور ایک خفیہ تدبیر ہمنے کی اور اُن کو خبر بھی نہ ہوئی (وہ یہ کہ ایک پہاڑ پر سے ایک پتھر اُن پر لڑھک آیا اور وہ سب وہاں ہی کھیت رہے یعنی ہلاک ہوئے۔ کذافی الدر المنثور) سو دیکھیے انکی شرارت کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو (بطریق مذکور) اور (پھر) ان کی (باقی) قوم کو (آسمانی عذاب سے) سب کو غارت کر دیا (جسکا قصہ دوسری آیات میں ہے فَعَقَرُوا النَّاقَةَ الیٰ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ) سو یہ اُنکے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں انکے کفر کے سبب سے (جو اہل مکہ کو ملک شام کے سفر میں ملتے ہیں) بلا شبہ اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے دانشمندوں کے لئے اور ہم نے ایمان اور تقویٰ والوں کو (اس قتل سے بھی جسکا مشورہ ہوا تھا اور عذابِ قہری سے بھی) نجات دی۔

معارف و مسائل

تِسْعَةُ رَهْطٍ لفظ رھط، جماعت کے معنے میں آتا ہے، یہاں نو اشخاص میں سے ہر شخص کو رھط کے لفظ سے شاید اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے مال و دولت اور جاہ و حشم کے سبب قوم کے بڑے مانے جاتے تھے اور ہر ایک کیساتھ الگ الگ جماعتیں تھیں اس لئے ان نو آدمیوں کو نو جماعتیں فرمایا۔ یہ لوگ قوم صالح علیہ السلام کی بستی یعنی حجر کے بڑے مانے جاتے تھے۔ حجر ملک شام میں معروف مقام ہے۔ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ،

مطلب یہ تھا کہ ہم سب مل کر رات کے اندھیرے میں ان پر اور ان کے متعلقین پر چھاپہ ماریں، سب کو ہلاک کر دیں، پھر انکے خون کا دعویدار وارث تحقیق و تفتیش کے لئے کھڑا ہوگا تو ہم یہ کہدیں گے کہ ہم نے تو فلاں آدمی کو نہ مارا، نہ مارتے کسی کو دیکھا۔ اور ہم اپنے اس قول میں اسلئے سچے ہونگے کہ رات کے اندھیرے میں یہ تعیین کہ کس نے کس کو مارا ہمیں معلوم نہیں ہوگی۔

اس میں ایک بات یہ قابلِ نظر ہے کہ یہ کفار اور ان میں سے بھی چیدہ بدمعاش جو فساد میں معروف تھے یہ سارے کام شرک کفر اور قتل و غارتگری کے کر رہے ہیں اور کوئی فکر نہیں، مگر ان کو بھی یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہم جھوٹ نہ بولیں یا جھوٹے قرار نہ دیئے جاویں۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ جھوٹ کیسا بڑا گناہ ہے، کہ سارے بڑے بڑے جرائم کے مرتکب بھی اپنی شرافتِ نفس اور عزت کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے پر اقدام نہ کرتے تھے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ قابلِ غور ہے کہ جس شخص کو ان لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا ولی قرار دیا ہے وہ تو انہی اہلِ صالح میں شامل تھا اس کو قتل کے ارادہ سے کیوں چھوڑ دیا۔ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ ولی خاندانی اعتبار سے ولی ہو مگر کافر ہو کافروں کیساتھ ملا ہوا ہو صالح علیہ السلام اور اُن کے متعلقین کے قتل کے بعد وہ ان کے خون کا دعویٰ اپنے نسبی تعلق کی بنا پر کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہی ہو مگر کوئی بڑا آدمی ہو جس کے قتل کرنے سے اپنی قوم میں اختلاف و انتشار کا خطرہ ہو اسلئے اسکو چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۵۴

اور لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو بے حیائی اور تم دیکھتے ہو

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر للچاکر عورتوں کو چھوڑ کر کوئی نہیں تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ۝۵۵ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا

بے سمجھ ہو پھر اور کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ کہتے تھے نکال دو

اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝۵۶ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ

لوط کے گھر کو اپنے شہر سے یہ لوگ ہیں ستھرے رہا چاہتے پھر بچا دیا ہم نے اسکو اور

اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۵۷ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ

اسکے گھر والوں کو، مگر اس کی عورت مقرر کر دیا تھا ہم نے اسکو رہ جانے والوں میں اور برسا دیا ہم نے اُن پر

مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۵۸ ع قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ

برساؤ پھر کیا برا برساؤ تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا تو کہہ تعریف ہے اللہ کو اور سلام ہے

ع ۴ / ۱۴ / ۱۹

عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی ؕ آٰللّٰہُ خَیۡرٌ اَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۵۹﴾

اس کے بندوں پر جن کو اُس نے پسند کیا بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو وہ شریک کرتے ہیں

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (پیغمبر کر کے اُن کی قوم کے پاس) بھیجا تھا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو حالانکہ سمجھدار ہو (کیا اس کی بُرائی نہیں سمجھتے، آگے اُس بے حیائی کا بیان ہے یعنی) کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اسکی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی) بلکہ (اس معاملے میں) تم (محض) جہالت کر رہے ہو (اس تقریر کا) اُن کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اسکے کہ آپس میں کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو (یعنی ان پر ایمان لانیوالوں کو مع ان کے) تم اپنی بستی سے نکالدو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں سو (جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی تو) ہمنے (اُس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (اس عذاب سے) بچالیا بجز اُن کی بیوی کے کہ اس کو (بوجہ ایمان نہ لانیکے) ہمنے انہیں لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جو اُن پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے اُنپر ایک نئی طرح کا مینھ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو اُن لوگوں کا کیسا بُرا مینھ تھا جو (اول عذاب خدا سے) ڈرائے گئے تھے (جس پر انہوں نے التفات نہ کیا) آپ (بیانِ توحید کے لئے بطور خطبہ کے) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام (نازل) ہو جن کو اُس نے منتخب فرمایا ہے (یعنی انبیاء و صلحاء۔ آگے مضمون ہماری طرف سے بیان کیجئے وہ یہ کہ لوگو یہ بتلاؤ کہ) کیا (کمالات اور احسانات میں) اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں (بہتر ہیں) جن کو (الوہیت میں) شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی ظاہر اور مسلّم ہے کہ اللہ ہی بہتر ہے پس مستحق عبادت بھی وہی ہوگا)۔

معارف و مسائل

اس قصّے کے متعلق قرآن میں متعدد جگہ خصوصاً سورۂ اعراف میں ضروری مضامین بیان ہوچکے ہیں وہاں دیکھ لئے جاویں۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ، انبیاء سابقین اور اُن کی اُمتوں کے کچھ حالات اور اُن پر عذاب آنے کے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ آپ کی اُمت کو دُنیا کے عذابِ عام سے مامون کردیا گیا ہے۔ اور انبیاء سابقین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں پر سلام بھیجئے، جمہور مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور بعض نے اسکا مخاطب بھی حضرت لُوط علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ اس آیت میں اَلَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی کے الفاظ سے ظاہر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مراد ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے صحابۂ کرام ہیں۔ سُفیان ثوری نے اسی کو اختیار کیا ہے (اخرجہ عبد بن حمید والبزار وابن جریر وغیرہم)

اگر آیت میں اَلَّذِيْنَ اصْطَفٰى سے مراد صحابۂ کرام لئے جائیں جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے تو اس آیت سے غیر انبیاء پر سلام بھیجنے کے لئے اُنھیں علیہ السلام کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق سورۂ احزاب میں آیت صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا کی تفسیر میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ: اس آیت سے خطبہ کے آداب بھی ثابت ہوئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور انبیاء علیہم السلام پر درود و سلام سے شروع ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تمام خطبات میں یہی معمول رہا ہے بلکہ ہر اہم کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام مسنون و مستحب ہے۔ (کذا فی الروح)

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا

بھلا کس نے بنائے آسمان اور زمین اور اُتار دیا تمہارے لئے آسمان سے پانی پھر اُگائے ہم نے

بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۭ ءَاِلٰهٌ

اس سے باغ رونق والے تمہارا کام نہ تھا کہ اُگاتے اُن کے درخت اب کوئی اور

مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا

حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کے لائق

وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ

اور بنائیں اسکے بیچ میں ندیاں اور رکھے اس کے ٹھہرانے کو بوجھ اور رکھا دو

الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾

دریا میں پردہ اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ کوئی نہیں بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ

بھلا کون پہنچتا ہے بے کس کی پکار کو جب اسکو پکارتا ہے اور دُور کر دیتا ہے سختی اور کرتا ہے تمکو نائب

خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ

اگلوں کا زمین پر اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تم بہت کم دھیان کرتے ہو بھلا کون

يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ

راہ بتاتا ہے تم کو اندھیروں میں جنگل کے اور دریا کے اور کون چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اسکی

يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ

رحمت سے پہلے اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ اللہ بہت اوپر ہے اس سے جسکو شریک بتلاتے ہیں بھلا

يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ

کون سرے سے بناتا ہے پھر اس کو دُہرائے گا اور کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تو کہہ لاؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو

خلاصۂ تفسیر

(پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ، یعنی کیا اللہ بہتر ہے یا وہ بت وغیرہ جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، یہ مشرکین کی بے وقوفی بلکہ کج فہمی پر نکیر تھی، آگے توحید کے دلائل کا بیان ہے، اے لوگو یہ بتلاؤ کہ) وہ ذات (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اُس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اسکے ذریعہ ہم نے رونق دار باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم اُن (باغوں) کے درختوں کو اُگا سکو (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ (دوسروں کو خدا کی برابر ٹھہراتے ہیں (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جس نے زمین کو (مخلوق کی) قرارگاہ بنایا اور اسکے درمیان درمیان نہریں بنائیں اور اس (زمین) کے (ٹھہرانے کے) لئے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان حدِ فاصل بنائی (جیسا سورۂ فرقان میں مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ آچکا ہے یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (خدائی کا شریک ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ اُن میں زیادہ تو (اچھی طرح) سمجھتے بھی نہیں (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی دُعا سنتا ہے جب وہ اُس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) مصیبت کو دُور کر دیتا ہے اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر) تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سُوجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو (بارش کی اُمید دلا کر دلوں کو) خوش کر دیتی ہیں (یہ سُنکر اب بتلاؤ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے برتر ہے (اچھا پھر دوسرے کمالات و احسانات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو مخلوقات کو اوّل بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا کر دیگا اور جو آسمان اور زمین سے (پانی برساکر اور نباتات نکالکر) تم کو رزق دیتا ہے (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (اور اگر وہ یہ سُنکر بھی کہیں کہ ہاں اور معبود بھی مستحقِ عبادت ہیں تو) آپ کہیئے کہ (اچھا) تم (اُن کے استحقاقِ عبادت پر) اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اس دعوی میں) سچے ہو۔

معارف و مسائل

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ، اَلْمُضْطَرُّ، اضطرار سے مشتق ہے کسی ضرورت سے مجبور و بے قرار ہونے کو اضطرار کہا جاتا ہے اور وہ جبھی ہوتا ہے جب اسکا کوئی یار و مددگار اور سہارا نہ ہو۔ اسلئے مضطر وہ شخص ہے جو سب دُنیا کے سہاروں سے مایوس ہو کر خالص اللہ تعالیٰ ہی کو فریاد رس سمجھ کر اسکی طرف متوجہ ہو۔ مضطر کی یہ تفسیر سُدی، ذوالنون مصری، سہل بن عبداللہ وغیرہ سے منقول ہے (قرطبی) رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ان الفاظ سے دُعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْا فَلَا تَكِلْنِیْٓ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَّاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ (ترجمہ) یا اللہ میں تیری رحمت کا اُمیدوار ہوں اسلئے مجھے ایک لحظہ کے لئے بھی میرے اپنے نفس کے حوالہ نہ کیجئے اور آپ ہی میرے سب کاموں کو درست کر دیجئے آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (قرطبی)

مضطر کی دُعا اخلاص کی بنا پر ضرور قبول ہوتی ہے امام قرطبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دُعا قبول کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور اس آیت میں اسکا اعلان بھی فرما دیا ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے سب سہاروں سے مایوس اور علائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کارساز سمجھ کر دُعا کرنا سرمایۂ اخلاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاص کا بڑا درجہ ہے وہ جس کسی بندہ سے پایا جائے وہ مؤمن ہو یا کافر، اور متقی ہو یا فاسق فاجر اسکے اخلاص کی برکت سے اسکی طرف رحمتِ حق متوجہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے کفار کا حال ذکر فرمایا ہے کہ جب یہ لوگ دریا میں ہوتے ہیں اور کشتی سب طرف سے موجوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور یہ گویا آنکھوں کے سامنے اپنی موت کو کھڑا دیکھ لیتے ہیں اسوقت یہ لوگ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں کہ اگر ہمیں اس مصیبت سے آپ نجات دیدیں تو ہم شکر گزار ہونگے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کی دُعا قبول کر کے خشکی پر لے آتے ہیں تو یہ پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (الیٰ قولہ) فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ، ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین دُعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، ایک مظلوم کی دُعا، دوسرے مسافر کی دُعا، تیسرے باپ جو اپنی اولاد کے لئے بد دُعا کرے۔ قرطبی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا کہ ان تینوں دُعاؤں میں بھی وہی صورت ہے جو دُعائے مضطر میں اوپر لکھی گئی ہے کہ جب کوئی مظلوم دُنیا کے سہاروں اور مددگاروں سے مایوس ہو کر دفع ظلم کے لئے اللہ کو پکارتا ہے وہ بھی مضطر ہی ہوتا ہے اسی طرح مسافر حالتِ سفر میں اپنے خویش و عزیز اور ہمدردوں غمگساروں سے الگ بے سہارا ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ اولاد کے لئے اپنی فطرت اور پدری شفقت کی بنا پر کبھی بد دعا نہیں کر سکتا بجز اسکے کہ اسکا

دل بالکل ٹوٹ جائے اور اپنے آپ کو مصیبت سے بچانے کے لئے اللہ کو پکارے۔ امام حدیث آجری نے حضرت ابوذر رضؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ میں مظلوم کی دُعا کو کبھی رَد نہیں کرونگا اگرچہ وہ کسی کافر کے منھ سے ہو (قرطبی) اگر کسی مضطر یا مظلوم یا مسافر وغیرہ کو کبھی یہ محسوس ہو کہ اسکی دعا قبول نہیں ہوئی تو بدگمان اور مایوس نہ ہو بعض اوقات دُعا قبول تو ہو جاتی ہے مگر کسی حکمت و مصلحت ربانی سے اسکا ظہور دیر میں ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اپنے نفس کو ٹٹولے کہ اسکے اخلاص اور توجہ الی اللہ میں کمی کوتاہی رہی ہے۔ واللہ اعلم

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَ

تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ اور

مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

اُن کو خبر نہیں کب جِلائے جائیں گے بلکہ تھک کر گر گیا اُن کا فکر آخرت کے بارے میں

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں اور بولے وہ لوگ جو

كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ

منکر ہیں کیا جب ہم ہو جائیں مٹی اور ہمارے باپ دادے کیا ہم کو زمین سے نکالیں گے وعدہ

وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ

پہنچ چکا ہے اسکا ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اگلوں کی تو کہدے پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام کار

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا

گنہگاروں کا اور غم نہ کر ان پر اور نہ خفا ہو ان کے فریب

يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾

بنانے سے اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ

تو کہہ کیا بعید ہے جو تمہاری پیٹھ پر پہنچ چکی ہو بعضی وہ چیز جس کی جلدی کر رہے ہو اور

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

تیرا رب تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر پر اُن میں بہت لوگ شکر نہیں کرتے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَمَا مِنْ
اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے اُن کے سینوں میں اور جو کچھ کہ ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز
غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾
نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں

خُلاصۂ تفسیر

ربط آیات | اُوپر نبوت کے بعد توحید کا ذکر ہو چکا، آگے معاد یعنی قیامت اور آخرت کا ذکر ہے جس کی طرف دلائل توحید میں اس قول سے اجمالی اشارہ بھی ہوا ہے (ثُمَّ يُعِيْدُهٗ) اور چونکہ کفار اس کی تکذیب کی ایک وجہ یہ بھی قرار دیتے تھے کہ قیامت کا معین وقت پوچھنے پر بھی نہیں بتلایا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یعنی وہ عدم تعیین کو عدم وقوع کی دلیل بناتے تھے اسلئے اس مضمون کو اس بات سے شروع کیا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے فرمایا قُلْ لَّا يَعْلَمُ الخ (جس میں اُن کے شبہ کا جواب بھی ہو گیا) قیامت کی تعیین کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر ان کے شک و انکار پر تشنیع ہے (بَلِ ادّٰرَكَ) پھر اُن کے ایک انکاری قول کی نقل ہے (وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا) پھر اس انکار پر تہدید ہے (قُلْ سِيْرُوْا) پھر اس انکار پر آپ کی تسلی ہے وَلَا تَحْزَنْ پھر اس تہدید کے متعلق انکے ایک شبہ کا جواب ہے (وَيَقُوْلُوْنَ الخ) پھر تہدید کی تاکید ہے وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ الخ جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہو گا۔

(یہ لوگ جو قیامت کا وقت نہ بتلانے سے اسکے عدم وقوع پر استدلال کرتے ہیں اسکے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا لازم آیا کہ مجھ سے اور تم سے اس تعیین کا علم غائب رہا سو اس میں اسی کی کیا تخصیص ہے غیب کی نسبت تو قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین (یعنی عالم) میں موجود ہیں (ان میں سے) کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور (اسی وجہ سے) ان (مخلوقات) کو یہ خبر (بھی) نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کئے جاویں گے (یعنی اللہ تعالیٰ کو تو بے بتلائے سب معلوم ہے اور کسی کو بے بتلائے کچھ بھی معلوم نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے اُمور جن کا پہلے سے علم نہیں ہوتا واقع ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حکمت سے بعض علوم کا پردہ غیب میں رکھنا منظور ہے قیامت کی تعیین بھی انہی اُمور میں ہے اسی لئے مخلوق کو اسکا علم نہیں دیا گیا مگر اس سے عدم وقوع کیسے لازم آگیا اور یہ عدم علم بالتعیین تو سب میں امر مشترک ہے لیکن ان کفار منکرین میں صرف یہی نہیں کہ وہ بالتعیین قیامت

کو نہیں مانتے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ) آخرت کے بارے میں (خود) ان کا (نفس) علم (بالوقوع ہی) نیست ہوگیا (یعنی خود اس کے وقوع ہی کا علم نہیں جو تعیین کے علم نہ ہونے سے بھی اشد ہے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ لوگ اس (کے وقوع) سے شک میں ہیں، بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (یعنی جیسے اندھے کو راستہ نظر نہیں آتا اسلئے مقصود تک پہنچنا مستبعد ہے اسی طرح تصدیق بالآخرت کا جو ذریعہ ہے یعنی دلائلِ صحیحہ یہ لوگ انتہائی عناد کیوجہ سے ان دلائل میں غور و تامل ہی نہیں کرتے اس لئے وہ دلائل ان کو نظر نہیں آتے جس سے مطلوب تک پہنچ جانے کی اُمید ہوتی۔ پس یہ شک سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ شک والا بعض اوقات دلائل میں نظر کرکے رفع شک کرلیتا ہے اور یہ نظر بھی نہیں کرتے) اور (اس تشنیع علی الکفار کے بعد آگے ان کا ایک انکاری قول نقل فرماتے ہیں کہ) یہ کافریوں کہتے ہیں کہ کیا ہم لوگ جب (مرکر) خاک ہوگئے اور (اسی طرح) ہمارے بڑے بھی تو کیا (پھر) ہم (زندہ کرکے قبروں سے) نکالے جاویں گے اسکا تو ہم سے اور ہمارے بڑوں سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) پہلے سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے (کیونکہ تمام انبیاء کا یہ قول مشہور ہے لیکن نہ آج تک ہوا اور نہ کسی نے بتلایا کہ کب ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں آپ کہدیجئے کہ (جب اس کے امکان پر دلائل عقلیہ اور وقوع پر دلائلِ نقلیہ جابجا بار بار تم کو سُنا دیئے گئے ہیں تو تم کو تکذیب سے باز آنا چاہیئے ورنہ جو اور مکذبین کا حال ہوا ہے کہ عذاب میں گرفتار ہوئے وہی تمہارا حال ہوگا۔ اگر ان کی حالت میں کچھ شبہ ہو تو) تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا (کیونکہ اُن کے ہلاک ہونے اور عذاب آنے کے آثار اب تک باقی تھے) اور (اگر باوجود ان مواعظِ بلیغہ کے پھر مخالفت پر کمربستہ رہیں تو) آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے دل تنگ نہ ہوجیئے (کہ اور انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے) اور (قُلْ سِيْرُوْا الخ میں اور اسکے امثال دوسری آیات میں جو ان کو وعیدِ عذاب سُنائی جاتی ہے تو چونکہ دل میں تصدیق نہیں اسلئے) یہ لوگ (بے باکانہ) یُوں کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (عذاب وقہر کا) کب ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہدیجئے کہ عجب نہیں کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہی آ لگا ہو اور (اب تک جو دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رب لوگوں پر (اپنا) بڑا فضل رکھتا ہے (اس رحمتِ عامّہ کی وجہ سے قدرے مہلت دے رکھی ہے) ولیکن اکثر آدمی (اس بات پر) شکر نہیں کرتے (کہ تاخیر کو غنیمت سمجھیں اور اس مہلت میں حق کی طلب کریں اور اس کو قبول کرلیں کہ عذاب سے نجات ابدی حاصل ہو بلکہ بالعکس انکار اور بطور استہزاء کے جلدبازی کرتے ہیں) اور (یہ تاخیر جو نکہ بمصلحت ہے اس لئے یہ نہ سمجھیں کہ ان افعال کی کبھی سزا ہی نہ ہوگی کیونکہ) آپ

کے رب کو سب خبر ہے جو کچھ اُن کے دلوں میں مخفی ہے اور جس کو وہ علانیہ کرتے ہیں اور (یہ صرف علم خداوندی ہی نہیں بلکہ دفتر خداوندی میں لکھا ہوا ہے جس میں کچھ ان ہی کے افعال کی تخصیص نہیں بلکہ) آسمان اور زمین میں ایسی کوئی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں نہ ہو (اور دفتر خداوندی یہی لوح محفوظ ہے اور جب مخفی چیزیں جن کو کوئی نہیں جانتا اس میں موجود ہیں تو ظاہر چیزیں تو بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں۔ غرض انکے اعمال کی اللہ تعالیٰ کو خبر ہے اور آسمانی دفتر میں بھی محفوظ ہیں اور وہ اعمال خود سزا کے مقتضی بھی ہیں اور سزا کے واقع ہونے پر سب انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اخبار صادقہ بھی متفق ہیں۔ پھر یہ سمجھنے کی کیا گنجائش ہے کہ سزا نہ ہوگی، البتہ دیر ہونا ممکن ہے چنانچہ بعض سزائیں ان منکرین کو دنیا میں بھی ہوئیں جیسے قحط و قتل و قید وغیرہ اور کچھ قبر و برزخ میں ہوں گی جو کچھ دور نہیں، اور کچھ آخرت میں ہوں گی)۔

معارف و مسائل

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ جتنی مخلوق آسمانوں میں ہے جیسے فرشتے اور جتنی مخلوق زمین میں ہے جیسے بنی آدم اور جنّات وغیرہ ان میں سے کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔ آیت مذکورہ نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے جس میں کوئی فرشتہ یا نبی و رسول بھی شریک نہیں ہوسکتا۔ اس مسئلہ کی ضروری تفصیل سورۂ انعام کی آیت نمبر ۵۹ کے تحت صفحہ ۳۵۲ جلد ۳ پر آچکی ہے۔ اسکے علاوہ اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ بنام کشف الریب عن علم الغیب احکام القرآن (عربی) کا جزء بنکر شائع ہوچکا ہے۔ اہل علم اس کی مراجعت فرما سکتے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ، لفظ ادّٰرَكَ میں قرأتیں بھی مختلف ہیں اور اس کے معنی میں بھی کئی قول ہیں۔ اہل علم اس کی تفصیل تفاسیر میں دیکھ سکتے ہیں، یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ادّٰرَكَ کے معنے بعض مفسرین نے تکامل کے کئے ہیں اور فی الاخرہ کو ادّٰرَكَ سے متعلق کرکے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ آخرت میں ان کا علم اس معاملہ میں مکمل ہوجائیگا کیونکہ اسوقت ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی مگر اسوقت علم ہونا اُن کے کچھ کام نہ آئے گا کیونکہ دنیا میں وہ آخرت کی تکذیب کرتے رہے تھے۔ اور بعض مفسرین نے لفظ ادّٰرَكَ کے معنے ضلّ و غاب کے لئے اور فی الآخرہ کو علمہم سے متعلق کیا کہ آخرت کے معاملہ میں اُن کا علم غائب ہوگیا اس کو نہ سمجھ سکے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ
یہ قرآن سُناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں جس میں
فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۷۶﴾ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۷۷﴾ إِنَّ
وہ جھگڑ رہے ہیں اور بیشک وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے واسطے تیرا
رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى
رب اُن میں فیصلہ کریگا اپنی حکومت سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا سو تو بھروسہ کر
اللَّهِ ۖ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿۷۹﴾
اللہ پر بیشک تو ہے صحیح کھلے رستہ پر

خلاصۂ تفسیر

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر اُن باتوں (کی حقیقت) کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ایمانداروں کے لئے (خاص) ہدایت اور (خاص) رحمت ہے (ہدایت باعتبار طاعات واعمال کے اور رحمت باعتبار ثمرات ونتائج کے) بالیقین آپ کا رب اُن کے درمیان اپنے حکم سے (وہ عملی) فیصلہ (قیامت کے دن) کریگا (اُسوقت معلوم ہوجاویگا کہ دینِ حق کیا تھا اور باطل کیا، تو ایسے لوگوں پر کیا افسوس کیا جائے) اور وہ زبردست علم والا ہے (بدون اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتا) تو آپ اللہ پر توکل رکھئے (اللہ کی مدد ضرور ہوگی کیونکہ) آپ صریح حق پر ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو مختلف مثالوں سے ثابت کر کے یہ بات ثابت کردی گئی ہے کہ قیامت کا وقوع اور اُسمیں مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا عقلاً ممکن ہے اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں۔ عقلی امکان کے ساتھ اسکا ضرور واقع ہونا یہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی نقل سے ثابت ہے اور کسی خبر کا صحیح اور ثابت ہونا اس پر موقوف ہے کہ اسکا ناقل مخبر اور روایت کرنے والا صادق اور سچا ہو۔ اسلئے اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اسکا مخبر قرآن ہے اور اُسکا مخبر صادق ہونا قابلِ انکار ہے، یہانتک کہ علماء بنی اسرائیل جن مسائل میں باہم سخت اختلافات رکھتے تھے اور وہ حل نہ ہوتے تھے۔ قرآن حکیم نے اُن مسائل میں محاکمہ کر کے صحیح فیصلوں کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے اختلاف میں محاکمہ اور فیصلہ کرنے والا ان سب علماء سے اعلم اور اعلیٰ ہونا ضروری ہے اسلئے قرآن کا مخبرِ صادق

ہونا واضح ہوگیا، اسکے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کی مخالفت سے تنگدل نہ ہوں، اللہ تعالیٰ خود آپ کا فیصلہ کرنے والا ہے آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد حق کے ساتھ ہے اور آپ کا طریق حق پر ہونا یقینی ہے۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٨٠﴾	
البتہ تو نہیں سنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لوٹیں وہ پیٹھ پھیر کر	
وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ	
اور نہ تو دکھلا سکے اندھوں کو جب وہ راہ سے بچلیں تو تو سناتا ہے اُس کو جو یقین رکھتا ہو	
بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨١﴾	
ہماری باتوں پر، سو وہ حکمبردار ہیں	

خلاصۂ تفسیر

آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلدیں اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے (بچاکر) رستہ دکھانے والے ہیں، آپ تو صرف اُن ہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں۔

معارف ومسائل

ہمارے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے ساتھ جو شفقت وہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اُسکا تقاضا تھا کہ سب کو اللہ کا پیغام سنا کر جہنم سے بچالیں جو لوگ اس پیغام کو قبول نہ کرتے تو آپکو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور آپ ایسے غمگین ہوتے تھے جیسے کسی کی اولاد اسکے کہنے کے خلاف آگ میں جارہی ہو۔ اسلئے قرآن نے جا بجا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے مختلف عنوانات اختیار فرمائے ہیں۔ سابقہ آیات میں وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ، اسی سلسلہ کا ایک عنوان تھا۔ مذکور الصدر آیت میں بھی تسلی کا مضمون دوسرے انداز سے بیان فرمایا ہے کہ آپ کا کام پیغام حق کو پہنچا دینے کا وہ آپ پورا کر چکے ہیں جن لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا اسمیں آپ کا کوئی قصور اور کوتاہی نہیں جس پر آپ غم کریں بلکہ وہ اپنی صلاحیتِ قبول ہی کو کھو چکے ہیں۔ ان کے گم کردہ صلاحیت ہونے کو اس آیت میں قرآن کریم نے تین مثالوں میں ثابت کیا ہے۔ اوّل یہ کہ یہ لوگ قبولِ حق کے معاملہ میں بالکل مُردہ لاش کی طرح ہیں جو کسی کی بات سن کر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ دوسرے یہ کہ ان کی مثال اُس بہرے آدمی کی ہے جو

بہرا ہونے کے ساتھ بات سُننا بھی نہیں چاہتا بلکہ جب کوئی سُنانا چاہے تو اُس سے پیٹھ موڑ کر بھاگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کی مثال اندھوں کی سی ہے کہ کوئی ان کو راستہ دکھانا بھی چاہے تو وہ نہیں دیکھ سکتے ان تین مثالوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرمایا۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ، یعنی آپ تو صرف ایسے ہی لوگوں کو سُنا سکتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں اور اطاعت قبول کریں۔ اس پورے مضمون میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس جگہ سُننے سُنانے سے مراد محض کانوں میں آواز پہنچانا نہیں بلکہ مراد اس سے وہ سماع اور سُننا ہے جو نفع بخش ہو۔ جو سماع نافع نہ ہو اس کو قرآن نے مقصد کے اعتبار سے عدم سماع سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آخر آیت میں یہ ارشاد کہ آپ تو صرف اُن لوگوں کو سُنا سکتے ہیں جو ایمان لائیں۔ اگر اسمیں سُنانے سے مراد محض اُن کے کان تک آواز پہنچانا ہوتا تو قرآن کا یہ ارشاد خلاف مشاہدہ اور خلاف واقع ہو جاتا کیونکہ کافروں کے کانوں تک آواز پہنچانے اور اُن کے سُننے جواب دینے کی شہادتیں بے شمار ہیں کوئی بھی اسکا انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح ہوا کہ سُنانے سے مراد سماع نافع ہے۔ انکو مُردہ لاش سے تشبیہ دیکر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اس کے معنے بھی یہی ہوئے کہ جیسے مُردے اگر کوئی بات حق کی سُن بھی لیں اور اسوقت وہ حق کو قبول کرنا بھی چاہیں تو یہ انکے لئے نافع نہیں، کیونکہ وہ دُنیا کے دار العمل سے گزر چکے ہیں جہاں ایمان و عمل نافع ہو سکتا تھا مرنے کے بعد برزخ یا محشر میں تو سبھی کافر منکر ایمان و عمل صالح کی تمنائیں کریں گے مگر وہ وقت ایمان و عمل کے قبول ہونیکا وقت نہیں۔ اس لئے اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مُردے کوئی کلام کسی کا سُن ہی نہیں سکتے۔ اسلئے سماع اموات کے مسئلہ سے درحقیقت یہ آیت ساکت ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ نظر ہے کہ مُردے کسی کلام کو سُن سکتے ہیں یا نہیں؟

مسئلہ سماع اموات | یہ مسئلہ کہ مُردے کوئی کلام سُن سکتے ہیں یا نہیں اُن مسائل میں سے ہے جنمیں خود صحابہ کرام کا باہم اختلاف رہا ہے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سماع موتیٰ کو ثابت قرار دیتے ہیں اور حضرت ام المؤمنین صدیقہ عائشہؓ اس کی نفی کرتی ہیں۔ اسی لئے دوسرے صحابہ و تابعین میں بھی دو گروہ ہو گئے بعض اثبات کے قائل ہیں بعض نفی کے۔ اور قرآن کریم میں یہ مضمون ایک تو اسی موقع پر سورۂ نمل میں آیا ہی دوسرے سورۂ روم میں تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ دوسری آیت آئی ہے اور سورۂ فاطر میں یہ مضمون ان الفاظ سے آیا ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ، یعنی آپ اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو کہ قبروں میں ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ مُردے سُن نہیں سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سُنا سکتے۔ تینوں آیتوں میں اس تعبیر و عنوان کو اختیار کرنے سے اسطرف واضح اشارہ نکلتا ہے کہ مردوں میں سُننے کی صلاحیت تو ہو سکتی ہے

مگر ہم باختیار خود اُن کو نہیں سُنا سکتے۔

ان تینوں آیتوں کے بالمقابل ایک چوتھی آیت جو شہدار کے بارے میں آئی ہے وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ شہدار کو اپنی قبروں میں ایک خاص قسم کی زندگی عطا ہوتی ہے اور اس زندگی کے مطابق رزق بھی انکو ملتا ہے اور اپنے پسماندہ متعلقین کے متعلق بھی منجانب اللہ ان کو بشارت سُنائی جاتی ہے آیت یہ ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ، یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد بھی رُوح انسانی میں شعور اور ادراک باقی رہ سکتا ہے بلکہ شہدار کے معاملہ میں اسکے وقوع کی شہادت بھی یہ آیت دے رہی ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ یہ حکم تو شہیدوں کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اموات کے لئے نہیں، سو اسکا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوگیا کہ مرنے کے بعد بھی روح انسانی میں شعور و ادراک اور اس دُنیا کیساتھ علاقہ باقی رہ سکتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہدار کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اُن کی ارواح کا تعلق انکے اجساد اور قبور کے ساتھ قائم رہتا ہے اسی طرح جب اللہ تعالیٰ چاہیں تو دوسرے اموات کو یہ موقع دے سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو سماع اموات کے قائل ہیں، اُنکا یہ قول بھی ایک صحیح حدیث کی بنار پر ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ منقول ہے وہ یہ ہے۔

ما من احد یمر بقبر اخیہ المسلم کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا رد اللہ علیہ روحہ حتی یرد علیہ السلام (ذکرہ ابن کثیر فی تفسیرہ مصححا عن ابن عمرؓ)

جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر گذرتا ہے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا اور وہ اس کو سلام کرے تو اللہ تعالیٰ اُس مُردے کی روح اسمیں واپس بھیجدیتے ہیں تاکہ وہ سلام کا جواب دے۔

اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص اپنے مُردہ مسلمان بھائی کی قبر پر جاکر سلام کرتا ہے تو وہ مردہ اسکے سلام کو سُنتا ہے اور جواب دیتا ہے اور اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس وقت اس کی رُوح اس دُنیا میں واپس بھیجدیتے ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ مُردے سُن سکتے ہیں دوسرے یہ کہ اُن کا سننا اور ہمارا سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہیں سُنا دیں، جب نہ چاہیں نہ سُنائیں۔ مسلمان کے سلام کرنے کے وقت تو اس حدیث نے بتلا دیا کہ حق تعالیٰ مُردہ کی روح واپس لاکر اسکو سلام سُنا دیتے ہیں اور اس کو سلام کا جواب دینے کی بھی قدرت دیتے ہیں۔ باقی حالات و کلمات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ مُردہ ان کو سُنے گا یا نہیں۔ اسی لئے امام غزالی اور علامہ سبکی وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ اتنی بات تو احادیث صحیحہ اور قرآن کی آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ بعض اوقات میں مُردے زندوں کا کلام سُنتے ہیں لیکن یہ ثابت نہیں کہ ہر مُردہ

ہر حال میں ہر شخص کے کلام کو ضرور سُنتا ہے اس طرح آیات و روایات کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مُردے ایک وقت میں اَحیاء کے کلام کو سُن سکیں دوسرے وقت نہ سُن سکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کے کلام کو سُنیں بعض کے کلام کو نہ سُنیں، یا بعض مُردے سُنیں بعض نہ سُنیں، کیونکہ سورۂ نمل، سورۂ روم، سورۂ فاطر کی آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مردوں کو سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں سُنا دیتے ہیں اس لئے جن مواقع میں حدیث کی روایات صحیحہ سے سُننا ثابت ہے وہاں سُننے پر عقیدہ رکھا جائے اور جہاں ثابت نہیں وہاں دونوں احتمال ہیں اسلئے نہ قطعی اثبات کی گنجائش ہے نہ قطعی نفی کی۔ واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم

اس مسئلہ کی مکمل تحقیق میں احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام تکمیل الحبور بسماع اہل القبور لکھا ہے جو احکام القرآن سورۂ روم حزب خامس میں بزبان عربی شائع ہوا ہے جس میں آیات و روایات اور اقوال سلف و خلف اور شرح الصدور وغیرہ سے بہت سے واقعات و مخاطبات اہلِ قبور کے نقل کئے گئے ہیں۔ اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے یہاں اسکا ضروری خلاصہ لکھا گیا ہے۔

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ
اور جب پڑ چکے گی اُن پر بات نکالیں گے ہم اُن کے آگے ایک جانور زمین سے اُن سے باتیں کرے گا
أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾
اسواسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور جب وعدہ (قیامت کا) ان (لوگوں) پر پورا ہونے کو ہوگا (یعنی قیامت کا زمانہ قریب آپہنچیگا) تو ہم اُن کے لئے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ اُن سے باتیں کریگا کہ (کافر) لوگ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر (خصوصاً اُن آیتوں پر جو قیامت کے متعلق ہیں) یقین نہیں لاتے تھے (مگر اب قیامت آپہنچی اُس کی علامتوں میں ایک علامت میرا ظہور بھی ہے)۔

معارف و مسائل

دابۃ الارض کیا ہے اور کہاں اور کب نکلے گا

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ (۱) آفتاب کا جانب مغرب سے طلوع ہونا (۲) دخان (۳) دابہ (۴)

خروج یاجوج ماجوج (۵) نزول عیسیٰ علیہ السلام (۶) دجال (۷، ۸، ۹) تین خسوف، ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں تیسرا جزیرۃ العرب میں ہوگا (۱۰) ایک آگ جو قعر عدن سے نکلے گی اور سب لوگوں کو ہنکا کر میدانِ حشر کیطرف لے آئیگی جس مقام پر لوگ رات گزارنے کے لئے ٹھہرینگے یہ آگ بھی ٹھہر جائے گی پھر اُن کو لے چلے گی (ہکذا رواہ مسلم واہل السنن من طرق وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

اس حدیث سے قربِ قیامت میں زمین سے ایک ایسے جانور کا نکلنا ثابت ہوا جو لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور لفظ دابۃ کی تنوین میں اس جانور کے عجیب الخلقت ہونے کی طرف بھی اشارہ پایا گیا، اور یہ بھی کہ یہ جانور عام جانوروں کی طرح توالد و تناسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا اور یہ بات بھی اسی حدیث سے سمجھ میں آتی ہے کہ دابۃ الارض کا خروج بالکل آخری علامات میں سے ہوگا جس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی۔ ابن کثیر نے بحوالہ ابوداؤد طیالسی حضرت طلحہ بن عمرؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ یہ دابۃ الارض مکہ مکرمہ میں کوہِ صفا سے نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجرِ اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائیگا۔ لوگ اس کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے ایک جماعت رہ جائے گی یہ دابہ اُن کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کردے گا۔ اسکے بعد وہ زمین کیطرف نکلے گا، ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگا دے گا۔ کوئی اس کی پکڑ سے بھاگ نہ سکے گا یہ ہر مومن و کافر کو پہچانے گا (ابن کثیر) اور مسلم بن حجاج نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی تھی جس کو میں کبھی بھولتا نہیں وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی آخری علامات میں سب سے پہلے آفتاب کا طلوع مغرب کی طرف سے ہوگا اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دابۃ الارض نکلے گا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہو جائے اسکے فوراً بعد قیامت آجائے گی۔ (ابن کثیر)

شیخ جلال الدین محلی نے فرمایا کہ خروجِ دابہ کے وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام منقطع ہو جائیں گے اور اسکے بعد کوئی کافر اسلام قبول نہ کرے گا۔ یہ مضمون بہت سی احادیث و آثار سے مستنبط ہوتا ہے (مظہری) ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ دابۃ الارض کی ہیئت اور کیفیات و حالات کے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں جنمیں سے اکثر قابلِ اعتماد نہیں اسلئے جتنی بات قرآن کی آیات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ عجیب الخلقت جانور ہوگا۔ بغیر توالد و تناسل کے زمین سے نکلے گا۔ اسکا خروج مکہ مکرمہ میں ہوگا پھر ساری دنیا میں پھرے گا۔ یہ کافر و مومن کو پہچانے گا۔ اور اُن سے کلام کریگا۔ بس اتنی بات پر عقیدہ رکھا جائے، زائد کیفیات و حالات کی تحقیق و تفتیش نہ ضروری ہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ دابۃ الارض لوگوں سے کلام کرے گا اسکا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ

اُسکا کلام یہی ہوگا جو قرآن میں مذکور ہے اِنَّ النَّاسَ كَانُوا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوقِنُوْنَ ، یہ کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو سُنائے گا، بہت سے لوگ آج سے پہلے ہماری آیتوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور مطلب یہ ہوگا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اُن سب کو یقین ہو جائے گا مگر اسوقت کا یقین شرعاً معتبر نہیں ہوگا۔ اور حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، قتادہؒ سے منقول ہے اور ایک روایت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بھی ہے کہ یہ دابۃ لوگوں سے خطاب اور کلام کرے گا جس طرح عام کلام ہوتا ہے۔ (ابن کثیر)

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جس دن گھیر بُلائیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے ایک جماعت جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو پھر اُنکی جماعت بندی ہوگی

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا

یہانتک کہ جب حاضر ہو جائیں فرمائیگا کیوں جھٹلایا تم نے میری باتوں کو اور نہ آچکی تھیں تمہاری سمجھ میں یا بولو کہ

ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

کیا کرتے تھے — اور پڑ چکی اُن پر بات اسواسطے کہ انہوں نے شرارت کی تھی اب وہ کچھ نہیں بول سکتے

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنائی رات کہ اسمیں چین حاصل کریں اور دن بنایا دیکھنے کو البتہ اس میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں اور جس دن پھونکی جائے گی صور تو گھبرا جائے

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ

جو کوئی ہے آسمان میں اور جو کوئی ہے زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے اور سب

اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ

چلے آئیں اسکے آگے عاجزی سے اور تو دیکھے پہاڑوں کو سمجھے کہ وہ جم رہے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے

السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

چلے بادل کاریگری اللہ کی جس نے درست کیا ہے ہر چیز کو اس کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ

جو کوئی لے کر آیا بھلائی تو اُس کو ملے اُس سے بہتر اور ان کو گھبراہٹ سے اس دن

اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ

امن ہے اور جو کوئی لے کر آیا بُرائی سو اوندھے ڈالیں اُن کے منہ آگ میں

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے

خُلاصۂ تفسیر

جس دن (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ہم ہر اُمت میں سے (یعنی اُمم سابقہ میں سے بھی اور اس اُمت میں سے بھی) ایک ایک گروہ اُن لوگوں کا (حساب کے لئے) جمع کریں گے جو میری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے (پھر اُن کو موقف کی طرف حساب کے لئے روانہ کیا جائیگا اور چونکہ یہ کثرت سے ہونگے اسلئے) اُن کو (چلنے میں پچھلوں سے آملنے کے واسطے) روکا جائے گا (تاکہ آگے پیچھے نہ رہیں سب ساتھ ہوکر موقف حساب کی طرف چلیں۔ مُراد اس سے کثرت کا بیان ہے کیونکہ بڑے مجمع میں عادۃً ایسا ہوتا ہے خواہ روک ٹوک ہو یا نہ ہو) یہانتک کہ جب (چلتے چلتے موقف میں) حاضر ہوجاویں گے تو (حساب شروع ہوگا اور) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماویگا کہ کیا تمنے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم اُن کو اپنے احاطۂ علمی میں بھی نہیں لاتے (جسکے بعد غور کرنیکا موقع ملتا اور غور کرکے اُس پر کچھ رائے قایم کرتے، مطلب یہ کہ سُنتے ہی بلا تدبّر و تفکر، اُن کی تکذیب کردی اور تکذیب ہی پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ (یاد تو کرو اسکے علاوہ) اور بھی کیا کیا کام کرتے رہے (مثلاً انبیاء کو اور اہلِ ایمان کو ایذائیں دیں جو تکذیب سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اور عقائدِ کفریہ اور فسق و فجور میں بتلا رہے) اور (اب وہ وقت ہے کہ) اُن پر (بوجہ قائم ہوجانے جرم کے) وعدہ (عذاب کا) پورا ہوگیا (یعنی سزا کا استحقاق ثابت ہوگیا) بوجہ اس کے کہ (دُنیا میں) اُنھوں نے (بڑی بڑی) زیادتیاں کی تھیں (جن کا آج ظہور ثابت ہوگیا) سو (چونکہ ثبوت قوی ہے اسلئے) وہ لوگ عذر وغیرہ کے متعلق) بات بھی نہ کرسکیں گے (اور بعض آیات میں جو ان کا عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ ابتدار میں ہوگا پھر بعد اقامتِ حجت کوئی بات نہ کہہ سکیں گے۔ اور یہ لوگ جو امکانِ قیامت کے منکر ہیں تو حماقتِ محضہ ہے کیونکہ علاوہ دلائلِ نقلیہ صادقہ کے اس پر دلیلِ عقلی بھی تو قائم ہے مثلاً) کیا انھوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہمنے رات بنائی تاکہ لوگ اس میں آرام کریں (اور یہ آرام مشابہ موت کے ہے) اور دن بنایا جس میں دیکھیں بھالیں (جو کہ موقوف ہے بیداری پر اور وہ مشابہ حیات بعد الموت کے ہے پس) بلاشبہ اس (روزانہ خواب بیداری) میں (امکانِ بعث پر اور ان آیات کے حق ہونے پر جو اس پر دال ہیں) بڑی دلیلیں ہیں (کیونکہ موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم سے زائل ہوجائے اور حیاتِ ثانیہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلق پھر عود کر آئے، اور نیند بھی ایک حیثیت سے زوال ہے اس تعلق کا، کیونکہ نیند میں یہ تعلق ضعیف ہوجاتا ہے اور ضعف جبھی ہوتا ہے جبکہ اسکے مراتبِ وجود میں کوئی مرتبہ زائل ہوجائے، اور بیداری اس زائل شدہ مرتبۂ وجود کے عود کا نام ہے اس لئے دونوں میں تشابہ تام ہوگیا۔ اور نیند کے بعد بیداری پر اللہ تعالیٰ کی قدرت روزانہ مشاہدہ میں آتی ہے تو موت کے بعد زندگی بھی اُس کی نظیر ہے وہ کیوں اللہ کی قدرت سے خارج ہوگا، اور

یہ دلیلِ عقلی ہر شخص کے لئے عام ہے مگر باعتبار انتفاع کے) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہے) جو ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ وہ غور و فکر کرتے ہیں، اور دوسرے تدبر نہیں کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نظر و فکر ضروری ہے اسلئے دوسرے اس سے منتفع نہیں ہوتے) اور (ایک واقعہ ہولناک اس حشر مذکور سے پہلے ہوگا جسکا آگے ذکر ہے اُس کی ہیبت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جس دن صور میں پھونک ماری جاوے گی (یہ نفخۂ اولی ہے اور حشر مذکور نفخۂ ثانیہ کے بعد تھا) سو جتنے آسمان اور زمین میں (فرشتے اور آدمی وغیرہ) ہیں سب گھبرا جاویں گے (اور پھر مر جاویں گے اور جو مر چکے ہیں ان کی روحیں بیہوش ہو جاویں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس گھبراہٹ سے اور موت سے محفوظ رہے گا۔ مُراد ان سے حسب حدیث مرفوع جبرئیل و میکائیل و اسرافیل و ملک الموت و حاملانِ عرش ہیں پھر ان سب کی بھی بدون اثر نفخہ وفات ہو جاویگی۔ کذا فی الدر المنثور۔ سورۃ الزمر) اور (دُنیا میں جیسے عادت ہے کہ جس سے گھبراہٹ اور ڈر ہوتا ہے اس سے بھاگ جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی بھاگ نہ سکے گا بلکہ) سب کے سب اُسی کے سامنے دبے جھکے حاضر رہیں گے (یہاں تک کہ زندہ آدمی مُردہ اور مُردے بیہوش ہو جاویں گے) اور (نفخہ کی یہ تغییر و تاثیر جانداروں میں ہوگی اور آگے بے جان چیزوں میں جو تاثیر ہوگی اسکا بیان ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) تو (اسوقت) پہاڑوں کو ایسی حالت میں دیکھ رہا ہے جس سے (ان کے ظاہری استحکام کے سبب بادی النظر میں) تجھ کو خیال ہوتا ہے کہ یہ (ہمیشہ یُوں ہی رہیں گے اور کبھی اپنی جگہ سے) جنبش نہ کریں گے حالانکہ (اسوقت ان کی یہ حالت ہوگی کہ) وہ بادلوں کی طرح (متخلخل اور خفیف اور اجزاءِ منتشرہ ہوکر فضائے آسمانی میں) اُڑے اُڑے پھریں گے (کقولہ تعالیٰ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا، اور اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایسی ثقیل اور سخت چیز کا یہ حال کیسے ہو جاویگا، وجہ یہ کہ) یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) بنا رکھا ہے (اور ابتداء میں کسی شیٔ میں کوئی مضبوطی نہ تھی کیونکہ خود اس شے کی ذات ہی نہ تھی، پس مضبوطی کی صفت تو بدرجۂ اولی نہ تھی سو جیسے اس نے معدوم سے موجود اور ضعیف سے قوی بنایا اسی طرح اسکا عکس بھی کرسکتا ہے کیونکہ قدرتِ ذاتیہ کی نسبت تمام مقدورات کے ساتھ یکساں ہے، بالخصوص جو چیزیں ایک دوسرے کی نظیر اور مشابہ ہیں ان میں تو زیادہ واضح ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات قویہ آسمان و زمین وغیرہ میں تغیر عظیم ہونا دوسری آیات میں مذکور ہے وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ الخ پھر اسکے بعد نفخۂ ثانیہ ہوگا جس سے ارواح ہوش میں آکر اپنے ابدان سے متعلق ہو جاویں گی اور پورا عالم نئے سرے سے درست ہو جاویگا اور اوپر جو حشر کا ذکر تھا وہ اسی نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا۔ آگے اصل مقصود یعنی قیامت میں جزاء و سزا کا بیان ہے۔ پس اوّل اسکی تمہید کے طور پر ارشاد ہے کہ) یہ یقینی بات ہے

کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پُوری خبر ہے (جو جزاء وسزا کی پہلی شرط ہے اور دوسری شرائط بھی مثل قدرت وغیرہا مستقل دلائل سے ثابت ہیں، پس مجازات کا ممکن ہونا تو اس سے ظاہر ہے اور پھر حکمت مقتضی ہے وقوع مجازات کو، اس سے جزاء وسزا کا واقع ہونا ثابت ہوگیا، تمہید کے بعد آگے اسکا وقوع مع اسکے قانون اور طریقہ کے بیان فرماتے ہیں کہ) جو شخص نیکی (یعنی ایمان) لاویگا سو (وہ ایمان لانے پر حسب اجر کا مستحق ہے) اس شخص کو اس (نیکی کے اجر مذکور) سے بہتر (اجر) ملے گا اور وہ لوگ بڑی گھبراہٹ سے اس روز امن میں رہیں گے (جیساکہ سورۂ انبیاء میں ہے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ، الآیۃ) اور جو شخص بدی (یعنی کفر وشرک) لاویگا تو وہ لوگ اوندھے منھ آگ میں ڈالدیئے جاویں گے (اور اُن سے کہا جاوے گا کہ) تم کو تو اُنہی اعمال کی سزا دیجارہی ہے جو تم (دُنیا میں) کیا کرتے تھے (یہ عذاب بے وجہ نہیں)۔

معارف و مسائل

فَهُمْ يُوزَعُونَ، وزع سے مشتق ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگلے حصّہ کو روکا جائیگا تاکہ پیچھے رہے ہوئے لوگ ساتھ ہوجاویں اور بعض حضرات نے وزع کے معنی یہاں دفع کے لئے ہیں یعنی ان کو دھکّے دے کر موقف کی طرف لایا جائیگا وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا، اسمیں اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی آیات کی تکذیب خود ایک بڑا جرم وگناہ ہے خصوصاً جبکہ سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی طرف توجہ کئے بغیر ہی تکذیب کرنے لگیں تو یہ جُرم دوہرا ہوجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ غور وفکر کرنے کے باوجود حق کو نہ پاسکیں کہ اُن کی نظر وفکر ہی گمراہی کی طرف لے جائے تو اُنکا جُرم کسی قدر ہلکا ہوجاتا ہے اگرچہ اللہ کے وجود اور توحید وغیرہ کی تکذیب پھر بھی کفر وضلال اور دائمی عذاب سے نہیں بچائے گی کیونکہ یہ ایسے بدیہی اُمور ہیں جن میں نظر وفکر کی غلطی معاف نہیں۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ، فزع کے معنے گھبرانے اور پریشان ہونے کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اس جگہ فزع کے بجائے صَعِقَ آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں۔ اگر یہ دونوں آیتیں پہلے نفخۂ صور کے متعلق قرار دی جائیں تو ان دونوں لفظوں کا حاصل یہ ہوگا کہ صور پھونکنے کے وقت اول تو سب گھبرائیں گے اور پریشان ہونگے پھر بیہوش ہوجائیں گے بالآخر مرجائیں گے۔ اور قتادہ وغیرہ ائمۂ تفسیر نے اس آیت کو نفخۂ ثانیہ کے متعلق قرار دیا ہے جس سے سب مُردے دوبارہ زندہ ہوجائیں گے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ سب زندہ ہونے کے وقت گھبرائے ہوئے اُٹھیں گے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صُور تین مرتبہ پھُونکا جائے گا، پہلا نفخہ نفخۂ فزع ہوگا جس سے سب پریشانی گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا ہوجائیں گے۔ دوسرا نفخہ صعق ہوگا جس سے سب مرجائیں گے، تیسرا نفخہ نفخۂ حشر ونشر ہوگا جس سے سب مُردے زندہ ہوجاویں گے مگر

آیاتِ قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثبوت دو ہی نفخوں کا ملتا ہے (قرطبی وابن کثیر) ابن مبارک نے حضرت حسن بصری سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ (قرطبی)

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ، یہ استثناء فزع سے ہے جس کے معنے گھبراہٹ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہونگے جن پر کوئی گھبراہٹ حشر کے وقت نہیں ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ یہ لوگ شہداء ہونگے حشر کی دوبارہ زندگی کے وقت ان پر کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی (صحح الحدیث ابن العربی، قرطبی) سعید بن جبیرؒ نے بھی یہی فرمایا کہ مُراد اس سے شہداء ہیں جو حشر کے وقت اپنی تلواریں باندھے ہوئے عرش کے گرد جمع ہونگے اور قشیری نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ان میں بدرجۂ اولی داخل ہیں کیونکہ انکو مقامِ شہادت بھی حاصل ہے اور مقامِ نبوت مزید براں ہے۔ (قرطبی)

اور سورۂ زمر میں آگے آیت آیا وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ، اس میں فزع کے بجائے صعق کا لفظ آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں۔ اور مراد اس جگہ بیہوش ہونا پھر مرجانا ہے اور اسمیں بھی اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کا استثناء ہے اور اس استثناء سے مراد مرفوع حدیث کے مطابق چھ فرشتے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حملۃ العرش ہیں کہ یہ نفخۂ صُور سے نہ مریں گے، بعد میں حسب تصریح حدیث ان سب کو بھی موت آئے گی۔ جن حضرات مفسرین نے فزع اور صعق کو ایک ہی قرار دیا ہے، انھوں نے سورۂ زمر کی طرح یہاں بھی استثناء سے مراد مخصوص فرشتے لئے ہیں خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا اور جنھوں نے فزع اور صعق کو الگ الگ مانا ہے انکے نزدیک فزع سے مستثنیٰ شہداء ہیں جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ مراد یہ ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر اس طرح چلیں گے جیسے بادل کہ دیکھنے والا اس کو اپنی جگہ جما ہوا سمجھتا ہے حالانکہ وہ تیزی سے چل رہے ہیں۔ تمام بڑے اجسام جن کی ابتدا و انتہاء انسان کی نظر کے سامنے نہیں ہوتی جب وہ کسی ایک سمت کی طرف حرکت کریں تو خواہ حرکت کتنی بھی تیز ہو دیکھنے والوں کو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں جسکا مشاہدہ سب کو گہرے بادل اور دُور تک چھائی ہوئی گھٹا سے ہوتا ہے کہ یہ بادل اپنی جگہ جمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوتے ہیں مگر ان کی حرکت دیکھنے والوں کو اسوقت محسوس ہوتی ہے جب وہ اتنی دُور چلے جائیں کہ افق کا کنارہ اس سے کھل جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہاڑوں کا جامد ہونا دیکھنے والے کی نظر کے اعتبار سے ہے اور اسکا حرکت کرنا حقیقت کے اعتبار سے۔ عامۂ مفسرین نے آیت کا مطلب یہی قرار دیا ہے اور خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ یہ دو حال دو وقتوں کے ہیں۔ جامد ہونا اسوقت کے اعتبار سے جسکو دیکھ کر

ہر دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے، اور تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ قیامت کے دن کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ قرآن کریم میں قیامت کے روز پہاڑوں کے حالات مختلف بیان ہوئے ہیں۔ پہلا حال اِندکاک اور زلزلہ ہے جو پوری زمین کے پہاڑوں کو محیط ہوگا۔ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا اور اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا، دوسرا حال اسکی بڑی بڑی چٹانوں کا دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جانا ہے وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ اور یہ اسوقت ہوگا جب اوپر سے آسمان بھی پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا زمین سے پہاڑ روئی کی طرح اوپر جائیں گے اُوپر سے آسمان نیچے آئیں گے اور دونوں مل جائیں گے یَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ۔ تیسرا حال یہ ہے کہ وہ دھنکی ہوئی روئی کے ایک جسم متصل کے بجائے ریزہ ریزہ اور ذرہ ذرہ ہو جائے۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا۔ چوتھا حال یہ ہے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر پھیل جائے فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا۔ پانچواں حال یہ ہے کہ یہ پہاڑ جو ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح زمین پر پھیل گئے ہیں ان کو ہوائیں اوپر اٹھا کر لیجائیں اور چونکہ یہ غبار ساری زمین پر چھایا ہوگا تو اگرچہ یہ بادل کی طرح تیز حرکت کرتا ہوگا مگر دیکھنے والا اسکو اپنی جگہ جما ہوا دیکھے گا تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ۔ ان میں سے بعض حالات صور کے نفخہ اولیٰ کے وقت ہونگے اور بعض نفخۂ ثانیہ کے بعد اسوقت جبکہ زمین کو ایک سطح مستوی بنا دیا جائے کہ نہ اسمیں کوئی غار رہے گا نہ پہاڑ نہ کوئی عمارت نہ درخت۔ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (از قرطبی و روح المعانی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ، صُنْع بمعنے صنعت ہے اور اتقن، اتقان سے مشتق ہے جس کے معنے کسی چیز کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے آتے ہیں۔ بظاہر یہ جملہ تمام مضامین سابقہ کے ساتھ متعلق ہے جن میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور صنعتِ عجیبہ کا ذکر ہے جس میں لیل و نہار کا انقلاب بھی ہے اور نفخ صور سے لے کر حشر و نشر تک کے سب حالات بھی اور مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں کچھ حیرت اور تعجب کی نہیں کیونکہ ان کا صانع کوئی محدود علم و قدرت والا انسان یا فرشتہ نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ اور اگر اسکا تعلق قریبی جملے تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً الآیۃ سے کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہاڑوں کا یہ حال کہ دیکھنے والے ان کو جما ہوا دیکھیں اور وہ واقع میں چل رہے اور حرکت کر رہے ہوں کچھ مستبعد اور جائے تعجب نہیں کیونکہ یہ صنعت اللہ رب العزت کی ہے۔ جس کی قدرت میں سب کچھ ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا، یہ حشر و نشر اور حساب کتاب کے بعد پیش آنے والے انجام کا ذکر ہے اور حسنہ سے مراد کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے (کما قال ابراہیم) یا اخلاص ہے (کما قال قتادہ) اور بعض حضرات نے مطلق طاعت کو اسمیں داخل قرار دیا ہے۔ معنے یہ ہیں کہ جو شخص نیک عمل کرے گا

اور نیک عمل اُسی وقت نیک کہلانے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اس کی پہلی شرط ایمان موجود ہو تو اس کو اپنے عمل سے بہتر چیز ملے گی مراد اس سے جنت کی لازوال نعمتیں اور عذاب اور ہر تکلیف سے دائمی نجات ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ خیر سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزار دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گی (مظہری)

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ، فزع ، سے مراد ہر بڑی مصیبت اور پریشانی اور گھبراہٹ ہے مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں تو ہر متقی پرہیزگار بھی انجام سے ڈرتا ہی رہتا ہے اور ڈرنا ہی چاہیئے جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ، یعنی رب کا عذاب ایسا نہیں کہ اُس سے کوئی بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ و اولیاء اُمت ہمیشہ خائف و لرزاں رہتے تھے مگر اس روز جبکہ حساب کتاب سے فراغت ہو چکے گی تو حسنہ لانے والے نیک لوگ ہر خوف و غم سے بے فکر اور مطمئن ہوں گے ۔ واللہ اعلم

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ
مجھ کو یہی حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی اور اسی

كُلُّ شَيْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا
کی ہے ہر ایک چیز اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں حکم بردار وں میں اور یہ کہ سُنا دوں

الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ
قرآن پھر جو کوئی راہ پر آیا سو راہ پر آئے گا اپنے ہی بھلے کو اور جو کوئی بھکا رہا

فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ
تو کہدے کہ میں تو یہی ہوں ڈر سُنا دینے والا اور کہہ تعریف ہے سب اللہ کو آگے دکھائیگا تم کو

اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱
اپنے نمونے تو ان کو پہچان لوگے اور تیرا رب بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو

خلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہد یجئے کہ) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالک (حقیقی) کی عبادت کیا کروں جس نے اس (شہر) کو محترم بنایا ہے (کہ حرم ہونا اسی احترام پر مرتب ہے، مطلب یہ ہے کہ عبادت میں کسی کو شریک نہ کروں) اور (اسکی عبادت کیوں نہ کیجاوے جبکہ سب چیزیں اسی کی (مِلک) ہیں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ میں (عقائد و اعمال سب میں) فرمانبردار رہوں

(یہ تو توحید کا حکم ہوا) اور (مجھ کو) یہ (بھی حکم ملا ہے) کہ میں (تم کو) قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں (یعنی احکامِ الٰہیہ کی تبلیغ کروں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے) سو (میری تبلیغ کے بعد) جو شخص راہ پر آویگا تو اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آویگا (یعنی اُسکو عذاب سے نجات اور جنت کی لازوال نعمتیں ملیں گی، میرا اُس سے کسی اپنے مالی یا جاہی نفع کا خواہاں نہیں) اور جو شخص گمراہ رہے گا تو آپ کہد یجئے کہ (میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صرف ڈرانیوالے (یعنی حکم سُنانیوالے) پیغمبروں میں سے ہوں (یعنی میرا کام تو حکم پہنچا دینا ہے، اسکے بعد میری ذمہ داری ختم ہے نہ مانوگے تو وبال تمھیں ہی بھگتنا پڑیگا) اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم جو قیامت کے آنے میں دیر کو اُسکے نہونے کی دلیل سمجھ کر انکار کرتے ہو یہ تمھاری بیوقوفی ہے کسی چیز کے واقع ہونے میں دیر لگنا اسکی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ کبھی واقع ہو ہی گی نہیں۔ اسکے علاوہ تم جو مجھ سے کہتے ہو کہ میں جلد قیامت لے آؤں یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ میں نے یہ کب دعوٰی کیا ہے کہ قیامت کا واقع کرنا میرے اختیار میں ہے بلکہ) سب خوبیاں خالص اللہ ہی کیلئے ثابت ہیں (قدرت بھی علم بھی حکمت بھی۔ وہ جب اسکی حکمت کا تقاضا ہوگا قیامت کو واقع کر دیگا۔ ہاں اتنی بات ہمیں بھی تبلادی گئی ہے کہ قیامت میں زیادہ دیر نہیں بلکہ) وہ تم کو عنقریب اپنی نشانیاں (یعنی قیامت کے واقعات) دکھلا دیگا سو تم (وقوع کے وقت) اُنکو پہچانو گے (جبکہ پہچاننے سے کوئی فائدہ نہوگا) اور (صرف یہ علامات دکھلانے پر اکتفا نہوگا بلکہ اپنے بُرے اعمال کی سزا بھی بھگتنا پڑیگی کیونکہ) آپکا رب اُن کاموں سے بے خبر نہیں جو تم سب لوگ کر رہے ہو۔

معارف و مسائل

رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ، بلدہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک مکہ مکرمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو رب العالمین اور رب السمٰوات والارض ہے مکہ مکرمہ کی تخصیص اس جگہ اسکی عظمتِ شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم و محترم ہونے کا اظہار ہے۔ لفظ حرّم تحریم سے مشتق ہے اسکے معنے مطلق احترام و اکرام کے بھی ہیں اور اس احترام و اکرام کیوجہ سے جو خاص احکامِ شرعیہ مکہ مکرمہ اور ارضِ حرم سے متعلق ہیں وہ بھی اسمیں داخل ہیں مثلاً جو شخص حرم میں پناہ لے وہ مامون ہو جاتا ہے۔ حرم میں کسی دشمن سے انتقام لینا اور قتل کرنا جائز نہیں اور ارضِ حرم میں شکار کو قتل کرنا بھی جائز نہیں، درختوں کا کاٹنا جائز نہیں۔ ان احکام کا بیان آیت وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کے تحت میں اور کچھ سورۂ مائدہ کے شروع میں اور کچھ آیت لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے تحت پہلے بیان ہو چکا۔

[الحمد للہ سورۂ نمل کی تفسیر آج شب دوشنبہ ۲۴ر شوال ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی جبکہ ۱۴ر شوال سے ہندوستان کے ہندوؤں نے مغربی پاکستان پر بھرپور حملے میدانی اور بحری اور ہوائی کر دیئے ہیں، کراچی خاص طور سے اسکا نشانہ ہے ہر رات بمباری ہوتی ہے، شہری آبادی پر بھی بم گرتے ہیں، رات مکمل اندھیرا رکھنا پڑتا ہے اور بموں کے دھماکے سے مکان لرزتے ہیں، مگر اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اُسنے ان حالات میں بھی سلسلہ اس تفسیر کا جاری رکھا، اور اس جنگ کے دس روز میں بھی تفسیر کے تقریباً چالیس صفحات لکھے گئے۔]

سُورَۃُ القَصَص

سُورَۃُ الْقَصَصِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰیَۃً وَّتِسْعُ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ قصص مکی ہے اور اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ۝۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى

یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی ہم سناتے ہیں تجھ کو کچھ احوال موسیٰ

وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۳ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ

اور فرعون کا تحقیقی ان لوگوں کے واسطے جو یقین کرتے ہیں فرعون چڑھ رہا تھا ملک میں

وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ

اور کر رکھا تھا وہاں کے لوگوں کو کئی فرقے کمزور کر رکھا تھا ایک فرقہ کو ان میں ذبح کرتا تھا اُن کے بیٹوں کو

وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۴ وَنُرِيْدُ اَنْ

اور زندہ رکھتا تھا اُنکی عورتوں کو بیشک وہ تھا خرابی ڈالنے والا اور ہم چاہتے ہیں کہ

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ

احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور ہوئے پڑے تھے ملک میں اور کر دیں اُن کو سردار اور

نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۵ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ

کر دیں اُن کو قائم مقام اور جما دیں اُن کو ملک میں اور دکھا دیں فرعون

وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝۶ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى

اور ہامان کو اور اُنکے لشکروں کو اُنکے ہاتھ سے جس چیز کا اُن کو خطرہ تھا اور ہم نے حکم بھیجا

اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ

موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اسکا تو ڈالدے اس کو دریا میں اور

لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷

نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچا دیں گے اسکو تیری طرف اور کر دیں گے اُس کو رسولوں سے

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ

پھر اُٹھالیا اُس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو اُن کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا بیشک فرعون اور

هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۸﴾ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ

ہامان اور اُن کے لشکر تھے چوکنے والے اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی

عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا

ٹھنڈک ہے میرے لئے اور تیرے لئے اسکو مت مارو، کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے یا ہم اسکو کرلیں بیٹا

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ

اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا قریب تھی کہ

لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰﴾

ظاہر کردے بیقراری کو، اگر نہ ہم نے گرہ دی ہوتی اسکے دل پر اسواسطے کہ رہے یقین کرنے والوں میں

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور کہدیا اسکی بہن کو پیچھے چلی جا پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہوکر اور اُن کو خبر نہ ہوئی

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى

اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے پھر بولی میں بتلاؤں تم کو ایک

اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ

گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لئے اور وہ اسکا بھلا چاہنے والے ہیں، پھر ہم نے پہنچادیا اسکو اسکی ماں

كَیْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ

کیطرف کہ ٹھنڈی رہے اسکی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پر

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

بہت لوگ نہیں جانتے

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر وحی کئے جاتے ہیں) کتاب واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جن میں اس مقام پر) ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر (یعنی نازل کرکے) سُناتے ہیں ان لوگوں کے (نفع کے) لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ مقاصد قصص کے یعنی عبرت اور ان سے نبوت پر استدلال وغیرہ یہ مؤمنین ہی کے ساتھ خاص ہیں خواہ اسوقت مومن ہوں یا ایمان کا ارادہ رکھتے ہوں اور اجمال تو اس قصہ کا یہ ہے کہ) فرعون

سرزمین (مصر) میں بہت چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا (اس طرح کہ قبطیوں یعنی مصری لوگوں کو معزز بنا رکھا تھا اور سبطیوں یعنی بنی اسرائیل کو پست اور خوار کر رکھا تھا جسکا آگے بیان ہے) کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا (اس طرح سے کہ) ان کے بیٹوں کو (جو نئے پیدا ہوتے تھے جلاّدوں کے ہاتھوں) ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا (تاکہ ان سے خدمت لیجاوے و نیز ان سے اندیشہ بھی نہ تھا) واقعی وہ بڑا مفسد تھا (غرض فرعون تو اس خیال میں تھا) اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دُنیوی و دینی) احسان کریں اور (وہ احسان یہ کہ) ان کو (دین میں) پیشوا بنادیں اور (دُنیا میں) ان کو (اس ملک کا) مالک بنائیں اور (مالک ہونے کے ساتھ) انکو (تملّک بھی بنائیں یعنی) زمین میں ان کو حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان (بنی اسرائیل) کی جانب سے وہ (ناگوار) واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے (مراد اس سے زوالِ سلطنت و ہلاکت ہے کہ اسی سے بچاؤ کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے بچوں کو ایک تعبیر خواب کی بنار پر جو فرعون نے دیکھا تھا اور نجومیوں نے تعبیر دی تھی قتل کر رہا تھا (کذا فی الدر المنثور) پس ہمارے قضا و قدر کے سامنے ان لوگوں کی تدبیر کچھ کام نہ آئی، یہ اجمال قصہ کا ہوا) اور (تفصیل اس کی اوّل سے یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اسی پُرآشوب زمانہ میں پیدا ہوئے تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو الہام کیا کہ (جب تک ان کا اخفا ممکن ہو) تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف و خطر) ان کو (صندوق میں رکھ کر) دریا (یعنی نیل) میں ڈالدینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا (کیونکہ) ہم ضرور ان کو پھر تمہارے ہی پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنادیں گے (غرض وہ اسی طرح دودھ پلاتی رہیں۔ پھر جب افشائے راز کا خوف ہوا تو صندوق میں بند کر کے اللہ کے نام پر نیل میں چھوڑ دیا، اسکی کوئی شاخ فرعون کے محل میں جاتی تھی یا تفریحاً فرعون کے متعلقین دریا کی سیر کو نکلے تھے۔ غرض وہ صندوق کنارے پر لگا) تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یعنی مع صندوق کے) اُٹھالیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنیں، بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارہ میں) بہت چُوکے (کہ اپنے دشمن کو اپنی بغل میں پالا) اور (جب وہ صندوق سے نکال کر فرعون کے سامنے لائے گئے تو) فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) نے (فرعون) سے کہا کہ یہ (بچہ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی اس کو دیکھ کر جی خوش ہوا کریگا تو) اس کو قتل مت کرو عجب نہیں کہ (بڑا ہو کر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچاوے یا ہم اس کو (اپنا) بیٹا ہی بنالیں اور ان لوگوں کو (انجام کی) خبر نہ تھی (کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت غارت ہوگی)

اور (ادھر یہ قصہ ہوا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (خیالات مختلفہ کے ہجوم سے) بیقرار ہوگیا (اور بیقراری بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ ایسی سخت بیقراری کہ) قریب تھا کہ (غایت بیقراری سے) وہ موسیٰ (علیہ السلام) کا حال (سب پر) ظاہر کر دیتیں اگر ہم اُن کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے رہتے کہ یہ (ہمارے وعدہ پر) یقین کئے (بیٹھی) رہیں (غرض بمشکل اُنھوں نے دل کو سنبھالا اور تدبیر شروع کی وہ یہ کہ) اُنھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی بہن (یعنی اپنی بیٹی سے) کہا ذرا موسیٰ کا سُراغ تو لگا سو (وہ چلیں اور یہ معلوم کر کے کہ صندوق محل میں کُھلا ہے محل میں پہنچیں، یا تو ان کی آمد و رفت ہوگی یا کسی حیلہ سے پہنچیں، اور) اُنھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دُور سے دیکھا اور ان لوگوں کو یہ خبر نہ تھی (کہ یہ ان کی بہن ہیں اور اس فکر میں آئی ہیں) اور ہم نے پہلے ہی سے (یعنی جب سے صندوق سے نکلے تھے) موسیٰ (علیہ السلام) پر دودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی (یعنی کسی کا دودھ نہ لیتے تھے) سو وہ (اس حال کو دیکھ کر موقع پاکر) کہنے لگیں کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جو تمھارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ (اپنی جبلت کے موافق دل سے) اس کی خیرخواہی کریں (ان لوگوں نے ایسے وقت میں کہ دودھ پلانے کی مشکل پڑ رہی تھی اس مشورہ کو غنیمت سمجھا اور ایسے گھرانے کا پتہ پوچھا اُنھوں نے اپنی والدہ کا پتہ بتلا دیا چنانچہ وہ بُلائی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام انکی گود میں دیئے گئے۔ جاتے ہی دودھ پینا شروع کر دیا اور ان لوگوں کی اجازت سے چین سے اپنے گھر لے آئیں اور گاہے گاہے لے جا کر ان کو دکھلا آتیں) غرض ہم نے موسیٰ (علیہ السلام کو اس طرح) انکی والدہ کے پاس (اپنے وعدہ کے موافق) واپس پہنچا دیا تاکہ (اپنی اولاد کو دیکھ کر) انکی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تاکہ (فراق کے) غم میں نہ رہیں اور تاکہ (مرتبہ معائنہ میں) اس بات کو (اور زیادہ یقین کے ساتھ) جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے لیکن (افسوس کی بات ہے کہ) اکثر لوگ (اسکا) یقین نہیں رکھتے (یہ تعریض ہے کفار پر)۔

معارف و مسائل

سورۂ قصص مکّی سورتوں میں سب سے آخری سُورت ہے جو ہجرت کے وقت مکہ مکرمہ اور جحفہ (رابغ) کے درمیان نازل ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ سفرِ ہجرت میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جحفہ یعنی رابغ کے قریب پہنچے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو آپ کا وطن جس میں آپ پیدا ہوئے یاد آتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں ضرور یاد آتا ہے۔ اس پر جبرئیل امین نے یہ سورت قرآن سُنائی جس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت ہے کہ انجام کار مکہ مکرمہ فتح ہو کر آپکے قبضہ میں آئے۔ وہ آیت یہ ہے اِنَّ

الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ، سورۂ قصص میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پہلے اجمال کے ساتھ پھر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ نصف سورت تک موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ اور آخر سورت میں قارون کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پورے قرآن میں کہیں مختصر کہیں مفصل بار بار آیا ہے سورۂ کہف میں تو اسکے اُس قصہ کی تفصیل آئی ہے جو خضر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا، پھر سورۂ طٰہٰ میں پورے قصہ کی تفصیل ہے اور یہی تفصیل سورۂ نمل میں بھی کچھ آئی ہے پھر سورۂ قصص میں اسکا اعادہ ہوا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کے لئے ارشاد ربانی یہ آیا ہے کہ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔ حضرات محدثین امام نسائی وغیرہ نے اس پورے قصے کی مکمل تفصیل وہاں لکھی ہے احقر نے بھی ابن کثیر کے حوالہ سے یہ مکمل تفصیل سورۂ طٰہٰ میں بیان کر دی ہے۔ اس قصہ کے متعلقہ اجزاء کی تمام بحثیں اور ضروری مسائل اور فوائد کچھ سورۂ کہف میں باقی سورۂ طٰہٰ میں ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ مسائل و مباحث کے لئے اُن کو دیکھنا کافی ہوگا یہاں صرف الفاظ آیات کی مختصر تفسیر پر اکتفا کیا جائے گا۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً الآیۃ، اس آیت میں تدبیر فرعونی کا بمقابلہ تقدیر الٰہی کے نہ صرف خائب و خاسر ہونا بلکہ فرعون اور اسکے سب اہلِ دربار کو انتہائی بے وقوف بلکہ اندھا بنانے کا ذکر ہے کہ جس لڑکے کے متعلق خواب اور تعبیر خواب کی بناء پر فرعون کو خطرہ لاحق ہوا تھا اور جس کی بناء پر بنی اسرائیل کے لاتعداد نوزائیدہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا قانون جاری کیا تھا اس کو حق تعالیٰ نے اسی فرعون کے گھر میں اسی کے ہاتھوں پرورش کرایا اور والدہ کے اطمینان کے لئے اُنہی کی گود میں حیرت انگیز طریقہ پر پہنچا دیا اور فرعون سے رضاعت کا خرچ جو بعض روایات میں ایک دینار روزانہ بتلایا گیا ہے مزید وصول کیا گیا۔ اور دودھ پلانے کا یہ معاوضہ چونکہ ایک کافر حربی سے اسکی رضامندی کے ساتھ لیا گیا ہے اسلئے اسکے جواز میں بھی کوئی اشکال نہیں۔ اور بالآخر جس خطرہ کے دُور کرنے کے لئے ساری قوم پر یہ مظالم ڈھائے تھے وہ اُسی کے گھر کے اندر سے ایک شدید لاوا بن کر پھوٹا اور خواب کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے اُس کو آنکھوں سے دکھادی وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ اِلٰی مَا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ کا یہی حاصل ہے۔

وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰۤی، وحی کا لفظ اس جگہ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، وحی نبوت مراد نہیں اسکی تحقیق سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤی اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی

اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا دی ہم نے اسکو حکمت اور سمجھ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا

نیکی والوں کو اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ

فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۙ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ

پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اسکے دشمنوں میں

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ

پھر فریاد کی اُس سے اُسنے جو تھا اسکے رفیقوں میں اسکی جو تھا اسکے دشمنوں میں پھر مُکا مارا

مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ

اسکو موسیٰ نے پھر اس کو تمام کر دیا بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے بیشک وہ دشمن ہے

مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ

بہکانے والا صریح بولا اے میرے رب میں نے بُرا کیا اپنی جان کا، سو بخش مجھ کو

فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ

پھر اسکو بخشدیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان بولا اے رب جیسا تو نے فضل

عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ

کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہونگا مددگار گناہگاروں کا پھر صبح کو اُٹھا اس شہر میں

خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ۭ

ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں جس نے کل مدد مانگی تھی اُس سے آج پھر فریاد کرتا ہے اُس سے

قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ

کہا موسیٰ نے بیشک تو بے راہ ہے صریح پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اُس پر

بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا

جو دشمن تھا ان دونوں کا بول اُٹھا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے

قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ڰ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي

خون کر چکا ہے کل ایک جان کا تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے

الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ رَجُلٌ

ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا اور آیا شہر کے

مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ

پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا کہا اے موسیٰ دربار والے مشورہ کرتے ہیں تجھ پر

لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا

کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا

يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾

راہ دیکھتا بولا اے رب بچالے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے

خلاصۂ تفسیر

اور جب (پرورش پاکر) اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (قوتِ جسمانیہ و عقلیہ سے) درست ہوگئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا (یعنی نبوت سے پہلے ہی فہم سلیم و عقلِ مستقیم جس سے حسن و قبح میں امتیاز کرسکیں عنایت فرمائی) اور ہم نیکوکاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں (یعنی عمل صالح سے فیضانِ علمی میں ترقی ہوتی ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ فرعون کے مشرب کو موسیٰ علیہ السلام نے کبھی اختیار نہ کیا تھا بلکہ اس سے نفور رہے) اور (اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایکبار) موسیٰ (علیہ السلام) شہر میں (یعنی مصر میں کذا فی الروح عن ابن اسحٰق کہیں باہر سے) ایسے وقت پہنچے کہ وہاں کے (اکثر) باشندے بے خبر (پڑے سو رہے) تھے (اکثر روایات سے یہ وقت دوپہر کا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے کچھ رات گئے کا وقت معلوم ہوتا ہے کذا فی الدر المنثور) تو انھوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ایک تو ان کی برادری (یعنی بنی اسرائیل) میں کا تھا اور دوسرا اُن کے مخالفین (یعنی فرعون کے متعلقین ملازمین) میں سے تھا (دونوں کسی بات پر اُلجھ رہے تھے اور زیادتی اس فرعونی کی تھی) سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے (جو) موسیٰ (علیہ السلام کو دیکھا تو ان) سے اسکے مقابلہ میں جو کہ انکے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی (موسیٰ علیہ السلام نے اول اسکو سمجھایا جب اسپر بھی وہ باز نہ آیا) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے (تادیباً دفع ظلم کیلئے) اس کو (ایک) گھونسا مارا سو اسکا کام بھی تمام کردیا (یعنی اتفاق سے وہ مر ہی گیا) موسیٰ (علیہ السلام اس خلاف توقع نتیجہ سے بہت پچھتائے اور) کہنے لگے کہ یہ تو شیطانی حرکت ہوگئی بیشک شیطان (بھی آدمی کا) کھلا دشمن ہے کسی غلطی میں ڈال دیتا ہے (اور نادم ہو کر حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ سے قصور ہوگیا آپ معاف کردیجئے سو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، بلاشبہ وہ غفور رحیم ہے (گو ظہور اور علم اس معافی کا قطعی طور پر وقت عطاء نبوت کے ہوا کما فی النمل اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اور اس وقت خواہ الہام سے معلوم ہوگیا ہو یا بالکل نہ معلوم ہوا ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے (توبہ عن الماضی کے ساتھ مستقبل کے متعلق یہ بھی) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار چونکہ آپ نے مجھ پر (بڑے بڑے) انعامات فرمائے ہیں (جنکا ذکر طٰہٰ میں ہے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى الیٰ قولہ وَلَا تَحْزَنَ) سو کبھی میں مجرموں کی مدد نہ کرونگا (یہاں مجرمین سے مراد وہ ہیں جو دوسروں سے گناہ کا کام کرانا چاہیں، کیونکہ گناہ کرانا کسی سے یہ بھی جُرم ہے پس اسمیں شیطان بھی داخل ہوگیا

کہ وہ گناہ کرایا کر اور گناہ کرنیوالا اسکی مدد کرتا ہے خواہ عمداً یا خطاءً جیسے اس آیت میں ہے وکان الکافر علیٰ ربہٖ ظہیراً ای للشیطان، مطلب یہ ہوا کہ میں شیطان کا کہنا کبھی نہ مانوں گا یعنی مواقع محتملہ خطاً میں احتیاط و تیقظ سے کام لونگا اور اصل مقصود اتنا ہی ہے مگر شمول حکم کے لئے مجرمین جمع کا صیغہ لایا گیا کہ اوروں کو بھی عام ہو جاوے بغرض اس اثنار میں اسکا چرچا ہو گیا مگر بجز اسرائیلی کے کوئی واقف راز نہ تھا اور چونکہ اسی کی حمایت میں یہ واقعہ ہوا تھا اس لئے اُسنے اظہار نہیں کیا اسوجہ سے کسی کو اطلاع نہوئی مگر موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ رہا، یہاں تک رات گزری) پھر موسیٰ (علیہ السلام) کو شہر میں صبح ہوئی خوف اور وحشت کیحالت میں کہ اچانک (دیکھتے کیا ہیں کہ) وہی شخص جس نے کل گزشتہ میں ان سے امداد چاہی ہے وہ پھر ان کو (مدد کے لئے) پکار رہا ہے کہ کسی اور سے اُلجھ پڑا تھا) موسیٰ (علیہ السلام یہ دیکھ کر اور کل کی حالت یاد کر کے اس پر ناخوش ہوئے اور) اس سے فرمانے لگے بیشک تو صریح بدراہ (آدمی) ہے کہ روز لوگوں سے لڑا کرتا ہے موسیٰ علیہ السلام کو قرائن سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس کی طرف سے بھی کوئی غصہ ہوا ہے لیکن زیادتی فرعونی کی دیکھ کر اس کو روکنے کا ارادہ کیا) سو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اس پر ہاتھ بڑھایا جو دونوں کا مخالف تھا (مُراد فرعونی ہے کہ وہ اسرائیلی کا بھی مخالف تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں اور وہ لوگ سب بنی اسرائیل کے مخالف تھے گویا بالتعیین موسیٰ علیہ السلام کو اسرائیلی نہ سمجھا ہو اور یا موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے طریقہ سے نفور تھے یہ امر مشہور ہو گیا ہو اسلئے فرعون والے ان کے مخالف ہو گئے ہوں۔ بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی پر ہاتھ لپکایا اور اس سے پہلے اسرائیلی پر خفا ہو چکے تھے تو اس سے اس اسرائیلی کو شبہ ہوا کہ شاید آج مجھ پر دار و گیر کرینگے تو گھبرا کر) وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ کیا (آج) مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو جیسا کہ کل ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو (معلوم ہوتا ہے کہ) بس تم دُنیا میں اپنا زور بٹھلانا چاہتے ہو اور صلح (اور ملاپ) کروانا نہیں چاہتے (یہ کلمہ اس فرعونی نے سُنا، قاتل کی تلاش ہو رہی تھی اتنا سُراغ لگ جانا بہت ہے فوراً فرعون کو خبر پہنچا دی۔ فرعون اپنے آدمی کے مارے جانے سے برہم تھا یہ سُن کر آشفتہ ہوا اور شاید اس سے اسکا وہ خواب کا اندیشہ قوی ہو گیا ہو کہ کہیں وہ شخص یہی نہ ہو، خصوصاً اگر موسیٰ علیہ السلام کا فرعونی طریقہ کو ناپسند کرنا بھی فرعون کو معلوم ہو تو کچھ عداوت اس سبب سے ہوگی اس پر یہ مزید ہوا بہرحال اس نے اپنے درباریوں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور اخیر رائے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرار پائی) اور (اس مجمع میں) ایک شخص (موسیٰ علیہ السلام کے محب اور خیر خواہ تھے وہ) شہر کے (اس) کنارے سے (جہاں یہ مشورہ ہو رہا تھا موسیٰ علیہ السلام کے پاس نزدیک کی گلیوں سے) دوڑتے ہوئے آئے (اور) کہنے لگے کہ اے موسیٰ

اہلِ دربار آپکے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ (یہاں سے) چلدیجئے میں آپ کی خیرخواہی کر رہا ہوں پس (یہ سُن کر) موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے (کسی طرف کو) نکل گئے، خوف اور وحشت کی حالت میں (اور چونکہ راستہ معلوم نہ تھا دُعا کے طور پر) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو ان ظالم لوگوں سے بچا لیجئے (اور امن کی جگہ پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى، اَشُدّ کے لفظی معنے قوت و شدّت کی انتہا پر پہنچنا ہے یعنی انسان بچپن کے ضعف سے تدریجاً قوت و شدّت کی طرف بڑھتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسکے وجود میں جتنی قوت و شدت آسکتی تھی وہ پوری ہو جائے اسوقت کو اَشُدّ کہا جاتا ہے اور یہ زمین کے مختلف خطوں اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کسی کا اشُدّ کا زمانہ جلد آجاتا ہے کسی کا دیر میں۔ لیکن حضرت ابنِ عباسؓ اور مجاہد سے بروایت عبدابن حُمَید یہ منقول ہے کہ اشُدّ عمر کے تینتیس سال میں ہوتا ہے اسی کو سنِ کمال یا سنِ وقوف کہا جاتا ہے جسمیں بدن کا نشو و نما ایک حد پر پہنچکر رُک جاتا ہے اسکے بعد چالیس کی عمر تک توقف کا زمانہ ہے اسی کو استوٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے چالیس سال کے بعد انحطاط اور کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا اشُدّ تینتیس سال کی عمر سے شروع ہو کر چالیس سال تک رہتا ہے۔ (روح و قرطبی)

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، حکم سے مراد نبوت و رسالت ہے اور علم سے مراد احکامِ الٰہیہ شرعیہ کا علم ہے۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا، المدینۃ سے مراد اکثر مفسّرین کے نزدیک شہر مصر ہے۔ اسمیں داخل ہونے کے لفظ سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام مصر سے باہر کہیں گئے ہوئے تھے پھر ایک روز اس شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جو عام لوگوں کی غفلت کا وقت تھا۔ آگے قتل قبطی کے قصہ میں اسکا بھی تذکرہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت و رسالت کا اور دینِ حق کا اظہار شروع کر دیا تھا اسی کے نتیجہ میں کچھ لوگ اُنکے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے جو اُنکے متبعین کہلاتے تھے مِنْ شِيْعَتِهٖ کا لفظ اس پر شاہد ہے۔ ان تمام قرائن سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے جو ابن اسحٰق اور ابن زید سے منقول ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ہوش سنبھالا اور دینِ حق کی کچھ باتیں لوگوں سے کہنے لگے تو فرعون ان کا مخالف ہو گیا اور قتل کا ارادہ کیا مگر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کی درخواست پر انکے قتل سے باز آیا مگر اُن کو شہر سے نکالنے کا حکم دیدیا۔ اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں کسی جگہ رہنے لگے اور کبھی کبھی چھپ کر مصر شہر میں آتے تھے، اور عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا سے مراد اکثر مفسّرین کے نزدیک دوپہر کا وقت ہے جبکہ لوگ قیلولہ میں تھے۔ (قرطبی)

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى، وکز کے معنے مکا مارنے کے ہیں فَقَضٰى عَلَيْهِ، قضاہ اور قضیٰ علیہ کا محاورہ اُسوقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا بالکل کام تمام کردے اور فارغ ہو جائے۔ اسی لئے یہاں اسکے معنی قتل کر دینے کے ہیں۔ (مظہری)

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ، اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اس قبطی کافر کا قتل جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا ارادہ صادر ہوگیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے اسکو بھی اپنے منصب نبوت و رسالت اور پیغمبرانہ عظمتِ شان کے لحاظ سے اپنا گناہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبطی کافر شرعی اصطلاح کے لحاظ سے ایک حربی کافر تھا جسکا قتل عمداً بھی مباح اور جائز تھا کیونکہ نہ یہ کسی اسلامی حکومت کا ذمی تھا نہ موسیٰ علیہ السلام سے اسکا کوئی معاہدہ تھا پھر موسیٰ علیہ السلام نے اسکو عملِ شیطان اور گناہ کیوں قرار دیا؟ اسکا قتل تو بظاہر موجبِ اجر ہونا چاہیئے تھا کہ ایک مسلمان پر ظلم کر رہا تھا اسکو بچانے کے لئے یہ قتل واقع ہوا۔

جواب یہ ہے کہ معاہدہ جیسے قولی اور تحریری ہوتا ہے جیسے عموماً اسلامی حکومتوں میں اہلِ ذمہ سے معاہدہ یا کسی غیر مسلم حکومت سے صلح کا معاہدہ اور یہ معاہدہ باتفاق واجب العمل اور اسکی خلاف ورزی غدر اور عہد شکنی کے سبب حرام ہوتی ہے اسی طرح معاہدہ عملی بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہوتا ہے اس کی بھی پابندی لازمی اور خلاف ورزی عہد شکنی کے مرادف ہے۔

معاہدہ عملی کی صورت یہ ہے کہ جس جگہ مسلمان اور کچھ غیر مسلم کسی دوسری حکومت میں باہمی امن و اطمینان کے ساتھ رہتے بستے ہوں، ایک دوسرے پر حملہ کرنا یا لُوٹ مار کرنا طرفین سے غداری سمجھا جاتا ہو تو اس طرح کی معاشرت اور معاملات بھی ایک قسم کا عملی معاہدہ ہوتے ہیں اُنکی خلاف ورزی جائز نہیں اسکی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی وہ طویل حدیث ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الشروط میں مفصل روایت کیا ہے اور واقعہ اسکا یہ تھا کہ حضرت مغیرہ ابن شعبہ قبل از اسلام اپنے زمانۂ جاہلیت میں ایک جماعت کفار کے ساتھ مصاحبت اور معاشرت رکھتے تھے پھر انکو قتل کر کے انکے اموال پر قبضہ کر لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے اور جو مال ان لوگوں کا لیا تھا وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اس پر آپ نے ارشاد فرمایا، اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منہ فی شیئ اور ابو داؤد کی روایت میں اسکے الفاظ یہ ہیں، اما المال فمال غدر لاحاجۃ لنا فیہ، یعنی آپ کا اسلام تو ہمنے قبول کر لیا اور اب آپ مسلمان ہیں مگر یہ مال ایسا مال ہے جو غدر اور عہد شکنی سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہمیں اس مال کی کوئی حاجت نہیں۔

شارح بخاری حافظ ابن حجر نے شرح میں فرمایا کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ کفار کا مال حالتِ امن میں لُوٹ لینا حلال نہیں کیونکہ ایک بستی کے رہنے والے یا ایک ساتھ کام کرنے والے

ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھتے ہیں اُن کا یہ عملی معاہدہ بھی ایک امانت ہے جس کا صاحب امانت کو ادا کرنا فرض ہے چاہے وہ کافر ہو یا مسلم۔ اور کفار کے اموال جو مسلمانوں کے لئے حلال ہوتے ہیں تو وہ صرف محاربہ اور مغالبہ کی صورت میں حلال ہوتے ہیں، حالتِ امن و امان میں جبکہ ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھ رہا ہو کسی کافر کا مال لُوٹ لینا جائز نہیں اور قسطلانی نے شرح بخاری میں فرمایا

ان اموال المشرکین ان کانت مغنومۃ عند القھر فلا یحل اخذھا عند الامن فاذا کان الانسان مصاحبا لھم فقد امن کل واحد منھم صاحبہ فسفک الدماء واخذ المال مع ذٰلک غدر حرام الا ان ینبذ الیھم عھدھم علی سواء

بیشک مشرکین کے اموال جنگ اور جہاد کے وقت مغنوم و مباح ہیں لیکن امن کی حالت میں حلال نہیں اسلئے جو مسلمان کفار کے ساتھ رہتا سہتا ہو کہ عملی طور پر ایک دوسرے سے مامون ہو تو ایسی حالت میں کسی کافر کا خون بہانا یا مال زبردستی لینا غدر حرام ہے جب تک کہ اُن کے اس عملی معاہدہ سے دست برداری کا اعلان نہ کردے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبطی کا قتل اس عملی معاہدہ کی بنا پر اگر بالقصد ہوتا تو جائز نہیں تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ اسرائیلی شخص کو اسکے ظلم سے بچانے کے لئے ہاتھ کی ضرب لگائی جو عادۃً سببِ قتل نہیں ہوتی مگر قبطی اس ضرب سے مرگیا تو موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ اسکو دفع کرنے کے لئے اس ضرب سے کم درجہ بھی کافی تھا یہ زیادتی میرے لئے درست نہ تھی، اسی لئے اسکو عمل شیطان قرار دے کر اُس سے مغفرت طلب فرمائی۔

فائدہ یہ تحقیق حکیم الامۃ مجدد الملۃ سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو آپ نے بزبانِ عربی احکام القرآن سورۂ قصص لکھتے وقت ارشاد فرمائی تھی اور یہ آخری علمی تحقیق ہے جس کا استفادہ احقر نے حضرت رح سے کیا کیونکہ آپ نے یہ ارشاد ۲ رجب ۱۳۶۲ھ میں فرمایا تھا اس کے بعد مرض کی شدت بڑھی اور ۱۶ رجب کو یہ آفتاب عالم غروب ہوگیا اناللہ وانا الیہ راجعون

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ قبطی کا قتل مباح تھا مگر انبیاء علیہم السلام مباحات میں بھی اہم معاملات میں اسوقت تک اقدام نہیں کرتے جب تک خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت واشارہ نہ ملے، اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خصوصی اجازت کا انتظار کئے بغیر یہ اقدام فرمایا تھا اسلئے اپنی شان کے مطابق اس کو گناہ قرار دے کر استغفار کیا (کذا فی الروح وغیرہ ولہ وجہ)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس لغزش کو جب حق تعالیٰ نے معاف فرما دیا تو آپ نے اس نعمت کے شکر میں یہ عرض کیا کہ میں آئندہ کسی مجرم کی مدد نہ کرونگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس اسرائیلی کی مدد کے لئے یہ اقدام کیا تھا دوسرے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ وہ خود ہی جھگڑالو ہی، جھگڑا لڑائی اسکی عادت ہے

اسلئے اس کو مجرم قرار دے کر آئندہ کسی ایسے شخص کی مدد نہ کرنے کا عہد فرمایا۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ مجرمین کی تفسیر کافرین کے ساتھ منقول ہے اور قتادہ نے بھی تقریباً ایسا ہی فرمایا ہے اس تفسیر کی بنا پر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلی جس کی امداد موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی یہ بھی مسلمان نہ تھا مگر اُس کو مظلوم سمجھ کر امداد فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد سے دو مسئلے ثابت ہوئے۔

مسئلہ اول یہ کہ مظلوم اگرچہ کافر یا فاسق ہی ہو اُس کی امداد کرنا چاہیئے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم ظالم کی مدد کرنا جائز نہیں۔ علماء نے اس آیت سے استدلال فرما کر ظالم حکام کی ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ وہ بھی اُن کے ظلم کے شریک سمجھے جائیں گے اور اس پر سلف صالحین سے متعدد روایات نقل کی ہیں (کما فی روح المعانی) کفار یا ظالموں کی امداد و اعانت کی مختلف صورتیں ہیں اور انکے احکام کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ احقر نے احکام القرآن میں بزبان عربی اسی آیت کے ذیل میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح لکھدی ہے اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ
اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا اُمید ہے کہ میرا رب لے جائے مجھ کو سیدھی

السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ
راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی

يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا
پانی پلاتے ہوئے، اور پایا اُن سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمھارا

خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ
کیا حال ہے بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیرلے جانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے

كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ
بڑی عمر کا پھر اُسنے پانی پلا دیا انکے جانوروں کو پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کیطرف، بولا اے رب تو جو چیز

اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى
اُتارے میری طرف اچھی میں اُسی کا محتاج ہوں پھر آئی اسکے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی

اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ
شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بُلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اسکا کہ تونے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں

لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ڨ نَجَوْتَ
کو پھر جب پہنچا اسکے پاس اور بیان کیا اُس سے احوال، کہا مت ڈر بچ آیا تو

مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ
اس قوم بے انصاف سے بولی ان دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ
البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانتدار کہا میں چاہتا ہوں کہ

اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ
بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ

حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ
برس پھر اگر تو پورے کردے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر

اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ
تکلیف ڈالوں، تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا

ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ
یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں، سو زیادتی نہ ہو مجھ پر

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع
اور اللہ پر بھروسہ اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور جب موسیٰ (علیہ السلام یہ دعا کر کے ایک سمت کو توکلاً علی اللہ چلے اور بتائید غیبی) مدین کی طرف ہولئے (چونکہ راستہ معلوم نہ تھا اسلئے تقویت و توکل اور نفس کو تسکین دینے کے لئے آپ ہی آپ) کہنے لگے کہ اُمید ہے کہ میرا رب مجھ کو (کسی مقامِ امن کا) سیدھا رستہ چلا دیگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدین جا پہنچے) اور جب مدین کے پانی (یعنی کنویں) پر پہنچے تو اس پر (مختلف) آدمیوں کا ایک مجمع دیکھا جو (اس کنویں سے کھینچ کھینچ کر اپنے مواشی کو) پانی پلا رہے تھے اور ان لوگوں سے ایک طرف (الگ) دو عورتیں دیکھیں کہ وہ (اپنی بکریاں) روکے کھڑی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان سے) پوچھا تمہارا کیا مطلب ہے وہ دونوں بولیں کہ (ہمارا معمول یہ ہے کہ) ہم (اپنے جانوروں کو) اسوقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک کہ یہ چرواہے (جو کنویں پر پانی پلا رہے ہیں) پانی پلا کر (جانوروں کو) ہٹا کر نہ لیجاویں (ایک تو حیا کے سبب، دوسرے مردوں سے مزاحمت ناتوانوں سے کب ہوسکتی ہے) اور (اس حالت میں ہم آتے بھی نہیں مگر) ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں (اور گھر پر اور کوئی کام کرنے والا ہی نہیں اور کام ضروری ہے اس مجبوری کو ہم کو آنا پڑتا ہے) بس (یہ سنکر)

موسیٰ (علیہ السلام کو رحم آیا اور انہوں نے) ان کے لئے پانی (کھینچ کر انکے جانوروں کو) پلایا (اور ان کو انتظار اور پانی کھینچنے کی تکلیف سے بچایا) پھر (وہاں سے) ہٹ کر (ایک) سایہ (کی جگہ) میں جا بیٹھے (خواہ کسی پہاڑ کا سایہ ہو یا کسی درخت کا) پھر (جناب باری میں) دُعا کی کہ اے میرے پروردگار (اسوقت) جو نعمت بھی (قلیل یا کثیر) آپ مجھ کو بھیجدیں میں اسکا (سخت) حاجتمند ہوں (کیونکہ اس سفر میں کچھ کھانے پینے کو نہ ملا تھا۔ حق تعالیٰ نے اسکا یہ سامان کیا کہ وہ دونوں بیبیاں اپنے گھر لوٹ کر گئیں تو باپ نے معمول سے جلدی آجانے کی وجہ دریافت کی، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پورا قصہ بیان کیا انہوں نے ایک لڑکی کو بھیجا کہ اُن کو بلا لاؤ) موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لڑکی آئی کہ شرماتی ہوئی چلتی تھی (جو کہ اہلِ شرف کی طبعی حالت ہے اور آکر) کہنے لگی کہ میرے والد تمکو بلاتے ہیں تاکہ تم کو اسکا صلہ دیں جو تمنے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلا دیا تھا (یہ ان صاجزادی کو اپنے والد کی عادت سے معلوم ہوا ہوگا کہ احسان کی مکافات کیا کرتے ہونگے۔ موسیٰ علیہ السلام ساتھ ہو لئے گو مقصود موسیٰ علیہ السلام کا بالیقین اپنی خدمت کا معاوضہ لینا نہ تھا، لیکن مقام امن اور کسی رفیق شفیق کے ضرور باقتضائے وقت جویاں تھے، اور اگر بھوک کی شدت بھی اس جانے کا ایک جزو علت ہو تو مضائقہ نہیں اور اس کو اُجرت سے کچھ تعلق نہیں اور ضیافت کی تو استدعا بھی بالخصوص حاجت کے وقت اور خصوصاً کریم و شریف آدمی سے کچھ ذلت نہیں چہ جائیکہ دوسرے کی استدعا پر ضیافت کا قبول کر لینا، راہ میں موسیٰ علیہ السلام نے ان بی بی سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ میں اولاد ابراہیم سے ہوں، اجنبیہ کو بے وجہ بے قصد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، غرض اسی طرح ان بزرگ کے پاس پہنچے) سو جب اُن کے پاس پہنچے اور ان سے تمام حال بیان کیا تو انہوں نے (تسلی دی اور) کہا کہ (اب) اندیشہ نہ کرو تم ظالم لوگوں سے بچ آئے (کیونکہ اس مقام پر فرعون کی عملداری نہ تھی کذا فی الروح، پھر) ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے اور ہم سیانی ہو گئیں اب گھر میں رہنا مناسب ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو (اور ان میں دونوں صفتیں ہیں، چنانچہ قوت انکے پانی کھینچنے سے اور امانت ان کے برتاؤ سے، خصوصاً راہ میں عورت کو پیچھے کر دینے سے ظاہر ہوتی تھی اور اپنے باپ سے بھی بیان کیا تھا اس پر) وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (اور اس نوکری کا بدلہ وہی نکاح ہے، حاصل یہ کہ آٹھ سال کی خدمت اس نکاح کا مہر ہے) پھر اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے (احسان) ہے (یعنی میری طرف سے جبر نہیں) اور میں (اس معاملہ میں) تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (یعنی

کام لینے اور وقت کی پابندی وغیرہ معاملہ کی فروعات میں آسانی برتوں گا اور) تم مجھ کو انشاء اللہ تعالیٰ خوش معاملہ پاؤ گے موسیٰ (علیہ السلام رضامند ہو گئے اور) کہنے لگے کہ (بس تو) یہ بات میرے اور آپکے درمیان (پکی) ہو چکی، میں ان دونوں مدتوں میں سے جس (مدت) کو بھی پورا کر دوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا اور ہم جو (معاملہ) کی بات چیت کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اسکا گواہ (کافی) ہے (اسکو حاضر ناظر سمجھ کر عہد پورا کرنا چاہیئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ، مَدْيَنَ ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے جو مدین بن ابراہیمؑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ فرعونی حکومت سے خارج تھا۔ مصر سے مدین کی مسافت آٹھ منزل کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعونی سپاہیوں کے تعاقب کا طبعی خوف پیش آیا، جو نہ نبوت و معرفت کے منافی ہے نہ توکل کے، تو مصر سے ہجرت کا ارادہ کیا اور مدین کی سمت شاید اسلئے متعین کی کہ مدین بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام کی بستی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کی اولاد میں تھے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل بے سرو سامانی کے ساتھ اسطرح مصر سے نکلے کہ نہ کوئی توشہ ساتھ تھا نہ کوئی سامان اور نہ راستہ معلوم، اسی اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کیطرف متوجہ ہوئے اور فرمایا عَسٰى رَبِّيٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ، یعنی امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا قبول فرمائی۔ مفسرین کا بیان ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غذا صرف درختوں کے پتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سب سے پہلا ابتلاء اور امتحان تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ابتلاءات اور امتحانات کی تفصیل سُورۂ طٰہٰ میں ایک طویل حدیث کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَاۗءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ، مَاۗءَ مَدْيَنَ سے مُراد وہ کنواں ہے جس سے اس بستی کے لوگ اپنے مواشی کو پانی پلاتے تھے وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ، یعنی دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی کیطرف جانے سے روک رہی تھیں تاکہ اُن کی بکریاں دوسرے لوگوں کی بکریوں میں رَل نہ جائیں۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَاۗءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ، لفظ خطب شان اور حال کے معنے میں جبکہ وہ کوئی مہم کام ہو۔ معنے یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں سے پُوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے کہ تم اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہو دوسرے لوگوں کی طرح کنوئیں کے پاس لاکر پانی نہیں پلاتیں؟ ان دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہماری عادت یہی ہے کہ ہم مردوں

کے ساتھ اختلاط سے بچنے کے لئے اسوقت تک اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں جب تک یہ لوگ کنویں پر رہتے ہیں، جب یہ چلے جاتے ہیں تو ہم اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں اور اسمیں جو یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا تمھارا کوئی مرد نہیں جو عورتوں کو اس کام کے لئے نکالا؟ اسکا جواب بھی ان عورتوں نے ساتھ ہی دیدیا کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف العمر ہیں وہ یہ کام نہیں کر سکتے اسلئے ہم مجبور ہوئے ۔

اس واقعہ سے چند اہم فوائد حاصل ہوئے ۔ اوّل یہ کہ ضعیفوں کی امداد انبیاء کی سنت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو عورتوں کو دیکھا کہ بکریوں کو پانی پلانے کے لئے لائی ہیں مگر اُن کو لوگوں کے ہجوم کے سبب موقع نہیں مل رہا تو ان سے حال دریافت کیا۔ دوسرا یہ کہ اجنبی عورت سے بوقت ضرورت بات کرنے میں مضائقہ نہیں جب تک کہ کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ اگرچہ یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جبکہ عورتوں پر پردہ لازم نہیں تھا جسکا سلسلہ اسلام کے بھی ابتدائی زمانہ تک جاری رہا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد عورتوں کے لئے پردہ کے احکام نازل ہوئے، لیکن اسوقت بھی پردہ کا جو اصل مقصد ہے وہ طبعی شرافت اور حیاء کے سبب عورتوں میں موجود تھا کہ ضرورت کے باوجود مردوں کے ساتھ اختلاط گوارا نہ کیا اور تکلیف اُٹھانا قبول کیا۔ چوتھا یہ کہ عورتوں کا اس طرح کے کاموں کے لئے باہر نکلنا اسوقت بھی پسندیدہ نہیں تھا اسی لئے اُنھوں نے اپنے والد کے معذور ہونے کا عذر بیان کیا ۔

فَسَقٰى لَهُمَا ، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں پر رحم کھا کر کنویں سے پانی نکال کر ان کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ چرواہوں کی عادت یہ تھی کہ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد کنویں کو ایک بھاری پتھر سے بند کر دیتے تھے اور یہ عورتیں اپنی بکریوں کے لئے بچے کھچے پانی پر اکتفا کرتی تھیں۔ یہ بھاری پتھر ایسا تھا جس کو دس آدمی مل کر اُٹھاتے تھے مگر موسیٰ ؑ نے اس کو تنہا اُٹھا کر الگ کر دیا اور کنویں سے پانی نکالا۔ شاید اسی وجہ سے ان عورتوں میں سے ایک نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے والد سے یہ کہا کہ یہ قوی ہیں۔ (قرطبی)

ثُمَّ تَوَلّٰىٓ اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سات روز سے کوئی غذا نہیں چکھی تھی، اسوقت ایک درخت کے سائے میں آکر اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حالت اور حاجت پیش کی جو دُعا کرنے کا ایک لطیف طریقہ ہے۔ لفظ خیر کبھی مال کے معنے میں آتا ہے جیسا اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ میں ہے، کبھی قوت کے معنے میں آتا ہے جیسے اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ میں کبھی کھانے کے معنے میں بھی آتا ہے جو اس جگہ مراد ہے (قرطبی)

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ، قرآنی اسلوب کے مطابق یہاں قصہ کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ پورا واقعہ یہ ہوا کہ یہ عورتیں اپنے مقررہ وقت سے پہلے جلدی سے گھر پہنچ گئیں تو انکے والد نے وجہ دریافت کی، لڑکیوں نے واقعہ بتلایا۔ والد نے چاہا کہ اس شخص نے احسان کیا ہے

اُس کی مکافات کرنا چاہیئے اسلئے انھیں لڑکیوں میں سے ایک کو اُن کے بُلانے کے لئے بھیجا۔ یہ حیا کے ساتھ چلتی ہوئی پہنچی۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ باوجود پردہ کے باقاعدہ احکام نازل نہ ہونے کے نیک عورتیں مَردوں سے بے محابا خطاب نہ کرتی تھیں ضرورت کی بنا پر یہ وہاں پہنچی تو حیا کے ساتھ بات کی جسکی صورت بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ اپنے چہرہ کو آستین سے چھپا کر گفتگو کی۔ روایاتِ تفسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسکے ساتھ چلنے لگے تو لڑکی سے کہا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ اور زبان سے مجھے راستہ بتاتی رہو۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی نظر لڑکی پر نہ پڑے شاید اسی سبب سے لڑکی نے اپنے والد سے ان کے متعلق انکے امین ہونے کا ذکر کیا۔ ان لڑکیوں کے والد کون تھے اسمیں مفسرین نے اختلاف نقل کیا ہے مگر آیاتِ قرآن سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے جیسا کہ قرآن میں ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (قرطبی)

اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ، یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی خود ہی اپنی طرف سے ان کو دعوت دیتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے والد کا پیغام سُنایا کیونکہ کسی اجنبی مرد کو خود دعوت دینا حیا کے خلاف تھا۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ، یعنی شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کو گھر کے کاموں کے لئے ملازم کی ضرورت ہے آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ ملازم میں دو صفتیں ہونا چاہئیں ایک کام کی قوت و صلاحیت دوسرے امانتداری۔ ہمیں ان کے پتھر اُٹھا کر پانی پلانے سے ان کی قوت و قدرت کا، اور راستہ میں لڑکی کو اپنے پیچھے کر دینے سے امانتداری کا تجربہ ہو چکا ہے۔

کوئی ملازمت یا عہدہ سُپرد کرنے کے لئے اہم شرطیں دو ہیں

حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کی بات جاری فرمائی۔ آجکل سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کیلئے کام کی صلاحیت اور ڈگریوں کو تو دیکھا جاتا ہے مگر دیانت و امانت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام دفتروں اور عہدوں کی کارروائی میں پوری کامیابی کے بجائے رشوت خوری، اقربا پروری وغیرہ کی وجہ سے قانون معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ کاش لوگ اس قرآنی ہدایت کی قدر کریں تو سارا نظام درست ہو جائے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ، یعنی لڑکیوں کے والد حضرت شعیب علیہ السلام نے خود ہی اپنی طرف سے اپنی لڑکی کو ان کے نکاح میں دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے ولی کو چاہیئے کہ کوئی مرد صالح ملے تو اسکا انتظار نہ کرے کہ اسی کی طرف سے نکاح کے معاملہ کی تحریک ہو، بلکہ خود بھی پیش کر دینا سُنّتِ انبیاء ہے جیسا کہ عمر بن خطابؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد از خود ہی صدیق اکبرؓ اور عثمان غنیؓ سے اُن کے نکاح کی پیش کش کی تھی۔ (قرطبی)

اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ، حضرت شعیب علیہ السلام نے دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو معین کر کے گفتگو نہیں فرمائی بلکہ اس کو مبہم رکھا کہ انمیں سے کسی ایک کو آپکے نکاح میں دینے کا ارادہ ہے مگر چونکہ یہ گفتگو باقاعدہ عقد نکاح کی گفتگو نہ تھی جسمیں ایجاب و قبول گواہوں کے سامنے ہونا شرط ہے بلکہ معاملہ کی گفتگو تھی کہ آپ کو آٹھ سال کی نوکری اس نکاح کے عوض میں منظور ہو تو ہم نکاح کر دیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر معاہدہ کر لیا۔ آگے یہ خود بخود ظاہر ہے کہ باقاعدہ نکاح کیا گیا ہوگا۔ اور قرآن کریم عموماً قصہ کے اُن اجزاء کو ذکر نہیں کرتا جن کا وقوع سیاق و سباق سے ظاہر اور یقینی ہو۔ اس تحقیق کی بناء پر یہاں یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ زوجہ منکوحہ کو متعین کئے بغیر نکاح کیسے ہو گیا یا گواہوں کے بغیر کیسے ہو گیا (کذا فی الروح وبیان القرآن)

عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ، یہ آٹھ سال کی ملازمت و خدمت نکاح کا مہر قرار دیا گیا اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی خدمت و ملازمت کو اسکا مہر قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی مکمل تحقیق مع دلائل کے بزبان عربی احکام القرآن سورۂ قصص میں مفصل لکھدی گئی ہے اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ معاملہ مہر کا شریعت محمدیہ کے لحاظ سے درست نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ شریعت شعیب علیہ السلام میں درست ہو اور شرائع انبیاء میں ایسے فرعی فرق ہونا نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رح سے ظاہر الروایت میں یہی صورت منقول ہے کہ خدمت زوجہ کو مہر نہیں بنایا جا سکتا مگر ایک روایت جس پر علماء متاخرین نے فتویٰ دیا ہے یہ ہے کہ خود بیوی کی خدمت کو مہر بنانا تو شوہر کی تکریم و احترام کے خلاف ہے مگر بیوی کا کوئی ایسا کام جو گھر سے باہر کیا جاتا ہے جیسے مواشی چرانا یا کوئی تجارت کرنا اگر اسمیں شرائط اجارہ کے مطابق مدت معین کر دی گئی ہو جیسا کہ اس واقعہ میں آٹھ سال کی مدت معین ہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس مدت کی ملازمت کی تنخواہ جو بیوی کے ذمہ لازم ہو تو اس تنخواہ کو مہر قرار دینا جائز ہے (ذکرہ فی البدائع عن نوادر ابن سماعہ)

ہاں ایک دوسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ مہر تو بیوی کا حق ہے بیوی کے باپ یا کسی عزیز کو بغیر اجازت زوجہ مہر کی رقم نقد بھی دے دی جائے تو مہر ادا نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں اَنْ تَاْجُرَنِيْ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ والد نے ان کو اپنے کام کے لئے ملازم رکھا تو ملازمت کا جو معاوضہ ہے وہ والد کو ملا، تو یہ زوجہ کا مہر کیسے بن گیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بکریاں لڑکیوں ہی کی ملک ہوں اور یہ ملازمت کا فائدہ اس حیثیت سے خود لڑکی کو پہنچا۔ دوسرے اگر باپ ہی کا کام انجام دیا اور اس کی تنخواہ والد کے ذمہ لازم ہوئی تو یہ زر مہر لڑکی کا ہو گیا لڑکی کی اجازت سے والد کو بھی اسکا استعمال درست ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ یہ معاملہ لڑکی کی اجازت سے ہوا ہے۔

مسئلہ لفظ اُنْكِحَكَ سے ثابت ہوا کہ نکاح کا معاملہ والد نے کیا ہے باجماع فقہاء ایسا ہی ہونا چاہئے کہ لڑکی کا ولی اُسکے نکاح کے معاملہ کی کفالت کرے، لڑکی خود اپنا نکاح نہ کرے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی لڑکی نے خود اپنا نکاح کسی ضرورت و مجبوری سے کرلیا تو وہ منعقد ہوجاتا ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور یہ آیت اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیتی۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ

پھر جب پوری کرچکا موسیٰ وہ مدت اور لیکر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک

نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا

آگ کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں

بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا

کی کچھ خبر یا انگارا آگ کا تاکہ تم تاپو پھر جب پہنچا اسکے

نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ

پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے تختہ میں ایک

الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ

درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب اور یہ کہ ڈالدے

عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ

اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی شکل اُلٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر

يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ

اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں ڈال اپنا ہاتھ اپنے

فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ

گریبان میں نکل آئے سفید ہوکر نہ کہ کسی بُرائی سے اور ملالے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے

الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا

سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اسکے سرداروں پر بیشک وہ تھے

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ

لوگ نافرمان بولا اے رب میں نے خون کیا ہے اُن میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو

يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ

مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون اسکی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ

رِدۡاً يُّصَدِّقُنِيۡۤ ۖ اِنِّيۡۤ اَخَافُ اَنۡ يُّكَذِّبُوۡنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ

مدد کو کہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں فرمایا ہم مضبوط کردیں گے تیرے بازو کو

بِاَخِيۡكَ وَنَجۡعَلُ لَـكُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا يَصِلُوۡنَ اِلَيۡكُمَا ۛۚ بِاٰيٰتِنَاۤ ۛۚ

تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے

اَنۡـتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۳۵﴾

تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے

معانقہ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

غرض جب موسیٰ (علیہ السلام) اس مدت کو پورا کر چکے اور (باجازت شعیب علیہ السلام کے) اپنی بی بی کو لے کر (مصر کو یا شام کو) روانہ ہوئے تو (ایک شب میں ایسا اتفاق ہوا کہ سردی بھی تھی اور راہ بھی بھول گئے اسوقت) ان کو کوہ طور کی طرف سے ایک (روشنی بشکل) آگ دکھلائی دی، انھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں تمھارے پاس وہاں سے (رستہ کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی آگ کا (دہکتا ہوا) انگارا لے آؤں تاکہ تم سینک لو، سو وہ جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ میں رب العالمین ہوں اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنا عصا ڈالدو (چنانچہ انھوں نے ڈالدیا اور وہ سانپ بن کر چلنے لگا) سو انھوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم ہوا کہ) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت (ہر طرح امن میں ہو (اور یہ کوئی ڈر کی بات نہیں بلکہ تمھارا معجزہ ہے اور دوسرا معجزہ اور عنایت ہوتا ہے کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بلا کسی مرض کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا اور (اگر مثل انقلاب عصا کے اس معجزہ سے بھی طبعاً خوف اور حیرت پیدا ہو تو) خوف (رفع کرنے) کے واسطے اپنا (وہ) ہاتھ (پھر) اپنے گریبان اور بغل) سے (بدستور سابق) ملا لینا (تاکہ وہ پھر اصلی حالت پر ہوجائے اور پھر طبعی خوف بھی نہ ہوا کرے) سو یہ (تمھاری نبوت کی) دو سندیں (اور دلیلیں) ہیں تمھارے رب کیطرف سے فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس جانے کے واسطے (جسکا تم کو حکم کیا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب (میں جانے کے لئے حاضر ہوں مگر آپ کی خاص امداد کی ضرورت ہے کیونکہ) میں نے ان میں سے ایک آدمی کا خون کردیا تھا سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ (کہیں پہلے ہی) وہ لوگ مجھ کو قتل کردیں (تبلیغ بھی نہونے پاوے)

اور (دوسری بات یہ ہے کہ زبان بھی زیادہ رواں نہیں ہے اور) میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو اُن کو بھی میرا مددگار بناکر میرے ساتھ رسالت دیدیجئے کہ (وہ میری تقریر کی تائید اور) تصدیق (مفصّل اور مکمل طور سے) کریں گے (کیونکہ) مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اور اسکے درباری) میری تکذیب کریں (تو اسوقت مناظرہ کی ضرورت ہوگی اور زبانی مناظرہ کے لئے عادۃً وہ آدمی زیادہ مفید ہوتا ہی جو رواں زبان ہو) ارشاد ہوا کہ (بہتر ہے) ہم ابھی تمھارے بھائی کو تمھارا قوتِ بازو بنائے دیتے ہیں (ایک درخواست تو یہ منظور ہوئی) اور (دوسری درخواست کی منظوری اس طرح ہوئی کہ) ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت (وہیبت) عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی (پس) ہمارے معجزے لیکر جاؤ تم دونوں اور جو تمھارا پیرو ہوگا (اُن لوگوں پر) غالب رہوگے۔

معارف و مسائل

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ، یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے مدّتِ معینہ ملازمت کی پوری کردی جو آٹھ سال لازمی اور دو سال اختیاری تھی سو یہاں سوال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف آٹھ سال پورے کئے یا دس سال ۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اُنھوں نے زیادہ مدت یعنی دس سال پورے کئے کہ انبیاء علیہم السّلام کی یہی شان ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اس کو پُورا کرتے ہیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی بھی عادت شریفہ تھی کہ حقدار کو اُسکے حق سے زائد ادا فرماتے تھے اور اُمّت کو اسی کی ہدایت فرمائی ہے کہ ملازمت، اُجرت اور خرید و فروخت میں مساہلت اور ایثار سے کام لیا جائے۔

نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (الیٰ) اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ، یہ مضمون بضمن قصہ موسیٰ علیہ السّلام سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نمل میں گزرا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ اور سُورۂ نمل میں ہے نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ اور اس سُورت میں ہے اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یہ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں مگر معنی تقریباً ایک ہی ہیں، واقعہ کی حکایت ہر مقام کے مناسب الفاظ سے کی گئی ہے (کذا قال الامام) اور یہ تجلّی بشکلِ نار تجلی مثالی تھی کیونکہ تجلّی ذاتی کا مشاہدہ اس دُنیا میں کسی کو نہیں ہوسکتا اور خود موسیٰ علیہ السلام کو اس تجلّی ذاتی کے اعتبار سے لَنْ تَرٰىنِیْ فرمایا گیا ہے یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے مراد مشاہدۂ ذاتِ حق ہے۔

نیک عمل سے جگہ بھی متبرک ہوجاتی ہے

فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ، کوہِ طور کے اس مقام کو قرآن کریم نے بُقعہ مبارکہ فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اسکے مبارک ہونے کا سبب یہ تجلّی خداوندی ہے جو اس مقام پر بشکلِ نار دکھائی دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس مقام میں کوئی نیک عمل اہم واقع

ہوتا ہے وہ مقام بھی متبرک ہو جاتا ہے۔

وعظ میں اچھی خطابت اور فصاحت مطلوب ہے | ھُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا ، اس سے معلوم ہوا کہ وعظ و تبلیغ میں فصاحتِ کلام اور مقبول طرزِ خطابت محمود اور مطلوب ہے۔ اسکی تحصیل میں کوشش بھی مذموم نہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ

پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ لے کر ہماری نشانیاں کھلی ہوئی بولے اور کچھ نہیں یہ جادو ہے

مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ

باندھا ہوا اور ہم نے سُنا نہیں یہ اپنے اگلے باپ دادوں میں اور کہا

مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ

موسیٰ نے میرا رب تو خوب جانتا ہے جو کوئی لایا ہے ہدایت کی بات اُس کے پاس سے اور جس کو

تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ

ملے گا آخرت کا گھر بیشک بھلا نہ ہوگا بے انصافوں کا اور بولا

فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ

فرعون اے دربار والو مجھ کو تو معلوم نہیں تمہارا کوئی حاکم ہو میرے سوا سو آگ دے اے

يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ

ہامان میرے واسطے گارے کو پھر بنا میرے واسطے ایک محل تاکہ میں جھانک کر دیکھ لوں موسیٰ

مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ

کے رب کو اور میری اٹکل میں تو وہ جھوٹا ہے اور بڑائی کرنے لگے وہ اور

جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا

اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ

يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ

آئیں گے پھر پکڑا ہم نے اسکو اور اسکے لشکروں کو، پھر پھینک دیا ہم نے اُن کو دریا میں سو دیکھ لے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ

کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ

اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ

کی طرف اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی اور پیچھے رکھدی ہم نے ان پر اس

الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع

دُنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن اُن پر بُرائی ہے

خُلاصۂ تفسیر

غرض جب ان لوگوں کے پاس موسٰی (علیہ السلام) ہماری صریح دلیلیں لے کر آئے تو ان لوگوں نے (معجزات دیکھ کر) کہا کہ یہ تو محض ایک جادو ہے کہ (خواہ مخواہ خدا تعالیٰ پر) افترا کیا جاتا ہے (کہ یہ اسکی جانب سے معجزات اور دلیلِ رسالت ہیں) اور ہمنے ایسی بات کبھی نہیں سنی کہ ہمارے اگلے باپ دادوں کے وقت میں بھی ہوئی ہو اور موسٰی (علیہ السلام) نے (اسکے جواب میں) فرمایا کہ (جب باوجود دلائل صحیحہ قائم ہونے کے اور اسمیں کوئی شبہ معقول نہ نکال سکنے کے بعد بھی نہیں مانتے تو یہ ہٹ دھرمی ہے اور اسکا اخیر جواب یہی ہے کہ) میرا پروردگار اس شخص کو خوب جانتا ہے جو صحیح دین اسکے پاس سے لیکر آیا ہی اور جسکا انجام (یعنی خاتمہ) اس عالم (دُنیا) سے اچھا ہونے والا ہے (اور) بالیقین ظالم لوگ (جو کہ ہدایت اور دین صحیح پر نہ ہوں) کبھی فلاح نہ پاویں گے (کیونکہ ان کا انجام اچھا نہوگا۔ مطلب یہ کہ خدا کو خوب معلوم ہے کہ ہم میں اور تم میں کون اہلِ ہُدیٰ ہے اور کون ظالم اور کون محمود العاقبت ہے اور کون محروم عن الفلاح پس ہر ایک کی حالت اور ثمرہ کا جلد ہی مرنے کے ساتھ ہی ظہور ہو جاوے گا اب نہیں مانتے تم جانو) اور (دلائل موسویہ دیکھ کر اور سُن کر) فرعون (کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارے معتقدین ان کی طرف مائل نہ ہو جاویں تو لوگوں کو جمع کر کے) کہنے لگا اے اہلِ دربار مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا (اسکے بعد تلبیس کے واسطے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر اس سے ان لوگوں کا اطمینان نہ ہو تو) اے ہامان تم ہمارے لئے مٹی (کی اینٹیں بنوا کر اُن) کو آگ میں پزاوہ لگا کر پکواؤ پھر (ان پختہ اینٹوں سے) میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ تاکہ (میں اس پر چڑھ کر) موسٰی کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو (اس دعویٰ میں کہ کوئی اور خدا ہے) موسٰی کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور فرعون اور اسکے تابعین نے ناحق دُنیا میں سر اُٹھا رکھا تھا اور یُوں سمجھ رہے تھے کہ انکو ہمارے پاس لوٹ کر آنا نہیں ہے تو ہم نے (اس تکبر کی سزا میں) اس کو اور اسکے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) سو دیکھئے ظالموں کا انجام کیسا ہوا (اور موسٰی علیہ السلام کے قول کا ظہور ہوگیا مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ) اور ہمنے ان لوگوں کو ایسا رئیس بنایا تھا جو (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بُلاتے رہے اور (اسی واسطے) قیامت کے روز (ایسے بے کس رہجاویں گے کہ) انکا کوئی ساتھ نہ دے گا اور (یہ لوگ دونوں عالم میں خائب و خاسر ہوئے چنانچہ) دنیا میں بھی ہمنے انکے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی بدحال لوگوں میں سے ہونگے۔

معارف و مسائل

فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ، فرعون نے بہت اونچا بلند محل تیار کرنے کا ارادہ کیا

تو اپنے وزیر ہامان کو اسکی تیاری کے لئے پہلے یہ حکم دیا کہ مٹی کی اینٹوں کو پکا کر پختہ کیا جائے کیونکہ کچی اینٹوں پر کوئی بڑی اور اونچی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ فرعون کے اس واقعہ سے پہلے پختہ اینٹوں کی تعمیر کا رواج نہ تھا سب سے پہلے فرعون نے یہ ایجاد کرائی۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ہامان نے اس محل کی تعمیر کیلئے پچاس ہزار معمار جمع کئے مزدور اور لکڑی لوہے کا کام کرنے والے انکے علاوہ تھے اور محل کو اتنا اُونچا بنایا کہ اُس زمانے میں اس سے زیادہ بلند کوئی تعمیر نہیں تھی۔ پھر جب یہ تیاری مکمل ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا، اُنھوں نے ایک ضرب میں اس محل کے تین ٹکڑے کر کے گرا دیا، جس میں فرعونی فوج کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ (قرطبی)

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ، یعنی فرعون کے درباریوں کو اللہ تعالیٰ نے انکی قوم کا پیشوا بنا دیا تھا مگر یہ غلط کار پیشوا اپنی قوم کو آگ یعنی جہنم کی طرف دعوت دے رہے تھے یہاں اکثر مفسرین نے آگ کیطرف دعوت دینے کو ایک استعارہ اور مجاز قرار دیا ہے کہ مراد آگ سے وہ اعمال کفریہ ہیں جنکا نتیجہ جہنم کی آگ میں جانا تھا مگر اُستاذِ محترم نادرہ روزگار حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی تحقیق تبعاً لابن عربی یہ تھی کہ آخرت کی جزا عین عمل ہے۔ انسان کے اعمال جو وہ دُنیا میں کرتا ہے برزخ پھر محشر میں اپنی شکلیں بدلیں گے اور جوہری صورتوں میں نیک اعمال گل و گلزار بن کر جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور اعمال کفر و ظلم آگ اور سانپ بچھوؤں اور طرح طرح کے عذابوں کی شکل اختیار کر لیں گے اسلئے جو شخص اس دُنیا میں کسی کو کفر و ظلم کیطرف بلا رہا ہے وہ حقیقۃً اس کو آگ ہی کیطرف بلا رہا ہے۔ اگرچہ اس دُنیا میں اسکی شکل آگ کی نہیں مگر حقیقت اسکی آگ ہی ہے۔ اسی طرح آیت میں کوئی مجاز یا استعارہ نہیں، اپنی حقیقت پر محمول ہے۔ یہ تحقیق اختیار کیجائے تو قرآن کی بے شمار آیات میں مجاز و استعارہ کا تکلف نہیں کرنا پڑے گا۔ مثلاً وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا اور مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وغیرہ

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ، مَقْبُوْحِيْنَ، مقبوح کی جمع ہے جس کے معنے ہیں بگاڑا ہوا۔ مُراد یہ ہے کہ قیامت کے روز انکے چہرے مسخ ہو کر سیاہ اور آنکھیں نیلی ہو جائیں گی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب بعد اس کے کہ ہم غارت کر چکے پہلی جماعتوں کو

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا

سمجھانے والی لوگوں کو اور راہ بتانے والی اور رحمت تاکہ وہ یاد رکھیں اور تو نہ

كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ

تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا

مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ

تو دیکھنے والا لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی اُن پر مدت

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا

اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ اُن کو سُناتا ہماری آیتیں پر ہم رہے ہیں

كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ

رسُول بھیجتے اور تو نہ تھا طُور کے کنارے جب ہم نے آواز دی لیکن

رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ

یہ انعام ہے تیرے رب کا تاکہ تو ڈر سُنا دے اُن لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سُنانے والا تجھ سے پہلے

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا

تاکہ وہ یاد رکھیں اور اتنی بات کے لئے کہ کبھی آن پڑے اُن پر آفت اُن

قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ

کاموں کی وجہ سے جن کو بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ، تو کہنے لگیں اے رب ہمارے کیوں نہ بھیجدیا ہمارے پاس کسی کو پیغام دے کر

اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ

تو ہم چلتے تیری باتوں پر اور ہوتے ایمان والوں میں پھر جب پہنچی اُن کو ٹھیک بات ہمارے

عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا

پاس سے کہنے لگے کیوں نہ ملا اس رسُول کو جیسا ملا تھا موسیٰ کو کیا ابھی منکر نہیں ہو چکے

بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا

اس سے جو موسیٰ کو ملا تھا اس سے پہلے کہنے لگے دونوں جادو ہیں آپس میں موافق اور کہنے لگے

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى

ہم دونوں کو نہیں مانتے تو کہہ اب تم لاؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس کی جو ان دونوں سے

مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ

بہتر ہو کہ میں اس پر چلوں، اگر تم سچے ہو پھر اگر نہ کر لائیں تیرا کہا

فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ

تو جان لے کہ وہ چلتے ہیں نری اپنی خواہشوں پر اور اس سے گمراہ زیادہ کون جو چلے اپنی خواہش پر بدون

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ

راہ بتلائے اللہ کے بیشک اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو اور ہم پے در پے

وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾

بھیجتے رہے ہیں اُن کو اپنے کلام تاکہ وہ دھیان میں لائیں

ع ۸

خُلاصۂ تفسیر

اور (رسالت کا سلسلہ خلق کے محتاج اصلاح ہونے کے سبب ہمیشہ سے چلا آیا ہے چنانچہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (جن کا قصہ ابھی پڑھ چکے ہو) اگلی اُمتوں (یعنی قوم نوح و عاد و ثمود) کے ہلاک ہونے کے پیچھے (جبکہ ان زمانوں کے انبیاء کی تعلیمات نایاب ہوگئی تھیں اور لوگ ہدایت کے سخت حاجتمند تھے) کتاب (یعنی تورات) دی تھی جو لوگوں کے (یعنی بنی اسرائیل کے) لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں (طالب حق کی اوّل فہم درست ہوتی ہے یہ بصیرت ہے، پھر احکام قبول کرتا ہے یہ ہدایت ہے، پھر ہدایت کا ثمرہ یعنی قرب و قبول عنایت ہوتا ہے یہ رحمت ہے) اور (اسی طرح جب یہ دورہ بھی ختم ہوچکا اور لوگ پھر محتاج تجدید ہدایت ہوئے تو اپنی سُنّتِ مستمرہ کے موافق ہم نے آپ کو رسُول بنایا جس کے دلائل میں سے ایک یہی واقعہ موسویہ کی یقینی خبر دینا ہے کیونکہ قطعی خبر دینے کے لئے کوئی طریق علم کا ضروری ہے اور وہ طریق منحصر ہے چار میں، اُمور عقلیہ میں عقل، سو یہ واقعہ اُمور عقلیہ میں سے تو ہے نہیں، اور اُمور نقلیہ میں یا سماع اہل علم سے جو کہ دوسرا طریق ہے سو یہ بھی بوجہ عدم مخالطت و عدم مدارست اہلِ اخبار کے منتفی ہے اور یا اپنا مشاہدہ جو کہ تیسرا طریق ہے سو اس کی نفی نہایت ہی اظہر ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ (طُور کے) مغربی جانب میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو احکام دیئے تھے (یعنی توراۃ دی تھی) اور (وہاں خاص تو کیا موجود ہوتے) آپ (تو) ان لوگوں میں سے (بھی) نہ تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے (پس احتمال مشاہدہ کا بھی نہ رہا) ولیکن (بات یہ کہ) ہم نے (موسیٰ علیہ السّلام کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا (جس سے پھر علوم صحیحہ نایاب ہوگئے اور پھر لوگ محتاجِ ہدایت ہوئے اور گو درمیان درمیان انبیاء علیہم السّلام آیا کئے مگر ان کے علوم بھی اس طرح نایاب ہوئے اسلئے ہماری رحمت مقتضی ہوئی کہ ہم نے آپ کو وحی و رسالت سے مشرف فرمایا جو کہ چوتھا طریق ہے خبر یقینی کا اور دوسرے طُرق علم ظنی کے ہیں جو بحث ہی سے خارج ہے کیونکہ آپ کی یہ خبریں بالکل یقینی اور قطعی ہیں حاصل یہ کہ علم یقینی کے چار طریقے ہیں اور تین منتفی پس چوتھا متعین اور یہی مطلوب ہے) اور (جیسے آپ نے عطاء توراۃ کا مشاہدہ نہیں کیا اور صحیح و یقینی خبر دے رہے ہیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قیام مدین کا مشاہدہ نہیں فرمایا چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ اہل مدین میں بھی قیام پذیر نہ تھے کہ آپ (وہاں کے حالات دیکھ کر ان حالات کے متعلق) ہماری آیتیں (اپنے) ان (معاصر) لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سُنا رہے ہوں ولیکن ہم ہی (آپ کو) رسول بنانے والے ہیں (کہ رسول بنا کر یہ واقعات وحی سے بتلا دیئے) اور (اسی طرح)

آپ طور کی جانب (غربی مذکور) میں اسوقت بھی موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) پکارا تھا (کہ "یٰمُوۡسٰۤی اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَاَنۡ اَلۡقِ عَصَاکَ" جو کہ ان کو نبوت عطا ہونے کا وقت تھا) ولیکن (اسکا علم بھی اسی طرح حاصل ہوا کہ) آپ اپنے رب کی رحمت سے نبی بنائے گئے تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا، کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کرلیں (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین بلکہ انکے آباء اقربین نے بھی کسی نبی کو نہیں دیکھا تھا گو بعض شرائع بالخصوص توحید بواسطہ ان تک بھی پہنچی تھی پس وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا سے تعارض نہ رہا) اور (اگر یہ لوگ ذرا تامل کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ پیغمبر بھیجنے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان ہی لوگوں کا فائدہ ہے کہ یہ لوگ حُسن و قُبح پر مطلع ہو کر عقوبت سے بچ سکتے ہیں ورنہ جن اُمور کا قبح عقل سے دریافت ہو سکتا ہے اس پر عذاب بلا ارسالِ رسول بھی ہونا ممکن تھا لیکن اسوقت انکو ایک گونہ حسرت ہوتی کہ ہائے اگر رسول آجاتا تو ہمکو زیادہ تنبّہ ہو جاتا اور اس مصیبت میں نہ پڑتے اسلئے رسُول بھی بھیجدیا تاکہ اس حسرت سے بچنا ان کو آسان ہو ورنہ احتمال تھا کہ) ہم رسول نہ بھی بھیجتے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے کرداروں کے سبب (جو عقلاً قبیح ہیں) کوئی مصیبت (دُنیا یا آخرت میں) نازل ہوتی (جس کی نسبت ان کو عقل کے یا فرشتے کے ذریعہ سے یقین ہو جاتا کہ یہ سزائے اعمال ہے) تو یہ کہنے لگتے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم آپکے احکام کا اتباع کرتے اور (ان احکام اور رسُول پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوتے سو (اس امر کا مقتضا تو یہ تھا کہ رسول کے آنے کو غنیمت سمجھتے اور اسکے دینِ حق کو قبول کرتے لیکن ان کی یہ حالت ہوئی کہ) جب ہماری طرف سے ان لوگوں کے پاس امرِ حق (یعنی رسول حق اور دینِ حق) پہنچا تو (اس میں شبہ نکالنے کے لئے یُوں) کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی (یعنی قرآن واحدۃً مثل توراۃ کے کیوں نہ نازل ہوا، آگے جواب ہے کہ) کیا جو کتاب موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی اسکے قبل یہ لوگ اسکے منکر نہیں ہوئے (چنانچہ ظاہر ہے کہ مشرکین موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو بھی نہ مانتے تھے کیونکہ وہ سرے سے اصل نبوت ہی کے منکر تھے) یہ لوگ تو (قرآن اور توراۃ دونوں کی نسبت) یُوں کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں (یہ اسلئے کہا کہ اُصولِ شرائع میں دونوں متفق ہیں) اور یُوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں میں کسی کو نہیں مانتے (خواہ یہی عبارت ان کا مقولہ ہو اور خواہ انکے اقوال سے لازم آتا ہو اور خواہ ایک ہی ساتھ دونوں کا انکار کیا ہو یا مختلف قول جمع کئے گئے ہوں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا منشاء قصد ایمان بالقرآن بصورت تماثل توراۃ کے نہیں بلکہ یہ بھی ایک حیلہ اور شرارت ہے آگے اس کا جواب ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) آپ کہدیجئے کہ اچھا تو (علاوہ توراۃ و قرآن کے) تم کوئی اور کتاب اللہ

کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو میں اسی کی پیروی کرنے لگوں گا، اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (کہ سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا، جس سے مقصود ان دونوں کتابوں کا نعوذ باللہ مفتری اور غلط ہونا ہے۔ یعنی مقصود تو اتباع حق کا ہے پس اگر کتب الٰہیہ کو حق مانتے ہو تو ان کی پیروی کرو، قرآن کی تو مطلقاً اور توراۃ کی توحید و بشاراتِ محمدیہ میں اور اگر ان کو حق نہیں مانتے تو تم کوئی حق پیش کرو اور اسکا حق ہونا ثابت کرو جس کو اہدیٰ ہونے سے اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ مقصود حق سے اسکا وسیلۂ ہدایت ہونا ہے۔ اگر فرضاً ثابت کردو گے تو میں اسکی پیروی کرلوں گا، غرض یہ کہ میں حق ثابت کردوں تو تم اسکا اتباع کرو، اور اگر تم حق ثابت کردو تو میں اتباع کے لئے آمادہ ہوں اور چونکہ قضیہ شرطیہ میں محض حکم اتصال کا ہوتا ہے اسلئے اتباع غیر کتب الٰہیہ کا اشکال لازم نہیں آتا) پھر (اس احتجاج کے بعد) اگر یہ لوگ آپ کا (یہ) کہنا (کہ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ الخ) نہ کرسکیں (اور ظاہر ہے کہ نہ کرسکیں گے لقولہ تعالیٰ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور پھر بھی آپ کا اتباع نہ کریں) تو آپ سمجھ لیجئے کہ (ان سوالات کا منشار کوئی اشتباہ و تردد و حق جوئی نہیں ہے بلکہ) یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں (ان کا نفس کہتا ہے کہ جس طرح بن پڑے انکار ہی کرنا چاہیے، بس یہ ایسا ہی کر رہے ہیں گو حق بھی واضح ہو جاوے) اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدون اسکے کہ منجانب اللہ کوئی دلیل (اسکے پاس) ہو (اور) اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو (جو کہ وضوحِ حق کے بعد بدون کسی متمسک صحیح کے بھی اپنی گمراہی سے باز نہ آوے) ہدایت نہیں کیا کرتا (جسکا سبب اس شخص کا خود قصد کرنا ہے اپنے گمراہ رہنے کا اور قصد کے بعد خلقِ فعل عادت ہے اللہ تعالیٰ کی اسلئے ایسا شخص ہمیشہ گمراہ رہتا ہے، یہاں تک تو جواب الزامی تھا انکے اس قول کا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى) اور (آگے تحقیقی جواب ہے جسمیں قرآن کے دفعۃً واحدۃً نازل نہ ہونے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کیلئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا تاکہ یہ لوگ (باربار تازہ بتازہ سُننے سے) نصیحت مانیں (یعنی ہم تو دفعۃً واحدۃً بھیجنے پر بھی قادر ہیں مگر ان ہی کی مصلحت سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں پھر اندھیر ہے کہ اپنی ہی مصلحت کی مخالفت کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَاۗىِٕرَ لِلنَّاسِ،

قرونِ اُولیٰ سے اقوام نوح و ہود و صالح و لوط علیہم السلام مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اپنی سرکشی کیوجہ سے ہلاک کی گئی تھیں، اور بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے لفظی معنے تو دانش و

بینش کے ہیں۔ مراد اس سے وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ انسانوں کے قلوب میں پیدا فرماتے ہیں جن سے وہ حقائق اشیاء کو دیکھ سکیں اور حق و باطل کا امتیاز کرسکیں۔ (مظہری)

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ میں اگر لفظ ناس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت ہے تو بات صاف ہی اُس اُمت کے لئے کتاب توراۃ ہی مجموعۂ بصائر تھی۔ اور اگر لفظ ناس سے تمام انسان مراد ہیں جن میں اُمت محمدیہ بھی داخل ہے تو یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ اُمت محمدیہ کے زمانے میں جو تورات موجود ہے وہ تحریفات کے ذریعہ مسخ ہوچکی ہے تو ان کے لئے اسکا بصائر کہنا کیسے درست ہوگا، اور یہ کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی تورات سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے حالانکہ حدیث میں یہ واقعہ معروف ہی کہ حضرت فاروق اعظم رضہ نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی اجازت طلب کی کہ وہ تورات میں جو نصائح وغیرہ ہیں انکو پڑھیں تاکہ انکے علم میں ترقی ہو، اس پر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ اگر اسوقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو اُن کو بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا (جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ آپ کو صرف میری تعلیمات کو دیکھنا چاہیئے، تورات و انجیل کا دیکھنا آپکے لئے درست نہیں) مگر اسکے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تورات کا جو اسوقت اہل کتاب کے پاس نسخہ تھا وہ تحریف شدہ تھا اور زمانہ ابتدا ء اسلام کا تھا جس میں نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اسوقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی مکمل حفاظت کے پیش نظر اپنی احادیث لکھنے سے بھی بعض حضرات کو روک دیا تھا کہ ایسا نہو لوگ قرآن کے ساتھ احادیث کو جوڑ دیں، ان حالات میں کسی دوسری منسوخ شدہ آسمانی کتاب کا پڑھنا پڑھانا ظاہر ہے کہ احتیاط کے خلاف تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً تورات و انجیل کے مطالعے اور پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ ان کتابوں کے وہ حصے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر مشتمل ہیں انکا مطالعہ کرنا اور نقل کرنا صحابۂ کرام سے ثابت اور معروف، و مشہور ہی حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اس معاملہ میں سب سے زیادہ معروف ہیں، دوسرے صحابۂ کرام نے بھی ان پر نکیر نہیں کیا۔ اسلئے حاصل آیت کا یہ ہوجائے گا کہ تورات و انجیل میں جو غیر محرف مضامین اب بھی موجود ہیں اور بلاشبہ بصائر ہیں، ان سے استفادہ درست ہے مگر ظاہر ہی کہ ان سے استفادہ صرف ایسے ہی لوگ کرسکتے ہیں جو محرف اور غیر محرف میں فرق کرسکیں اور صحیح اور غلط کو پہچان سکیں وہ علماء ماہرین ہی ہوسکتے ہیں، عوام کو بے شک اس سے اجتناب اسلئے ضروری ہی کہ وہ کسی مغالطے میں نہ پڑجائیں، یہی حکم اُن تمام کتابوں کا ہے جسمیں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے کہ عوام کو انکے مطالعہ سے پرہیز کرنا چاہیئے علماء ماہرین دیکھیں تو مضائقہ نہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ، یہاں اس قوم سے عرب مراد ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور انکے بعد سے خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک انمیں کوئی پیغمبر

مبعوث نہ ہوا تھا یہی مضمون سورۂ یٰسٓ میں بھی آنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری جگہ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کہ کوئی امت ایسی نہیں جس میں اللہ کا کوئی پیغمبر نہ آیا ہو یہ اس آیت کے منافی نہیں کیونکہ مراد اس آیت کی یہ ہے کہ زمانہ دراز سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد انمیں کوئی نبی نہیں آیا مگر نبی و رسول کے آنے سے بالکل خالی یہ اُمّت بھی نہیں رہی۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ، وصّلنا، توصیل سے مشتق ہے جس کے اصلی لغوی معنے رسّی کے تاروں میں اور تار ملا کر اسکے مضبوط کرنے کے ہیں مُراد یہ ہے کہ قرآن حکیم میں حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رکھا اور بہت سے نصیحت کے مضامین کا بار بار تکرار بھی کیا گیا تاکہ سُننے والے متاثر ہوں۔

تبلیغ و دعوت کے بعض آداب اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ حق بات کو مُسلسل کہتے اور پہنچاتے ہی رہتے تھے۔ لوگوں کا انکار و تکذیب اُن کے اپنے عمل اور اپنی لگن میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ حق کو اگر ایک مرتبہ نہ مانا گیا تو دوسری مرتبہ، پھر بھی نہ مانا گیا تو تیسری چوتھی مرتبہ برابر پیش کرتے ہی رہتے تھے۔ کسی کے دل میں ڈال دینا تو کسی ناصح ہمدرد کے بس میں نہیں مگر اپنی کوشش کو بغیر کسی تکان اور اکتاہٹ کے جاری رکھنا جو ان کے قبضہ میں تھا اسکو مُسلسل انجام دیتے۔ آج بھی تبلیغ و دعوت کے کام کرنے والوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى
جن کو ہم نے دی ہے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب اُن کو
عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ
سُنائے تو کہیں ہم یقین لائیں اس پر یہی ہے ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا ہم ہیں اس سے پہلے
مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ
کے حکمبردار وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دوہرا اس بات پر کہ قائم رہے اور
يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا
بھلائی کرتے ہیں بُرائی کے جواب میں اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور جب
سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ
سُنیں نکمّی باتیں اس سے کنارہ کریں اور کہیں ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمھارے کام،
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِى الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾
سلامت رہو ہم کو نہیں چاہئیں بے سمجھ لوگ

النصف

خلاصۂ تفسیر

(اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اُن بشارتوں سے بھی ثابت ہے جن کی اُن علماء نے تصدیق کی ہے جن کو تورات و انجیل میں ان بشارتوں کا علم ہے۔ چنانچہ) جن لوگوں کو ہمنے قرآن سے پہلے (آسمانی) کتابیں دی ہیں (اُن میں جو منصف ہیں) وہ اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب قرآن اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے بے شک یہ حق ہے (جو) ہمارے رب کی طرف سے (نازل ہوا ہے اور) ہم تو اس (کے آنے) سے پہلے بھی (اپنی کتابوں کی بشارتوں کی بنار پر) مانتے تھے (اب نزول کے بعد تجدید عہد کرتے ہیں۔ یعنی ہم ان لوگوں کی طرح نہیں جو نزولِ قرآن سے پہلے تو اسکی تصدیق کرتے تھے بلکہ اسکے آنے کے منتظر اور شائق تھے مگر جب قرآن آیا تو اسکے منکر ہوگئے (فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهٖ) اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تورات و انجیل کی بشارتوں کے مصداق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی تھے جیساکہ سورۂ شعراء کے آخر میں فرمایا ہے اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ - یہاں تک رسالتِ محمدیہ پر علمار بنی اسرائیل کی شہادت کا بیان ہوا آگے مومنین اہلِ کتاب کی فضیلت کا بیان ہے کہ) اُن لوگوں کو اُن کی پختگی کیوجہ سے دوہرا ثواب ملے گا (کیونکہ وہ پہلی کتاب پر ایمان رکھنے کے ضمن میں بھی قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور بعد نزول کے بھی اس پر قائم رہے اور اس کی تجدید کی، یہ تو اُنکے اعتقاد اور جزار کا بیان تھا آگے اعمال و اخلاق کا ذکر ہے کہ) اور وہ لوگ نیکی (اور تحمل) سے بدی (اور ایذار) کا دفعیہ کردیتے ہیں اور ہمنے جو کچھ اُن کو دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور (جس طرح یہ لوگ عملی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں اسی طرح) جب کسی سے (اپنے متعلق) کوئی لغو بات سُنتے ہیں (جو قولی ایذار ہے) تو اس کو (بھی) ٹال جاتے ہیں اور (سلامت روی کے طور پر) کہدیتے ہیں کہ (ہم کچھ جواب نہیں دیتے) ہمارا عمل ہمارے سامنے آئے گا اور تمھارا عمل تمھارے سامنے (بھائی) ہم تو تم کو سلام کرتے ہیں (ہم کو جھگڑے سے معاف رکھو) ہم بے سمجھ لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ، اس آیت میں اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اور نزولِ قرآن سے پہلے ہی تورات و انجیل کی دی ہوئی بشارتوں کی بنار پر، نزولِ قرآن اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر یقین رکھتے تھے۔ پھر آپ مبعوث ہوئے تو اپنے سابق یقین کی بنار پر ایمان لے آئے۔ حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے،

کہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے درباریوں میں سے چالیس آدمی مدینہ طیبہ میں اسوقت حاضر ہوئے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر میں مشغول تھے یہ لوگ بھی جہاد میں شریک ہوگئے، بعض کو کچھ زخم بھی لگے مگر ان میں سے کوئی مقتول نہیں ہوا۔ اُنھوں نے جب صحابۂ کرام کی معاشی تنگی کا حال دیکھا تو آپ سے درخواست کی کہ ہم اللہ کے فضل سے مالدار اصحاب جائداد ہیں ہم اپنے ملک واپس جا کر صحابۂ کرام کے لئے مال فراہم کر کے لائیں آپ اجازت دے دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (الی قولہ) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اخرجہ ابن مردویہ والطبرانی فی الاوسط۔ مظہری) اور حضرت سعید بن جبیرؒ کی روایت ہے کہ حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب ہجرتِ مدینہ سے پہلے حبشہ گئے تھے اور نجاشی کے دربار میں اسلام کی تعلیمات پیش کیں تو نجاشی اور اسکے اہلِ دربار جو اہلِ کتاب تھے اور تورات و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور علامتیں دیکھے ہوئے تھے ان کے دلوں میں اسی وقت اللہ نے ایمان ڈالدیا۔ (مظہری)

لفظ مسلمین اُمتِ محمدیہ کا مخصوص لقب ہے یا تمام اُمتوں کے لئے عام ہے اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ، یعنی ان حضرات اہلِ کتاب نے کہا کہ ہم تو قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے یہاں لفظ مسلم اگر اپنے لغوی معنے میں لیا جائے یعنی مطیع و فرمانبردار تو بات صاف ہے کہ ان کو جو یقین قرآن اور نبی آخر الزماں پر اپنی کتابوں کی وجہ سے حاصل تھا اس یقین کو لفظ اسلام اور مسلمین سے تعبیر فرمایا کہ ہم تو پہلے ہی سے اس کو مانتے تھے۔ اور اگر لفظ مسلمین اس جگہ اُس معنے میں لیا جائے جس کے لحاظ سے اُمتِ محمدیہ کا لقب مسلمین ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسلام اور مسلمین کا لفظ صرف اُمتِ محمدیہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا اور وہ سب مسلمین ہی تھے مگر قرآن کریم کی بعض آیات سے اسلام اور مسلمین کا اس اُمت کے لئے مخصوص لقب ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول خود قرآن نے نقل کیا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ، اور علامہ سیوطی اسی خصوصیت کے قائل ہیں اور اس مضمون پر اُن کا ایک مستقل رسالہ ہے انکے نزدیک اس آیت میں مسلمین سے مراد یہ ہے کہ ہم تو پہلے ہی سے اسلام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کے دین کا مشترک نام بھی ہو اور اس اُمت کے لئے مخصوص لقب بھی۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام اپنے معنی وصفی کے اعتبار سے سب میں مشترک ہو مگر مسلم کا لقب صرف اس اُمت کے لئے مخصوص ہو جیسے صدیق اور فاروق وغیرہ کے القاب ہیں جنکا مصداقِ خاص اس اُمت میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، حالانکہ اپنے معنے وصفی کے اعتبار سے دوسرے حضرات بھی صدیق اور فاروق ہوسکتے ہیں

(ہذا ما سنح لی واللہ اعلم)

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ، یعنی مؤمنین اہلِ کتاب کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اسی طرح کا وعدہ ازواج مطہرات کے متعلق بھی آیا ہے وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین شخصوں کے لئے دوہرے اجر کا ذکر فرمایا ہے ایک وہ اہلِ کتاب جو پہلے اپنے سابق نبی پر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر، دوسرا وہ شخص جو کسی کا مملوک غلام ہو اور وہ اپنے آقا کی بھی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہو اور اللہ اور اسکے رسُول کی بھی، تیسرا وہ شخص جس کی ملک میں کوئی کنیز تھی جس سے بلا نکاح صحبت اسکے لئے حلال تھی اس نے اس کو اپنی غلامی سے آزاد کر دیا پھر اس کو منکوحہ زوجہ بنالیا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ان چند قسموں کو دو مرتبہ اجر دینے کی علت کیا ہے اگر کہا جائے کہ ان دونوں کے دو عمل اس دوہرے اجر کا سبب ہیں کیونکہ مؤمنین اہلِ کتاب کے دو عمل یہ ہیں کہ پہلے ایک نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لائے پھر دوسرے نبی اور اس کی کتاب پر، اور ازواج مطہرات کے دو عمل یہ ہیں کہ وہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت بحیثیت رسُول بھی کرتی ہیں اور بحیثیت شوہر بھی، اور مملوک غلام کے دو عمل اسکی دوہری اطاعت و فرمانبرداری ہے، اللہ و رسول کی بھی اور آقا کی بھی، اور کنیز کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے والے کا ایک عمل صالح اسکو آزاد کرنا دوسرا اسکو منکوحہ زوجہ بنالینا ہے۔ مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو عمل کے دو اجر ہونا تو مقتضائے عدل و انصاف ہونے کی وجہ سے سب کے لئے عام ہے اسمیں مؤمنین اہلِ کتاب یا ازواج مطہرات وغیرہ کی کیا خصوصیت ہے جو شخص بھی دو عمل کرے گا دو اجر پائے گا؟ اس سوال کے جواب کی مکمل تحقیق احقر نے احکام القرآن سورۂ قصص میں لکھی ہے اسمیں جو بات خود الفاظِ قرآن کی دلالت سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام اقسام میں مراد صرف دو اجر نہیں، کیونکہ وہ تو ہر عمل کرنے والے کے لئے عام ضابطہ قرآنیہ ہے لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ جتنے نیک عمل کرے گا اُسی کے حساب سے اجر پائے گا۔ بلکہ ان اقسامِ مذکورہ میں دو اجر سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کے ہر عمل کا دوہرا ثواب ملے گا۔ ہر نماز پر اسکا دوہرا، ہر روزہ پر اسکا دوہرا، ہر صدقہ اور حج و عمرہ پر اسکا دوہرا ثواب پا دیں گے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کریں تو دو اجر دینے کے لئے مختصر لفظ اجرین کا تھا مگر قرآن نے اسکو چھوڑ کر اجر مرتین کا لفظ اختیار کیا جس میں صاف اشارہ اسکا پایا جاتا ہے کہ اجر مرتین سے مراد یہ ہے کہ ان کا ہر عمل مکرر لکھا جائیگا اور ہر عمل پر دوہرا ثواب ملے گا۔

رہا یہ معاملہ کہ ان کی اتنی بڑی فضیلت اور خصوصیت کا سبب کیا ہے تو اس کا

واضح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ کسی خاص عمل کو دوسرے اعمال سے افضل قرار دیدے اور اسکا اجر بڑھادے، کسی کو اس سوال کا حق نہیں ہے کہ روزہ کا ثواب اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ کیوں کر دیا، زکوٰۃ و صدقہ کا کیوں ایسا نہ کیا؟ ہو سکتا ہے کہ یہ اعمال جنکا ذکر آیاتِ مذکور اور حدیث بخاری میں ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ دوسرے اعمال سے ایک حیثیت میں بڑھا ہوا ہو اس پر یہ انعام فرمایا۔ اور بعض اکابر علماء نے جو اسکا سبب ان لوگوں کی دوہری مشقت کو قرار دیا ہے وہ بھی اپنی جگہ محتمل ہے اور اسی آیت کے آخر میں لفظ بِمَا صَبَرُوْا سے اس پر استدلال ہو سکتا ہے کہ علت اس دوہرے اجر کی اُن کا مشقت پر صبر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ دُور کرتے ہیں۔ اس بُرائی اور بھلائی کی تعبیر میں ائمہ تفسیر کے بہت سے اقوال ہیں بعض نے فرمایا کہ بھلائی سے طاعت اور بُرائی سے معصیت مُراد ہے کیونکہ نیکی بدی کو مٹا دیتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا اَتْبِعِ الْحَسَنَةَ السَّيِّئَةَ تَمْحُهَا، یعنی بدی اور گناہ کے بعد نیکی کرو تو وہ گناہ کو مٹا دے گی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا حسنہ سے مراد علم و حلم اور سیئہ سے مراد جہل و غفلت ہے یعنی یہ لوگ دوسروں کی جہالت کا جواب جہالت کے بجائے حلم و بُردباری سے دیتے ہیں اور درحقیقت ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ لفظ حسنہ اور سیئہ یعنی بھلائی اور بُرائی کے الفاظ ان سب چیزوں کو شامل ہیں۔

اس آیت میں دو اہم ہدایتیں ہیں اوّل یہ کہ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ خطا سرزد ہو جائے تو اسکا علاج یہ ہے کہ اسکے بعد نیک عمل کی فکر کرے تو نیک عمل اُس گناہ کا کفارہ ہو جائیگا جیسا کہ حدیث معاذ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کسی کے ساتھ ظلم اور بُرائی سے پیش آئے اگرچہ قانون شرع کی رُو سے اسکو اپنا انتقام لے لینا جائز ہے بشرطیکہ انتقام برابر سرابر ہو کہ جتنا نقصان یا تکلیف اسکو پہنچائی ہے اتنا ہی یہ اپنے حریف کو پہنچا دے مگر اولی اور احسن یہ ہے کہ انتقام کے بجائے بُرائی کے بدلہ میں بھلائی اور ظلم کے بدلہ میں احسان کرے کہ یہ اعلیٰ درجہ مکارمِ اخلاق کا ہے اور دُنیا و آخرت میں اسکے منافع بیشمار ہیں۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں یہ ہدایت بہت واضح الفاظ میں اس طرح آئی ہے اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، یعنی بُرائی اور ظلم کو ایسے طریقہ سے دفع کرو جو کہ بہتر ہے۔ (یعنی ظلم کے بدلہ میں احسان کرو) تو جس شخص کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ، یعنی ان لوگوں کی ایک عمدہ خصلت یہ ہے کہ جب

یہ کسی جاہل دشمن سے لغویات سنتے ہیں تو اسکا جواب دینے کے بجائے یہ کہدیتے ہیں کہ ہمارا سلام لو، ہم جاہل لوگوں سے اُلجھنا پسند نہیں کرتے۔ امام جصاص نے فرمایا کہ سلام کی دو قسمیں ہیں، ایک سلام تحیہ جو مسلمان باہم ایک دوسرے کو کرتے ہیں، دوسرا سلام مسالمت و متارکت یعنی اپنے حریف کو یہ کہدینا کہ ہم تمھاری لغویات کا کوئی انتقام تم سے نہیں لیتے، یہاں سلام سے یہی دوسرے معنے مراد ہیں۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے پر اللہ راہ پر لائے جس کو

يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

چاہے اور وہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے

خلاصۂ تفسیر

آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے (اور ہدایت کرنے کی قدرت تو کسی کو کیا ہوتی اللہ کے سوا کسی کو اس کا علم تک بھی نہیں کہ کون کون ہدایت پانے والا ہے بلکہ) ہدایت پانے والوں کا علم اُسی کو ہے۔

معارف و مسائل

لفظ ہدایت کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنے صرف راستہ دکھا دینے کے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ جس کو راستہ دکھایا گیا وہ منزل مقصود پر پہنچے اور ایک معنی ہدایت کے یہ بھی آتے ہیں کہ کسی کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا جائے۔ پہلے معنے کے اعتبار سے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کا ہادی ہونا اور یہ ہدایت اُن کے اختیار میں ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ ہدایت ہی اُن کا فرض منصبی ہے اگر اس کی اُن کو قدرت نہ ہو تو فریضہ رسالت و نبوت کیسے ادا کریں۔ اس آیت میں جو آپ کا ہدایت پر قادر نہ ہونا بیان فرمایا ہے اس سے مراد دوسرے معنے کی ہدایت ہے، یعنی مقصود پر پہنچا دینا۔ اور مطلب یہ ہے کہ اپنی تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ آپ کسی کے دل میں ایمان ڈالدیں اس کو مؤمن بنا دیں یہ آپ کا کام نہیں یہ تو براہِ راست حق تعالےٰ کے اختیار میں ہے۔ ہدایت کے معنی اور اُس کی اقسام کی مکمل تحقیق سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ آپ کی بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ کسی طرح ایمان قبول کرلیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا گیا

کسی کو مومن بنا دینا آپکی قدرت میں نہیں ۔ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ ابو طالب کے ایمان و کفر کے معاملے میں بے ضرورت گفتگو اور بحث و مباحثہ سے اور اُن کو بُرا کہنے سے اجتناب کرنا چاہیئے کہ اُس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طبعی ایذاء کا احتمال ہے ۔ واللہ اعلم

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ
اور کہنے لگے اگر ہم راہ پر آئیں تیرے ساتھ اُچک لئے جائیں اپنے ملک سے کیا ہم نے

نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ
جگہ نہیں دی اُن کو حرمت والے پناہ کے مکان میں کھنچے چلے آتے ہیں اسکی طرف میوے ہر چیز کے روزی ہماری

لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ
طرف سے پر بہت ان میں سمجھ نہیں رکھتے اور کتنی غارت کر دیں ہم نے بستیاں

بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ
جو اترا چلی تھیں اپنی گزران میں اب یہ ہیں اُن کے گھر آباد نہیں ہوئے اُن کے پیچھے

اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ
مگر تھوڑے اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے اور تیرا رب نہیں غارت کرنے والا

الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا
بستیوں کو جب تک نہ بھیج لے انکی بڑی بستی میں کسی کو پیغام دے کر جو سنائے اُنکو ہماری باتیں اور ہم ہرگز نہیں

مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ
غارت کرنے والے بستیوں کو مگر جبکہ وہاں کے لوگ گناہگار ہوں اور جو تم کو ملی ہے کوئی چیز

فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ
سو فائدہ اُٹھا لینا ہے دُنیا کی زندگی میں اور یہاں کی رونق ہے، اور جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے اور باقی رہنے والا

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع
کیا تم کو سمجھ نہیں

ع ۶

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر دُور سے کفار کے ایمان نہ لانے کا ذکر چلا آرہا ہے ان آیات میں اُن موانع کا ذکر ہے جو کفار کو ایمان لانے کی راہ میں حائل سمجھے جاتے تھے، مثلاً ایک مانع کا بیان یہ ہے کہ) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ ہو کر (اس دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے

جا دیں (کہ بے وطنی کی بھی مضرت ہو اور معاش کی پریشانی الگ ہو، لیکن اس عذر کا بطلان ہی بالکل ظاہر ہے) کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے (یعنی ہماری قدرت اور رزاقی سے) کھانے کو ملتے ہیں (پس حرم ہونے کی وجہ سے جس کا سب احترام کرتے ہیں مضرت کا بھی اندیشہ نہیں اور اس مضرت کے منتفی ہونے کی وجہ سے احتمال فوتِ منفعتِ رزق کا بھی نہیں، پس ان کو چاہیئے تھا کہ اس حالت کو غنیمت سمجھتے اور اسکو نعمت سمجھ کر قدر کرتے اور ایمان لے آتے) ولیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے (یعنی اسکا خیال نہیں کرتے) اور (ایک سبب اُن کے ایمان نہ لانے کا یہ ہے کہ یہ اپنی خوش عیشی پر نازاں ہیں لیکن یہ بھی حماقت ہے کیونکہ) ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں تھے، سو (دیکھ لو) یہ انکے گھر (تمہاری آنکھوں کے سامنے پڑے) ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے (کہ کسی مسافر وارد و صادر کا ادھر کو اتفاقاً گزر ہو جاوے اور وہ تھوڑی دیر وہاں ستانے کو یا تماشا دیکھنے کو بیٹھ جاوے یا شب کو رہ جاوے) اور آخر کار (انکے ان سب سامانوں کے) ہم ہی مالک رہے (کوئی ظاہری وارث بھی ان کا نہ ہوا) اور (ایک شبہ انکو یہ ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کی ہلاکت بسبب کفر کے ہے تو ہم مدت سے کفر کرتے آرہے ہیں ہمکو کیوں نہ ہلاک کیا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ الخ اور اس شبہ کیوجہ سے ایمان نہیں لاتے سو اسکا حل یہ ہے کہ) آپکا رب بستیوں کو (اول ہی بار میں) ہلاک نہیں کیا کرتا جبتک کہ (بستیوں) کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے اور (پیغمبر کو بھیجنے کے بعد بھی فوراً) ہم ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اسی حالت میں کہ وہاں کے باشندے بہت ہی شرارت کرنے لگیں (یعنی ایک مدتِ معتد بہ تک بار بار کی تذکیر سے تذکر حاصل نہ کریں تو اس وقت ہلاک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جن بستیوں کی ہلاکت کا اوپر ذکر تھا وہ بھی اسی قانون کے موافق ہلاک ہوئیں سو اسی قانون کے موافق تمہارے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے اسلئے نہ رسول سے پہلے ہلاک کیا اور نہ بعد رسول کے ابھی تک ہلاک کیا مگر چند روز گزرنے دو۔ اگر تمہارا یہی عناد رہا تو سزا ہو ہی گی چنانچہ بدر وغیرہ میں ہوئی) اور (ایک وجہ ایمان نہ لانے کی یہ ہے کہ دُنیا نقد ہے اسلئے مرغوب ہے اور آخرت اُدھار ہے اسلئے غیر مرغوب ہے، پس دُنیا کی رغبت سے دل خالی نہیں ہوتا کہ اسمیں آخرت کی رغبت سماوے پھر اس کی تحصیل کا طریقہ تلاش کیا جاوے جو کہ ایمان ہے سو اسکی نسبت یہ سُن رکھو کہ) جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دُنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی (زیب و) زینت ہے (کہ خاتمہ عمر کے ساتھ اسکا بھی خاتمہ ہو جائیگا) اور جو (اجر و ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیۃً بھی) بہتر ہے اور (کمیۃً بھی) زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے سو کیا تم لوگ (اس تفاوت کو یا اس تفاوت کے اقتضار کو) نہیں سمجھتے (غرض تمہارے اعذار اور اسباب پر

اصرار علی الکفر سب محض بے بنیاد اور لغو ہیں سمجھو اور مانو)

معارف و مسائل

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ، یعنی کفار مکہ حارث بن عثمان وغیرہ نے اپنے ایمان نہ لانے کی ایک وجہ یہ بیان کی کہ اگرچہ ہم آپ کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں مگر ہمیں خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم آپ کی ہدایات پر عمل کر کے آپکے ساتھ ہو جاویں تو سارا عرب ہمارا دشمن ہو جائیگا اور ہمیں ہماری زمین مکہ سے اُچک لے گا (اخرجہ النسائی وغیرہ) قرآن کریم نے انکے اس عذرِ لنگ کے تین جواب دیئے اول یہ کہ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ، یعنی اُن کا یہ عذر اسلئے باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اہلِ مکہ کی حفاظت کا ایک قدرتی سامان پہلے سے یہ کر رکھا ہے کہ ارضِ مکہ کو حرم بنا دیا اور پُورے عرب کے قبائل کفر و شرک اور باہمی عداوتوں کے باوجود اس پر متفق تھے کہ زمین حرم مکہ میں قتل و قتال سخت حرام ہے۔ حرم میں باپ کا قاتل بیٹے کو ملتا تو انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ حرم کے اندر اپنے دشمن کو قتل کر دے یا اُس سے کوئی انتقام لے لے، اسلئے ایمان لانے میں اُن کو یہ خطرہ محسوس کرنا کسقدر جہالت ہے کہ جس مالک نے اپنے رحم و کرم سے اُنکے کفر و شرک کے باوجود اس زمین میں امن دے رکھا ہے تو ایمان لانے کی صورت میں وہ اُن کو کیسے ہلاک ہونے دے گا۔ یحییٰ بن سلام نے فرمایا کہ معنے آیت کے یہ ہیں کہ تم حرم کی وجہ سے مامون و محفوظ تھے، میرا دیا ہوا رزق فراخی کے ساتھ کھا رہے تھے اور عبادت میرے سوا دوسرے کی کرتے تھے اپنی اس حالت سے تو تمہیں خوف نہ ہوا اُلٹا خوف اللہ پر ایمان لانے سے ہوا۔ (قرطبی) آیتِ مذکورہ میں حرم مکہ کے دو وصف بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ وہ جائے امن ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں اطرافِ دُنیا سے ہر چیز کے ثمرات لائے جاتے ہیں تاکہ مکہ کے باشندے اپنی تمام ضروریات آسانی سے پُوری کر سکیں۔

حرم مکہ میں ہر چیز کے ثمرات کا جمع ہونا خاص آیاتِ قدرت میں سے ہے مکہ مکرمہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کے لئے ساری دُنیا میں سے منتخب فرمایا ایک ایسا مقام ہے کہ وہاں دُنیا کی معیشت کی کوئی چیز آسانی سے نہ ملنا چاہیئے کیونکہ گیہوں، چنا، چاول وغیرہ جو عام انسانی غذا ہے، ان چیزوں کی پیداوار بھی وہاں نہ ہونے کے حکم میں تھی۔ پھل اور ترکاریوں وغیرہ کا تو کہنا کیا ہے مگر یہ سب چیزیں جس افراط کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں عقل حیران رہ جاتی ہے کہ موسم حج کے موقع پر مکہ کی دو تین لاکھ کی آبادی پر بارہ پندرہ لاکھ مسلمانوں کا اضافہ ہر سال ہو جاتا ہے جو اوسطاً دو ڈھائی مہینے تک رہتا ہے۔ کبھی نہیں سُنا گیا کہ ان میں سے کسی کو کسی

زمانے میں غذائی ضروریات نہ ملی ہوں بلکہ رات دن کے تمام اوقات میں تیار شدہ غذا ہر وقت ملتے رہنے کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کے لفظ (ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ) میں غور کریں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرفِ عام کے اعتبار سے ثمرات کا تعلق درختوں کے ساتھ ہے مقام اسکا تھا کہ ثمرات كُلِّ شجر فرمایا جاتا، اسکے بجائے ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ فرماتے ہیں بعید نہیں کہ اشارہ اس طرف ہو کہ لفظ ثمرات یہاں صرف پھلوں کے معنے میں نہیں بلکہ مطلقاً حاصل اور پیداوار کے معنی میں ہے ملوں اور کارخانوں کی مصنوعات بھی اُنکے ثمرات ہیں، اس طرح حاصل اس آیت کا یہ ہوگا کہ حرم مکہ میں صرف کھانے پینے ہی کی چیزیں جمع نہیں ہوں گی بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی جمع کر دی جائیں گی جسکا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو رہا ہے کہ شاید دُنیا کے کسی بھی ملک میں یہ بات نہو کہ ہر ملک اور ہر خطے کی غذائیں اور وہاں کی مصنوعات اس افراط کے ساتھ وہاں ملتی ہوں جیسی مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں۔ یہ تو کفارِ مکہ کے عذر کا ایک جواب ہوا کہ جس مالک نے تمھاری حالتِ کفر و شرک میں تم پر یہ انعامات برسائے کہ تمھاری زمین کو ہر خطرہ سے مامون و محفوظ کر دیا اور باوجودیکہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، ساری دُنیا کی پیداوار یہاں لاکر جمع کر دی تو تمھارا یہ خطرہ کیسی بڑی جہالت ہے کہ خالقِ کائنات پر ایمان لانے کی صورت میں تم سے یہ نعمتیں سلب ہو جائیں گی۔

اس کے بعد دوسرا جواب اس عذر کا یہ ہے وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا، جسمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کافر قوموں کے حالات پر نظر ڈالو کہ اُن کے کفر و شرک کے وبال سے کس طرح اُن کی بستیاں تباہ ہوئیں اور مضبوط و مستحکم قلعے اور حفاظتی سامان سب خاک میں مل گئے تو اصل خوف کی چیز کفر و شرک ہے جو تباہی و بربادی کا سبب ہوتا ہے۔ تم کیسے بے خبر بے وقوف ہو کہ کفر و شرک سے خطرہ محسوس نہیں کرتے ایمان سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔

تیسرا جواب اس آیت میں دیا گیا وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الآیۃ جس میں یہ بتلایا کہ اگر بالفرض ایمان لانے کے نتیجہ میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچ ہی جائے تو وہ چند روزہ ہے اور جس طرح دُنیا کی عیش و عشرت مال و دولت سب چند روزہ متاع ہے کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتی، اسی طرح یہاں کی تکلیف بھی چند روزہ ہے جلد ختم ہو جانے والی ہے اسلئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ فکر اُس تکلیف و راحت کی کرے جو پائیدار اور ہمیشہ رہنے والی ہو، ہمیشہ رہنے والی دولت و نعمت کیخاطر چند روزہ تکلیف و مشقت برداشت کر لینا ہی عقلمندی کی دلیل ہے۔

لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا، یعنی پچھلی قوموں کی جن بستیوں کو عذابِ الٰہی سے برباد کیا گیا تھا، اب تک بھی اُن میں آبادی نہیں ہوئی بجز قدرِ قلیل کے۔ اس قدرِ قلیل سے مراد اگر مساکن اور مقامات قلیلہ لئے جاویں جیسا کہ زجاج کا قول ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان تباہ شدہ

بستیوں میں کوئی مقام اور کوئی مکان پھر آباد نہیں ہو سکا بجز عدد قلیل کے کہ وہ آباد ہوئے مگر حضرت ابن عباس سے آیت کی یہ تفسیر منقول ہے کہ قدر قلیل سے مقامات اور مکانات قلیلہ کا استثناء نہیں بلکہ زمانِ سکونت کا استثناء مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان بستیوں میں کوئی رہتا بھی ہے تو بہت تھوڑی دیر کے لئے جیسے کوئی راہگیر مسافر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائے جس کو بستیوں کی آبادی نہیں کہا جا سکتا۔

حَتّٰى يَبْعَثَ فِىْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا، لفظ اُمّ کے مشہور معنے والدہ اور ماں کے ہیں اور ماں چونکہ تخلیقِ انسانی کی بنیاد ہے اسلئے لفظ اُمّ اصل اور اساس کے معنے میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اُمِّهَا کی ضمیر قُرٰی کی طرف راجع ہے اُمِّهَا سے مراد اُمّ القُرٰی ہے یعنی بستیوں کی اصل اور مدار کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُسوقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک اُس قوم کے بڑے شہروں میں اپنے کسی رسُول کے ذریعہ پیغامِ حق نہ پہنچا دے، جب دعوتِ حق پہنچ جائے اور لوگ اُس کو قبول نہ کریں اُسوقت ان بستیوں پر عذاب آتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے انبیاء اور رُسل عموماً بڑے شہروں میں مبعوث ہوتے ہیں وہ چھوٹے قصبات و دیہات میں نہیں آتے کیونکہ ایسے قصبات و دیہات عادۃً شہر کے تابع ہوتے ہیں اپنی معاشی ضروریات میں بھی اور تعلیمی ضروریات میں بھی۔ اور شہر میں جو بات پھیل جائے اس کا تذکرہ ملحقہ قصبات و دیہات میں خود بخود پھیل جاتا ہے اسی لئے جب کسی بڑے شہر میں رسُول مبعوث ہوا اور اُس نے دعوتِ حق پیش کردی تو یہ دعوت ان قصبات و دیہات میں بھی عادۃً پہنچ جاتی ہے اس طرح ان سب پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور انکار و تکذیب کیا جائے تو سب پر عذاب آتا ہے۔

احکام و قوانین میں قصبات و دیہات شہروں کے تابع ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے معاشی ضروریات میں چھوٹی بستیاں بڑے شہر کے تابع ہوتی ہیں وہیں سے اُن کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اسی طرح جب کسی حکم کا اعلان شہر میں کر دیا جائے تو اس حکم کی تعمیل اس کی ملحقہ بستیوں پر بھی لازم ہو جاتی ہے، نہ جاننے یا نہ سُننے کا عذر مسموع نہیں ہوتا۔

ہلالِ رمضان و عید کے مسئلے میں بھی فقہاء نے یہی فرمایا ہے کہ ایک شہر میں اگر شہادتِ شرعیہ کے ساتھ قاضی شہر کے حکم سے چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے تو ملحقہ بستیوں کو بھی اُس پر عمل کرنا لازم ہے۔ لیکن دوسرے شہر والوں پر اُسوقت تک لازم نہیں ہوگا جبتک خود اس شہر کا قاضی شہادت کو تسلیم کر کے اسکا حکم نہ دے۔ (کذا فی الفتاوی الغیاثیہ)

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى، یعنی دنیا کا مال و متاع اور عیش و عشرت سب فانی ہے اور یہاں کے اعمال کا جو بدلہ آخرت میں ملنے والا ہے وہ یہاں کے مال و اسباب اور عیش و

عشرت سے اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہے کہ دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی راحت ولذت بھی اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی اور پھر وہ ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہے بخلاف متاعِ دُنیا کے کہ وہ کتنا ہی بہتر ہو مگر بالآخر فانی اور زائل ہونے والا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسے عیش کو جو کم درجہ بھی ہو اور چند روزہ بھی اُس عیش و آرام پر ترجیح نہیں دے سکتا جو راحت و لذت میں اس سے زیادہ بھی ہو اور ہمیشہ رہنے والا بھی ہو۔

عقلمند کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دُنیا کے دھندوں میں زیادہ منہمک نہ ہو بلکہ آخرت کی فکر میں لگے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مال و جائیداد کے متعلق یہ وصیت کر کے مرجائے کہ میرا مال اُس شخص کو دیدیا جائے جو سب سے زیادہ عقلمند ہو تو اس مال کے مصرف شرعی وہ لوگ ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت میں مشغول ہوں، کیونکہ عقل کا تقاضا یہی ہے اور دُنیا داروں میں سے سب سے زیادہ عقل والا وہی ہے۔ یہی مسئلہ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب دُرِّ مختار باب الوصیت میں بھی مذکور ہے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ

بھلا ایک شخص جس سے ہم نے وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ سو وہ اُس کو پانے والا ہے برابر ہے اسکی جس کو ہم نے فائدہ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَوْمَ

دیا دُنیا کی زندگی کا پھر وہ قیامت کے دن پکڑا ہوا آیا اور جس دن

يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اُن کو پکارے گا تو کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ

بولے جن پر ثابت ہو چکی بات اے رب یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا

اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾

اُن کو بہکایا جیسے ہم آپ بہکے ہم منکر ہوئے تیرے آگے وہ ہم کو نہ پوجتے تھے

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ

اور کہیں گے پکارو اپنے شریکوں کو پھر پکاریں گے اُن کو تو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ

دیکھیں گے عذاب کسی طرح وہ راہ پائے ہوئے ہوتے اور جسدن اُن کو پکارے گا

فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اَجَبۡتُمُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِیَتۡ عَلَیۡهِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ
تو فرمائے گا کیا جواب دیا تھا تم نے پیغام پہنچانے والوں کو پھر بند ہو جائیں گی اُن پر باتیں

یَوۡمَئِذٍ فَهُمۡ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَ
اُس دن سو وہ آپس میں بھی نہ پوچھیں گے سو جس نے کہ توبہ کی اور یقین لایا اور

عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِیۡنَ ﴿۶۷﴾
عمل کئے اچھے سو اُمید ہے کہ ہو چھوٹنے والوں میں

خُلاصۂ تفسیر

بھلا وہ شخص جس سے ہم نے ایک پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے پھر وہ شخص اُس (وعدہ کی چیز) کو پانے والا ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دُنیوی زندگی کا چند روزہ فائدہ دے رکھا ہے پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہوگا جو گرفتار کر کے لائیں جائیں گے (مُراد پہلے شخص سے مؤمن ہے جس سے جنّت کا وعدہ ہے اور دوسرے سے مراد کافر جو مجرم ہو کر آوے گا اور چونکہ متاعِ دُنیا ہی ان لوگوں کی بھول کا سبب ہے اسلئے اسکی تصریح فرما دی، ورنہ ان دونوں کا برابر نہ ہونا تو دراصل اسوجہ سے ہے کہ وہ گرفتار کر کے حاضر کئے جاویں گے یہ جنّت کی نعمتوں سے سرفراز ہونگے) اور (آگے اس تفاوت اور کیفیت احضار کی تفصیل ہے کہ وہ دن قابل یاد کرنے کے ہے) جس دن خدا تعالیٰ ان کافرونکو (بطور سزا کے) پکار کر کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کو تم (ہمارا شریک) سمجھ رہے تھے (مراد اس سے شیاطین ہیں کہ اُنہی کی اطاعت مطلقہ سے شرک کرتے تھے اس لئے ان کو شرکا کہا اسکو سنکر شیاطین) جن پر (لوگوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے) خدا کا فرمودہ (یعنی استحقاقِ عذاب اس قول سے کہ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ) ثابت ہو چکا ہوگا وہ (بطور عذر کے) بول اُٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار بیشک یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا (یہ جواب کی تمہید ہے اس حکایت کی تصریح اسلئے فرمائی گئی کہ جن کی شفاعت کی ان کو اُمید ہے وہ برعکس انکے خلاف شہادت دیں گے اور آگے جواب ہے کہ ہم نے بہکایا تو ضرور لیکن) ہم نے اُن کو ویسا ہی (بلا جبر و اکراہ) بہکایا جیسا ہم خود (بلا جبر و اکراہ) بہکے تھے (یعنی جس طرح ہم خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے کسی نے ہمیں مجبور نہیں کیا اسی طرح ہمکو اُن پر جابرانہ تسلط نہ تھا ہمارا کام صرف بہکانا تھا پھر اسکو انھوں نے اپنی رائے اور اختیار سے قبول کر لیا جیسا سورۂ ابراہیم میں ہے وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ الآیۃ، مطلب یہ ہے کہ ہم بھی مجرم ہیں مگر یہ بھی بری نہیں) اور ہم آپکی پیشی میں انکے (تعلقات) سے دستبرداری کرتے ہیں (اور) یہ لوگ (درحقیقت صرف) ہم کو (ہی) نہ پوجتے تھے (یعنی

جب یہ اپنے اختیار سے بہکے ہیں تو یہ خود خواہش پرست ہوئے نہ کہ صرف شیطان پرست، مقصود اس سب حکایت سے یہ ہے کہ جن کے بھروسے بیٹھے ہیں وہ قیامت کے روز ان سے دست بردار ہو جائینگے اور (جب وہ شرکاء اس طرح ان سے بیزاری و بے رُخی کریں گے تو اسوقت ان مشرکین سے) کہا جائیگا کہ (اب) اپنے ان شرکاء کو بلاؤ چنانچہ وہ (فرط حیرت سے بالاضطرار) ان کو پکاریں گے سو وہ جواب بھی نہ دیں گے اور (اسوقت) یہ لوگ (اپنی آنکھوں) سے عذاب کو دیکھ لیں گے، اے کاش یہ لوگ دُنیا میں راہ راست پر ہوتے (تو یہ مصیبت نہ دیکھتے) اور جس دن ان کافروں سے پکار کر پُوچھے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا سو اس روز ان (کے ذہن) سے سارے مضامین گم ہو جائیں گے تو وہ (خود بھی نہ سمجھ سکیں گے اور) آپس میں پُوچھ پاچھ بھی نہ کر سکیں گے البتہ جو شخص (کفر و شرک سے دُنیا میں) توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ اُمید ہے کہ (آخرت میں) فلاح پانیوالوں سے ہونگے (اور ان آفات سے محفوظ رہیں گے)۔

معارف و مسائل

محشر میں کفار و مشرکین سے پہلا سوال شرک کے متعلق ہوگا کہ جن شیاطین وغیرہ کو تم ہمارا شریک کہا کرتے تھے اور اُن کا کہا مانتے تھے آج وہ کہاں ہیں، کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ اسکے جواب میں ظاہر یہ تھا کہ مشرکین یہ جواب دیں کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، ہم نے از خود شرک نہیں کیا بلکہ ہمیں توان شیاطین نے بہکایا تھا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ خود ان شیاطین کی زبانوں سے کہلوا دیں گے کہ ہم نے بہکایا ضرور تھا مگر مجبور تو ہم نے نہیں کیا۔ اس لئے مجرم ہم بھی ہیں مگر جُرم سے بُری یہ بھی نہیں کیونکہ جس طرح ہم نے اُن کو بہکایا تھا اسکے بالمقابل انبیاء علیہم السلام اور اُن کے نائبوں نے انکو ہدایت بھی تو کی تھی اور دلائل کے ساتھ ان پر حق واضح کر دیا تھا، اُنھوں نے اپنے اختیار سے انبیاء کی بات نہ مانی ہماری مان لی تو یہ کیسے بری ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے سامنے حق کے دلائل واضحہ موجود ہوں اور وہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے بجائے گمراہ کرنے والوں کی بات مان کر گمراہی میں پڑ جائے تو یہ کوئی عذر معتبر نہیں۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ

اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے اُن کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا، اللہ

اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ

نرالا ہے اور بہت اُوپر ہے اس چیز سے کہ شریک بتلاتے ہیں، اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے انکے سینوں میں

وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى

اور جو کچھ کہ ظاہر میں کرتے ہیں، اور وہی اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اسکے سوا، اسی کی تعریف ہے دُنیا اور

وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ

آخرت میں اور اسی کے ہاتھ حکم ہے اور اسی کے پاس پھیرے جاؤگے۔ تو کہہ دیکھو تو اگر اللہ

اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ

رکھ دے تم پر رات ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے

يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ

کہ لائے تم کو کہیں سے روشنی، پھر کیا تم سنتے نہیں تو کہہ دیکھو تو اگر رکھدے اللہ

عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ

تم پر دن ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو

بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ

رات جس میں آرام کرو، پھر کیا تم نہیں دیکھتے اور اپنی مہربانی سے بنا دیئے تمہارے واسطے

الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

رات اور دن کہ اسمیں چین بھی کرو اور تلاش بھی کرو کچھ اسکا فضل اور تاکہ تم شکر کرو

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا رب (بالانفراد صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف ہے چنانچہ وہ) جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (تو تکوینی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے (اور انبیاء کے ذریعہ سے نازل فرماتا ہے پس تشریعی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) ان لوگوں کو تجویز (احکام) کا کوئی حق (حاصل) نہیں (کہ جو حکم چاہیں تجویز کرلیں جیسے یہ مشرک اپنی طرف سے شرک کو جائز تجویز کر رہے ہیں اور اس خصوصی اختیار سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ اُن کے شرک سے پاک اور برتر ہے (کیونکہ جب تکویناً و تشریعاً خالق اور مختار ہونے میں وہ منفرد ہے تو عبادت کا بھی تنہا وہی مستحق ہے کیونکہ معبود ہونا صرف اسکا حق ہے جو تکوینی اور تشریعی دونوں اختیار رکھتا ہو) اور آپ کا رب (علم ایسا کامل رکھتا ہے کہ وہ) سب چیزوں کی خبر رکھتا ہے جو اُن کے دلوں میں پوشیدہ رہتا ہے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (اور کسی کا ایسا علم بھی نہیں اس سے بھی انفراد ثابت ہوا) اور (آگے اس کی تصریح ہے کہ) اللہ وہی (ذات کامل الصفات) ہے اسکے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں حمد (وثناء) کے لائق دُنیا و آخرت میں وہی ہے (کیونکہ اسکے تصرفات دونوں عالم میں ایسے ہیں جو اسکے جامع کمالات اور مستحق حمد

ہونے پر شاہد ہیں) اور (اختیاراتِ سلطنت اسکے ایسے ہیں کہ) حکومت بھی (قیامت میں) اسی کی ہوگی اور (قوت و وسعتِ سلطنت اسکی ایسی ہے) کہ تم سب اسی کے پاس لَوٹ کر جاؤ گے (یہ نہیں کہ بچ جاؤ یا اور کہیں جاکر پناہ لے لو اور اسکے اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آوے (پس قدرت میں بھی وہی منفرد ہے) تو کیا تم (توحید کے ایسے صاف دلائل کو) سنتے نہیں (اور اسی اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان سے اسکے عکس کی نسبت بھی) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آوے جس میں تم آرام پاؤ کیا تم (اس شاہد قدرت کو) دیکھتے نہیں (قدرت میں اسکا منفرد ہونا بھی اس کو مقتضی ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو) اور (وہ منعم ایسا ہے کہ) اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ تم رات میں آرام کرو اور تاکہ دن میں اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (ان دونوں نعمتوں پر) تم (اللہ کا) شکر کرو (تو انعام و احسان میں بھی وہی منفرد ہے یہ بھی اسکی دلیل ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو)۔

معارف و مسائل

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ، اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لیا گیا کہ یختار سے مراد اختیار احکام ہے کہ حق تعالیٰ جبکہ تخلیق کائنات میں منفرد ہے کوئی اسکا شریک نہیں تو اجرائے احکام میں بھی منفرد ہے جو چاہے اپنی مخلوق میں حکم نافذ فرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اختیار تکوینی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اسی طرح اختیار تشریعی میں بھی کوئی شریک نہیں اور اسکا ایک دوسرا مفہوم وہ ہے جو امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ اس اختیار سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہیں اپنے اکرام و اعزاز کے لئے انتخاب فرما لیتے ہیں اور بقول بغوی یہ جواب ہے مشرکین مکہ کے اس قول کا کہ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ، یعنی یہ قرآن اللہ کو نازل ہی کرنا تھا تو عرب کے دو بڑے شہروں مکہ اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل فرماتا کہ اسکی قدر و منزلت پہچانی جاتی، ایک یتیم مسکین پر نازل فرمانے میں کیا حکمت تھی؟ اسکے جواب میں فرمایا کہ جس مالک نے تمام مخلوقات کو بغیر کسی شریک کی امداد کے پیدا فرمایا ہے یہ اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے کہ اپنے کسی خاص اعزاز کے لئے اپنی مخلوق میں سے کسی کو منتخب کرے اسمیں وہ تمہاری تجویزوں کا کیوں پابند ہو کہ فلاں اسکا مستحق ہے فلاں نہیں۔

ایک چیز کو دوسری چیز پر یا ایک شخص کو دوسرے پر فضیلت کا معیارِ صحیح اختیارِ خداوندی ہے

حافظ ابن قیم نے اس آیت سے ایک عظیم الشان ضابطہ اخذ کیا ہے کہ دُنیا میں جو ایک جگہ کو دوسری جگہ پر یا ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دی جاتی ہے یہ اُس چیز کے کسب عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بلا واسطہ خالق کائنات کے انتخاب و اختیار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اُس نے سات آسمان پیدا کئے اُنہیں سے سماءِ عُلیا کو دوسروں پر فضیلت دیدی حالانکہ مادہ ساتوں آسمانوں کا ایک ہی تھا، پھر اُس نے جنت الفردوس کو دوسری سب جنتوں پر اور جبرئیل و میکائیل و اسرافیل وغیرہ خاص فرشتوں کو دوسرے فرشتوں پر، اور انبیاء علیہم السلام کو دوسرے سارے بنی آدم پر اور اُن میں سے اولوالعزم رسولوں کو دوسرے انبیاء پر اور اپنے خلیل ابراہیم اور حبیب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسرے سب اولوالعزم رسولوں پر، پھر اولاد اسماعیل علیہ السلام کو دوسری ساری دُنیا کے لوگوں پر پھر قریش کو اُن سب پر اور بنی ہاشم کو سب قریش پر اور سید ولد آدم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب بنی ہاشم پر پھر اسی طرح صحابہ کرام اور دوسرے اسلاف اُمت کو دوسروں پر فضیلت دینا یہ سب حق تعالیٰ جل شانہٗ کے انتخاب و اختیار کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح زمین کے بہت سے مقامات کو دوسرے مقامات پر اور بہت دنوں اور راتوں کو دوسرے دنوں اور راتوں پر فضیلت دینا یہ سب اُسی اختیار اور انتخاب حق جل شانہ کا اثر ہے غرض افضلیت و مفضولیت کا اصل معیار تمام کائنات میں یہی انتخاب و اختیار ہے البتہ افضلیت کا ایک دوسرا سبب انسانی اعمال و افعال بھی ہوتے ہیں اور جن مقامات میں نیک اعمال کئے جادیں وہ مقامات بھی ان اعمال صالحہ یا صالحین عباد کی سکونت سے متبرک ہو جاتے ہیں۔ یہ فضیلت کسب و اختیار اور عمل صالح سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں مدارِ فضیلت دو چیزیں ہیں ایک غیر اختیاری یہ جو صرف حق تعالیٰ کا انتخاب ہے دوسرا اختیاری جو اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ سے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے اس موضوع پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور آخر میں صحابہ کرام میں سے خلفاء راشدین کو تمام دوسرے صحابہ پر اور خلفاء راشدین میں صدیقِ اکبر انکے بعد عمر بن خطاب ان کے بعد عثمانِ غنی انکے بعد علیِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی ترتیب کو ان دونوں معیاروں سے ثابت کیا ہے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک مستقل رسالہ فارسی زبان میں اس موضوع پر ہے جسکا اُردو ترجمہ احقر نے بنام بعض التفصیل لمسئلۃ التفضیل شائع کر دیا ہے اور احکام القرآن سورۂ قصص میں بھی اس کو بزبان عربی مفصل لکھدیا ہے۔ اہل علم کے ذوق کی چیز ہے وہاں مطالعہ فرمائیں۔

اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ الٰی قولہٖ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اس

آیت میں حق تعالیٰ نے رات کے ساتھ تو اُسکا ایک فائدہ ذکر فرمایا، لِتَسْكُنُوا فِيهِ، یعنی رات میں انسان کو سکون ملتا ہے اسکے بالمقابل دن کے ذکر میں بضیاء کے ساتھ کوئی فائدہ ذکر نہیں فرمایا سبب ظاہر ہے کہ دن کی روشنی اپنی ذات میں افضل ہے اور ظلمت سے روشنی کا بہتر ہونا معلوم معروف ہے۔ روشنی کے بیشمار فوائد اتنے معروف ہیں کہ اُن کے بیان کی ضرورت نہیں، بخلاف رات کے کہ وہ ظلمت اور اندھیری ہی جو اپنی ذات میں کوئی فضیلت نہیں رکھتی بلکہ اسکی فضیلت لوگوں کے سکون و آرام کے سبب سے ہے اسلئے اسکو بیان فرمادیا۔ اور اسی لئے دن کے معاملہ کا ذکر کرکے آخر میں فرمایا: أَفَلَا تَسْمَعُونَ اور رات کا معاملہ ذکر کرکے فرمایا أَفَلَا تُبْصِرُونَ اسمیں اشارہ ہو سکتا ہے کہ دن کے فضائل و برکات اور اسکے فوائد و ثمرات بیشمار ہیں جو احاطۂ بصر میں نہیں آسکتے البتہ سُنے جاسکتے ہیں اسلئے أَفَلَا تَسْمَعُونَ فرمایا۔ کیونکہ انسانی علم و ادراک کا بڑا ذخیرہ کانوں ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، آنکھوں سے دیکھی ہوئی اشیاء ہمیشہ کانوں سے سُنی ہوئی اشیاء سے بہت کم ہوئی ہیں اور رات کے فوائد بہ نسبت دن کے فوائد کے کم ہیں وہ دیکھے بھی جاسکتے ہیں اسلئے یہاں أَفَلَا تُبْصِرُونَ کا کلمہ اختیار فرمایا۔ (مظہری)

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾

اور جس دن اُن کو پکارے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ

اور جُدا کر دیں گے ہم ہر فرقے میں سے ایک احوال بتلانے والا، پھر کہیں گے لاؤ اپنی سند تب جان لیں گے کہ

الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾ ع

سچ بات ہے اللہ کی اور کھوئی جائیں گی اُن سے جو باتیں وہ جوڑتے تھے

ع ۱۵ / ۱۰

خُلاصۂ تفسیر

اور جس دن اللہ تعالیٰ اُن کو پکار کر فرمائے گا (تاکہ سب لوگ اُن کی رسوائی سُن لیں) کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے وہ کہاں گئے اور (اگرچہ حجت تمام کرنے کے لئے خود اسکا اقرار کافی تھا مگر مزید تاکید کے لئے ان پر شہادت بھی قائم کر دی جاوے گی اس طرح کہ) ہم ہر اُمت میں سے ایک ایک گواہ (بھی) نکال کر لائیں گے (مُراد اس سے انبیاء ہیں جو اُنکے کفر کی گواہی دیں گے) پھر ہم (ان مشرکین سے) کہیں گے کہ (اب) اپنی کوئی دلیل (شرک کے دعوے کی صحت پر) پیش کرو سو (اُسوقت) اُن کو (بعین الیقین) معلوم ہو جاوے گا کہ سچی بات خدا کی تھی (جو انبیاء کے ذریعہ تبلائی گئی تھی

اور شرک کا دعویٰ جھوٹا تھا) اور (دنیا میں) جو کچھ باتیں گھڑا کرتے تھے (آج) کسی کا پتہ نہ رہے گا۔ (کیونکہ انکشافِ حق کے لئے باطل کا غائب ہو جانا لازم ہے)۔

فائدہ اس سے پہلی آیت میں جو سوال مَاذَآ اَجَبْتُمُ میں کیا گیا اس میں کفار سے انبیاء کو جواب دینے کے متعلق باز پرس تھی اور یہاں خود انبیاء علیہم السلام سے شہادت دلوانا مقصود ہے اسلئے سوال میں کوئی تکرار نہیں۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ

قارون جو تھا سو موسیٰ کی قوم سے پھر شرارت کرنے لگا ان پر اور ہم نے دیئے تھے اسکو خزانے

مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۖ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ

اتنے کہ اسکی کنجیاں اٹھانے سے تھک جاتے کئی مرد زور آور جب کہا اس کو اسکی قوم نے

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ

اترا مت اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے اور جو تجھ کو اللہ نے

اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ

دیا ہے اُس سے کمالے پچھلا گھر اور نہ بھول اپنا حصہ دنیا سے اور بھلائی کر جیسے

اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور مت چاہ خرابی ڈالنی ملک میں اللہ کو بھاتے نہیں

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ ۖ اَوَلَمْ يَعْلَمْ

خرابی ڈالنے والے بولا یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے کیا اُسنے یہ نہ جانا

اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً

کہ اللہ غارت کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی جماعتیں جو اس سے زیادہ رکھتی تھیں زور

وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۖ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ فَخَرَجَ عَلٰى

اور زیادہ رکھتی تھیں مال کی جمع، اور بوچھے نہ جائیں گنہگاروں سے اُن کے گناہ پھر نکلا اپنی

قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ ۖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ

قوم کے سامنے اپنے ٹھاٹھ سے، کہنے لگے جو لوگ طالب تھے دنیا کی زندگی کے اے کاش

لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

ہم کو ملے جیسا کچھ ملا ہے قارون کو بیشک اسکی بڑی قسمت ہے اور بولے جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ

ملی تھی سمجھ اے خرابی تمہاری اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے انکے واسطے جو یقین لائے اور کام کیا بھلا

وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ
اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو سہنے والے ہیں، پھر دھنسا دیا ہم نے اسکو اور اسکے گھر کو زمین میں
فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ
پھر نہ ہوئی اس کی کوئی جماعت جو مدد کرتی اس کی اللہ کے سوائے اور نہ وہ
مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ
خود مدد لا سکا اور فجر کو لگے کہنے جو کل شام آرزو کرتے تھے اس کا سا
يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ
درجہ اے خرابی یہ تو اللہ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے
لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع
اگر نہ احسان کرتا ہم پر اللہ تو ہمکو بھی دھنسا دیتا، اے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر

خُلاصۂ تفسیر

قارون (کا حال دیکھ لو کہ کفر و خلاف کرنے سے اس کو کیا ضرر پہنچا اور اسکا مال و متاع کچھ کام نہ آیا بلکہ اسکے ساتھ اسکا مال و متاع بھی برباد ہو گیا، مختصر اسکا قصہ یہ ہے کہ وہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی برادری میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے، بلکہ ان کا چچازاد بھائی) تھا (کذا فی الدر) سو وہ کثرت مال کی وجہ سے) ان لوگوں کے مقابلہ میں تکبر کرنے لگا اور (مال کی اسکے پاس یہ کثرت تھی کہ) ہم نے اس کو اسقدر خزانے دیئے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں (یعنی اُن سے بتکلف اُٹھتی تھیں تو جب کنجیاں اس کثرت سے تھیں تو ظاہر ہے کہ خزانے بہت ہی ہونگے اور یہ تکبر اسوقت کیا تھا) جبکہ اس کو اس کی برادری نے (سمجھانے کے طور پر) کہا کہ تو (اس مال وحشمت پر) اترا مت واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور (یہ بھی کہا کہ) تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کرا ور دُنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) فراموش مت کر اور (مطلب اِبْتَغِ وَلَا تَنْسَ کا یہ ہے کہ) جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر اور (خدا کی نافرمانی اور حقوق واجبہ ضائع کر کے) دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو (یعنی گناہ کرنے سے دُنیا میں فساد ہوتا ہے کقولہ تعالیٰ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ بالخصوص متعدی گناہ) بیشک اللہ تعالیٰ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا (یہ سب نصیحت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی غالباً یہ مضامین موسیٰ علیہ السلام نے اوّل فرمائے ہونگے پھر مکرر دوسرے مسلمانوں نے ان کا اعادہ کیا ہوگا) قارون (یہ سُن کر) کہنے لگا کہ

مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے (یعنی میں وجوہ و تدابیر معاش کی خوب جانتا ہوں اس سے میں نے یہ سب جمع کیا ہے پھر میرا تفاخر بیجا نہیں اور نہ اس کو غیبی احسان کہا جا سکتا ہے اور نہ کسی کا اسمیں کچھ استحقاق ہو سکتا ہے آگے اللہ تعالیٰ اسکے اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ) کیا اُس (قارون) نے (اخبار متواترہ سے) یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اُمتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت (مالی) میں (بھی) اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع (بھی اس سے) اُن کا زیادہ تھا اور (صرف یہی نہیں کہ بس ہلاک ہو کر چھوٹ گئے ہوں بلکہ بوجہ اُن کے ارتکابِ جرم کفر اور اللہ تعالیٰ کو یہ جرم معلوم ہونے کے قیامت میں بھی معذب ہونگے جیسا وہاں کا قاعدہ ہے کہ) اہلِ جُرم سے اُن کے گناہوں کا (تحقیق کرنے کی غرض سے) سوال نہ کرنا پڑے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ سب معلوم ہے گو زجر و تنبیہ کے لئے سوال ہو لقولہ تعالیٰ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، مطلب یہ کہ اگر قارون اس مضمون پر نظر کرتا تو ایسی جہالت کی بات نہ کہتا کیونکہ پچھلی قوموں کے حالاتِ عذاب سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور مؤاخذۂ اخرویہ سے اُسیکا احکم الحاکمین ہونا ظاہر ہے، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی نعمت کو اپنی ہنرمندی کا نتیجہ بتلائے اور حقوق واجبہ سے انکار کرے) پھر (ایکبار ایسا اتفاق ہوا کہ) وہ اپنی آرائش (اور شان) سے اپنی برادری کے سامنے نکلا جو لوگ (اُس کی برادری میں) دُنیا کے طالب تھے (گو مؤمن ہوں جیسا اُن کے اگلے قول وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الخ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے وہ لوگ) کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے (یہ تمنا حرص کی تھی، اس سے کافر ہونا لازم نہیں آتا، جیسا اب بھی بعضے آدمی باوجود مسلمان ہونے کے شب و روز دوسری قوموں کی ترقیاں دیکھ کر للچاتے ہیں اور اسکی فکر میں لگے رہتے ہیں) اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی وہ (ان حریصوں سے) کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو (تم اس دُنیا پر کیا جاتے ہو) اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب (اس دُنیوی کر و فر سے) ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور (پھر ایمان و عمل صالح والوں میں سے بھی) وہ (ثواب کامل طور پر) ان ہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیا کی حرص و طمع سے) صبر کرنے والے ہیں (پس تم لوگ ایمان کی تکمیل اور عمل صالح کی تحصیل میں لگو اور حد شرعی کے اندر دنیا حاصل کر کے زائد کی حرص و طمع سے صبر کرو) پھر ہمنے اس قارون کو اور اسکے محل سرائے کو (اس کی شرارت بڑھ جانے سے) زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ (کے عذاب) سے بچا لیتی (گو وہ بڑی جماعت والا تھا) اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا اور کل (یعنی پچھلے قریب زمانہ میں) جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (آج اسکے خسف کو دیکھ کر) کہنے لگے بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ (رزق کی فراخی

اور تنگی کا مدار خوش نصیبی یا بد نصیبی پر نہیں ہے بلکہ یہ تو محض حکمتِ تکوینیہ سے اللہ ہی کے قبضہ میں ہے بس) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے اور (جسکو چاہے) تنگی سے دینے لگتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ اس کو خوش نصیبی سمجھتے تھے ہماری توبہ ہے اور واقعی) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا (کیونکہ حرص اور حُبِّ دُنیا کی معصیت کے ہم بھی مرتکب ہوئے تھے) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر خسران ہے بس فلاح معتد بہ اہلِ ایمان ہی کے ساتھ مخصوص ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ قصص کے شروع سے یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ مذکور تھا جو اُن کو فرعون اور آلِ فرعون کے ساتھ پیش آیا، یہاں اُنکا دوسرا قصہ بیان ہوتا ہے جو اپنی برادری کے آدمی قارون کے ساتھ پیش آیا اور مناسبت اسکی سابقہ آیتوں سے یہ ہے کہ پچھلی آیت میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ دُنیا کی دولت و مال جو تمھیں دیا جاتا ہے وہ چند روزہ متاع ہے اس کی محبت میں لگجانا دانشمندی نہیں۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، الآیۃ، قارون کے قصہ میں یہ بتلایا گیا کہ اُسنے مال و دولت حاصل ہونے کے بعد اس نصیحت کو بھلا دیا اسکے نشہ میں مست ہو کر اللہ تعالےٰ کی ناشکری بھی کی اور مال پر جو حقوق واجبہ اللہ تعالےٰ کیطرف سے فرض ہیں اُنکی ادائگی سے منکر بھی ہو گیا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے خزانوں سمیت زمین کے اندر دھنسا دیا گیا۔

قارون ایک عجمی لفظ غالباً عبرانی زبان کا ہے اسکے متعلق اتنی بات تو خود الفاظِ قرآن سے ثابت ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برادری بنی اسرائیل ہی میں سے تھا۔ باقی یہ کہ اسکا رشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا اسمیں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ کی ایک روایت میں اسکو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی قرار دیا ہے اور بھی کچھ اقوال ہیں۔ (قرطبی و روح)

رُوح المعانی میں محمد بن اسحٰق کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قارون تورات کا حافظ تھا اور دوسرے بنی اسرائیل سے زیادہ اس کو تورات یاد تھی مگر سامری کی طرح منافق ثابت ہوا اور اسکی منافقت کا سبب دُنیا کے جاہ و عزت کی بیجا حرص تھی۔ پورے بنی اسرائیل کی سیادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی اور اُنکے بھائی ہارون اُنکے وزیر اور شریکِ نبوت تھے اس کو یہ حسد ہوا کہ میں بھی تو ان کی برادری کا بھائی اور قریبی رشتہ دار ہوں میرا اس سیادت و قیادت میں کوئی حصہ کیوں نہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے اسکی شکایت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے مجھے اسمیں کچھ دخل نہیں مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوا اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے حسد رکھنے لگا۔

فَبَغٰى عَلَيْهِمْ، لفظ بغی چند معانی کے لئے آتا ہے۔ مشہور معنے ظلم کے ہیں، یہاں یہ معنی بھی مُراد ہوسکتے ہیں کہ اس نے اپنے مال و دولت کے نشہ میں دوسروں پر ظلم کرنا شروع کیا، یحییٰ بن سلام اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ قارون سرمایہ دار آدمی تھا، فرعون کیطرف سے بنی اسرائیل کی نگرانی پر مامور تھا، اس امارت کے عہدے میں اُسنے بنی اسرائیل کو ستایا۔ (قرطبی)

اور دوسرے معنے تکبر کے بھی آتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اس جگہ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ اسنے مال و دولت کے نشہ میں بنی اسرائیل پر تکبر شروع کیا اور اُن کو حقیر و ذلیل قرار دیا۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ، کنوز، کنز کی جمع ہے، مدفون خزانہ کو کہا جاتا ہے اور اصطلاحِ شرع میں کنز وہ خزانہ ہے جسکی زکوٰۃ نہ دی گئی ہو۔ حضرت عطار سے روایت ہے کہ اسکو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک عظیم الشان مدفون خزانہ مل گیا تھا۔ (مرح)

لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ، ناء کا لفظ بوجھ سے جُھکا دینے کے معنی میں آتا ہے اور عصبہ کے معنی جماعت کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اسکے خزانے اتنے زیادہ تھے کہ اُن کی کنجیاں اتنی تعداد میں تھیں کہ ایک قوی جماعت بھی ان کو اُٹھائے تو بوجھ سے جُھک جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قفل کی کنجی بہت ہلکے وزن کی رکھی جاتی ہے جسکا اُٹھانا اور پاس رکھنا مشکل نہ ہو مگر کثرتِ عدد کے سبب یہ اتنی ہوگئی تھیں کہ ان کا وزن ایک قوی جماعت بھی آسانی سے نہ اُٹھا سکے۔ (مرح)

لَا تَفْرَحْ، فرح کے لفظی معنے اُس خوشی کے ہیں جو انسان کو کسی لذتِ عاجلہ کے سبب حاصل ہو۔ قرآن کریم نے بہت سی آیات میں فَرح کو مذموم قرار دیا جیسا کہ ایک اسی آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ اور ایک آیت میں لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ اور ایک آیت میں ہے فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور بعض آیات میں فرح کی اجازت بلکہ ایک طرح کا امر بھی وارد ہوا ہے جیسے يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ میں اور آیت فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا میں ارشاد ہوا ہے۔ ان سب آیات کے مجموعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ فَرح ہے جو اِترانے اور تکبر کرنے کی حد تک پہنچ جائے اور وہ جبھی ہوسکتا ہے کہ اس لذت و خوشی کو وہ اپنا ذاتی کمال اور ذاتی حق سمجھے اللہ تعالیٰ کا انعام و احسان نہ سمجھے۔ اور جو خوشی اس حد تک نہ پہنچے وہ ممنوع نہیں بلکہ ایک حیثیت سے مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی شکر گزاری ہے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا، یعنی مسلمانوں نے قارون کو یہ نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت تجھے عطا فرمایا ہے اسکے ذریعہ آخرت کا سامان فراہم کر، اور دُنیا میں جو تیرا حصہ ہے اُس کو نہ بھول۔

دُنیا کا حصّہ کیا ہے اس کی تفسیر اکثر مفسّرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد دُنیا کی عمر اور اُسمیں کئے ہوئے وہ اعمال ہیں جو اُس کو آخرت میں کام آویں جس میں صدقہ خیرات بھی داخل ہے اور دوسرے اعمالِ صالحہ بھی۔ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور مفسّرین سے یہی معنے منقول ہیں کما فی القرطبی) اس صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید و تائید ہوگی۔ پہلے جملے میں جو کہا گیا کہ جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے یعنی مال و دولت اور عمر و قوت و صحت وغیرہ ان سب سے وہ کام لے جو دار آخرت میں تیرے کام آئے اور درحقیقت دُنیا کا یہی حصّہ تیرا ہے جو آخرت کا سامان بن جائے باقی دُنیا تو دوسرے وارثوں کا حصّہ ہے۔ اور بعض مفسّرین نے فرمایا کہ دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمھیں دیا ہے اُس سے اپنی آخرت کا سامان بھی کرو مگر اپنی ضروریاتِ دُنیا کو بھی نہ بھلاؤ کہ سب صدقہ خیرات کر کے کنگال بن جاؤ بلکہ بقدر ضرورت اپنے لئے بھی رکھو۔ اس تفسیر پر نصیبِ دُنیا سے مراد اُس کی معاشی ضروریات ہونگی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ۚ، بعض مفسّرین نے فرمایا کہ یہاں علم سے مراد علمِ تورات ہے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ قارون تورات کا حافظ اور عالم تھا اور اُن ستر اصحاب میں سے تھا جن کو حضرت موسٰی علیہ السلام نے میقات کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ مگر اس کو اپنے اس علم پر ناز و غرور پیدا ہوگیا اسکو اپنا ذاتی کمال سمجھ بیٹھا اور اسکے اس کلام کا مطلب یہی تھا کہ مجھے جو کچھ مال و دولت ملا ہے میرے اپنے ذاتی کمالِ علمی کے سبب ملا ہے اسلئے میں اسکا خود حقدار ہوں اس میں مجھ پر کسی کا احسان نہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہاں علم سے مُراد معاشی تدبیروں کا علم ہے مثلاً تجارت صنعت وغیرہ کا جن سے مال حاصل ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو مال مجھے حاصل ہوا ہے اسمیں اللہ تعالیٰ کے احسان کا کیا دخل ہے یہ تو میں نے اپنی ہوشیاری اور کارگزاری کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور جاہل نے یہ نہ سمجھا کہ یہ ہوشیاری اور کارگزاری اور صنعت یا تجارت کا تجربہ اور علم بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا تھا اسکا کوئی ذاتی کمال نہ تھا۔

أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِۦ، قارون کے اس قول کا کہ میرا مال و دولت میرے ذاتی علم و ہنر سے حاصل کردہ ہے اصل جواب تو وہ تھا جو اُوپر لکھا گیا ہے کہ اگر یہی تسلیم کر لیا جائے کہ اسکا سبب کوئی خاص علم و ہنر تھا تو بھی اللہ تعالیٰ کے احسان سے کیسے بَری ہوا کیونکہ یہ علم و ہنر اور قوتِ کسب بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے مگر اسکا جواب بوجہ غایت ظہور کے نظر انداز فرما کر قرآن نے یہ بتلایا کہ یہ مال و دولت فرض کرو کہ اس کو اپنے ہی ذاتی کمال سے حاصل ہوا ہو مگر خود اس مال و دولت کی کوئی حقیقت نہیں، مال کی فراوانی کسی انسان کے لئے نہ کوئی کمال اور فضیلت ہے اور نہ وہ ہر حال میں اسکے کام آتا ہے اسکے ثبوت میں پچھلی اُمتوں کے بڑے سرمایہ داروں

کی مثال پیش فرمائی کہ جب اُنھوں نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو اچانک پکڑ لیا مال و دولت اُن کے کچھ بھی کام نہ آیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ الآیۃ، اس آیت میں، اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی علماء کا مقابلہ اَلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا سے کیا گیا ہے جسمیں واضح اشارہ اسطرف ہے کہ متاعِ دُنیا کا ارادہ اور اس کو مقصود بنانا اہلِ علم کا کام نہیں اہلِ علم کی نظر ہمیشہ آخرت کے دائمی فائدہ پر رہتی ہے، متاعِ دُنیا کو بقدرِ ضرورت حاصل کرتے ہیں اور اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ
وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے اپنی بڑائی ملک میں

وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ
اور نہ بگاڑ ڈالنا اور عاقبت بھلی ہے ڈرنے والوں کی جو لے کر آیا بھلائی اسکو ملنا ہے اس سے

مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ
بہتر اور جو کوئی لے کر آیا بُرائی سو بُرائیاں کرنے والے اُن کو وہی سزا ملے گی

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾
جو کچھ وہ کرتے تھے

خُلاصۂ تفسیر

یہ عالمِ آخرت (جس کے ثواب کا مقصود ہونا اُوپر (ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ) میں بیان ہوا ہے) ہم اُنہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دُنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا (یعنی نہ تکبر کرتے ہیں جو باطنی گناہ ہے اور نہ کوئی ظاہری گناہ ایسا کرتے ہیں جس سے زمین میں فساد برپا ہو) اور صرف ان باطنی اور ظاہری بُرائیوں سے بچنا کافی نہیں بلکہ) نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے، (جو بُرائیوں سے اجتناب کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے بھی پابند ہوں اور کیفیت اعمال پر جزا و سزا کی یہ ہوگی کہ) جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آوے گا اُس کو اُس (کے مقتضا) سے بہتر (بدلہ) ملے گا (کیونکہ نیک عمل کا اصل مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اُس کی حیثیت کے موافق عوض ملے مگر وہاں اُس سے زیادہ دیا جاوے گا جس کا کم سے کم درجہ اس کی حیثیت سے دس گُنا ہے) اور جو شخص بدی لے کر آوے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے ہیں اُتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے (یعنی اسکے مقتضیٰ سے زیادہ بدلہ سزا کا نہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۔ اس آیت میں دار آخرت کی نجات و فلاح کو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے جو زمین میں عُلُو اور فساد کا ارادہ نہ کریں ۔ عُلُو سے مراد تکبر ہے یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا بنانے اور دوسروں کو حقیر کرنے کی فکر ۔ اور فساد سے مراد لوگوں پر ظلم کرنا ہے (سفیان ثوری) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر معصیت فساد فی الارض ہے کیونکہ گناہ کے وبال سے دُنیا کی برکت میں کمی آتی ہے ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تکبر اور ظلم کا یا مطلق معصیت کا ارادہ کریں اُن کا آخرت میں حصّہ نہیں ۔

فائدہ تکبر جس کی حُرمت اور وبال اس آیت میں ذکر کیا گیا وہ وہی ہے کہ لوگوں پر تفاخر اور انکی تحقیر مقصود ہو، ورنہ اپنے لئے اچھے لباس اچھی غذا اچھے مکان کا انتظام جب وہ دوسروں کے تفاخر کے لئے نہ ہو مذموم نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے ۔

معصیت کا پختہ عزم بھی معصیت ہے اس آیت میں علو اور فساد کے ارادہ پر دار آخرت سے محروم ہونے کی وعید ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت کا پختہ ارادہ جو عزم مصمّم کے درجہ میں آجائے وہ بھی معصیت ہی ہے (کما فی الروح) البتہ اگر پھر وہ خدا کے خوف سے اس ارادہ کو ترک کر دے تو گناہ کی جگہ ثواب اُسکے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہے اور اگر کسی غیر اختیاری سبب سے اُس گناہ پر قدرت نہ ہوئی اور عمل نہ کیا مگر اپنی کوشش گناہ کے لئے پوری کی تو وہ بھی معصیت اور گناہ لکھا جائیگا (کما ذکرہ الغزالی رح) آخر آیت میں فرمایا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اسکا حاصل یہ ہے کہ آخرت کی نجات اور فلاح کے لئے دو چیزوں عُلُو اور فساد سے اجتناب بھی لازم ہے اور تقویٰ یعنی اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی، صرف ان دو چیزوں سے پرہیز کر لینا کافی نہیں بلکہ جو اعمال ازروئے شرع فرض و واجب ہیں اُن پر عمل کرنا بھی نجاتِ آخرت کی شرط ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ

جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ، تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے

مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ

کون لایا ہے راہ کی سُوجھ اور کون پڑا ہے صریح گمراہی میں اور تو تو توقع

تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا

نہ رکھتا تھا کہ اُتاری جائے تجھ پر کتاب مگر مہربانی سے تیرے رب کی سو تو

تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

مت ہو مددگار کافروں کا اور نہ ہو کہ وہ تجھ کو روک دیں اللہ کے حکموں سے

بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ

بعد اسکے کہ اُتر چکے تیری طرف اور بُلا اپنے رب کی طرف اور مت ہو شریک

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

والوں میں اور مت پکار اللہ کے سوائے دوسرا حاکم، کسی کی بندگی نہیں اسکے سوائے

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٨٨﴾

ہر چیز فنا ہے مگر اسکا منھ اُسی کا حکم ہے اور اُسی کیطرف پھر جاؤ گے

وقف لازم

ع ۹ / ۱۲

خلاصۂ تفسیر

(اور آپکے ان مخالفین نے جو آپ کو پریشان کر کے ترکِ وطن پر مجبور کیا ہے جسکی اضطراری مفارقت کا آپ کو صدمہ ہے تو آپ تسلی رکھیں) جس خدا نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اسکی تبلیغ) کو فرض کیا ہے (جو مجموعاً دلیل ہے آپکی نبوت کی) وہ آپکو (آپکے) اصلی وطن (یعنی مکہ) میں پھر پہنچادے گا (اور اُس وقت آپ آزاد اور غالب اور صاحبِ سلطنت ہونگے، اور ایسی حالت میں اگر دوسری جگہ قیام کے لئے تجویز کیجاتی ہے بمصلحت دباختیار ہوتی ہے جس سے رنج نہیں ہوتا، اور باوجود آپکے تحقق نبوت کے جو یہ لوگ آپ کو غلطی پر اور اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں تو) آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون سچا دین لیکر (منجانب اللہ) آیا ہے اور کون صریح گمراہی میں (مبتلا) ہے (یعنی میرے حق پر ہونے اور تمہارے باطل پر ہونے کے دلائل قطعیہ موجود ہیں مگر جب ان سے کام نہیں لیتے تو اخیر جواب یہی ہے کہ خیر، خدا کو معلوم ہے وہ بتلادے گا) اور (آپ کی یہ دولت نبوت محض خدا داد ہے حتیٰ کہ خود) آپ کو (نبی ہونے کے قبل) یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جاوے گی مگر محض آپکے رب کی مہربانی سے اسکا نزول ہوا، سو آپ (ان لوگوں کی خرافات کیطرف توجہ نہ کیجئے اور جس طرح ابتک ان سے الگ تھلگ رہے آئندہ بھی اسی طرح) ان کافروں کی ذرا تائید نہ کیجئے، اور جب اللہ کے احکام آپ پر نازل ہو چکے تو ایسا نہ ہونے پاوے (جیسا ابتک کبھی نہیں ہونے پایا) کہ یہ لوگ آپکو اُن احکام سے روکدیں اور آپ (بدستور) اپنے رب (کے دین) کی طرف (لوگوں کو) بلاتے رہیئے اور (جس طرح ابتک مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اسی طرح آئندہ ہمیشہ) ان مشرکوں میں شامل نہ ہو جیئے اور (جس طرح ابتک شرک سے معصوم ہیں اسی طرح آئندہ بھی) اللہ کے ساتھ کسی معبود کو نہ پکارنا (ان آیتوں میں کفار و مشرکین کو انکی درخواستوں سے نا اُمید کرنا ہے اور رُوئے سخن آن ہی کی طرف ہے کہ تم جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دین میں

موافق ہونے کی درخواست کرتے ہو اسمیں کامیابی کا کبھی احتمال نہیں، مگر عادت ہے کہ جس شخص پر زیادہ غصہ ہوتا ہے اُس سے بات نہیں کیا کرتے اپنے محبوب سے باتیں کرکے اُس شخص کو سُنایا کرتے ہیں۔ معالم میں حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ خطاب صرف ظاہر میں آپؐ کو ہے اور مقصود آپ نہیں۔ یہاں تک رسالت کے متعلق مضمون قصداً تھا، گو توحید کا بھی ضمناً آگیا، آگے توحید کا مضمون قصداً ہے کہ) اُس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اسلئے کہ) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، بجز اسکی ذات کے پس اُسکے سوا کوئی مستحق عبادت نہ ٹھہرا، یہ مضمون توحید کا ہوگیا، آگے معاد کا مضمون ہے کہ) اُسی کی حکومت ہے (جسکا ظہور کامل قیامت میں ہے) اور اُسی کے پاس تم سب کو جانا ہے (پس سب کو اُن کے کئے کی جزا دیگا۔ یہ معاد کا مضمون بھی ختم ہوگیا)۔

معارف و مسائل

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۔ آخر سورت میں یہ آیات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اپنے فریضۂ رسالت و نبوت پر پوری طرح قائم رہنے کی تاکید کے لئے ہیں، اور مناسبت اسکی سابقہ آیات سورت سے یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی قصہ فرعون اور اسکی قوم کی دشمنی اور اُس سے خوف کا، پھر اپنے فضل سے انکو قوم فرعون پر غالب کرنے کا ذکر فرمایا تو آخر سورت میں خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی حالات کا خلاصہ بیان فرمایا کہ کفار مکہ نے آپکو پریشان کیا، قتل کے منصوبے بنائے، مسلمانوں کی زندگی مکہ میں اجیرن کردی مگر حق تعالیٰ نے اپنی عادتِ قدیمہ کے مطابق آپ کو سب پر فتح اور غلبہ نصیب فرمایا اور مکہ مکرمہ جہاں سے کفار نے آپ کو نکالا تھا وہ پھر مکمل طور پر آپکے قبضہ میں آیا۔ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ، جس ذات پاک نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے یعنی اُسکی تلاوت اور تبلیغ اور اس پر عمل آپ پر فرض فرمایا ہے وہ ہی ذات آپ کو پھر معاد پر لوٹائے گی۔ معاد سے مراد مکہ مکرمہ ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے معاد کی یہ تفسیر منقول ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ چند روز کے لئے آپ کو اپنا وطنِ عزیز خصوصاً حرم اور بیت اللہ چھوڑنا پڑا مگر قرآن کا نازل کرنے والا اور اُسپر عمل کو فرض کرنے والا خدا تعالیٰ آخر کار آپ کو پھر مکہ میں لوٹا کر لائیگا۔ ائمہ تفسیر میں سے مقاتل کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور سے رات کے وقت نکلے اور مکہ سے مدینہ جانے والے معروف راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے سفر کیا کیونکہ دشمن تعاقب میں تھے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ طیبہ کے راستہ کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے اور وہاں سے وہ مکہ سے مدینہ کا معروف راستہ ملجاتا ہے اسوقت مکہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد

آیا، اُسی وقت جبرئیل امین یہ آیت لے کرنازل ہوئے جس میں آپ کو بشارت دی گئی ہے کہ مکہ مکرمہ سے یہ جُدائی چند روزہ ہے اور بالآخر آپ کو پھر مکہ مکرمہ پہنچا دیا جائیگا جو فتح مکہ کی بشارت تھی۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت جحفہ میں نازل ہوئی ہے نہ مکی ہے نہ مدنی (قرطبی)

قرآن دشمنوں پر فتح اور مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ ہے

اس آیت میں آپ کو دوبارہ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ واپسی کی بشارت اس عنوان سے دی گئی ہے کہ جس ذاتِ حق نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے آپ کو دشمنوں پر غالب کرکے دوبارہ مکہ مکرمہ لوٹائے گا، اسمیں اشارہ اسطرف بھی ہے کہ قرآن کی تلاوت اور اُس پر عمل ہی اس نصرتِ خداوندی اور فتح مبین کا سبب ہوگی۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ اس آیت میں وجہہ سے مراد ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور معنے یہ ہیں ذات حق سُبحانہ وتعالیٰ کے سوا ہر چیز ہلاک و فنا ہونے والی ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ وجہہ سے مراد وہ عمل ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جو عمل اللہ تعالےٰ کے لئے اخلاص کے ساتھ کیا جائے وہ ہی باقی رہنے والا ہے باقی سب فانی ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

الحمد للہ سُورۂ قصص آج ۹ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ کو ایسے حالات میں تمام ہوئی کہ پاکستان پر ہندوستان اور دوسری بڑی طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے شدید حملہ ہوا اور چودہ روز کراچی پر روزانہ بمباری ہوتی رہی، شہری آبادی کو جابجا سخت نقصان پہنچا، سیکڑوں مسلمان شہید اور مکانات منہدم ہوئے، اور چودہ دن کی جنگ اس حادثہ جانکاہ پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان پاکستان سے کٹ گیا اور تقریباً نوے ہزار پاکستانی فوج نے وہاں محصور ہو کر ہتھیار ڈالدیئے اور اسوقت تک وہاں مسلمانوں کا قتلِ عام جاری ہے، ہر مسلمان کا دل اس صدمہ سے پاش پاش اور دماغ ماؤف ہے، فانا للہ وانا الیہ راجعون

وَالَیْہِ الْمُشْتَکٰی وَلَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنَ اللہِ اِلَّا اِلَیْہِ

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ عنکبوت مکہ میں نازل ہوئی اس کی انہتر آیتیں ہیں اور سات رکوع ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الٓمّٓ ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ

کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو

لَا يُفْتَنُوْنَ ② وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ

جانچ نہ لیں گے ، اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے سو البتہ معلوم کرے گا اللہ

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ

جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو ، کیا یہ سمجھتے ہیں جو لوگ

يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ④ مَنْ

کہ کرتے ہیں برائیاں کہ ہم سے بچ جائیں ، بری بات طے کرتے ہیں ، جو کوئی

كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ⑤

توقع رکھتا ہے اللہ کی ملاقات کی سو اللہ کا وعدہ آ رہا ہے ، اور وہ ہے سننے والا جاننے والا ،

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ⑥

اور جو کوئی محنت اٹھائے سو اٹھاتا ہے اپنے ہی واسطے اللہ کو پروا نہیں جہان والوں کی ،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ

اور جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام ہم اُتار دیں گے اُن پر سے برائیاں انکی اور

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾

بدلہ دیں گے ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ، اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے میں چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو (انواع مصائب سے) آزمایا نہ جائے گا، (یعنی ایسا نہ ہوگا بلکہ اس قسم کے امتحانات بھی پیش آئیں گے) اور ہم تو (ایسے ہی واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گذرے ہیں (یعنی اور امتوں کے مسلمانوں پر بھی یہ معاملے گذر رہے ہیں) سو (اسی طرح ان کی آزمائش بھی کی جاوے گی اور اس آزمائش میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعوے میں) سچے تھے، اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا (چنانچہ جو صدق و اعتقاد سے مسلمان ہوتے ہیں وہ ان امتحانات میں ثابت رہتے ہیں بلکہ اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جو دفع الوقتی کے لئے مسلمان ہو جاتے ہیں وہ ایسے وقت میں اسلام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یعنی یہ ایک حکمت ہے امتحان کی کیونکہ مخلص اور غیر مخلص کے خلط ملط میں بہت سی مضرتیں ہوتی ہیں، خصوص ابتدائی حالات میں۔ یہ مضمون تو مسلمانوں کے متعلق ہوا آگے ان ایذا دینے والے کفار کی نسبت فرماتے ہیں کہ) ہاں کیا جو لوگ بُرے بُرے کام کر رہے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سے کہیں نکل بھاگیں گے، ان کی یہ تجویز نہایت ہی بیہودہ ہے (یہ جملہ معترضہ کے طور پر تھا جس میں کفار کی بد انجامی سنا کر مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی کر دی کہ ان ایذاؤں کا ان سے بدلہ لیا جاوے گا، آگے پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ) جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو (اس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان ہونا ہی نہ چاہئے کیونکہ) اللہ (کے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور ہی آنے والا ہے (جس سے سارے غم غلط ہو جائیں گے، کقولہ تعالیٰ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ) اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (نہ کوئی قول اس سے مخفی نہ کوئی فعل پس لقاء کے وقت تمہاری سب طاعات قولیہ و فعلیہ کا صلہ دے کر سب غم دُور کر دے گا) اور (یاد رکھو کہ ہم جو تم کو ترغیب دے رہے ہیں مشقتوں کے برداشت کرنے کی، سو اس میں ظاہر

اور مسلّم ہے کہ ہماری کوئی منفعت نہیں بلکہ) جو شخص محنت کرتا ہو وہ اپنے ہی (نفع کے) لئے محنت کرتا ہے (ورنہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں (اس میں بھی ترغیب ہے تحمل مشاق کی کیونکہ اپنے نفع پر متنبہ ہونے سے وہ فعل زیادہ آسان ہو جاتا ہے) اور (وہ نفع جو طاعت سے پہنچتا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دُور کر دیں گے (جس میں بعض گناہ جیسے کفر و شرک تو ایمان سے زائل ہو جاتے ہیں، اور بعض گناہ توبہ سے کہ اعمالِ صالحہ میں داخل ہے اور بعضے گناہ صرف حسنات سے اور بعضے گناہ محض فضل سے معاف ہو جائیں گے اور کوئی گناہ بعد قدرے سزا کے یہاں تکفیر سب کو عام ہے) اور ان کو ان کے (ان) اعمال (ایمان و اعمالِ صالحہ) کا (استحقاق سے) زیادہ اچھا بدلہ دیں گے، (پس اتنی ترغیبات پر طاعت اور مجاہدہ پر استقامت کا اہتمام ضروری ہے) ؛

معارف و مسائل

وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ، فتنہ سے مشتق ہو جس کے معنی آزمائش کے ہیں، اہلِ ایمان خصوصاً انبیاء و صلحاء کو دنیا میں مختلف قسم کی آزمائشوں سے گذرنا ہوتا ہے پھر انجام کار فتح اور کامیابی ان کی ہوتی ہے، یہ آزمائشیں مخالفین کبھی کفار و فجار کی دشمنی اور ان کی طرف سے ایذاؤں کے ذریعہ ہوتی ہیں، جیسا کہ اکثر انبیاء اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر پیش آیا ہے، جس کے بے شمار واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، اور کبھی یہ آزمائش امراض اور دوسری قسم کی تکلیفوں کے ذریعہ ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو پیش آیا، اور بعض کے لئے یہ سب قسمیں جمع بھی کر دی جاتی ہیں۔

شانِ نزول اس آیت کا اگرچہ از روئے روایات وہ صحابہ ہیں جو ہجرت مدینہ کے وقت کفار کے ہاتھوں ستائے گئے، مگر مراد عام ہے ہر زمانے کے علماء و صلحاء اور اولیاء امت کو مختلف قسم کی آزمائشیں پیش آتی ہیں، اور آتی رہیں گی۔ (قرطبی)

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ صَدَقُوا ، یعنی ان امتحانات اور شدائد کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص اور نیک و بد میں ضرور امتیاز کریں گے۔ کیونکہ مخلصین کے ساتھ منافقین کا خلط ملط بعض اوقات بڑے نقصانات پہنچا دیتا ہے، مقصد اس آیت کا نیک و بد اور مخلص و غیر مخلص کا امتیاز واضح کر دینا ہے، جس کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے گا صادقین کو اور کاذبین کو، اللہ تعالیٰ کو تو ہر انسان کا صادق یا کاذب ہونا اس کے پیدا ہونے سے پہلے بھی معلوم ہے، امتحانات اور آزمائشوں کے جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس امتیاز کو

دوسروں پر بھی ظاہر فرمادیں گے۔

اور حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے شیخ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اس کی توجیہ یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ بعض اوقات عوام کے درجۂ علم پر تنزل کر کے بھی کلام کیا جاتا ہے، عام انسان مخلص اور منافق میں فرق آزمایش ہی کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں، ان کے مذاق کے مطابق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مختلف قسم کے امتحانات کے ذریعہ ہم یہ جان کر رہیں گے کہ کون مخلص ہے کون نہیں، حالانکہ اس کے علم میں یہ سب کچھ ازل سے ہے۔ واللہ اعلم

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ

اور ہم نے تاکید کردی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی، اور اگر وہ تجھ سے زور کریں کہ تو شریک کرے

بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ

میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کا کہنا مت مان، مجھی تک پھر آنا ہے تم کو سو میں بتلادوں گا تم کو

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

جو کچھ تم کرتے تھے، اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کئے

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ﴿٩﴾

ہم ان کو داخل کریں گے نیک لوگوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس (کے معبود ہونے) کی کوئی (صحیح) دلیل تیرے پاس نہیں ہے، (اور ہر چیز ایسی ہی ہے کہ کل اشیاء کے ناقابل عبادت ہونے پر دلائل قائم ہیں) تو (اس باب میں) ان کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے سو میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا بد) جتلادوں گا اور (تم میں) جو لوگ ایمان لائے ہوں گے ہم ان کو نیک بندوں (کے درجہ) میں (جو کہ بہشت ہے) داخل کر دیں گے (اور اسی طرح اعمالِ بد پر ان کے مناسب سزا دیں گے، پس اسی بناء پر جس نے والدین کی اطاعت کو ہماری اطاعت پر مقدم رکھا ہوگا

وہ سزا پائے گا، اور جس نے اس کا عکس کیا ہوگا نیک جزا پائے گا، حاصل یہ ہوا کہ واقعہ بالا میں ماں باپ کی نافرمانی سے وسوسہ گناہ کا نہ کیا جائے)۔

معارف و مسائل

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ، وصیت کہتے ہیں کسی شخص کو کسی عمل کی طرف بلانے کو جبکہ وہ بلانا نصیحت و خیر خواہی پر مبنی ہو۔ (مظہری)

بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا، لفظ حُسن مصدر ہے بمعنی خوبی، اس جگہ خوبی والے طرزِ عمل کو مبالغہ کے لئے حُسن سے تعبیر کیا ہے۔ مراد واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ وصیت فرمائی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي، یعنی والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے حکم کی اطاعت اسی حد تک کی جائے کہ وہ حکم اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ ہو، وہ اگر اولاد کو کفر و شرک پر مجبور کریں تو اس میں ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (رواہ احمد والحاکم وصححہٗ) یعنی خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحابہ کرام میں سے اُن دس حضرات میں شامل ہیں جن کو آپ نے بیک وقت جنتی ہونے کی بشارت دی ہے، جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی والدہ کے بہت فرمانبردار اور ان کی راحت رسانی میں بڑے مستعد تھے۔ ان کی والدہ حمنہ بنت ابی سفیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے سعدؓ مسلمان ہو گئے تو انھوں نے بیٹے کو تنبیہ کی اور قسم کھالی کہ میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی جب تک کہ تم پھر اپنے آبائی دین پر واپس آجاؤ یا میں اسی طرح بھوک پیاس سے مر جاؤں، اور ساری دنیا میں ہمیشہ کے لئے یہ رسوائی تمہارے سر رہے کہ تم اپنی ماں کے قاتل ہو۔ (مسلم، ترمذی) اس آیتِ قرآن نے حضرت سعدؓ کو ان کی بات ماننے سے روک دیا۔

بغوی کی روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ کی والدہ ایک دن رات اور بعض اقوال کے مطابق تین دن تین رات اپنی قسم کے مطابق بھوکی پیاسی رہی۔ حضرت سعدؓ حاضر ہوئے، ماں کی محبت و اطاعت اپنی جگہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کے سامنے کچھ نہ تھی، اس لئے والدہ کو خطاب کر کے کہا کہ اماں جان اگر تمہارے بدن میں سو روحیں ہوتیں اور ایک ایک کر کے نکلتی رہتیں میں اس کو دیکھ کر بھی کبھی اپنا دین نہ چھوڑتا، اب تم چاہو کھاؤ پیو یا مر جاؤ، بہر حال

اپنے دین سے نہیں ہٹ سکتا، ماں نے ان کی اس گفتگو سے مایوس ہو کر کھانا کھا لیا،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ

اور ایک وہ لوگ ہیں کہ کہتے ہیں یقین لائے ہم اللہ پر پھر جب اسکو ایذا پہنچے اللہ کی راہ میں کرنے

فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ

لگے لوگوں کے ستانے کو برابر اللہ کے عذاب کی اور اگر آ پہنچے مدد تیرے رب کی طرف سے

لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ

تو کہنے لگیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، کیا یہ نہیں کہ اللہ خوب خبردار ہے جو کچھ سینوں میں ہے

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

جہان والوں کے۔ اور البتہ معلوم کرے گا اللہ ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اور البتہ معلوم کر یگا جو لوگ دغاباز ہیں،

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو تم چلو ہماری راہ اور ہم اٹھالیں گے

خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ

تمہارے گناہ، اور وہ کچھ نہ اٹھائیں گے اُن کے گناہ بے شک وہ

لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ز

جھوٹے ہیں، اور البتہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور کتنے بوجھ ساتھ اپنے بوجھ کے،

وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

اور البتہ ان سے پوچھ ہوگی قیامت کے دن جو باتیں کہ جھوٹ بناتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو کہدیتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب ان کو راہِ خدا میں کچھ تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو لوگوں کی ایذا رسانی کو ایسا (عظیم) سمجھ بیٹھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب (جس سے آدمی بالکل ہی مجبور ہو جائے) حالانکہ کسی مخلوق کو ایسے عذاب پر قدرت ہی نہیں

اب تو ان کا یہ حال ہے) اور اگر (کبھی) کوئی مدد (مسلمانوں کی) آپ کے رب کی طرف سے آپہنچتی ہے (مثلاً جہاد ہوا اور اس میں ایسے لوگ ہاتھ آجائیں) تو (اس وقت) کہتے ہیں کہ ہم تو (دین اور عقیدہ میں) تمہارے ساتھ تھے (یعنی مسلمان ہی تھے گو کفار کے اکراہ اور زبردستی کی وجہ سے کفار کے ساتھ ہو گئے تھے، اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ) کیا اللہ تعالیٰ کو دنیا جہان والوں کے دل کی باتیں معلوم نہیں ہیں (یعنی انکے دل ہی میں ایمان نہ تھا) اور (یہ واقعات اس لئے ہوتے رہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو معلوم کر کے رہے گا، اور منافقوں کو بھی معلوم کر کے رہیگا اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم (دین میں) ہماری راہ چلو اور (قیامت میں) تمھارے گناہ (جو کفر و معاصی سے ہوں گے) ہمارے ذمہ (اور تم سبکدوش) حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی (اس طور پر کہ وہ سبکدوش ہو جائیں) نہیں لے سکتے یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں اور (البتہ یہ تو ہوگا کہ) یہ لوگ اپنے گناہ (پورے پورے) اپنے اوپر لادے ہونگے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور بھی (لادے ہوں گے اور یہ گناہ وہ ہیں جن کے لئے یہ سبب بنتے تھے، اور یہ گناہ ان پر لادنے سے اصل گنا ہگار سبکدوش نہیں ہوں گے، غرض دوسرے تو ہلکے نہ ہوئے مگر یہ لوگ ان کو گمراہ کرنے کے سبب اور زیادہ بھاری ہو گئے) اور یہ لوگ جیسی جیسی جھوٹی باتیں بناتے تھے قیامت میں ان سے باز پرس (اور پھر اس پر سزا) ضرور ہوگی :

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، کفار کی طرف سے اسلام کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو بہکانے کی تدبیریں مختلف طریقوں سے ہوتی رہی ہیں، کبھی زور و زر کی نمائش سے کبھی شکوک و شبہات پیدا کرنے سے اس آیت میں بھی ان کی ایک ایسی ہی تدبیر مذکور ہے، کہ کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم لوگ بلا وجہ عذابِ آخرت کے خوف سے ہمارے طریقہ پر نہیں چلتے، تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر تمھاری ہی بات سچی ہوئی کہ اس طریقہ پر چلنے کی وجہ سے آخرت میں عذاب ہوگا تو تمھارے گناہوں کا بوجھ ہم اٹھالیں گے جو کچھ عذاب، تکلیف پہونچے گی ہمیں پہونچے گی تم پر آنچ نہ آئے گی۔

اسی طرح کا ایک شخص کا واقعہ سورۂ نجم کے آخری رکوع میں ذکر کیا گیا ہے أَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى وَأَعْطٰى قَلِيْلًا وَّأَكْدٰى، جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص کو اس کے کافر ساتھیوں نے یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ تم ہمیں کچھ مال یہاں دیدو تو ہم قیامت اور آخرت کے دن تمھارے عذاب کو اپنے ذمہ لے کر تمھیں بچادیں گے، اس نے کچھ دینا بھی شروع کر دیا پھر بند کر دیا۔

اس کی بے وقوفی اور اس کے عمل کے لغو ہونے کا بیان سورۂ نجم میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اسی طرح کا ایک قول کفار کا عام مسلمانوں سے یہاں مذکور ہے، یہاں حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ایک تو یہ فرمایا کہ ایسا کہنے والے بالکل جھوٹے ہیں، یہ قیامت میں ان لوگوں کے گناہوں کا کوئی بوجھ نہ اٹھائیں گے، وَمَا هُمْ بِحَامِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ، یعنی وہاں کے ہولناک عذاب کو دیکھ کر ان کو ہمت نہ ہوگی کہ اس کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں، اس لئے یہ وعدہ ان کا جھوٹا ہے۔ اور سورۂ نجم میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ کچھ بوجھ اٹھانے کو تیار بھی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اس کا اختیار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے کہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو پکڑ لیا جائے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ ان لوگوں کا یہ کہنا تو غلط اور جھوٹ ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر تمہیں سبکدوش کر دیں گے، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ تمہارا بہکانا اور تمہیں راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرنا خود ایک بڑا گناہ ہے جو ان کے اپنے اعمال کے عذاب کے علاوہ اُن پر لاد دیا جائے گا۔ اس طرح اُن پر اپنے اعمال کا بھی وبال ہوگا اور جن کو بہکایا تھا اُن کا بھی۔

گناہ کی دعوت دینے والا بھی گناہگار ہے، گناہ کرنے والے کو جو عذاب ہوگا وہی اس کو بھی ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا کرنے کی تحریک کرے یا گناہ میں اس کی مدد کرے وہ بھی ایسا ہی مجرم ہے جیسا یہ گناہ کرنے والا۔ ایک حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت کی گئی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہدایت کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو جتنے لوگ اس کی دعوت کی وجہ سے ہدایت پر عمل کریں گے ان سب کے عمل کا ثواب اس داعی کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی اور گناہ کی طرف دعوت دے تو جتنے لوگ اس کے کہنے سے اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے ان سب کا گناہ اور وبال اس شخص پر بھی پڑے گا بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے وبال و عذاب میں کوئی کمی ہو (مسلم عن ابی ہریرۃ وابن ماجہ عن انس، قرطبی)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کے پاس پھر رہا ان میں ہزار برس پچاس

خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ

برس کم پھر پکڑا ان کو طوفان نے اور وہ گنہگار تھے، پھر بچا دیا ہم نے اس کو

وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ

اور جہاز والوں کو اور رکھا ہم نے جہاز کو نشانی جہان والوں کے واسطے، اور ابراہیم کو جب کہا

لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اس نے اپنی قوم کو بندگی کرو اللہ کی اور ڈرتے رہو اس سے یہ بہتر ہے تمھارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ

تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوائے یہی بتوں کے تھان اور بناتے ہو جھوٹی باتیں، بے شک

الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے وہ مالک نہیں تمھاری روزی کے

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَیْهِ

سو تم ڈھونڈو اللہ کے یہاں روزی اور اس کی بندگی کرو اور اس کا حق مانو اسی کی طرف

تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ

پھر جاؤ گے۔ اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو جھٹلا چکے ہیں بہت فرقے تم سے پہلے،

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۸﴾

اور رسول کا ذمہ تو بس یہی ہے پیغام پہنچا دینا کھول کر۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا سو وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے (اور قوم کو سمجھاتے رہے) پھر (جب اس پر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے تو) ان کو طوفان نے آدبایا اور وہ بڑے ظالم لوگ تھے (کہ اتنی مدت دراز کی فہمائش سے بھی متاثر نہ ہوئے) پھر (اس طوفان آنے کے بعد) ہم نے ان کو اور کشتی والوں کو (جو ان کے ساتھ سوار تھے، اس طوفان سے) بچالیا اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے (جن کو تواتر کے ساتھ خبر پہنچی) موجب عبرت بنایا (کہ غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ مخالفتِ حق کا کیا انجام ہے) اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھے) فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو (اور ڈر کر شرک چھوڑ دو) یہ تمھارے لئے بہتر ہے

اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (بخلاف طریقۂ شرک کے کہ محض بے وقوفی ہو کیونکہ) تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو (جو بالکل عاجز اور ناکارہ ہیں) پوج رہے ہو اور (اس کے متعلق) جھوٹی باتیں تراشتے ہو، (کہ ان سے ہماری روزی روزگار کی کاربرآری ہوتی ہے، اور یہ محض جھوٹ ہی کیونکہ) تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو، (یعنی اس سے مانگو، مالکِ رزق وہی ہے) اور (جب مالکِ رزق وہی ہر تو) اسی کی عبادت کرو اور (چونکہ پچھلا رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے تو) اسی کا شکر کرو (ایک تو سبب وجوب عبادت کا یہ ہو کہ وہ مالک نفع کا ہے) اور (دوسرا سبب یہ ہو کہ وہ مالک ضرر کا بھی ہو چنانچہ) تم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (اس وقت کفر پر تم کو سزا دے گا) اور اگر تم (ان باتوں میں) مجھ کو جھوٹا سمجھو تو (یاد رکھو کہ میرا کوئی ضرر نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھوٹا سمجھ چکی ہیں (مگر ان پیغمبروں کا کوئی ضرر نہیں ہوا) اور (وجہ اس کی یہ ہو کہ) پیغمبر کے ذمہ تو صرف (بات کا) صاف طور پر پہنچا دینا ہے (منوانا اس کا کام نہیں پس سب انبیاء تبلیغ کے بعد سبکدوش ہو گئے، اسی طرح میں بھی، پس ہم کو کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ البتہ ماننا تمھارے ذمہ واجب تھا اس کے ترک سے تمھارا ضرر ضرور ہوا)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار کی مخالفت اور ان کی ایذاؤں کا بیان تھا جو مسلمانوں کو پہونچتی رہتی ہیں۔ آیاتِ صدر میں اس طرح کے واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات کا بیان ہے، کہ قدیم سے یہ سلسلہ اہلِ ہدایت کو کفار کی طرف سے ایذاؤں کا جاری ہے۔ مگر ان تکلیفوں کی وجہ سے انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، اس لئے آپ بھی ایذاءِ کفار کی پرواہ نہ کریں، اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں مضبوطی سے کام کرتے رہیں۔

انبیاءِ سابقین میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، اوّل تو اس وجہ سے کہ وہ ہی سب سے پہلے پیغمبر ہیں جن کو کفر و شرک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ جتنی ایذائیں اپنی قوم سے ان کو پہونچیں وہ کسی دوسرے پیغمبر کو نہیں پہونچیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر طویل دینے کا خصوصی امتیاز عطا فرمایا، اور ساری عمر کفار کی ایذاؤں میں بسر ہوئی۔ ان کی عمر قرآن کریم میں جو نو سو پچاس سال مذکور ہو، وہ تو قطعی اور یقینی ہے ہی، بعض روایات میں یہ بھی ہو کہ یہ عمر زمانۂ تبلیغ و دعوت کی ہے اور اس سے پہلے اور طوفان کے بعد مزید عمر کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم

بہرحال اتنی غیر معمولی طویل عمر مسلسل دعوت و تبلیغ میں صرف کرنا اور ہر تبلیغ و دعوت کے وقت کفار کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں مار پیٹ اور گلا گھونٹنے کی سہتے رہنا اور ان سب کے باوجود کسی وقت ہمت نہ ہارنا یہ سب خصوصیات حضرت نوح علیہ السلام کی ہیں۔

دوسرا قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو بڑے بڑے سخت امتحانات سے گذرے ہیں، آتشِ نمرود، پھر ملکِ شام سے ہجرت کرکے ایک لق و دق جنگل بے آب و گیاہ کا قیام، پھر صاحبزادے کے ذبح کرنے کا واقعہ وغیرہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے قصہ کے ضمن میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی امت کے واقعات اور آخر سورۃ تک دوسرے بعض انبیاء اور ان کی سرکش امتوں کے حالات کا سلسلہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امتِ محمدیہ کی تسلی کے لئے اور ان کو دین کے کام پر ثابت قدم رکھنے کے لئے بیان ہوا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى

کیا دیکھتے نہیں کیوں کر شروع کرتا ہے اللہ پیدائش کو پھر اس کو دُہرائے گا، یہ اللہ پر آسان

اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ

ہے، تو کہہ ملک میں پھرو پھر دیکھو کیوں کر شروع کیا ہے پیدائش

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

کو پھر اللہ اٹھائے گا پچھلا اٹھان، بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا

قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ

ہے، دُکھ دے گا جس کو چاہے اور رحم کرے گا جس پر چاہے، اور اسی کی طرف پھر

تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ز

جاؤ گے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں،

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَالَّذِيْنَ

اور کوئی نہیں تمہارا اللہ سے ورے حمایتی اور نہ مددگار، اور جو لوگ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ

منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے اور اس کے ملنے سے وہ ناامید ہوئے میری رحمت سے

ع ۲ ۹ ۱۴

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اوّل بار پیدا کرتا ہے، (عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے (بلکہ ابتدائی نظر میں دوبارہ پیدا کرنا اوّل آفرینش سے زیادہ سہل ہے، گو قدرت ذاتیہ کے اعتبار سے دونوں مساوی ہیں، اور یہ لوگ امر اول یعنی اللہ تعالیٰ کے خالق کائنات ہونے کا تو اعتراف کرتے تھے، لقولہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ اور امر ثانی یعنی دوبارہ پیدا کرنا اسی کے مماثل ہے، اس کا داخل قدرت ہونا اور زیادہ واضح ہے، اس لئے اَوَلَمْ يَرَوْا اس سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور زیادہ اہتمام کے لئے آگے پھر یہی مضمون قدرے تفاوت عنوان سے سنانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اوّل بار پیدا کیا ہے، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (پہلے عنوان میں ایک عقلی استدلال ہے اور دوسرے عنوان میں حسی، جس کا تعلق احوالِ کائنات کے مشاہدہ سے ہے، یہ تو قیامت کا اثبات تھا آگے جزاء کا بیان ہے کہ بعد بعث کے) جس کو چاہے گا عذاب دے گا (یعنی جو اس کا مستحق ہوگا) اور جس پر چاہے رحمت فرما دے گا، یعنی جو اس کا اہل ہوگا) اور (اس تعذیب و رحمت میں اور کسی کا دخل نہ ہوگا، کیونکہ) تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، (نہ کہ اور کسی کے پاس) اور (اس کی تعذیب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے) تم نہ زمین میں (چھپ کر خدا کو) ہرا سکتے ہو کہ اس کے ہاتھ نہ آؤ) اور نہ آسمان میں (اڑ کر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار، (پس نہ اپنی تدبیر سے بچ سکے نہ دوسرے کی حمایت سے) اور (اوپر جو ہم نے کہا تھا يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، اب قاعدہ کلیہ سے اس کا مصداق بتلاتے ہیں کہ) جو لوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے ناامید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہو جائے گا کہ ہم محل رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ

پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے اس کو مار ڈالو یا جلا دو پھر اس کو بچا دیا

اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۲۴ وَقَالَ

اللہ نے آگ سے اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین لاتے ہیں، اور ابراہیم بولا

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ

جو ٹھہرائے تم نے اللہ کے سوائے بتوں کے تھان سو دوستی کر کر آپس میں دنیا کی زندگانی

الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ

میں، پھر دن قیامت کے منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے

بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۵ قلے

ایک کو ایک، اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ

(وقف لازم)

پھر مان لیا اس کو لوط نے اور وہ بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف بیشک وہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ۝۲۶ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ

حکمت والا، اور دیا ہم نے اس کو اسحق اور یعقوب اور رکھ دی اس کی اولاد میں

النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي

پیغمبری اور کتاب اور دیا ہم نے اس کو اس کا ثواب دنیا میں، اور وہ

الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۲۷

آخرت میں البتہ نیکوں سے ہے۔

خلاصۂ تفسیر

سو (ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر دلپذیر کے بعد) ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان کو یا تو قتل کر ڈالو یا ان کو جلا دو (چنانچہ جلانے کا سامان کیا) سو اللہ نے ان کو اس آگ سے بچا لیا (جس کا قصہ سورۃ انبیاء میں گذر چکا ہے)

بیشک اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں کئی نشانیاں ہیں (یعنی یہ واقعہ کئی چیزوں کی دلیل ہے، اللہ کا قادر ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا نبی ہونا، کفر و شرک کا باطل ہونا اس لئے یہ ایک ہی دلیل متعدد دلائل کے قائم مقام ہو گئی) اور ابراہیم (علیہ السلام) نے (وعظ میں یہ بھی) فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) تجویز کر رکھا ہے، بس یہ تمھارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے (چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر آدمی اپنے تعلقات اور دوستی اور رشتہ داروں کے طریق پر رہتا ہے اور اس وجہ سے حق بات میں غور نہیں کرتا، اور حق کو سمجھ کر بھی ڈرتا ہے کہ سب دوست اور رشتہ دار چھوٹ جاویں گے) پھر قیامت میں (تمھارا یہ حال ہوگا کہ) تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہو جاوے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا، (جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے لَعَنَتْ اُخْتَهَا اور سورۂ سبا میں ہے يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ۨالْقَوْلَ اور سورۂ بقرہ میں ہے اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا الخ خلاصہ یہ ہے کہ آج جن احباب و اقارب کی وجہ سے تم گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہو قیامت کے روز یہی احباب تمھارے دشمن بن جائیں گے) اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمھارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمھارا کوئی حمایتی نہ ہوگا سو اتنے وعظ و پند پر بھی انکی قوم نے نہ مانا) صرف لوط (علیہ السلام) نے انکی تصدیق فرمائی اور ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں (تم لوگوں میں نہیں رہتا، بلکہ) اپنے پروردگار کی (بتلائی ہوئی جگہ کی) طرف ترک وطن کر کے چلا جاؤں گا بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے (وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھ کو اس کا ثمرہ دے گا) اور ہم نے (ہجرت کے بعد) ان کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور (آخرت میں بھی (بڑے درجہ کے) نیک بندوں میں ہوں گے (اس صلہ میں مراد قرب و قبول ہے، کقولہ تعالیٰ فی البقرۃ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا الخ)۔

معارف و مسائل

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ، حضرت لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھانجے تھے، آتش نمرود میں ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر سب سے پہلے انہوں نے تصدیق کی۔ یا در آپ کی اہلیہ حضرت سارہ جو آپ کی چچازاد بہن بھی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں ان دونوں کو ساتھ لے کر ابراہیم علیہ السلام نے وطن سے ہجرت کا ارادہ کیا، ان کا وطن مقام کوثا تھا، جو کوفہ کی ایک بستی ہے، اور فرمایا اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ، یعنی میں وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مقام کی طرف جاؤں گا جہاں رب کی عبادت میں رکاوٹ نہ ہو

حضرت نخعیؒ اور قتادہؒ نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کا قائل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ تو یقیناً انہی کا حال ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کو حضرت لوط علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے، خلاصۂ تفسیر کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے، مگر سیاقِ کلام سے پہلی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام بھی اگرچہ اس ہجرت میں شریک ضرور تھے مگر جیسا حضرت سارہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع تھیں اسی طرح لوط علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر مستقلاً نہ ہونا کچھ بعید نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلی ہجرت حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جن کو دین کے لئے ترکِ وطن اور ہجرت اختیار کرنا پڑی، ان کی یہ ہجرت پچھتر سال کی عمر میں ہوئی (یہ سب بیان قرطبی سے لیا گیا ہے)۔

بعض اعمال کی جزاء دنیا میں بھی مل جاتی ہے، وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْيَا، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اللہ کی راہ میں قربانیوں اور دوسرے اعمالِ صالحہ کی جزاء دنیا میں بھی دیدی کہ ان کو تمام مخلوق میں مقبول امام بنادیا، یہودی، نصرانی، بت پرست سبھی ان کی عزت کرتے ہیں، اور اپنا مقتداء مانتے ہیں، اور آخرت میں وہ صالحین اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کی اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی مگر اس کا کچھ حصہ دنیا میں بھی نقد دیا جاتا ہے، جیسا کہ احادیث معتبرہ میں بہت سے اچھے اعمال کے دنیوی فوائد اور بُرے اعمال کے دنیوی مفاسد کا بیان آیا ہے، ایسے اعمال کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مستقل رسالہ "جزاء الاعمال" میں جمع فرمادیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ؗ مَا سَبَقَكُمْ

اور بھیجا لوط کو جب کہا اپنی قوم کو تم آتے ہو بےحیائی کے کام پر تم سے پہلے نہیں کیا

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ

وہ کسی نے جہان میں، کیا تم دوڑتے ہو مَردوں پر اور تم راہ

السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ

مارتے ہو اور کرتے ہو اپنی مجلس میں بُرا کام، پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا

اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

مگر یہی کہ بولے لے آ ہم پر عذاب اللہ کا اگر تو ہے سچا،

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿٣٠﴾ وَلَمَّا جَاءَتْ

بولا اے رب میری مدد کر ان شریر لوگوں پر ، اور جب پہنچے ہمارے

رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُو أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ

بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر ، بولے ہم کو غارت کرنا ہے اس بستی والوں کو

إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ

بیشک اس بستی کے لوگ ہو رہے ہیں گنہگار ، بولا اس میں تو لوط بھی ہے وہ بولے ہم کو خوب معلوم ہے

بِمَنْ فِيهَا لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٣٢﴾

جو کوئی اس میں ہے ہم بچالیں گے اس کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت کہ رہے گی رہجانے والوں میں

وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالُوا

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس ناخوش ہوا ان کو دیکھ کر اور تنگ ہوا دل میں اور وہ بولے

لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ

مت ڈر اور غم نہ کھا ، ہم بچائیں گے تجھ کو اور تیرے گھر کو مگر عورت تیری

كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٣٣﴾ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ

رہ گئی رہ جانے والوں میں ، ہم کو اتارنی ہے اس بستی والوں پر

رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا

ایک آفت آسمان سے اس بات پر کہ وہ نافرمان ہو رہے تھے ، اور چھوڑ رکھا ہم نے اس کا نشان

آيَةً بَيِّنَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٣٥﴾

نظر آتا ہوا سمجھ دار لوگوں کے واسطے ،

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں نہیں کیا کیا تم مردوں سے بُرا فعل کرتے ہو، (وہ بے حیائی کا کام یہی ہے) اور (اس کے علاوہ دوسری

نامعقول حرکتیں بھی کرتے ہو، مثلاً یہ کہ، تم ڈاکہ ڈالتے ہو (کذا فی الدر عن ابن زید) اور (غضب یہ ہو کہ) اپنی بھری مجلس میں نامعقول حرکت کرتے ہو (اور معصیت کا اعلان یہ خود ایک معصیت وقبح عقلی ہے) سو ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو (کہ یہ افعال موجب عذاب ہیں) لوط (علیہ السلام) نے دعاء کی کہ اے میرے رب مجھ کو ان مفسد لوگوں پر غالب (اور ان کو عذاب سے ہلاک) کر دے اور (ان کی دعاء قبول ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عذاب کی خبر دینے کے لئے فرشتے معین فرمائے۔ اور دوسرا کام ان فرشتوں کو یہ بتلایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام کے تولد کی بشارت دیں چنانچہ) ہمارے (وہ) بھیجے ہوئے فرشتے جب ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (ان کے فرزند اسحٰق کے تولد کی) بشارت لے کر آئے تو (اثنائے گفتگو میں جس کا مفصل بیان دوسرے موقع پر ہے قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ) ان فرشتوں نے (ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو (جس میں قوم لوط آباد ہے) ہلاک کرنے والے ہیں (کیونکہ) وہاں کے باشندے بڑے شریر ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہاں تو لوط (علیہ السلام بھی موجود) ہیں (وہاں عذاب نہ بھیجا جائے کہ ان کو گزند پہنچے گا) فرشتوں نے کہا کہ جو جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین کو (یعنی ان کے خاندان والوں کو اور جو مؤمن ہوں اس غذا سے) بچا لیں گے (اس طرح سے کہ نزول عذاب کے قبل ان کو بستی سے باہر نکال لے جائیں گے) بجز اُن کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہوگی (جس کا ذکر سورۃ ہود اور سورۃ حجر میں گذر چکا ہے، یہ گفتگو تو ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی) اور (پھر وہاں سے فارغ ہو کر) جب ہمارے وہ فرستادے لوط (علیہ السلام) کے پاس پہونچے تو لوط (علیہ السلام) ان (کے آنے) کی وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین جوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) ان (کے آنے) کے سبب تنگ دل ہوئے اور (فرشتوں نے جو یہ حال دیکھا تو) وہ فرشتے کہنے لگے (آپ کسی بات کا) اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں (ہم آدمی نہیں ہیں بلکہ عذاب کے فرشتے ہیں، کقولہ تعالیٰ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ اور اس عذاب سے) ہم آپ کو اور آپ کے خاص متعلقین کو بچا لیں گے بجز آپ کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں ہوگی (اور آپ کو مع متعلقین کے اس سے بچا کر) ہم اس بستی کے (بقیہ) باشندوں پر ایک آسمانی عذاب (یعنی اسباب طبعیہ غیر ارضیہ سے) ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں (چنانچہ وہ بستی اُلٹ دی گئی، اور غیبی پتھروں سے سنگباری کی گئی)

اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان (اب تک) رہنے دیئے ہیں ان لوگوں (کی عبرت) کے لئے جو عقل رکھتے ہیں (چنانچہ اہلِ مکہ سفرِ شام میں ان ویران مقامات کو دیکھتے تھے اور جو اہلِ عقل تھے وہ منتفع بھی ہوتے تھے کہ ڈر کر ایمان لے آتے تھے)۔

معارف و مسائل

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ، اس جگہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کے تین سخت گناہوں کا ذکر کیا ہے، اوّل مرد کی مرد کے ساتھ بدفعلی، دوسرے قطع طریق یعنی مسافروں پر ڈاکہ زنی، تیسرے اپنی مجلسوں میں اعلاناً سب کے سامنے گناہ کرنا۔ قرآن کریم نے اس تیسرے گناہ کی تعیین نہیں فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ جو اپنی ذات میں گناہ ہے اگر اس کو علانیہ بے پروائی سے کیا جائے تو یہ دوسرا مستقل گناہ ہو جاتا ہے وہ کوئی بھی گناہ ہو، بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ ان گناہوں کو شمار کیا ہے جو یہ بے حیا اپنی مجلسوں میں سب کے سامنے کیا کرتے تھے، مثلاً رستہ چلتے لوگوں کو پتھر مارنا اور ان کا استہزاء کرنا جیسا کہ اُمِّ ہانی رضؓ کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جو بے حیائی ان کی مشہور تھی اس کو وہ کہیں چھپ کر نہیں کھلی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے۔ العیاذ باللہ۔

جن تین گناہوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان سب میں اشد پہلا گناہ ہے، جو ان سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا، اور جنگل کے جانور بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ باتفاقِ اُمت یہ گناہ زنا سے زیادہ شدید ہے (کذا فی الروح)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ

اور بھیجا مدین کے پاس اس کے بھائی شعیب کو پھر بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی اور

ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾

توقع رکھو پچھلے دن کی اور مت پھرو زمین میں خرابی مچاتے،

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ

پھر اس کو جھٹلایا تو پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں

جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫

اوندھے پڑے ، اور ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور تم پر حال کھل چکا ہے ان کے گھروں سے

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ

اور فریفتہ کیا ان کو شیطان نے ان کے کاموں پر پھر روک دیا ان کو راہ سے اور

كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ

وہ تھے ہوشیار ، اور ہلاک کیا قارون اور فرعون اور ہامان کو اور ان کے

جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا

پاس پہنچا موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر ، پھر بڑائی کرنے لگے ملک میں اور نہیں تھے

سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ

ہم سے جیت جانے والے ، پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر ، پھر کوئی تھا کہ اس پر ہم نے بھیجا

حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا

پتھراؤ ہوا سے اور کوئی تھا کہ اس کو پکڑا چنگھاڑ نے ، اور کوئی تھا کہ اس کو دھنسا دیا

بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ

ہم نے زمین میں ، اور کوئی تھا کہ اس کو ڈبا دیا ہم نے ، اور اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا

پر تھے وہ اپنا آپ ہی بُرا کرتے ، مثال ان لوگوں کی جنھوں نے پکڑے اللہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖ اِتَّخَذَتْ

کو چھوڑ کر اور حمائتی جیسے مکڑی کی مثال بنالیا اس نے ایک

بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

گھر اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو

يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ

سمجھ ہوتی ، اللہ جانتا ہے جس جس کو وہ پکارتے ہیں اس کے سوائے کوئی

وقف لازم

شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٢﴾ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا

چیز ہو، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا، اور یہ مثالیں بٹھلاتے ہیں ہم لوگوں کے

لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ

واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے، اللہ نے بنائے آسمان

وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً

اور زمین جیسے چاہئیں، اس میں نشانی ہے یقین لانے

لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٤﴾

والوں کے لئے۔

ع ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور مدین والوں کے پاس ہم نے ان (کی برادری) کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا سو انھوں نے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو (اور شرک چھوڑ دو) اور روزِ قیامت سے ڈرو (اور اس کے انکار سے باز آؤ) اور سرزمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی حقوق اللہ و حقوق العباد کو ضائع مت کرو، کیونکہ یہ لوگ کفر و شرک کے ساتھ کم ناپنے کم تولنے کے بھی خوگر تھے، جس سے فساد پھیلنا ظاہر ہے) سو ان لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس زلزلہ نے ان کو آ پکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں گھر کر رہ گئے۔ اور ہم نے عاد و ثمود کو بھی (ان کے عناد و خلاف کی وجہ سے) ہلاک کیا، اور یہ ہلاک ہونا تم کو ان کے رہنے کے مقامات سے نظر آرہا ہے (کہ ان کی ویران بستیوں کے کھنڈرات ملکِ شام کو جاتے ہوئے تمہارے راستہ پر ملتے ہیں) اور حالت ان کی یہ تھی کہ شیطان نے ان کے اعمالِ (بد) کو ان کی نظر میں مستحسن کر رکھا تھا اور (اس ذریعہ سے) ان کو راہِ (حق) سے روک رکھا تھا اور وہ لوگ (ویسے) ہوشیار تھے (مجنون و بیوقوف نہ تھے، مگر اس جگہ انھوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا) اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور (ان تینوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق کی) لے کر آئے تھے، پھر ان لوگوں نے زمین میں سرکشی کی اور ہمارے (عذاب سے) بھاگ نہ سکے تو ہم نے (ان پانچوں میں سے) ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا، سو ان میں بعضوں پر تو ہم نے سخت ہوا بھیجی (مراد اس سے قومِ عاد ہے)

اور ان میں بعضوں کو ہولناک آواز نے آدبایا (مراد اس سے قوم ثمود ہے، لقولہ تعالیٰ فی سورۃ
ہود: وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ) اور ان میں بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا (مراد اس سے
قارون ہے) اور ان میں بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا (مراد اس سے فرعون وہامان ہے) اور
(ان لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے تو) اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا (یعنی بلاوجہ سزا دیتا
جو ظاہراً مشابہ ظلم کے ہے گو واقع میں بوجہ اپنی ملک میں تصرّف کرنے کے یہ بھی ظلم نہ تھا)
لیکن یہی لوگ (شرارتیں کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے (کہ اپنے کو مستحق عذاب بنایا، اور
غارت ہوئے تو اپنا ضرر خود کیا) جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں
کی مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا
مکڑی کا گھر ہوتا ہے، (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے زعم میں ایک اپنی جائے پناہ بنائی ہے،
مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کے سبب کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ
معبوداتِ باطلہ کو اپنے زعم میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں، مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ
(حقیقتِ حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا)
اللہ تعالیٰ (تو) ان سب چیزوں (کی حقیقت اور ضعف) کو جانتا ہے جن جن کو وہ لوگ خدا
کے سوا پوج رہے ہیں (پس وہ چیزیں تو نہایت ضعیف ہیں) اور وہ (خود یعنی اللہ تعالیٰ)
زبردست حکمت والا ہے (جس کا حاصل قوت علمیہ وعملیہ میں کامل ہونا ہے) اور (چونکہ ہم
ان چیزوں کی حقیقت کو جانتے ہیں اسی لئے) ہم ان (قرآنی) مثالوں کو (جن میں سے
ایک مثال اس مقام پر مذکور ہے) لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں، اور
(ان مثالوں سے چاہیے تھا کہ ان لوگوں کا جہل علم سے بدل جاتا مگر) ان مثالوں کو بس علم والے
ہی سمجھتے ہیں (خواہ بالفعل عالم ہوں یا انجام کے اعتبار سے، یعنی علم اور حق کے طالب ہوں اور یہ
لوگ عالم بھی نہیں طالب بھی نہیں، اس لئے جہل میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن ان کے جہل سے
حق حق ہی رہے گا جس کو خدا جانتا ہے، اور اپنے بیان سے ظاہر فرماتا ہے، پس غیر اللہ کا مستحق عبادت
نہ ہونا تو ثابت ہوا۔ آگے اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے
آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے، (چنانچہ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں) ایمان والوں
کے لئے اس میں (اس کے استحقاقِ عبادت کی) بڑی دلیل ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات میں جن انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے واقعات اجمالاً بیان کئے گئے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں مفصل آچکے ہیں، مثلاً شعیب علیہ السلام کا قصہ سورہ اعراف اور ہود میں، اسی طرح عاد و ثمود کا قصہ بھی اعراف اور ہود میں گذر چکا ہے، اور قارون، فرعون، ہامان کا قصہ سورہ قصص میں ابھی گذرا ہے۔

وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِيْنَ، استبصار سے مشتق ہے جو بصیرت کے معنی میں ہے، اور مستبصر بمعنی مبصر۔ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو کفر و شرک پر اصرار کر کے عذاب میں اور ہلاکت میں مبتلا ہوئے کچھ بیوقوف یا دیوانے نہ تھے، دنیا کے کاموں میں بڑے مبصر اور ہوشیار تھے، مگر اُن کی عقل اور ہوشیاری اسی مادّی دنیا میں مقید ہو کر رہ گئی۔ یہ نہ پہچانا کہ نیک و بد کی جزاء و سزا کا کوئی دن آنا چاہئے، جس میں مکمل انصاف ہو۔ کیونکہ دنیا میں تو اکثر مجرم ظالم دندناتے پھرتے ہیں اور مظلوم و مصیبت زدہ مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی انصاف کے دن کا نام قیامت اور آخرت ہے، اس کے معاملہ میں ان کی عقل ماری گئی۔

یہی مضمون سورہ روم میں بھی آگے آنے والا ہے، يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ دنیا کی زندگی کے کاموں کو تو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل ہیں۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِيْنَ کے معنی یہ بتلائے کہ یہ لوگ ایمان اور آخرت پر بھی دل میں تو یقین رکھتے تھے اور اس کا حق ہونا خوب سمجھتے تھے، مگر دنیوی اغراض نے ان کو انکار پر مجبور کر رکھا تھا۔

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اسکی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے زمین میں گھر بناتی ہیں، بظاہر وہ یہاں مراد نہیں، بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے، اور اس میں معلق رہتی ہے۔ اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی جتنی قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں، یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہے جو کہ نہایت کمزور ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔

مسئلہ: مکڑی کو مارنے اور اس کے جالے صاف کر دینے کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات اس کو پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ جانور بوقت ہجرت غار ثور کے دہانے پر جالا تان دینے کی وجہ سے قابل احترام ہو گیا، جیسا کہ خطیب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کے قتل کی ممانعت نقل کی ہے۔ مگر ثعلبی نے اور ابن عطیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے طَهِّرُوْا بُيُوْتَكُمْ مِّنْ نَسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ فَاِنَّ تَرْكَهٗ يُوْرِثُ الْفَقْرَ، یعنی مکڑی کے جالوں سے اپنے مکانات کو صاف رکھا کرو، کیونکہ اس کے چھوڑ دینے سے فقر و فاقہ پیدا ہوتا ہے، سنداً ان دونوں روایتوں کی قابلِ اعتماد نہیں، اور دوسری روایت کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے جن میں مکانات اور فناءِ دار کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ (روح المعانی)

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ، مشرکین کے خداؤں کی کمزوری کی مثال مکڑی کے جالے سے دینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ہم ایسی ایسی واضح مثالوں سے توحید کی حقیقت کا بیان کرتے ہیں، مگر ان مثالوں سے بھی سمجھ بوجھ صرف علماءِ دین ہی حاصل کرتے ہیں، دوسرے لوگ تدبر اور غور و فکر ہی نہیں کرتے، کہ حق ان پر واضح ہو جائے

اللہ کے نزدیک عالم کون ہے؟ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر فرمایا کہ عالم وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں غور و فکر کرے، اور اس کی طاعت پر عمل کرے، اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے محض الفاظ سمجھ لینے سے اللہ کے نزدیک کوئی شخص عالم نہیں ہوتا، جب تک قرآن میں تدبر اور غور و فکر کی عادت نہ ڈالے، اور جب تک کہ اپنے عمل کو قرآن کے مطابق نہ بنائے۔

مسند احمد میں حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار امثال سیکھی ہیں، ابن کثیرؒ اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت عمرو بن عاصؓ کی بہت بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مذکورہ میں عالم انہی کو فرمایا ہے جو اللہ و رسول کی بیان کردہ امثال کو سمجھیں۔

اور حضرت عمرو بن مرہؓ نے فرمایا کہ جب میں قرآن کی کسی آیت پر پہونچتا ہوں جو میری سمجھ میں نہ آئے تو مجھے بڑا غم ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (ابن کثیر)

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ

تو پڑھ جو اُتری تیری طرف کتاب اور قائم رکھ نماز

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ

بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے اور اللہ کی یاد ہے

اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

سب سے بڑی اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آپ رسول ہیں، اس لئے) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ (تبلیغ کے واسطے اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھا کیجئے (اور تبلیغ قولی کے ساتھ تبلیغ عملی بھی کیجئے کہ دین کے کام ان کو عمل کر کے بھی بتلائیے، خصوصاً) نماز کی پابندی رکھئے (کیونکہ تمام اعمال میں نماز اعظم عبادت بھی ہے اور اس کے اثرات بھی دور رس ہیں کہ) بیشک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے، (یعنی بزبانِ حال کہتی ہے کہ تو جس معبود کی انتہائی تعظیم کر رہا ہے اور اس کی اطاعت کا اقرار کر رہا ہے، فحشا اور منکر میں مبتلا ہونا اس کی شان میں بے ادبی ہے) اور (اسی طرح نماز کے سوا جتنے نیک کام ہیں سب پابندی کے لائق ہیں، کیونکہ وہ سب قولاً یا فعلاً اللہ کی یاد ہی ہیں) اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور (اگر تم اللہ کی یاد میں غفلت کرو تو یہ بھی سن لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (جیسا کرو گے ویسا بدلہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ، سابقہ آیات میں چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر تھا، جن میں چند بڑے بڑے سرکش کفار اور ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنینِ امت کے لئے تسلی بھی ہے کہ انبیاء سابقین نے مخالفین کی کیسی کیسی ایذاؤں پر صبر کیا، اور اس کی تلقین بھی کہ تبلیغ و دعوت کے کام میں کسی حال میں ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔

اصلاحِ خلق کا مختصر جامع نسخہ

مذکور الصدر آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا ایک مختصر جامع نسخہ بتلایا گیا ہے، جس پر عمل کرنے سے پورے دین پر عمل کرنے کے راستے کھل جاتے ہیں، اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں عادۃً پیش آتی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں، اس نسخہ اکسیر کے دو جزء ہیں، ایک تلاوتِ قرآن، دوسرے نماز کی اقامت۔ اور اس جگہ اصل مقصود تو یہی ہے کہ لوگوں کو ان دونوں چیزوں کا پابند کیا جائے، لیکن ترغیب و تاکید کے لئے ان دونوں چیزوں کا حکم اولاً خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، تاکہ امت کو اس پر عمل کرنے کی زیادہ رغبت ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تعلیم سے ان کو خود عمل کرنا بھی آسان ہو جائے۔

ان میں تلاوتِ قرآن تو سب کاموں کی روح اور اصل بنیاد ہے، اس کے بعد دوسری چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے، جس کو تمام دوسرے فرائض اور اعمال سے ممتاز کر کے بیان کرنے کی یہ حکمت بھی بیان فرمادی کہ نماز خود اپنی ذات میں بھی بہت بڑی اہم عبادت اور دین کا عمود ہے، اس کے ساتھ اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص نماز کی اقامت کرلے تو نماز اس کو فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ فحشاء، ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور ایسی واضح ہو کہ ہر عقل والا مؤمن ہو یا کافر اس کو بُرا سمجھے، جیسے زنا، قتلِ ناحق، چوری ڈاکہ وغیرہ، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو، اس لئے ائمہ فقہاء کے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا۔

فحشاء اور منکر کے دو لفظوں میں تمام جرائم اور ظاہر و باطنی گناہ آگئے، جو خود بھی فساد ہی فساد ہیں اور اعمال صالحہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔

نماز کا تمام گناہوں سے روکنے کا مطلب

متعدد مستند احادیث کی رُو سے یہ مطلب ہے، کہ اقامتِ صلوٰۃ میں بالخاصہ تاثیر ہے کہ جو اس کو ادا کرتا ہے اس سے گناہ چھوٹ جاتے ہیں بشرطیکہ صرف نماز پڑھنا نہ ہو، بلکہ الفاظِ قرآن کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ ہو۔ اقامت کے لفظی معنی سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں، جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہوا کہ نماز کے تمام ظاہری اور باطنی آداب اُس طرح ادا کرے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر ادا کر کے بتلایا، اور عمر بھر ان کی زبانی تلقین بھی فرماتے رہے کہ بدن اور کپڑے اور جائے نماز کی مکمل طہارت بھی ہو، پھر نمازِ جماعت کا پورا اہتمام بھی اور نماز کے تمام اعمال کو سنت کے مطابق بنانا بھی، یہ تو ظاہری آداب ہوئے۔ باطنی یہ کہ مکمل خشوع خضوع سے اس طرح اللہ کے سامنے کھڑا ہو کہ گویا وہ حق تعالیٰ سے عرض و معروض کر رہا ہے۔ اس طرح

اقامت صلوٰۃ کرنے والے کو منجانب اللہ خود بخود توفیق اعمالِ صالحہ کی بھی ہوتی ہے، اور ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی بھی، اور جو شخص نماز پڑھنے کے باوجود گناہوں سے نہ بچا تو سمجھ لے کہ اس کی نماز ہی میں قصور ہے۔ جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا مَنْ لَّمْ تَنْھَہٗ صَلٰوتُہٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ فَلَا صَلٰوۃَ لَہٗ (رواہ ابن ابی حاتم بسندہ عن عمران بن حصین والطبرانی من حدیث ابی معاویۃ) یعنی جس شخص کو اس کی نماز نے فحشاء اور منکر سے نہ روکا اس کی نماز کچھ نہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یُطِعِ الصَّلٰوۃَ (رواہ ابن جریر بسندہ) یعنی اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے اپنی نماز کی اطاعت نہ کی اور نماز کی اطاعت یہی ہے کہ فحشاء اور منکر سے باز آجائے۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ جس شخص کی نماز نے اس کو اعمالِ صالحہ پر عمل اور منکرات سے پرہیز پر آمادہ نہیں کیا تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ان تینوں روایتوں کو نقل کر کے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ احادیث مرفوعہ نہیں، بلکہ عمران بن حصین اور عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں جو ان حضرات نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمائے ہیں۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ فلاں آدمی رات کو تہجد پڑھتا ہے اور جب صبح ہو جاتی ہے تو چوری کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ عنقریب نماز اس کو چوری سے روک دے گی۔ (ابن کثیر)

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد وہ اپنے گناہ سے تائب ہو گیا۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ نماز کے پابند ہونے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں جو بظاہر اس آیت کے ارشاد کے خلاف ہے۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے تو یہ فرمایا کہ آیت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نماز نمازی کو گناہوں سے منع کرتی ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جس کو کسی کام سے منع کیا جائے وہ اس سے باز بھی آجائے۔ آخر قرآن و حدیث سب لوگوں کو گناہ سے منع کرتے ہیں،

مگر بہت سے لوگ اس منع کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے، اور گناہ سے باز نہیں آتے۔ خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہی توجیہ لی گئی ہے۔

مگر اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ نماز کے منع کرنے کا مفہوم صرف حکم دینا نہیں بلکہ نماز میں بالخاصہ یہ اثر بھی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہوجاتی ہے، اور جس کو توفیق نہ ہو تو غور کرنے سے ثابت ہوجائے گا کہ اس کی نماز میں کوئی خلل تھا، اور اقامتِ صلوٰۃ کا حق اس نے ادا نہیں کیا، احادیث مذکورہ سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ، یعنی اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے، اور وہ تمہارے سب اعمال کو خوب جانتا ہے" یہاں ذکر اللہ کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ بندے جو اللہ کا ذکر نماز یا خارج نماز میں کرتے ہیں وہ بڑی چیز ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ بندے جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے ذاکر بندوں کا ذکر فرشتوں کے مجمع میں کرتے ہیں (فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ) اور یہ عبادت گذار بندوں کو اللہ کا یاد کرنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ بہت سے صحابہ و تابعین سے اس جگہ ذکر اللہ کا یہی دوسرا مفہوم منقول ہے، ابن جریر اور ابن کثیر نے اسی کو ترجیح دی ہے، اور اس مفہوم کے لحاظ سے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ نماز پڑھنے میں گناہوں سے نجات کا اصل سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس کا ذکر فرشتوں میں کرتے ہیں اور اس کی برکت سے اس کو گناہوں سے نجات مل جاتی ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو اُن میں

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

بے انصاف ہیں اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم کو اور اترا تم کو

وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ

اور بندگی ہماری اور تمہاری ایک ہی کو ہے اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں، اور ویسی ہی

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ

ہم نے اتاری تجھ پر کتاب، سو جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو مانتے

بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

ہیں اور ان (مکہ والوں) میں بھی بعضے ہیں کہ اس کو مانتے ہیں اور منکر وہی ہیں ہماری باتوں سے جو نافرمان ہیں

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے تب تو

لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ

البتہ شبہ میں پڑتے یہ جھوٹے ، بلکہ یہ (قرآن) تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ

ملی ہے سمجھ ، اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں ، اور کہتے ہیں کیوں

اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ

نہ اُتریں اس پر کچھ نشانیاں اس کے رب سے تو کہہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے اور میں تو بس

اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

سنا دینے والا ہوں کھول کر ، کیا اُن کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر اُتاری کتاب کہ اُن پر

يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ع

پڑھی جاتی ہے ، بیشک اس میں رحمت ہے اور سمجھانا اُن لوگوں کو جو مانتے ہیں ،

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

تو کہہ کافی ہے اللہ میرے اور تمہارے بیچ گواہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین

الْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ

میں اور جو لوگ یقین لاتے ہیں جھوٹ پر اور منکر ہوئے اللہ سے ، وہی ہیں

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ

نقصان پانے والے ، اور جلدی مانگتے ہیں تجھ سے آفت ، اور اگر نہ ہوتا ایک

مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

وعدہ مقررہ تو آپہنچتی اُن پر آفت ، اور البتہ آئے گی اُن پر اچانک اور ان کو خبر

۵ ع ۷

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ

نہ ہوگی ، جلدی مانگتے ہیں تجھ سے عذاب اور دوزخ گھیر رہی ہے

بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ

منکروں کو ، جس دن گھیر لے گا ان کو عذاب ان کے اوپر سے اور

تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

پاؤں کے نیچے سے اور کہے گا چکھو جیسا کچھ تم کرتے تھے ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہو تو اے مسلمانوں منکرین رسالت میں سے جو اہل کتاب ہیں ہم ان سے طریقہ گفتگو بتلاتے ہیں، اور یہ تخصیص اس لئے کہ اول تو وہ بوجہ اہل علم ہونے کے بات کو سنتے ہیں اور مشرکین تو بات سننے سے پہلے ہی ایذاء کے درپے ہو جاتے ہیں، دوسرا اہل علم کے ایمان لے آنے سے عوام کا ایمان زیادہ متوقع ہو جاتا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ) تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو ہاں جو ان میں زیادتی کریں (تو ان کو جواب ترکی بہ ترکی دینے کا مضائقہ نہیں، گو افضل جب بھی طریقۂ احسن ہی) اور (وہ مہذب طریقہ یہ ہے کہ مثلاً ان سے) یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو تم پر نازل ہوئیں، (کیونکہ مدار ایمان کا منزل من اللہ ہونا ہے، پس جب ہماری کتاب کا منزل من اللہ ہونا تمہاری کتب سے بھی ثابت ہے، پھر تم کو قرآن پر بھی ایمان لانا چاہئے) اور (یہ تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ) ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے کقولہ تعالیٰ اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ بَيْنَنَا الخ جب توحید متفق علیہ ہوا اور اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کی وجہ سے نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لانا خلاف توحید ہے، تو تم کو ہمارے نبی پر ایمان لانا چاہئے (کقولہ تعالیٰ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا الخ) اور (اس گفتگو کے ساتھ اپنا مسلمان ہونا تنبیہ کے لئے سنا دو کہ) ہم تو اس کی اطاعت کرتے ہیں (اس میں عقائد و اعمال سب آگئے یعنی اسی طرح تم کو بھی چاہئے جب کہ مقتضی موجود ہے کقولہ تعالیٰ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ) اور (جس طرح ہم نے پہلے انبیاء پر کتابیں نازل کیں) اسی طرح ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی (جس کی بناء پر مجادلہ بالاحسن کی تعلیم کی گئی) سو جن لوگوں کو ہم نے کتاب (کی نافع سمجھ) دی ہے وہ اس

(آپ والی) کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (اور ان سے مجادلہ کی بھی نوبت شاذ و نادر آتی ہے) اور ان (اہلِ عرب مشرک) وگو نہیں بھی بعض ایسے (منصف) ہیں کہ اس کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (خواہ خود سمجھ کر یا اہلِ علم کے ایمان سے استدلال کر کے) اور (وضوح دلائل کے بعد) ہماری (اس کتاب کی) آیتوں سے بجز (ضدی) کافروں کے اور کوئی منکر نہیں ہوتا (اوپر مجادلہ کی تقریر دلیلِ نقلی تھی جس سے خاص اہلِ نقل کو تخاطب تھا آگے دلیل عقلی ہے جس میں عام تخاطب ہے یعنی) اور (جو لوگ آپ کی نبوت کے منکر ہیں، ان کے پاس کوئی منشا اشتباہ بھی تو نہیں، کیونکہ) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے (کہ یہ لکھے پڑھے آدمی ہیں آسمانی کتابیں دیکھ بھال کر ان کی مدد سے مضامین سوچ کر فرصت میں بیٹھ کر لکھ لئے اور یاد کر کے ہم لوگوں کو سنا دیتے یعنی اگر ایسا ہوتا تو کچھ تو منشاء اشتباہ کا ہوتا، گو جب بھی یہ شبہ کرنے والے مبطل ہوتے، کیونکہ اعجازِ قرآنی پھر بھی دلالت علی النبوۃ کے لئے کافی تھا، لیکن اب تو اتنا منشاءِ اشتباہ بھی نہیں اس لئے یہ کتاب محلِ ارتیاب نہیں) بلکہ یہ کتاب (باوجود واحد ہونے کے چونکہ ہر حصہ اس کا معجزہ ہے، اور حصص کثیر ہیں، اس لئے وہ تنہا گویا) خود بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور (باوجود ظہور اعجاز کے) ہماری آیتوں سے بس ضدی لوگ انکار کئے جاتے ہیں (ورنہ منصف کو تو ذرا شبہ نہیں رہنا چاہئے) اور یہ لوگ (باوجود عطاء معجزہ قرآن کے محض براہ تعنّت وعناد) یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر ان کے رب کے پاس سے (ہماری فرمائشی) نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوئیں، آپ یوں کہہ دیجئے کہ وہ نشانیاں تو خدا کے قبضہ (قدرت) میں ہیں اور (میرے اختیار کی چیزیں نہیں) میں تو صرف ایک صاف صاف (عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) ہوں (اور رسول ہونے پر صحیح دلیلیں رکھتا ہوں جن میں سب سے بڑی دلیل قرآن ہے۔ پھر خاص دلیل کی کیا ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اس کے واقع نہ ہونے میں حکمت بھی ہو۔ آگے قرآن کا اعظم فی الدلالۃ ہونا فرماتے ہیں) کیا (دلالت علی النبوۃ میں) ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب (معجز) نازل فرمائی ہے جو ان کو (ہمیشہ) سنائی جاتی رہتی ہے، (کہ اگر ایک بار سننے سے اعجاز ظاہر نہ ہو تو دوسری بار میں ہو جائے یا اس کے بعد ہو جائے، اور دوسرے معجزات میں تو یہ بات بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس کا خارق ہونا دائمی نہ ہونا جیسا ظاہر ہے اور ایک ترجیح اس معجزہ میں یہ ہے کہ) بلاشبہ اس کتاب میں (معجزہ ہونے کے ساتھ) ایمان لانے والے لوگوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے (رحمت یہ کہ تعلیم احکام کی ہے جو نفع محض ہے اور نصیحت

ترغیب و ترہیب سے ہے، اور یہ بات دوسرے معجزات میں کب ہوتی، پس ان ترجیحات سے تو اس کو غنیمت سمجھتے، اور ایمان لے آتے، اور اگر اس وضوح دلائل کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو آخری جواب کے طور پر) آپ کہدیجئے کہ (خیر بھائی مت مانو) اللہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کا) گواہ بس ہے اس کو سب چیز کی خبر ہے جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے اور (جب میری رسالت اور اللہ کا علم محیط ثابت ہوا تو) جو لوگ جھوٹی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ (کی باتوں) کے منکر ہیں (جن میں رسالت بھی داخل ہے) تو وہ لوگ بڑے زیان کار ہیں (یعنی جب اللہ کے ارشاد سے میری رسالت ثابت ہے تو اس کا انکار کفر باللہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے تو اس کو اس انکار و کفر کی بھی خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ کفر پر سزائے خسارہ دیتے ہیں، پس لامحالہ ایسے لوگ خاسر ہوں گے) اور یہ لوگ آپؐ سے عذاب (واقع ہونے کا) تقاضا کرتے ہیں (اور فوراً عذاب نہ آنے سے آپ کی نبوت و رسالت میں شبہ وانکار کرتے ہیں)، اور اگر (علم الٰہی میں عذاب آنے کے لئے) میعاد معین نہ ہوتی تو (ان کے تقاضہ کے ساتھ ہی) ان پر عذاب آچکا ہوتا اور (جب وہ میعاد آجاوے گی تو) وہ عذاب اُن پر دفعۃً آپہونچے گا، اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی (آگے ان لوگوں کی جہالت کے اظہار کے لئے ان کی جلد بازی کو مکرر ذکر کر کے عذاب کی میعاد معین اور اس میں پیش آنے والے عذاب کا ذکر کرتے ہیں کہ) یہ لوگ آپؐ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں اور (عذاب کی صورت یہ ہوگی کہ) اس میں کچھ شک نہیں کہ جہنم ان کافروں کو (چاروں طرف سے) گھیر لے گا جس دن اُن پر عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے نیچے سے گھیر لے گا اور (اس وقت ان سے) حق تعالیٰ فرمائے گا کہ جو کچھ (دنیا میں) کرتے رہے ہو (اب اس کا مزہ) چکھو۔

معارف و مسائل

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَھْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، یعنی اہل کتاب سے بحث و مباحثہ کی نوبت آوے تو مجادلہ بھی ایسے طریقہ سے کرو جو بہتر ہو مثلاً سخت بات کا جواب نرم الفاظ سے، غصہ کا جواب بردباری سے، جاہلانہ شور و شغب کا جواب باوقار گفتگو سے، اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، مگر وہ لوگ جنھوں نے تم پر ظلم کیا کہ تمہاری باوقار نرم گفتگو اور دلائل واضحہ کے مقابلہ میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تو وہ اس احسان کے مستحق نہیں رہے، بلکہ ایسے لوگوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے تو جائز ہے، اگرچہ اولیٰ اور بہتر اس وقت بھی یہی ہے کہ ان کی بدخوئی کا جواب بدخوئی سے اور ظلم کا جواب ظلم سے نہ دیں۔

بلکہ کج خلقی کے جواب میں خوش خلقی کا اور ظلم کے جواب میں انصاف کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ دوسری آیاتِ قرآن میں اس کی تصریح ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ، یعنی اگر ظلم و جور کا بدلہ تم ان سے برابر سرابر لے لو تو تمھیں اس کا حق ہے، لیکن صبر کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے"۔

اس آیت میں اہل کتاب سے مجادلہ میں جو ہدایت طریقۂ حسنہ کے ساتھ کرنے کی دی گئی ہے یہی سورۂ نحل میں مشرکین کے متعلق بھی ہے۔ اس جگہ اہل کتاب کی تخصیص اس کلام کی وجہ سے ہے جو بعد میں آرہا ہے، کہ ہمارے اور تمہارے دین میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں تم غور کرو تو ایمان اور اسلام کے قبول کرنے میں تمھیں کوئی مانع نہ ہونا چاہئے، جیسا کہ ارشاد فرمایا قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ، یعنی تم اہل کتاب سے مجادلہ کے وقت ان کو اپنے قریب کرنے کے لئے یہ کہو کہ ہم مسلمان تو اس وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف بواسطہ ہمارے رسول کے بھیجی گئی ہے، اور اس وحی پر بھی جو تمھاری طرف تمھارے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی گئی ہے، اس لئے ہم سے مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔

کیا اس آیت میں موجودہ تورات وانجیل کے مضامین کی تصدیق کا حکم ہے

اس آیت میں اہل کتاب کی طرف آنے والی کتابوں تورات وانجیل پر مسلمانوں کے ایمان کا تذکرہ جس عنوان سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کتابوں پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں بایں معنی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موجودہ تورات وانجیل کے سب مضامین پر ہمارا ایمان ہو، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی بہت تحریفات ہو چکی تھیں اور اس وقت سے اب تک ان میں تحریف کا سلسلہ چل ہی رہا ہے۔ ایمان صرف ان مضامینِ تورات وانجیل پر ہے جو اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئے تھے، تحریف شدہ مضامین اس سے خارج ہیں۔

موجودہ تورات وانجیل کی نہ مطلقاً تصدیق کی جائے نہ مطلقاً تکذیب

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اہل کتاب تورات وانجیل کو ان کی اصلی زبان عبرانی میں پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو ان کا ترجمہ عربی زبان میں سناتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو، بلکہ یوں کہو اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ، یعنی ہم اجمالاً اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تمھارے انبیاء پر نازل ہوئی ہے، اور جو تفصیلات تم بتلاتے ہو وہ ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد نہیں۔ اس لئے ہم اس کی تصدیق و تکذیب سے اجتناب کرتے ہیں۔

تفسیروں میں جو عام مفسرین نے اہل کتاب کی روایات نقل کی ہیں ان کا بھی یہی درجہ ہے۔ اور نقل کرنے کا منشا بھی صرف اس کی تاریخی حیثیت کو واضح کرنا ہے، احکام حلال و حرام کا ان سے استنباط نہیں کیا جا سکتا، مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ، یعنی نزولِ قرآن سے پہلے نہ آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے، نہ کچھ لکھ سکتے تھے بلکہ آپ اُمّی تھے، اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ لکھے پڑھے ہوتے تو اہلِ باطل کے لئے شک و شبہ کی گنجائش نکل آتی کہ یہ الزام لگاتے کہ آپ نے پچھلی کتابیں تورات و انجیل پڑھی ہیں یا نقل کی ہیں آپ جو کچھ قرآن میں فرماتے ہیں وہ انہی پچھلی کتابوں کا اقتباس ہے، کوئی وحی اور نبوت و رسالت نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ کی بڑی فضیلت اور بڑا معجزہ ہے

حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جس طرح بہت سے واضح اور کھلے ہوئے معجزات ظاہر فرمائے انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو پہلے سے اُمّی رکھا، نہ کچھ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ خود کچھ لکھ سکتے تھے، اور عمر کے چالیس سال اسی حال میں تمام اہلِ مکہ کے سامنے گذرے۔ آپ کا اختلاط اہلِ کتاب سے بھی کبھی نہیں ہوا، کہ ان سے کچھ سُن لیتے۔ کیونکہ مکہ میں اہلِ کتاب تھے ہی نہیں، چالیس سال ہونے پر یکایک آپ کی زبانِ مبارک سے ایسا کلام جاری ہونے لگا جو اپنے مضامین اور معانی کے اعتبار سے بھی معجزہ تھا، اور لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی۔

بعض علماء نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آپ کا اُمّی ہونا ابتداء میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا اور اس کی دلیل میں واقعۂ حدیبیہ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ جب معاہدۂ صلح لکھا گیا تو اس میں مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اوّل لکھا تھا، اس پر مشرکینِ مکہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپ کو رسول مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ ہم قبول نہیں کریں گے۔ لکھنے والے حضرت علی مرتضیٰؓ تھے، آپ نے ان کو فرمایا کہ یہ لفظ مٹا دو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ادب سے مجبور ہو کر ایسا کرنے سے انکار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ لفظ مٹا کر یہ لکھ دیا، مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ۔

اس روایت میں لکھنے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے، جس سے کچھ حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپ لکھنا جانتے تھے، مگر صحیح بات یہی ہے کہ کسی دوسرے سے لکھوانے کو بھی عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ "اس نے لکھا" جیسا کہ محاورات میں عام

ہے، اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ اس واقعہ میں بطور معجزہ آپ سے نام مبارک بھی اللہ تعالیٰ نے لکھوا دیا، اس کے علاوہ صرف اپنے نام کے چند حروف لکھ دینے سے کوئی آدمی لکھا پڑھا نہیں کہلا سکتا، اس کو اَن پڑھ اور اُمّی ہی کہا جائے گا جب لکھنے کی عادت نہ ہو اور بلا دلیل کتابت کا آپ کی طرف منسوب کرنا آپ کی فضیلت کا اثبات نہیں، غور کریں تو بڑی فضیلت اُمّی ہونے میں ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے بندو میرے جو یقین لائے ہو میری زمین کشادہ ہے سو مجھ ہی کی بندگی کرو

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِیْنَ

جو جی ہے سو چکھے گا موت پھر ہماری طرف پھر آؤ گے ، اور جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ

یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کو ہم جگہ دیں گے بہشت میں جھروکے نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۵۸﴾ ۖ

بہتی ہیں ان کے نہریں سدا رہیں ان میں، خوب ثواب ملا کام والوں کو

الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ

جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ رکھا، اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں

لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِیْعُ

رکھتے اپنی روزی ، اللہ روزی دیتا ہے ان کو اور تم کو بھی ، اور وہی ہے سننے والا

الْعَلِیْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

جاننے والا ، اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمان اور زمین کو

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور کام میں لگایا سورج اور چاند کو تو کہیں اللہ نے ، پھر کہاں سے اُلٹ جاتے ہیں ،

اَللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ

اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اپنے بندوں میں اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے

إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ

بیشک اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ اور جو تو پوچھے اُن سے کس نے اُتارا آسمان

السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ

سے پانی پھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد تو کہیں

اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾

اللہ نے تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

خُلاصۂ تفسیر

اے میرے ایمان دار بندو (جب یہ لوگ غایتِ عداوت وعناد سے تم کو اقامتِ شرائع واختیارِ دین پر ایذاء پہونچاتے ہیں تو یہاں رہنا کیا ضرور) میری زمین فراخ ہے، سو (اگر یہاں رہ کر عبادت نہیں کرسکتے تو اور کہیں چلے جاؤ اور وہاں جاکر) خالص میری ہی عبادت کرو (کیونکہ یہاں اہلِ شرک کا زور ہے، تو ایسی عبادت جو توحید محض پر مبنی ہو اور شرک سے خالی ہو، یہاں مشکل ہے، البتہ خدا کے ساتھ غیر خدا کی بھی عبادت ہو یہ ممکن ہے مگر وہ عبادت ہی نہیں اور اگر تم کو ہجرت میں احباب واوطان کی مفارقت شاق معلوم ہو تو یہ سمجھ لو کہ ایک نہ ایک روز یہ تو ہونا ہی ہے، کیونکہ) ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا (ضرور) ہے (آخر اس وقت سب چھوٹیں گے اور) پھر تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے (اور نافرمان ہو کر آنے میں خوفِ سزا کا ہے) اور (یہ مفارقت اگر ہماری رضا کے واسطے ہو تو ہمارے پاس پہنچنے کے بعد اس وعدہ کے مستحق ہو جاؤ اور وہ وعدہ یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (جن پر عمل کرنا بعض اوقات ہجرت پر موقوف ہوتا ہے تو ایسے وقت میں ہجرت بھی کی) ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان نیک) کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے، جنھوں نے (واقع شدہ سختیوں پر جن میں ہجرت کی سختی بھی داخل ہو گئی) صبر کیا، اور (دوسرے ملک یا شہر میں جاکر جو تکالیف کا اور گذارے کی مشکلات کا اندیشہ تھا اس میں) وہ اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے اور (اگر ہجرت میں تم کو یہ وسوسہ ہو کہ پردیس میں کھانے کو کہاں سے

ملے گا تو یہ سمجھ لو کہ) بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے (یعنی جمع نہیں کرتے گو بعضے جمع بھی کرتے ہیں، مگر بہت سے نہیں بھی کرتے) اللہ ہی ان کو (مقدر) روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی (مقدر روزی پہنچاتا ہے خواہ تم کہیں ہو پھر ایسا وسوسہ مت لاؤ، بلکہ دل قوی کر کے اللہ پر بھروسہ رکھو) اور (وہ بھروسہ کے لائق ہے کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (اسی طرح دوسری صفات میں کامل ہے اور جو ایسا کامل الصفات ہو وہ ضرور بھروسہ کے قابل ہے) اور (توحید فی الالوہیت کا جو مبنیٰ ہے یعنی توحید فی التخلیق وہ تو ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہے چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ (بھلا) وہ کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے پھر (جب توحید فی التخلیق کو مانتے ہیں تو توحید فی الالوہیت کے بارے میں) کدھر الٹے چلے جارہے ہیں (اور جیسا خالق اللہ ہی ہے اسی طرح اللہ ہی رازق بھی ہے چنانچہ) وہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک اللہ ہی سب چیز کے حال سے واقف ہے (جیسی مصلحت دیکھتا ہے ویسی ہی روزی دیتا ہے غرض رازق وہی ٹھہرا، اس لئے رزق کا اندیشہ ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے) اور (جیسا کہ تخلیقِ کائنات میں اللہ کی توحید ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے، اسی طرح کائنات کے باقی رکھنے اور ان کا نظام چلانے میں بھی توحید کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک (ناقابل نبات) پڑی تھی تر و تازہ (قابل نبات) کر دیا تو (جواب میں) وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے آپ کہئے کہ الحمدللہ (اتنا تو اقرار کیا جس سے توحید فی الالوہیت پر استدلال بھی بدیہی ہے، مگر یہ لوگ مانتے نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں (نہ اس وجہ سے کہ عقل نہیں، بلکہ عقل سے کام نہیں لیتے اور غور نہیں کرتے، اس لئے بدیہی بھی خفی رہتا ہے)۔

معارف ومسائل

شروع سورت سے یہاں تک مسلمانوں کے ساتھ کفار کی عداوت اور توحید و رسالت سے مسلسل انکار اور حق اور اہلِ حق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹوں کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں مسلمانوں کے لئے ان کے شر سے بچنے اور حق کو شائع کرنے اور حق و انصاف

کو دنیا میں قائم کرنے کی ایک تدبیر کا بیان ہے جس کا اصطلاحی نام ہجرت ہے، یعنی وہ وطن اور ملک چھوڑ دینا جس میں انسان خلافِ حق بولنے اور کرنے پر مجبور کیا جائے۔

ہجرت کے احکام اور اس کی راہ میں پیش آنے والے شکوک و شبہات کا ازالہ

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے، اس لئے کسی کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں کہ فلاں شہر یا فلاں ملک میں کفار غالب تھے، اس لئے ہم اللہ کی توحید اور اس کی عبادت سے مجبور رہے۔ ان کو چاہئے کہ اس سرزمین کو جہاں وہ کفر و معصیت پر مجبور کئے جائیں اللہ کے لئے چھوڑ دیں، اور کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں آزادی سے اللہ تعالیٰ کے احکام پر خود بھی عمل کر سکیں، اور دوسروں کو بھی تلقین کر سکیں۔ اسی کا نام ہجرت ہے۔

وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانے میں دو قسم کے خطرات انسان کو عادۃً پیش آیا کرتے ہیں، جو اس کو ہجرت سے روکتے ہیں۔ پہلا خطرہ اپنی جان کا ہے کہ جب اس وطن کو چھوڑ کر کہیں جائیں گے تو یہاں کے کفار اور ظالم لوگ راہ میں حائل ہوں گے، اور مقابلہ و مقاتلہ کے لئے آمادہ ہوں گے۔ نیز راستہ میں ممکن ہے کہ دوسرے کفار سے بھی مقابلہ کرنا پڑے جس میں جان کا خطرہ ہے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں یہ دیا گیا کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر ایک جان چکھنے والی ہے مزہ موت کا، جس سے کسی کو کسی جگہ کسی حال مفر نہیں۔ اس لئے موت سے خوف اور گھبراہٹ مؤمن کا کام نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تو ہر شخص کو ہر حال میں پیش آئیگی۔ اپنی جگہ میں کیسے ہی حفاظت کے سامان کر کے رہے، پھر بھی آئیگی۔ اور مؤمن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت نہیں آسکتی۔ اس لئے اپنی جگہ رہنے یا ہجرت کر کے دوسری جگہ جانے میں موت کا خوف حائل نہ ہونا چاہئے خصوصاً جبکہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کرتے ہوئے موت آجانا دائمی راحتوں اور نعمتوں کا ذریعہ ہے جو ان کو آخرت میں ملیں گی جس کا ذکر بعد کی دو آیتوں میں فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا الآیۃ۔

دوسرا خطرہ ہجرت کی راہ میں یہ پیش آتا ہے کہ دوسرے وطن دوسرے ملک میں جا کر رزق کا کیا سامان ہوگا؟ اپنی جگہ تو کچھ آبائی میراث سے کچھ اپنی کمائی سے آدمی کوئی زمین جائداد یا صنعت و حرفت و تجارت وغیرہ کے سامان کئے رہتا ہے، ہجرت کے وقت یہ سب تو یہیں چھوٹ جائیں گے، آگے گذارہ کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب بعد کی تین آیتوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ تم ان حاصل کردہ سامانوں کو رزق کی علت اور کافی سبب قرار

دیتے ہو یہ تمھاری بھول ہے، رزق دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے وہ جب چاہتا ہے تو بغیر کسی ظاہری سامان کے بھی رزق پہنچا دیتا ہے، اور وہ نہ چاہے تو سب سامان و اسباب کے ہوتے ہوئے بھی انسان رزق سے محروم ہو سکتا ہے۔ اس کے بیان کے لئے پہلے تو یہ فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ، یعنی اس پر غور کرو کہ زمین پر چلنے والے کتنے ہزاروں قسم کے جانور ہیں جو اپنے رزق جمع کرنے اور رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے نہ تحصیلِ رزق کے اسباب جمع کرنے کی کوئی فکر کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزانہ اپنے فضل سے رزق مہیا کرتے ہیں۔ علماء نے فرمایا ہے کہ عام جانور ایسے ہی ہیں۔ ان میں صرف چیونٹی اور چوہا تو ایسے جانور ہیں جو اپنی غذا کیلئے اپنے بلوں میں جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ چیونٹی سردی کی موسم میں باہر نہیں آتی، اس لئے گرمی کے ایام میں کھانے کا سامان اپنے بل میں جمع کرتی ہے۔ اور مشہور ہے کہ پرندہ جانوروں میں سے عقعق (کوّا) بھی اپنی غذا اپنے گھونسلہ میں جمع کرتا ہے مگر وہ رکھ کر بھول جاتا ہے۔ بہرحال دنیا کے تمام جانور جن کی انواع و اصناف کا شمار بھی انسان سے مشکل ہے، وہ بیشتر وہی ہیں جو آج اپنی غذا حاصل کرنے کے بعد کل کے لئے نہ غذا مہیا کرتے ہیں نہ اس کے اسباب ان کے پاس ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ یہ پرندے جانور صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔ نہ اُن کی کوئی کھیتی باڑی ہے نہ کوئی جائداد و زمین، نہ یہ کسی کارخانے یا دفتر کے ملازم ہیں جہاں سے اپنا رزق حاصل کریں۔ خدا تعالیٰ کی کھلی زمین میں نکلتے ہیں اور سب کو پیٹ بھرائی رزق ملتا ہے۔ اور یہ ایک دن کا معاملہ نہیں، جب تک وہ زندہ ہیں یہی سلسلہ جاری ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں رزق کا اصلی ذریعہ بتلایا ہے جو حق تعالیٰ کی عطاء ہے، اور فرمایا ہے کہ خود ان منکروں کافروں سے سوال کرو کہ آسمان زمین کس نے پیدا کئے؟ اور شمس و قمر کس کے تابع فرمان چل رہے ہیں؟ بارش کون برساتا ہے؟ پھر اس بارش کے ذریعہ زمین سے نباتات کون اُگاتا ہے؟ تو مشرکین بھی اس کا اقرار کریں گے کہ یہ سب کام ایک ذات حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ تو ان سے کہئے کہ پھر تم اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا پاٹ اور ان کو اپنا کارساز کیسے سمجھتے ہو۔ اگلی آیات وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ سے آخر رکوع تک اسی کا بیان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے روکنے والی دوسری فکر معاش کی ہے، وہ بھی انسان کی بھول ہے۔ معاش کا مہیا کرنا اس کے یا اس کے جمع کردہ اسباب و سامان کے

قبضہ میں نہیں، وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کی عطا ہے۔ اسی نے اس وطن میں یہ سامان جمع فرما دیئے تھے وہ دوسری جگہ بھی سامانِ معاش دے سکتا ہے۔ اور بغیر کسی سامان کے بھی ضروریات معاش فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ دوسرا خطرہ بھی ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے۔

ہجرت کب فرض یا واجب ہوتی ہے۔ ہجرت کے معنی اور تعریف اور اس کے فضائل و برکات سورۂ نساء کی آیات نمبر ۹۷ تا ۱۰۰ میں اور شرعی احکام میں تبدیلی اسی سورت کی آیت نمبر ۸۹ کے تحت میں معارف القرآن کی جلد دوم صفحہ ۵۲۵ تا ۵۲۹ اور کچھ صفحہ ۵۱۰ میں بیان ہو چکے ہیں، ایک مضمون وہاں بیان کرنے سے رہ گیا تھا وہ یہاں لکھا جاتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بامر الٰہی مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی، اور سب مسلمانوں کو بشرطِ قدرت ہجرت کا حکم فرمایا اس وقت مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا فرضِ عین تھا جس سے کوئی مرد و عورت مستثنیٰ نہیں تھا، بجز ان لوگوں کے جو ہجرت پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔

اور اس زمانے میں ہجرت صرف فرض ہی نہیں، بلکہ مسلمان ہونے کی علامت اور شرط بھی سمجھی جاتی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے، اس کو مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا تھا جو کفار کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا بیان سورۂ نساء کی آیت نمبر ۸۹ میں ہے، حَتّٰی یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اس وقت ہجرت کا مقام اسلام میں وہ تھا جو کلمۂ شہادت لا الٰہ الا اللہ کا ہے، کہ یہ شہادت خود بھی فرض ہے اور مسلمان ہونے کی شرط اور علامت بھی کہ جو شخص باوجود قدرت کے زبان سے ایمان کا اقرار اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت نہ دے اگرچہ دل میں یقین اور تصدیق رکھتا ہو وہ مسلمان نہیں سمجھا جاتا۔ عاجز جس کو اس کلمہ کے بولنے پر قدرت نہ ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کو ہجرت پر قدرت نہ تھی وہ مستثنیٰ سمجھے گئے جس کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۸ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ میں آیا ہے، اور جو لوگ باوجود ہجرت پر قادر ہونے کے مکہ میں مقیم رہے، ان کیلئے جہنم کی سخت وعید آیت نمبر ۹۷ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الیٰ) فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ، میں مذکور ہے۔

جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو ہجرت کا یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت مکہ خود دار الاسلام بن گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حکم جاری فرما دیا: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، یعنی فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت کرنے کی ضرورت

نہیں، مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فرض ہونا پھر منسوخ ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہوگیا، جو ایک واقعہ جزئیہ تھا۔ فقہاء امت نے اس واقعہ سے یہ مسائل مستنبط کئے:۔

مسئلہ: جس شہر یا ملک میں انسان کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو، وہ کفر و شرک یا احکام شرعیہ کی خلاف ورزی پر مجبور ہو وہاں سے ہجرت کرکے کسی دوسرے شہر یا ملک میں جہاں دین پر عمل کی آزادی ہو چلا جانا بشرطیکہ قدرت ہو واجب ہے، البتہ جس کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسّر نہ ہو جہاں آزادی سے دین پر عمل کرسکے وہ شرعاً معذور ہے۔

مسئلہ: جس دارالکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض و واجب تو نہیں، مگر مستحب بہرحال ہے اور اس میں دارالکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دارالفسق جہاں احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی اعلاناً ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ وہاں کے حکمران کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس کو دارالاسلام کہا جاتا ہو۔

یہ تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تحریر فرمائی ہے اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں۔ اور مسند احمد کی ایک روایت جو حضرت ابو یحییٰ مولیٰ زبیر ابن عوامؓ سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْبِلَادُ بِلَادُ اللّٰهِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰهِ حَيْثُمَا اَصَبْتَ خَيْرًا فَاَقِمْ (ابن کثیر)	"یعنی سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو"۔

اور ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جس شہر میں معاصی اور فواحش عام ہوں اس کو چھوڑ دو۔ اور امام تفسیر حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ جب تمہیں کسی شہر میں معاصی کے لئے مجبور کیا جائے تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہو۔ (ابن جریر طبری فی التفسیر)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ

اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے اور پچھلا گھر جو

الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی
بس سو وہی ہے زندہ رہنا اگر ان کو سمجھ ہوتی ، پھر جب سوار ہوئے

الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ
کشتی میں پکارنے لگے اللہ کو خالص اسی پر رکھ کر اعتقاد پھر جب بچا لایا ان کو

اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۚۙ
زمین کی طرف اسی وقت لگے شریک بنانے ، تاکہ مکرتے رہیں ہمارے دیئے ہوئے سے

وَ لِیَتَمَتَّعُوْا ۥ وقفہ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا
اور مزے اڑاتے رہیں ، سو عنقریب جان لیں گے ، کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رکھ دی ہے

حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ
پناہ کی جگہ امن کی ، اور لوگ اُچکے جاتے ہیں ان کے آس پاس سے کیا جھوٹ پر یقین

یُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
رکھتے ہیں اور اللہ کا احسان نہیں مانتے ، اور اس سے زیادہ بے انصاف کون

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیْسَ
جو باندھے اللہ پر جھوٹ یا جھٹلائے سچی بات کو جب اس تک پہنچے ، کیا دوزخ

فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۸﴾ وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا
میں بسنے کی جگہ نہیں منکروں کے لئے ، اور جنھوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم

لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۶۹﴾
سمجھادیں گے ان کو اپنی راہیں ، اور بیشک اللہ ساتھ ہے نیکی والوں کے ۔

خُلاصۂ تفسیر

اور (وجہ ان کے غور نہ کرنے کی انہماک ہے مشاغل دنیا میں حالانکہ) یہ دنیوی زندگی (جس کے یہ تمام تر اشتغال ہیں فی نفسہٖ) بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت (کی) ہے (چنانچہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے

سے یہ دونوں مضمون ظاہر ہیں پس فانی میں اس قدر انہماک کہ باقی کو بھول ہی میں ڈال کر اس سے محروم ہو جاوے خود یہ بے عقلی کی بات ہے) اگر ان کو اس کا (کافی) علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں منہمک ہو کر باقی کو بھلا دیتے اور اس کے لئے سامان نہ کرتے بلکہ یہ لوگ دلائل میں غور کرتے ... اور ایمان لے آتے جیسا کہ خود ان کو یہ تسلیم ہے کہ تخلیقِ کائنات اور اس کے باقی رکھنے میں خدا کا کوئی شریک نہیں) پھر (جیسا کہ ان کے اس اقرار و تسلیم کا مقتضی ہے کہ خدائی اور عبادت میں اسی کو منفرد مانتے اور اس کا بھی کبھی اظہار و اقرار کرتے چنانچہ) جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور وہ کشتی زیر و زبر ہونے لگتی ہے) تو (اس وقت) خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ای الموحدین جس میں خدائی اختیارات اور معبودیت میں بھی توحید کا اقرار ہے، مگر یہ حالت بوجہ انہماک فی الدنیا کے دیرپا نہیں ہوتی، چنانچہ اس وقت تو سب قول و اقرار توحید کے ہو چکے ہیں مگر) پھر جب ان کو (اس آفت سے) نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو نعمت (نجات وغیرہ) ان کو دی ہے اس کی ناقدری کرتے ہیں اور یہ لوگ (عقائد شرکیہ و اعمالِ فسقیہ میں ہوائے نفسانی کا اتباع کر کے) چندے اور حظ حاصل کر لیں پھر قریب ہی ان کو سب خبر ہوئی جاتی ہے، (اور اب اس انہماک فی الدنیا کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا، سو ایک مانع تو ان کو توحید سے یہ انہماک ہے اور دوسرا ایک اور نامعقول حیلۂ مانعہ نکالا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یعنی اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہمیں عرب کے لوگ مار دیں گے۔ حالانکہ مشاہدہ سے ان کو خود لغویت اس کی معلوم ہو سکتی ہے) کیا ان لوگوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم نے (ان کے شہر مکہ کو) امن والا حرم بنایا ہے اور ان کے گرد و پیش (کے مقامات) میں (جو خارج حرم ہیں) لوگوں کو (مار دھاڑ کر ان کے گھروں سے) نکالا جا رہا ہے (بخلاف ان کے کہ امن سے بیٹھے ہیں اور یہ بات خود محسوسات میں سے تو بدیہیات سے گذر کر محسوسات میں بھی خلاف کرتے اور خوفِ ہلاکت کو ایمان لانے میں عذر مانع بناتے ہیں اور) پھر (وضوحِ حق کے بعد اس حماقت اور ضد کا کیا ٹھکانا ہے کہ) یہ لوگ جھوٹے معبود (وں) پر تو ایمان لاتے ہیں (جن پر ایمان لانے کا کوئی مقتضی نہیں اور موانع بہت سے ہیں) اور اللہ (جن پر ایمان لانے کے بہت سے مقتضی اور دلائل صحیحہ ہیں اس کی) نعمتوں کی ناشکری (یعنی اللہ کے ساتھ شرک) کرتے ہیں (کیونکہ شرک سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں کہ نعمتِ تخلیق و ترزیق و ابقاء و تدبیر وغیرہ تو وہ عطا فرماوے اور عبادت

جو کہ ان نعمتوں کا شکر ہے دوسرے کے لئے تجویز کی جاوے) اور (واقعی بات یہ ہے کہ) اس شخص سے زیادہ کون نا انصاف ہوگا جو (بلا دلیل) اللہ پر جھوٹ افترا کرے (کہ وہ شریک رکھتا ہے) اور جب سچی بات اس کے پاس (دلیل کے ساتھ) پہنچے وہ اس کو جھٹلا دے (بے انصافی ظاہر ہے کہ بلا دلیل بات کی تو تصدیق کرے اور دلیل والی بات کی تکذیب) کیا ایسے کافروں کا (جو اس قدر نا انصافی کریں) جہنم میں ٹھکانا نہ ہوگا (یعنی ضرور ہے۔ کیونکہ سزا مناسب جرم کے ہوتی ہے۔ پس جیسا جرم عظیم ہے ایسی ہی سزا بھی عظیم ہے۔ اوپر انکا حال تھا جو اہل کفر اور نفس پرست ہوں) اور (اب انکے اضداد کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے (قرب و ثواب یعنی جنت) کے راستے ضرور دکھاویں گے (جس سے وہ جنت میں جا پہنچیں گے کقولہ تعالیٰ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ہَدٰنَا الآیۃ) اور بیشک اللہ تعالیٰ (کی رضا و رحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کا یہ حال مذکور ہوا ہے کہ آسمان و زمین کی پیدائش، شمس و قمر کا نظام، بارش نازل کرنے اور اس سے نباتات اُگانے کا سارا نظام یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہونے پر یقین رکھتے ہیں اسمیں کسی بُت وغیرہ کی شرکت نہیں مانتے، مگر پھر بھی وہ خدائی میں بتوں کو شریک ٹھہراتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (یعنی انمیں بکثرت لوگ وہ ہیں جو سمجھتے نہیں)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ مجنون دیوانے تو نہیں ہوشیار سمجھدار ہیں، دنیا کے بڑے بڑے کام خوب کرتے ہیں پھر ان کے بے سمجھ ہو جانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں یہ دیا گیا کہ ان کو دنیا اور اس کی مادّی اور فانی لذات و خواہشات کی محبت نے آخرت اور انجام میں غور و فکر کرنے سے اندھا اور بے سمجھ بنا دیا ہے، حالانکہ یہ دنیا کی زندگی لہو و لعب یعنی وقت گزاری کا مشغلہ اور کھیل کے سوا کچھ نہیں، اور اصلی زندگی جو جاودانی ہے وہ آخرت کی زندگی ہے۔ وَمَا ہٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ وَّ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ، اس جگہ حیوان کا لفظ بمعنی حیات مصدری معنی میں ہے۔ (قرطبی)

اس میں حیاتِ دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے کھیلوں کا کوئی ثبات و قرار نہیں اور کوئی بڑا مقصد ان سے حل نہیں ہوتا، تھوڑی دیر کے بعد سب تماشہ ختم ہو جاتا ہے یہی حال اس دنیا کا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مشرکین کا ایک اور برا حال یہ بتلایا گیا کہ جیسے یہ لوگ تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کو منفرد ماننے کے باوجود اس جہالت کے شکار ہیں کہ بتوں کو خدائی کا ساجھی بتاتے ہیں۔ اس سے زیادہ عجب یہ ہے کہ جب ان پر کوئی بڑی مصیبت

آپڑتی ہو تو اس مصیبت کے وقت بھی ان کو یہ یقین اور اقرار ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بت ہمارا مددگار نہیں بن سکتا۔ مصیبت سے رہائی صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ اس کے لئے بطور مثال کے فرمایا کہ یہ لوگ جب دریا کے سفر میں ہوتے ہیں اور ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے، تو اس خطرہ کو ٹالنے کے لئے کسی بت کو پکارنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کے مضطر اور بیقرار ہونے اور وقتی طور پر دنیا کے سارے سہاروں سے منقطع ہونے کی بناء پر ان کی دعاء قبول کر کے ان کو دنیا کے مہلکہ سے نجات دے دیتا ہے۔ مگر یہ ظالم جب خشکی پر پہونچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں تو پھر بتوں کو خدا کا شریک کہنے لگتے ہیں۔ آیت فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر بھی جس وقت اپنے آپ کو بے سہارا جان کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اور اس وقت یہ یقین کرتا ہے کہ خدا کے سوا مجھے اس مصیبت سے کوئی نہیں چھڑا سکتا، تو اللہ تعالیٰ کافر کی بھی دعاء قبول فرمالیتے ہیں۔ کیونکہ وہ مضطر ہے اور اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دعاء قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے (قرطبی وغیرہ)

اور ایک آیت میں جو یہ ارشاد آیا ہے وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی کافروں کی دُعاء نا قابلِ قبول ہے، یہ حال آخرت کا ہے، کہ وہاں کافر عذاب سے رہائی کی دعاء کریں گے تو قبول نہ ہوگی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا الآیۃ اوپر کی آیات میں مشرکینِ مکہ کی جاہلانہ حرکتوں کا ذکر تھا کہ سب چیزوں کا خالق و مالک خدا تعالیٰ کو یقین کرنے کے باوجود پتھر کے خود تراشیدہ بتوں کو اس کی خدائی کا شریک بناتے ہیں، اور صرف تخلیقِ کائنات ہی کا خدا تعالیٰ کو مالک نہیں سمجھتے بلکہ آڑے وقت میں مصیبت سے نجات دینا بھی اسی کے اختیار میں جانتے ہیں مگر نجات کے بعد پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے کفر و شرک کا ایک عذر بعض مشرکینِ مکہ کی طرف سے یہ بھی پیش کیا جاتا تھا کہ ہم آپؐ کے دین کو تو حق و درست مانتے ہیں لیکن اس کی پیروی کرنے اور مسلمان ہو جانے میں ہم اپنی جانوں کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ سارا عرب اسلام کے خلاف ہے ہم اگر مسلمان ہوگئے تو باقی عرب ہمیں اُچک لے جائیں گے اور مار ڈالیں گے۔ (کما روی عن ابن عباسؓ، روح)

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یہ عذر بھی لغو ہے۔ کیونکہ اہلِ مکہ کو تو حق تعالیٰ نے بیت اللہ کی وجہ سے وہ شرف اور بزرگی دی ہے جو دنیا میں کسی مقام کے لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ ہم نے مکہ کی پوری زمین کو حرم بنا دیا ہے۔ عرب کے باشندے

مؤمن ہوں یا کافر سب کے سب حرم کا احترام کرتے ہیں۔ اس میں قتل و قتال کو حرام سمجھتے ہیں، حرم میں انسان تو انسان وہاں کے شکار کو قتل کرنا اور وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی کوئی جائز نہیں سمجھتا، باہر کا کوئی آدمی حرم میں داخل ہوجائے تو وہ بھی قتل سے مامون ہوجاتا ہے۔ تو مکہ مکرمہ کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے سے اپنی جانوں کا خطرہ بتلانا بھی ایک عذرِ لنگ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، جہاد کے اصلی معنی دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے ہیں، اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار و فجار کی طرف سے پیش آتی ہیں، کفار سے جنگ و مقاتلہ اس کی اعلیٰ فرد ہے، اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔

جہاد کی ان دونوں قسموں پر اس آیت میں یہ وعدہ ہے کہ ہم جہاد کرنے والوں کو اپنی راستوں کو ہدایت کر دیتے ہیں۔ یعنی جن مواقع میں خیر و شر یا حق و باطل یا نفع و ضرر میں التباس ہوتا ہے عقلمند انسان سوچتا ہے کہ کس راہ کو اختیار کروں، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو صحیح، سیدھی، بے خطر راہ بتا دیتے ہیں۔ یعنی ان کے قلوب کو اسی طرف پھیر دیتے ہیں جس میں ان کے لئے خیر و برکت ہو۔

علم پر عمل کرنے سے علم میں زیادتی

اور حضرت ابوالدرداءؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جو علم لوگوں کو دیا گیا ہے جو لوگ اپنے علم پر عمل کرنے میں جہاد کرتے ہیں ہم ان پر دوسرے علوم بھی منکشف کر دیتے ہیں جو اب تک حاصل نہیں۔ اور فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ جو لوگ طلبِ علم میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے عمل بھی آسان کر دیتے ہیں۔ (مظہری) واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم ؕ

تمت سورۃ العنکبوت

سُوْرَةُ الرُّوْمِ

سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝۲ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ

مغلوب ہوگئے ہیں رومی ، ملتے ہوئے ملک میں اور وہ اس مغلوب

بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝۳ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ

ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے چند برسوں میں ، اللہ کے ہاتھ ہیں

مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۴

سب کام پہلے اور پچھلے اور اس دن خوش ہوں گے مسلمان ،

بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۵

اللہ کی مدد سے مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی زبردست رحم والا ،

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

اللہ کا وعدہ ہو چکا ، خلاف نہ کریگا اللہ اپنا وعدہ لیکن بہت لوگ

لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ

نہیں جانتے ، جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو

وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷

اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے ۔

خلاصۂ تفسیر

الۤمّۤ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) اہلِ روم ایک قریب کے موقع میں (یعنی ارضِ روم کے ایسے مقام میں جو بہ نسبت فارس کے عرب سے قریب تر ہے، مراد اس سے اذرعات و بصرٰی ہے، جو ملکِ شام میں دو شہر ہیں۔ کذا فی القاموس، اور حکومتِ روم کے تحت میں ہونے سے ارضِ روم میں داخل ہیں۔ اس موقع پر اہلِ روم اہلِ فارس کے مقابلہ میں) مغلوب ہوگئے (جس سے مشرکین خوش ہوئے) اور وہ (رومی) اپنے (اس) مغلوب ہونے کے بعد عنقریب (اہلِ فارس پر دوسرے مقابلہ میں) تین سال سے لے کر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے (اور یہ مغلوب اور غالب ہونا سب خدا کی طرف سے ہے، کیونکہ مغلوب ہونے سے) پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا (جس سے مغلوب کر دیا تھا) اور (مغلوب ہونے سے) پیچھے بھی (اللہ ہی کو اختیار ہے جس سے غالب کر دے گا) اور اس روز (یعنی جب اہلِ روم غالب آئیں گے) مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے (اس امداد سے یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے قول میں سچا اور غالب فرما دے گا۔ کیونکہ اس پیشینگوئی کو مسلمانوں نے کفار پر ظاہر کیا اور انھوں نے تکذیب کی تو اس کے وقوع سے مسلمانوں کی جیت ہوجائیگی۔ اور یا یہ مراد ہے کہ مسلمانوں کو مقاتلہ میں بھی غالب کر دے گا۔ چنانچہ وہ وقت جنگِ بدر میں منصور ہونے کا تھا، اور ہر حال میں نصرت کا محل اہلِ اسلام ہی ہیں، اور مسلمانوں کی حالت ظاہری مغلوبیت کی دیکھ کر یہ بات مستبعد نہ سمجھی جائے کہ یہ مغلوب مسلمان مقابلہ کے وقت کفار پر غالب آجائیں گے، کیونکہ نصرت اللہ کے قبضے میں ہے) وہ جس کو چاہے غالب کر دیتا ہے اور وہ زبردست ہے (کفار کو جب چاہے قولاً یا فعلاً مغلوب کرا دے اور) رحیم (بھی) ہے (مسلمانوں کو جب چاہے غالب کر دے) اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا (اس واسطے یہ پیشینگوئی ضرور واقع ہوگی) ولیکن اکثر لوگ (اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو) نہیں جانتے (بلکہ صرف ظاہری اسباب کو دیکھ کر ان اسباب پر حکم لگا دیتے ہیں، اس لئے اس پیشینگوئی میں استبعاد کرتے ہیں حالانکہ مسبّب الاسباب اور مالکِ اسباب حق تعالیٰ ہے، اس کو اسباب بدلنا بھی آسان ہے اور اسباب کے خلاف مسبب کا واقع کرنا بھی آسان۔

اور جس طرح پیشینگوئی کے واقع ہونے سے پہلے اسباب ظاہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اسی طرح پیشین گوئی کو پورا ہوتا ہوا دیکھ کر بھی اس کو ایک اتفاقی

امر قرار دیتے ہیں، وعدۂ الٰہیہ کا ظہور نہیں سمجھتے اس لئے لفظ لَا یَعْلَمُوْنَ میں یہ دونوں چیزیں آگئیں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ اور نبوت سے غافل و جاہل رہنا اس سبب سے ہے کہ) یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لئے ان کو دنیا میں نہ اسباب عذاب سے بچنے کی فکر ہے نہ اسباب نجات ایمان اور عمل صالح کی تلاش ہے)۔

معارف و مسائل

قصہ نزول سورت روم اور فارس کی جنگ

سورۂ عنکبوت اس آیت پر ختم ہوئی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے راستہ میں جہاد و مجاہدہ کرنے والوں کے لئے اپنے راستے کھول دینے اور ان کے لئے مقاصد میں کامیابی کی بشارت دی تھی۔ سورۂ رُوم کی ابتداء جس قصہ سے ہوئی ہے وہ اسی نصرتِ الٰہیہ کا ایک مظہر ہے، اس سورت میں جو واقعہ روم اور فارس کی جنگ کا مذکور ہے یہ دونوں کفار ہی تھے، ان میں سے کسی کی فتح کسی کی شکست بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں، مگر ان دونوں کفار میں اہلِ فارس مشرکین آتش پرست تھے اور روم و نصاریٰ اہلِ کتاب۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے کفار میں اہلِ کتاب مسلمانوں سے نسبتاً قریب ہیں۔ کیونکہ بہت سے اصولِ دین آخرت پر ایمان، رسالت اور وحی پر ایمان، ان کے ساتھ قدر مشترک ہے۔ اسی قدر مشترک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مکتوب میں کام لیا جو روم کے بادشاہ کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجا تھا کہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ الاٰیة، اہلِ کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا ایک گونہ قرب ہی اس کا سبب بنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مکہ مکرمہ کے زمانہ میں فارس نے روم پر حملہ کیا۔ حافظ ابن حجر وغیرہ کے قول کے مطابق ان کی یہ جنگ ملکِ شام کے مقام اذرعات اور بصریٰ کے درمیان واقع ہوئی۔ اس جنگ کے دوران میں مشرکینِ مکہ یہ چاہتے تھے کہ فارس غالب آجائے، کیونکہ وہ بھی شرک و بت پرستی میں ان کے شریک تھے۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ روم غالب آئیں، کیونکہ وہ دین و مذہب کے اعتبار سے اسلام کے قریب تھے۔ مگر ہوا یہ کہ اس وقت فارس روم پر غالب آگئے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ بھی فتح کرلیا، اور وہاں اپنی عبادت کے لئے ایک آتشکدہ تعمیر کیا۔ اور یہ فتح کسریٰ پرویز کی آخری فتح تھی، اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوا، اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا (از قرطبی)

اس واقعہ پر مشرکین مکہ نے خوشیاں منائیں اور مسلمانوں کو عار دلائی کہ تم جس کو چاہتے تھے وہ ہار گیا، اور جیسا کہ روم اہل کتاب کو بمقابلہ فارس شکست ہوئی ہمارے مقابلہ میں تم کو شکست ہوگی۔ اس سے مسلمانوں کو رنج ہوا (ابن جریر، ابن ابی حاتم)

قرآن میں سورۂ روم کی ابتدائی آیتیں اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جن میں یہ پیشین گوئی اور بشارت دی گئی ہے کہ چند سال بعد پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یہ آیات سنیں تو مکہ کے اطراف اور مشرکین کے مجامع اور بازار میں جا کر اس کا اعلان کیا کہ تمہارے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ چند سال میں پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے، مشرکین مکہ میں سے اُبَی بن خلف نے مقابلہ کیا، اور کہنے لگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، ایسا نہیں ہوسکتا۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ خدا کے دشمن تو ہی جھوٹا ہے، اور میں تو اس واقعہ پر شرط کرنے کو تیار ہوں کہ اگر تین سال کے اندر روم غالب آگئے تو دس اونٹنیاں میں تمہیں دونگا اور وہ غالب آگئے تو دس اونٹنیاں تمہیں دینا پڑینگی (یہ معاملہ قمار کا تھا مگر اس وقت قمار حرام نہیں تھا) یہ کہہ کر صدیق اکبرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو تین سال کی مدت متعین نہیں کی تھی۔ کیونکہ قرآن میں اس کے لئے لفظ بِضْعِ سِنِيْنَ مذکور ہے، جس کا اطلاق تین سے نو سال تک ہوسکتا ہے، تم جاؤ اور جس سے یہ معاہدہ ہوا ہے اس سے کہدو کہ میں دس اونٹنیوں کے بجائے سَو کی شرط کرتا ہوں، مگر مدت تین سال کے بجائے نو سال اور بعض روایات کی رُو سے سات سال مقرر کرتا ہوں۔ صدیق اکبرؓ نے حکم کی تعمیل کی، اور اُبَی بن خلف اس نئے معاہدہ پر راضی ہوگیا (ابن جریر بسندہ عن مجاہد وروی القصۃ الترمذی عن ابی سعید الخدری و دینار بن مکرم الاسلمی بتغیر یسیر)

روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پانچ سال پہلے پیش آیا اور پورے سات سال ہونے پر غزوۂ بدر کے وقت روم دوبارہ فارس پر غالب آگئے اس وقت اُبَی بن خلف مرچکا تھا۔ صدیق اکبرؓ نے اس کے وارثوں سے اپنی شرط کے مطابق سَو اونٹنیوں کا مطالبہ کیا، انھوں نے اونٹنیاں دے دیں۔

بعض روایات میں ہے کہ ہجرت سے پہلے اُبَی بن خلف کو جب اندیشہ ہوا کہ ابو بکرؓ بھی شاید ہجرت کرکے چلے جائیں تو اس نے کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک آپ کوئی کفیل پیش نہ کریں، کہ میعاد معیّن تک روم غالب نہ آئے تو سَو اونٹنیاں وہ مجھے دیدے گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰن کو اس کا کفیل بنادیا تھا۔

جب شرط کے مطابق صدیق اکبرؓ جیت گئے اور سو اونٹنیاں اُن کو ہاتھ آئیں تو وہ سب لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان اونٹنیوں کو صدقہ کردو۔ اور ابویعلیٰ، ابن عساکر میں حضرت براء بن عازب کی روایت سے اس میں یہ الفاظ منقول ہیں ھٰذَا السُّحْتُ تَصَدَّقْ بِهٖ، یہ تو حرام ہے اس کو صدقہ کردو (روح المعانی)

مسئلہ قمار قمار یعنی جوا از روئے نصوص قرآن حرام قطعی ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد جس وقت شراب حرام کی گئی اسی کے ساتھ قمار بھی حرام کردیا گیا، اور اس کو شیطانی عمل قرار دیا۔ آیت اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ میں میسر اور ازلام جوئے (قمار) ہی کی صورتیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور یہ دوطرفہ لین دین اور ہار جیت کی شرط جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُبی بن خلف کے ساتھ ٹھہرائی یہ بھی ایک قسم کا جوا اور قمار ہی تھا، مگر یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے جب قمار حرام نہیں تھا۔ اس لئے اس واقعہ میں جب یہ قمار کا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو کوئی مال حرام نہیں تھا۔

اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس کے صدقہ کردینے کا حکم کیوں فرمایا، خصوصاً دوسری روایت میں جو اس کے متعلق لفظ سحت آیا ہے جس کے مشہور معنی حرام کے ہیں یہ کیسے درست ہوگا؟ اس کا جواب حضرات فقہاء نے یہ دیا ہے کہ یہ مال اگرچہ اس وقت حلال تھا مگر قمار کے ذریعہ اکتسابِ مال اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ تھا، اس لئے صدیق اکبرؓ کی شان کے مناسب نہ سمجھ کر ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے شراب حلال ہونے کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی۔

اور لفظ سحت جو بعض روایات میں آیا ہے اوّل تو اس روایت کو محدثین نے صحیح تسلیم نہیں کیا، اور اگر صحیح بھی مانا جائے تو یہ لفظ بھی کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے بمعنے حرام مشہور ہے، دوسرے معنی اس کے مکروہ و ناپسندیدہ کے بھی آتے ہیں۔ جیسا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کَسْبُ الْحَجَّامِ سُحْتٌ، یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی سحت ہے۔ یہاں جمہور فقہاء نے اس کے معنی ناپسندیدہ اور مکروہ کے لئے ہیں۔ اور امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں لفظ سحت کے یہ مختلف معانی محاوراتِ عرب اور احادیث نبویہ سے ثابت کئے ہیں۔

حضرات فقہاء کا یہ کلام اس لئے بھی واجب القبول ہے کہ اگر واقع میں یہ مال حرام تھا تو شرعی اصول کے مطابق یہ مال اسی شخص کو واپس کرنا لازم تھا جس سے لیا گیا ہے، مالِ حرام کو صدقہ کرنے کا حکم صرف اُن صورتوں میں ہوتا ہے جبکہ اس کا مالک معلوم نہ ہو یا اس کو پہنچانا مشکل ہو، یا اس کو واپس کرنے میں کوئی اور شرعی قباحت ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ، یعنی اس روز (جبکہ روم فارس پر غالب آئیں گے) مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے۔ نظمِ عبارت کے اعتبار سے ظاہر یہ ہے کہ یہاں نصر اور مدد سے رومیوں کی نصرت و امداد ہے، وہ اگرچہ کافر تھے مگر دوسرے کے مقابل کافروں کے اعتبار سے کفر میں ہلکے تھے، اس لئے ان کی نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا کوئی امر مستبعد نہیں، خصوصاً جبکہ ان کی نصرت سے مسلمانوں کو بھی خوشی حاصل ہو اور کفار کے مقابلہ میں ان کی جیت بھی ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ نصرت سے مراد یہاں مسلمانوں کی نصرت ہو جو دو وجہ سے ہو سکتی ہے، اوّل تو یہی کہ مسلمانوں نے رومیوں کے غلبہ کو قرآن کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا تھا، اس لئے رومیوں کا غلبہ درحقیقت مسلمانوں کی نصرت تھی، دوسری وجہ نصرتِ مسلمین کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں کفار کی بڑی طاقتیں بھی دو فارس اور روم تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو باہم بھِڑا کر دونوں کو کمزور کر دیا، جو آئندہ مسلمانوں کی فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ (کذا فی الروح)

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ یعنی یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ایک پہلو کو تو خوب جانتے ہیں، کہ تجارت کس طرح کریں، کس مال کی کریں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں، اور کھیتی کس طرح کریں، کب بیج ڈالیں کب کاٹیں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں، سامانِ عیش و عشرت کیا کیا مہیا کریں۔ لیکن اسی حیاتِ دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے کہ دنیا کا چند روزہ قیام درحقیقت ایک مسافرانہ قیام ہے، انسان یہاں کا مقامی آدمی (نیشنل) نہیں، بلکہ دوسرے ملک آخرت کا باشندہ ہے، یہاں کچھ مدت کے لئے ویزا پر آیا ہوا ہے، اس کا اصلی کام یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کے لئے یہاں سے سامانِ راحت فراہم کر کے وہاں بھیجے، اور وہ سامانِ راحت ایمان اور عمل صالح ہے، اس دوسرے رُخ سے بڑے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے کہ يَعْلَمُوْنَ کے ساتھ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

فرمایا ہے، جس میں لفظ ظاہراً کو تنوین کے ساتھ نکرہ لاکر قواعد عربیت کی رُو سے اس طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ حیاتِ ظاہر کو بھی پورا نہیں جانتے، اس کے صرف ایک رُخ کو جانتے ہیں دوسرے رُخ سے غافل ہیں اور آخرت سے بالکل ہی غافل و جاہل ہیں۔

دنیا کے فنونِ معاش اگر آخرت سے غفلت کے ساتھ حاصل ہوں تو وہ کوئی دانشمندی نہیں

قرآن کریم اقوامِ دنیا کے عبرتناک قصّوں سے بھرا ہوا ہے، جو مکاسبِ دنیا اور عیش و عشرت کے سامان جمع کرنے میں بڑے نام آور تھے، پھر ان کا انجام بد بھی دنیا ہی میں لوگوں کے سامنے آیا، اور آخرت کا دائمی عذاب ان کا حصّہ بنا، اس لئے ان کو کوئی سمجھدار آدمی عقلاء یا حکماء نہیں کہہ سکتا۔ افسوس ہے کہ آجکل عقل و حکمت کا سارا انحصار اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کرے اور اپنی عیش و عشرت کا سامان سب سے بہتر بنالے وہ سب سے بڑا عقلمند کہلاتا ہے، اگرچہ اخلاقِ انسانیت سے بھی کورا ہو۔ عقل و شرع کی رُو سے اس کو عقلمند کہنا عقل کی توہین ہے، قرآن کریم کی زبان میں عقل والے صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اور آخرت کو پہچانیں، اس کے لئے عمل کریں۔ دنیا کی ضروریات کو بقدرِ ضرورت رکھیں، اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائیں۔ آیتِ قرآن اِنَّ فِیْ ..... لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا الآیۃ کا یہی مفہوم ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ٝ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ

کیا دھیان نہیں کرتے اپنے جی میں کہ اللہ نے جو بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَاِنَّ

اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے سو ٹھیک سادھ کر اور وعدہ مقرر پر اور

کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَکٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا

بہت لوگ اپنے رب کا ملنا نہیں مانتے، کیا انھوں نے سیر نہیں کی

فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

ملک کی جو دیکھیں انجام کیسا ہوا ان سے پہلوں کا،

کَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ

ان سے زیادہ تھے زور میں اور جوتا انھوں نے زمین کو اور بسایا اس کو

أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۖ فَمَا كَانَ
ان کے بسانے سے زیادہ اور پہنچے ان کے پاس رسول ان کے کھلے حکم لے کر سو اللہ نہ
اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝٩ ثُمَّ
تھا ان پر ظلم کرنے والا لیکن وہ اپنا آپ برا کرتے تھے، پھر
كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ
ہوا انجام برا کرنے والوں کا برا اس واسطے کہ جھٹلاتے تھے اللہ کی
اللّٰهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ۝١٠
باتیں اور اُن پر ٹھٹھے کرتے تھے ۔

ع ۲

خلاصۂ تفسیر

کیا (دلائل وقوعِ آخرت کے سن کر بھی ان کی نظر دنیا ہی پر مقصور رہی اور) انھوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے (جیسا اس نے آیات میں خبر دی ہے کہ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت جزاء وسزاء کی ہے۔ اور میعاد معین قیامت ہے۔ اگر اپنے دلوں میں غور کرتے تو ان واقعات کا امکان عقل سے اور ان کا وقوع نقل یعنی قرآن سے اور اس نقل کا صدق صفتِ اعجاز سے منکشف ہو جاتا، اور آخرت کے منکر نہ ہوتے، مگر غور نہ کرنے سے منکر ہو رہے ہیں)۔ اور (یہی کیا اور) بہت سے آدمی اپنے رب کے ملنے کے منکر ہیں کیا یہ لوگ (کبھی گھر سے نہیں نکلے اور) زمین میں چلے پھرے نہیں، جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کا (آخری) انجام کیا ہوا (کیفیت ان کی یہ تھی کہ) وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے اور انھوں نے زمین کو بھی (ان سے زیادہ) بو یا تھا اور جتنا انھوں نے (سامان اور مکان سے) اس کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ انھوں نے اس کو آباد کیا تھا اور ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے (جن کو انھوں نے نہیں مانا اور عذاب سے ہلاک ہوئے جن کی ہلاکت کے آثار ان کے ویران مکانات سے جو طریقِ شام میں ملتے ہیں نمودار ہیں) سو (اس ہلاکت میں) خدا تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ اُن پر

ظلم کرتا وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (کہ انکار پیغمبروں کا کر کے مستحق ہلاکت ہوئے یہ تو ان کی حالت دنیا میں ہوئی اور) پھر (آخرت میں) ایسے لوگوں کا انجام جنھوں نے (ایسا) بُرا کام (یعنی رسل کا انکار) کیا تھا بُرا ہی ہوا (محض) اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو (یعنی احکام و اخبار کو) جھٹلایا تھا اور (تکذیب سے بڑھ کر یہ کہ) ان کی ہنسی اڑاتے تھے (وہ انجام سزائے دوزخ ہے)۔

معارف ومسائل

مذکور الصدر دونوں آیتیں مضمون سابق کا تکملہ اور اس پر بطور شہادت کے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی چند روزہ چمک دمک اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہوگئے کہ اس کارخانہ کی حقیقت اور انجام سے بالکل غافل ہوگئے، اگر یہ خود بھی ذرا اپنے دل میں سوچتے اور غور کرتے تو ان پر یہ راز کائنات منکشف ہوجاتا کہ خالق کائنات نے یہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان کی مخلوقات کو فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا۔ ان کی تخلیق کا کوئی بڑا مقصد اور بڑی حکمت ہے، اور وہ یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں کے ذریعہ ان کے پیدا کرنے والے کو بھی پہچانیں، اور اس کی تلاش میں لگ جائیں کہ وہ کن کاموں سے راضی ہوتا ہے کن سے ناراض، تاکہ اس کی رضاجوئی کا سامان کریں، اور ناراضی کے کاموں سے بچیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں کے کاموں کی کچھ جزاء و سزاء بھی ہونا ضروری ہے، ورنہ نیک و بد کو ایک ہی پلّے میں رکھنا عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے جس میں انسان کو اس کے اچھے یا بُرے عمل کی پوری جزاء ضرور مل ہی جائے، بلکہ یہاں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ آدمی خوش خرّم اور بامراد نظر آتا ہے، اور بُرے کاموں سے پرہیز کرنے والا مصائب اور تنگی کا شکار دیکھا جاتا ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جب یہ سب کارخانہ ختم ہو اور اچھے بُرے اعمال کا حساب ہو، اور ان پر جزاء و سزا مرتب ہو، جس کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ اگر غور و فکر کرتے تو یہی آسمان و زمین اور ان کی مخلوقات اس کی شہادت دے دیتیں کہ یہ چیزیں دائمی نہیں، کچھ مدت کے لئے ہیں، اور ان کے بعد دوسرا عالم آنے والا ہے جو دائمی ہوگا۔ مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت کا یہی حاصل ہے اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ الآیۃ، یہ مضمون تو ایک عقلی استدلال کا ہے۔ اگلی آیت

میں دنیا کی محسوسات و مشاہدات اور تجربات کو اس کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے، اور اہل مکہ کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ اہل مکہ تو ایک ایسی زمین کے باشندے ہیں جہاں نہ زراعت ہے نہ صنعت نہ تجارت کے مواقع اور نہ بلند و بالا حسین تعمیرات، مگر ملکِ شام اور یمن کے سفر ان لوگوں کو اپنے تجارتی مقاصد کے لئے پیش آتے ہیں۔ کیا ان سفروں میں ان لوگوں نے اپنے سے پہلی اقوام دنیا کے انجام کا مشاہدہ نہیں کیا جنکو اللہ تعالیٰ نے زمین میں بڑے بڑے تصرّفات کرنے کا سلیقہ دیا تھا کہ زمین کو کھود کر اس سے پانی نکالنا اور اس سے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرنا اور چھپے ہوئے معادن سے سونا چاندی اور دوسری قسم کی معدنی دھاتیں نکالنا اور ان سے انسانی فوائد کے لئے مختلف قسم کی مصنوعات تیار کرنا ان کا وظیفۂ زندگی تھا اور یہ اپنے زمانے کی متمدن قومیں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر انھوں نے اسی مادی اور فانی عیش و عشرت میں مست ہو کر اللہ کو اور آخرت کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلانے کے لئے اپنے پیغمبر اور کتابیں بھیجیں، مگر انھوں نے کسی کی طرف التفات نہیں کیا، اور بالآخر دنیا میں بھی مبتلائے عذاب ہوئے۔ جس پر ان کی بستیوں کے ویران کھنڈرات اس وقت تک شہادت دے رہے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ غور کرو کہ کیا اس عذاب میں ان پر اللہ کی طرف سے کوئی ظلم ہوا ہے یا انھوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ اسبابِ عذاب جمع کر لئے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

اللہ بناتا ہے پہلی بار پھر اس کو دہرائے گا پھر اُسی کی طرف پھر جاؤ گے،

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ

اور جس دن برپا ہوگی قیامت آس توڑ کر رہ جائیں گے گنہگار، اور نہ ہوں گے

لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

ان کے شریکوں میں کوئی ان کے سفارش کرنے والے اور وہ ہو جائیں گے اپنے شریکوں سے منکر

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

اور جس دن قائم ہوگی قیامت اس دن لوگ ہوں گے قسم قسم، سو جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾

یقین لائے اور کئے بھلے کام سو باغ میں ہوں گے ان کی آؤ بھگت ہوگی،

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ

اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں اور ملنا پچھلے گھر کا

فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ

سو وہ عذاب میں پکڑے آئیں گے، سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام

تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ

کرو اور جب صبح کرو، اور اسی کی خوبی ہے آسمان میں

وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ

اور زمین میں اور پچھلے وقت اور جب دوپہر ہو، نکالتا ہے زندہ کو

مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ

مُردے سے اور نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہو زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

اس کے مرنے کے پیچھے، اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے

ع ۹ / ۵

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ خلق کو اوّل بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی اس کو پیدا کرے گا پھر (پیدا ہونے کے بعد) اس کے پاس (حساب کتاب کے لئے) لائے جاؤ گے اور جس روز قیامت قائم ہوگی (جس میں اعادہ مذکور ہونے والا ہے) اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگ (داد پرس کے وقت) حیرت زدہ رہ جائیں گے (یعنی کوئی معقول بات ان سے نہ بن پڑیگی) اور ان کے (تراشے ہوئے) شریکوں میں سے (جن کو شریکِ عبادت بناتے تھے) ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور (اس وقت خود) یہ لوگ (بھی) اپنے شریکوں میں سے منکر ہو جائینگے (کہ وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز (علاوہ واقعہ مذکورہ کے ایک واقعہ یہ بھی ہوگا کہ مختلف طریقوں کے) سب آدمی جُدا جُدا ہو جائیں گے

یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انھوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو (بہشت کے) باغ میں مسرور ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا، اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے (یہ معنی ہیں جدا جدا ہونے کے، جب ایمان و عمل صالح کی فضیلت تم کو معلوم ہوگئی) سو تم اللہ کی تسبیح (اعتقاداً و قلباً بھی جس میں ایمان آ گیا اور قولاً و لساناً بھی جس میں اقرار و دیگر اذکار آ گئے اور عملاً و ارکاناً بھی جس میں تمام عبادتیں عموماً اور نماز خصوصاً آ گئیں، غرض تم اللہ کی تسبیح ہر وقت) کیا کرو (اور خصوصاً) شام کے وقت اور صبح کے وقت اور (اللہ کی تسبیح کرنے کا جو حکم ہوا ہے تو وہ واقع میں اس کا مستحق بھی ہے، کیونکہ) تمام آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہو (یعنی آسمان میں فرشتے اور زمین میں بعض اختیاراً اور بعض اضطراراً اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ کقولہ تعالیٰ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، پس جب وہ ایسا محمود الصفات کامل الذات ہے تو تم کو بھی ضرور اس کی تسبیح کرنی چاہئے) اور بعد زوال (بھی تسبیح کیا کرو) اور ظہر کے وقت (بھی تسبیح کیا کرو کہ یہ اوقات تجددِ نعمت و زیادت ظہور آثار قدرت کے ہیں ان میں تجدید تسبیح کی مناسب ہی بالخصوص نماز کے لئے یہی اوقات مقرر ہیں، چنانچہ مَسا میں مغرب و عشاء آ گئی اور عشیّ میں ظہر اور عصر دونوں داخل تھے، مگر ظہر صراحۃً مذکور ہے، اس لئے صرف عصر مراد رہ گئی، اور صبح بھی تصریحاً مذکور ہے، اور اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، کیونکہ اس کی ایسی قدرت ہی کہ) وہ جاندار کو بے جان سے باہر لاتا ہے اور بے جان کو جاندار سے باہر لاتا ہے (مثلاً نطفہ اور بیضہ سے انسان اور بچہ اور انسان اور پرندہ سے نطفہ اور بیضہ) اور زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد زندہ (یعنی تازہ و شاداب) کرتا ہے اور اسی طرح تم لوگ (قیامت کے روز) قبروں سے نکالے جاؤ گے۔

معارف و مسائل

فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ، يُحْبَرُوْنَ، حبور سے مشتق ہے، جس کے معنی سرور اور خوشی کے ہیں۔ اور اس لفظ کے عموم میں ہر طرح کا سرور داخل ہے جو نعماءِ جنت سے اہلِ جنت کو حاصل ہوگا۔ قرآن کریم میں اس کو یہاں بھی عام رکھا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ یہ ارشاد ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ، یعنی کسی شخص کو دنیا میں معلوم نہیں کہ اس کے لئے جنت میں آنکھوں کی ٹھنڈک (اور راحت و سرور)

کے کیا کیا سامان جمع ہیں۔ بعض مفسرین نے جو خاص خاص سرور کی چیزوں کو اس آیت کے تحت میں ذکر کیا ہے وہ سب اسی اجمال میں داخل ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ، لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ مصدر ہے، اس کا فعل محذوف ہے یعنی سَبِّحُوا اللّٰهَ سُبْحَانًا، حِیْنَ تُمْسُوْنَ، یعنی جب تم شام کے وقت میں داخل ہو، اور وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ، یعنی جب تم پر صبح کا وقت آئے، وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ جملہ درمیان میں بطور دلیل کے لایا گیا ہے کہ صبح شام اللہ کی تسبیح اس لئے ضروری ہے کہ آسمان و زمین میں صرف وہی مستحق حمد ہے اور تمام آسمان و زمین والے اس کی حمد کرنے میں مشغول ہیں۔ اور جس طرح شروع آیت میں صبح شام کی تسبیح کا حکم ہے، آخر آیت میں عَشِیًّا اور حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ سے اور دو وقتوں میں تسبیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک وقت عَشِیّ جو دن کے آخری حصہ کو کہا جاتا ہے، جو عصر کا وقت ہے۔ دوسرا وقت ظہر یعنی بعد زوالِ آفتاب کے۔

اور ترتیب بیان میں جس طرح شام کو صبح سے مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، اسی طرح دن کے آخری حصہ کو ظہر پر مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، شام یعنی رات کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ میں رات مقدم ہوتی ہے، اور تاریخ غروبِ آفتاب سے بدلتی ہے۔ اور عشی یعنی وقتِ عصر کو ظہر سے مقدم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عصر کا وقت عموماً کاروبار کی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے، اس میں کوئی دعاء، تسبیح یا نماز عادۃً مشکل ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں صلوٰۃ وُسطیٰ جس کی تفسیر جمہور کے نزدیک نماز عصر ہے، اس کی خصوصی تاکید آئی ہے۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی۔

آیت مذکورہ کے الفاظ میں نماز یا صلوٰۃ کی تصریح نہیں۔ اس لئے ہر قسم کے ذکر اللہ قولی اور عملی کو شامل ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں چونکہ نماز سب سے اعلیٰ اور افضل ہے، اس لئے وہ اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا مع ان کے اوقات کے ذکر آ گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر صریح ہے؟ تو فرمایا ہاں! اور استدلال میں یہی آیت پیش کر کے فرمایا کہ حِیْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب اور حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ میں نماز فجر اور عَشِیًّا میں نماز عصر اور

حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ میں نمازِ ظہر کا ذکر صریح موجود ہے۔ اب صرف ایک نمازِ عشار رہی، اس کے ثبوت میں دوسری آیت کا جملہ ارشاد فرمایا مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب و عشار دونوں داخل ہیں۔

فائدہ عظیمہ یہ آیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعار ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم نے ان کو وفارِ عہد کا خطاب دیا ہے، ارشاد فرمایا وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰىٓ، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کلمات صبح شام پڑھا کرتے تھے۔ جیسا کہ اسانید صحیحہ کے ساتھ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف وفارِ عہد سے کرنے کا سبب اُن کی یہ دُعار تھی۔

اور ابو داؤد، طبرانی، ابن سنی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ، يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ، ان دو آیتوں کے متعلق فرمایا کہ جس شخص نے صبح کو یہ کلمات پڑھ لئے تو دن بھر میں اس کے عمل میں جو کوتاہی ہوگی وہ ان کلمات کی برکت سے پوری کر دی جائے گی، اور جس نے شام کے وقت یہ کلمات پڑھ لئے تو اس کے رات کے اعمال کی کوتاہی اس کے ذریعے پوری کر دی جائے گی۔ (روح)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے پھر اب تم انسان ہو

تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

زمین میں پھیلے پڑے، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے

اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ

جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ

اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ
آسمان اور زمین کا بنانا اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ ،

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ
اس میں بہت نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کو ، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا

بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
سونا رات اور دن میں اور تلاش کرنا اس کے فضل سے اس میں بہت

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ
پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں ، اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ دکھلاتا ہے تم کو بجلی

خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ
ڈرا اور امید کے لئے اور اُتارتا ہے آسمان سے پانی پھر زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ
مرگئے پیچھے اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو سوچتے ہیں ، اور اس کی

اٰیٰتِهٖ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ
نشانیوں سے یہ ہے کہ کھڑا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے پھر جب پکارے گا تم کو

دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ
ایک بار زمین میں سے اسی وقت تم نکل پڑو گے ، اور اسی کا ہے جو

فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِیْ
کوئی ہے آسمان اور زمین میں سب اس کے حکم کے تابع ہیں ، اور وہی ہے جو

یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ
پہلی بار بناتا ہے پھر اس کو دُہرائے گا اور وہ آسان ہے اس پر اور اس کی شان

الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾ ع
سب سے اوپر ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا ۔

ع ۳ ، ۸ ، ۲۱

خلاصۂ تفسیر

اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (امر) ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا دیا تو اس طرح کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے جو مشتمل تھے تمام ذریت پر اور یا اس طرح کہ نطفہ کی اصل غذا ہے اور اس کی اصل عناصر ہیں جس میں جزو غالب مٹی ہے) پھر تھوڑے ہی روز بعد (کیا ہوا کہ) تم آدمی بن کر (زمین پر) پھیلے ہوئے پھرتے (نظر آتے) ہو اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ اس نے تمہارے (فائدے کے) واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں (اور وہ فائدہ یہ ہے کہ) تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بی بی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں (کیونکہ استدلال کے لئے فکر کی ضرورت ہے اور نشانیاں جمع اس لئے فرمایا کہ امر مذکور کئی امر پر مشتمل ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب ولہجہ اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا ہے، (لب ولہجہ سے مراد یا لغات ہوں یا آواز وطرز گفتگو) اس (امر مذکور) میں (بھی) دانشمندوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں (یہاں بھی صیغۂ جمع لانے کی وہی توجیہہ مذکور ہو سکتی ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں (گو رات کو زیادہ اور دن کو کم ہو) اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے (دن کو زیادہ اور رات کو کم، اسی لئے دوسری آیات میں نیند کو رات کے ساتھ اور تلاشِ معاش کو دن کے ساتھ خاص کر کے بیان کیا گیا ہے) اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو (دلیل کو توجہ سے) سنتے ہیں اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ وہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہو جانے کے بعد زندہ (یعنی تروتازہ) کر دیتا ہے اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو عقل (نافع رکھتے ہیں) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم (یعنی ارادہ) سے قائم ہیں (اس میں بیان ہے کہ ان کے ابقاء کا، اور اوپر خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ذکر تھا ان کی ابتداءِ آفرینش کا اور یہ تمام نظامِ عالم جو مذکور ہوا، یعنی تمہارا سلسلہ توالد وتناسل کا جاری ہونا اور

باہم ازدواج ہونا اور آسمان و زمین کا بہیئت کذائیہ موجود و قائم ہونا اور زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف اور لیل و نہار کے انقلاب میں خاص مصلحتوں کا ہونا اور بارش کا نزول اور اس کے مبادی و آثار کا ظہور وہ سب اسی وقت تک باقی ہیں جب تک دنیا کو باقی رکھنا مقصود ہے اور ایک روز یہ سب ختم ہو جائے گا) پھر (اس وقت یہ ہوگا کہ) جب تم کو پکار کر زمین میں سے بلاوے گا تو تم یکبارگی نکل پڑو گے (اور دوسرا انتظام شروع ہو جائے گا جو مقصود مقام ہے) اور (اوپر دلائلِ قدرت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ) جتنے (فرشتے اور انسان وغیرہ) آسمان اور زمین میں موجود ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں (اور) سب اسی کے تابع (یعنی مسخر قدرت) ہیں اور (اس ثبوت و اختصاص قدرت کاملہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ) وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے (چنانچہ یہ مخاطبین کے نزدیک بھی مسلّم تھا) پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا (جیسا کہ دلائل مذکورہ کے ساتھ خبر صادق کے مل جانے سے معلوم ہوا) اور یہ (دوبارہ پیدا کرنا) اس کے نزدیک (باعتبار مخاطبین کے بادی النظر کے بہ نسبت اوّل بار پیدا کرنے کے) زیادہ آسان ہے (جیسا قدرت بشریہ کے اعتبار سے عادت غالبہ یہی ہے کہ کسی چیز کو پہلی بار کے بنانے سے دوسری بار بنانا سہل تر ہوتا ہے) اور آسمان اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے (یعنی نہ آسمانوں میں کوئی ایسا بڑا ہے اور نہ زمین میں کقولہ تعالیٰ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) اور وہ (بڑا) زبردست (یعنی قادرِ مطلق اور) حکمت والا ہے (چنانچہ اوپر کے تصرفات سے قدرت اور حکمت دونوں ظاہر ہیں، پس وہ اپنی قدرت سے اعادہ کرے گا، اور اس اعادہ تخلیق میں جتنا توقف ہو رہا ہے اس میں حکمت و مصلحت ہے، پس قدرت و حکمت کے ثبوت کے بعد فی الحال واقع نہ ہونے سے انکار کرنا جہل ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ روم کے شروع میں روم و فارس کی جنگ کا ایک واقعہ سنانے کے بعد منکرین اور کفار کی گمراہی اور حق بات کے سننے سمجھنے سے بے پروائی کا سبب ان کا صرف دنیا کی فانی زندگی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لینا اور آخرت کی طرف کوئی توجہ نہ دینا قرار دیا گیا تھا، اس کے بعد قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حساب کتاب اور جزاء و سزا کے واقع ہونے پر جو سطحی نظر والوں کو استبعاد ہو سکتا ہے، اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا گیا ہے، پہلے خود اپنے نفس میں غور و فکر کی پھر گرد و پیش میں گذرنے والی اقوام

کے حالات اور ان کے انجام میں نظر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پھر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ مطلقہ کا ذکر فرمایا جس میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں، ان سب شواہد و دلائل کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستحق عبادت صرف اس کی یکتا ذات کو قرار دیا جائے۔ اور اس نے جو اپنے انبیاء کے ذریعہ قیامت قائم ہونے اور تمام اوّلین و آخرین کے دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کے بعد جنت یا دوزخ میں جانے کی خبر دی ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ مذکور الصدر آیات میں اسی قدرت کاملہ اور اس کے ساتھ حکمت بالغہ کے چھ مظاہر آیاتِ قدرت کے عنوان سے بیان فرمائے گئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں۔

پہلی آیتِ قدرت: انسان جیسے اشرف المخلوقات اور حاکم کائنات کو مٹی سے پیدا کرنا ہے جو اس دنیا کے عناصر ترکیبیہ میں سب سے زیادہ ادنیٰ درجہ کا عنصر ہے جس میں حس و حرکت اور شعور و ادراک کا کوئی شمہ نظر نہیں آتا، کیونکہ مشہور چار عناصر آگ، پانی، ہوا، اور مٹی، میں سے مٹی کے سوا اور سب عناصر میں کچھ نہ کچھ حرکت تو ہے مٹی اس سے بھی محروم ہے، قدرت نے تخلیق انسانی کے لئے اس کو منتخب فرمایا۔ ابلیس کی گمراہی کا سبب یہی بنا کہ اس نے آگ کے عنصر کو مٹی سے اشرف و اعلیٰ سمجھ کر تکبر اختیار کیا، اور یہ نہ سمجھا کہ شرافت اور بزرگی خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے بڑا بنا سکتا ہے۔

اور انسان کی تخلیق کا مادّہ مٹی ہونا حضرت آدم علیہ السلام کے اعتبار سے ظاہر ہی ہے۔ اور وہ چونکہ تمام بنی آدم کے وجود کی اصل بنیاد ہیں اس لئے دوسرے انسانوں کی تخلیق بالواسطہ اُن ہی کی طرف منسوب کرنا کچھ بعید نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام انسان جو توالد و تناسل کے سلسلہ سے نطفہ کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی نطفہ جن اجزاء سے مرکب ہوتا ہے ان میں مٹی کا جز و غالب ہے۔

دوسری آیتِ قدرت: یہ ہے کہ انسان ہی کی جنس میں اللہ تعالیٰ نے عورتیں پیدا کر دیں جو مردوں کی بیبیاں بنیں، ایک ہی مادہ سے ایک ہی جگہ میں ایک ہی غذا سے پیدا ہونے والے بچوں میں یہ دو مختلف قسمیں پیدا فرما دیں جن کے اعضاء و جوارح، صورت و سیرت، عادات و اخلاق میں نمایاں تفاوت و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت و حکمت کے لئے یہ تخلیق ہی کافی نشانی ہے۔ اس کے بعد عورتوں کی اس خاص نوع کی تخلیق کی حکمت و مصلحت یہ بیان فرمائی لِتَسْكُنُوٓا اِلَيْهَا، یعنی ان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تمہیں ان کے پاس پہونچ کر سکون ملے۔ مرد کی جتنی ضروریات عورت سے متعلق ہیں ان سب میں غور کیجئے تو سب کا حاصل سکونِ قلب اور راحت و

اطمینان نکلے گا، قرآن کریم نے ایک لفظ میں ان سب کو جمع فرما دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ازدواجی زندگی کے تمام کاروبار کا خلاصہ سکون و راحتِ قلب ہی، جس گھر میں یہ موجود ہے وہ اپنی تخلیق کے مقصد میں کامیاب ہی، جہاں قلبی سکون نہ ہو اور جا ہے سب کچھ ہو وہ ازدواجی زندگی کے لحاظ سے ناکام و نامراد ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ باہمی سکونِ قلب صرف اسی صورت سے ممکن ہی کہ مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد شرعی نکاح اور ازدواج پر ہو، جن ممالک اور جن لوگوں نے اس کے خلاف کی حرام صورتوں کو رواج دیا اگر تفتیش کی جائے تو ان کی زندگی کو کہیں پر سکون نہ پائیں گے، جانوروں کی طرح وقتی خواہش پوری کر لینے کا نام سکون نہیں ہو سکتا۔

ازدواجی زندگی کا مقصد سکون ہی جس کے لئے باہمی الفت و محبت اور رحمت ضروری ہے

اس آیت نے مرد و عورت کی ازدواجی زندگی کا مقصد سکونِ قلب قرار دیا ہے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ طرفین ایک دوسرے کا حق پہچانیں اور ادا کریں، ورنہ حق طلبی کے جھگڑے خانگی سکون کو برباد کر دیں گے۔ اس ادائے حقوق کے لئے ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کے قوانین بنا دینے اور احکام نافذ کر دینے پر اکتفاء کیا جاتا، جیسے دوسرے لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں ایسا ہی کیا گیا ہے، کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کو حرام کر کے اس پر سخت وعیدیں سنائی گئیں سزائیں مقرر کی گئیں، ایثار و ہمدردی کی نصیحت کی گئی۔ لیکن تجربہ شاہد ہی کہ صرف قانون کے ذریعہ کوئی قوم اعتدال پر نہیں لائی جا سکتی جب تک اس کے ساتھ خدا کا خوف نہ ہو، اسی لئے معاشرتی معاملات میں احکامِ شرعیہ کے ساتھ ساتھ پورے قرآن میں ہر جگہ اِتَّقُوا اللّٰهَ ، وَاخْشَوْا وغیرہ کے کلمات بطور تکملہ کے لائے گئے ہیں۔

مرد و عورت کے باہمی معاملات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے حقوق باہمی پورے ادا کرانے پر نہ کوئی قانون حاوی ہو سکتا ہے نہ کوئی عدالت ان کا پورا انصاف کر سکتی ہی۔ اسی لئے خطبۂ نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی وہ آیات انتخاب فرمائی ہیں جن میں تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت کی تلقین ہے کہ وہی درحقیقت زوجین کے باہمی حقوق کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اس پر ایک مزید انعام حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ازدواجی حقوق کو صرف شرعی اور قانونی نہیں رکھا بلکہ طبعی اور نفسانی بنا دیا۔ جس طرح ماں باپ اور اولاد کے باہمی حقوق کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، کہ ان کے قلوب میں فطرۃً ایک ایسی محبت پیدا فرما دی کہ ماں باپ اپنی جان سے زیادہ اولاد کی حفاظت کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی

طرح اولاد کے قلوب میں بھی ایک فطری محبت ماں باپ کی رکھ دی گئی ہے۔ یہی معاملہ زوجین کے متعلق بھی فرمایا گیا۔ اس کے لئے ارشاد فرمایا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، یعنی اللہ تعالیٰ نے زوجین کے درمیان صرف شرعی اور قانونی تعلق نہیں رکھا بلکہ ان کے دلوں میں مودّت اور رحمت پیوست کر دی۔ وُدّ اور مَوَدَّت کے لفظی معنی چاہنے کے ہیں، جس کا ثمرہ محبت و الفت ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو لفظ اختیار فرمائے، ایک مودّت، دوسرے رحمت۔ ممکن ہے اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ مودّت کا تعلق جوانی کے اس زمانے سے ہو جس میں طرفین کی خواہشات ایک دوسرے سے محبت و الفت پر مجبور کرتی ہیں، اور بڑھاپے میں جب یہ جذبات ختم ہو جاتے ہیں تو باہمی رحمت و ترحم طبعی ہو جاتا ہے۔ (کما ذکرہ القرطبی عن البعض)

اس کے بعد فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں، یہاں ذکر تو ایک نشانی کا کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں اس کو آیات اور نشانیاں فرمایا، وجہ یہ ہے کہ ازدواجی تعلق جس کا ذکر اس میں کیا گیا اس کے مختلف پہلوؤں پر اور ان سے حاصل ہونے والے دینی اور دنیوی فوائد پر نظر کی جائے تو یہ ایک نہیں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تیسری آیت قدرت: آسمان و زمین کی تخلیق اور انسانوں کے مختلف طبقات کی زبانیں اور لب و لہجہ کا مختلف ہونا اور مختلف طبقات کے رنگوں میں امتیاز ہونا ہے، کہ بعض سفید ہیں بعض سیاہ بعض سرخ بعض زرد۔ اس میں آسمان و زمین کی تخلیق تو قدرت کا عظیم شاہکار ہے ہی، انسانوں کی زبانیں مختلف ہونا بھی ایک عجیب کرشمۂ قدرت ہے۔ زبانوں کے اختلاف میں لغات کا اختلاف بھی داخل ہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ کتنی مختلف زبانیں ہیں، جو مختلف خطوں میں رائج ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بعض تو ایسی مختلف ہیں کہ کوئی باہمی ربط و مناسبت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اور اس اختلافِ السنہ میں لب و لہجہ کا اختلاف بھی شامل ہے کہ قدرتِ حق نے ہر فرد انسان مرد، عورت، بچے، بوڑھے کی آواز میں ایسا امتیاز پیدا فرمایا ہے کہ ایک فرد کی آواز کسی دوسرے فرد سے ایک صنف کی آواز دوسری صنف سے پوری طرح نہیں ملتی، کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رہتا ہے۔ حالانکہ اس آواز کے آلات زبان، ہونٹ، تالو، حلق، سب میں مشترک اور یکساں ہیں۔ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی طرح الوان کا اختلاف ہے۔ کہ ایک ہی ماں باپ سے ایک ہی قسم کے

حالات میں دو بچے مختلف رنگ کے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو تخلیق و صنعت گری کا کمال تھا، آگے زبانیں اور لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے رنگ مختلف ہونے میں کیا کیا حکمتیں مستور ہیں، ان کا بیان طویل ہے۔ اور بہت سی حکمتوں کا معمولی غور و فکر سے سمجھ لینا مشکل بھی نہیں۔

اس آیتِ قدرت میں متعدد چیزیں آسمان، زمین، اختلافِ السنہ، اختلافِ الوان، اور ان کے ضمن میں اور بہت سی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں، اور وہ ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ کسی مزید غور و فکر کی بھی ضرورت نہیں، ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے، اس لئے اس کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے۔

چوتھی آیت قدرت : انسانوں کا سونا رات میں اور دن میں، اسی طرح ان کی تلاش معاش ہے رات میں اور دن میں۔ اس آیت میں تو نیند کو بھی دن رات دونوں میں بیان فرمایا ہے اور تلاشِ معاش کو بھی، اور بعض دوسری آیات میں نیند کو صرف رات میں اور تلاش معاش کو دن میں بتلایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رات میں اصل کام نیند کا ہے، اور کچھ تلاش معاش کا بھی چلتا ہے، اور دن میں اس کے برعکس اصل کام تلاش معاش کا ہے، اور کچھ سونے آرام کرنے کا بھی وقت ملتا ہے۔ اس لئے دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں بعض مفسرین نے تاویل کر کے اس آیت میں بھی نیند کو رات کے ساتھ اور تلاش معاش کو دن کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

سونا اور تلاش معاش زہد و توکل کے منافی نہیں اس آیت سے ثابت ہوا کہ سونے کے وقت سونا اور جاگنے کے وقت تلاش معاش انسان کی فطرت بنائی گئی ہے، اور ان دونوں چیزوں کا حاصل کرنا انسانی اسباب و کمالات کے تابع نہیں، بلکہ درحقیقت یہ دونوں چیزیں خاص عطاءِ حق ہیں۔ جیسا کہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات نیند اور آرام کے سارے بہتر سے بہتر سامان جمع ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی، بعض اوقات ڈاکٹری گولیاں بھی نیند لانے میں فیل ہو جاتی ہیں، اور جس کو مالک چاہتا ہے کھلی زمین پر دھوپ اور گرمی میں نیند عطا فرما دیتا ہے۔

یہی حال تحصیل معاش کا رات دن مشاہدہ میں آتا ہے کہ دو شخص یکساں علم و عقل والے برابر کے مال والے، برابر کی محنت والے تحصیلِ معاش کا یکساں ہی کام لے کر بیٹھتے ہیں ایک ترقی کر جاتا ہے دوسرا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عالمِ اسباب بڑی حکمت و مصلحت سے بنایا ہے۔ اس لئے تلاشِ معاش اسباب ہی کے ذریعہ کرنا

لازم ہے مگر عقل کا کام یہ ہے کہ حقیقت شناسی سے دور نہ ہو ان اسباب کو اسباب ہی سمجھے اور اصل رازق اسباب کے بنانے والے کو سمجھے۔

اس آیتِ قدرت کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو بات کو دھیان دے کر سنتے ہیں"، اس میں سننے پر مدار رکھنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ دیکھنے میں تو نیند خود بخود آجاتی ہے جب آدمی ذرا آرام کی جگہ کر کے لیٹ جائے۔ اسی طرح معاش کا حصول محنت مزدوری تجارت وغیرہ سے ہو جاتا ہے۔ اس لئے دستِ قدرت کی کارسازی ظاہری نظروں سے مخفی رہتی ہے، وہ اللہ کا پیام لانے والے انبیاء بتلاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ نشانیاں انہی کو کارآمد ہوتی ہیں جو بات کو دھیان دے کر سنیں، اور جب سمجھ میں آجائے تو تسلیم کر لیں، ہٹ دھرمی اور ضد نہ کریں۔

پانچویں آیت قدرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو بجلی کا کوندنا دکھاتے ہیں جس میں اس کے گرنے اور نقصان پہونچانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے پیچھے بارش کی امید بھی اور پھر بارش نازل فرماتے ہیں۔ اور اس خشک بے جان زمین کو زندہ تروتازہ کر کے اس میں طرح طرح کے درخت اور پھل پھول اگاتے ہیں۔ اس کے آخر میں فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، کیونکہ برق و باراں اور ان کے ذریعہ حاصل ہونے والی نباتات اور ان کے پھل پھول کی تخلیق منجانب اللہ ہونا یہ عقل و حکمت ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

چھٹی آیت قدرت یہ ہے کہ آسمان و زمین کا قیام اللہ ہی کے امر سے ہے، اور جب اس کا امر یہ ہو گا کہ یہ نظام توڑ پھوڑ دیا جائے تو یہ سب مضبوط مستحکم چیزیں جن میں ہزاروں سال چل کر بھی کہیں کوئی نقصان یا خلل نہیں آتا، دم کے دم میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائیں گی، اور پھر اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے دوبارہ سب مُردے زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

یہ چھٹی آیت قدرت درحقیقت پہلی سب آیات کا ماحصل اور مقصد ہے، اسی کے سمجھانے کے لئے اس سے پہلی پانچ آیتیں بیان فرمائی ہیں، اور اس کے بعد کئی آیات تک اسی مضمون کا ذکر فرمایا ہے۔

لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى، لفظ مَثَل بفتح میم و ثاء، ہر ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دوسرے سے کچھ مماثلت اور مناسبت رکھتی ہو بالکل اس جیسی ہونا اس کے مفہوم میں

داخل نہیں اسی لئے حق تعالیٰ کے لئے مثل ہونا تو قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، ایک یہیں، دوسرے فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ، لیکن مثل اور مثال سے حق تعالیٰ کی ذات پاک اور وراء الوراء ہے۔ واللہ اعلم

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ

بتلائی تم کو ایک مثل تمہارے اندر سے دیکھو جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں

اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ

ان میں ہیں کوئی ساجھی تمہارے ہماری دی ہوئی روزی میں کہ تم سب اس میں برابر ہو

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

خطرہ رکھو ان کا جیسے خطرہ رکھو اپنوں کا، یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں

لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ

ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں، بلکہ چلتے ہیں یہ بے انصاف اپنی خواہشوں پر

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ

بن سمجھے، سو کون سمجھائے جن کو اللہ نے بھٹکایا، اور کوئی نہیں اُن کا

نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ

مددگار، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہوکر وہی تراش اللہ کی

الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ

جس پر تراشا لوگوں کو بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو یہی ہے

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

دین سیدھا، ولیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے،

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا

سب رجوع ہو کر اس کی طرف اور اس سے ڈرتے رہو اور قائم رکھو نماز اور مت ہو

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ

شرک کرنے والوں میں ، جنھوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہو گئے ان میں بہت فرقے

كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ

ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر غش ہے ، اور جب پہنچے لوگوں کو کچھ سختی

دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً

تو پکاریں اپنے رب کو اس کی طرف رجوع ہو کر پھر جہاں چکھائی ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی

اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ

اسی وقت ایک جماعت ان میں اپنے رب کا شریک لگی بتانے ، کہ منکر ہو جائیں ہمارے دئیے ہوئے سے

فَتَمَتَّعُوْا ٚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا

سو مزے اڑا لو اب آگے جان لوگے ، کیا ہم نے ان پر اُتاری ہے کوئی سند

فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ

سو وہ بول رہی ہے جو یہ شریک بتاتے ہیں ، اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو

رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ

کچھ مہربانی اس پر پھولے نہیں سماتے ، اور اگر آ پڑے اُن پر کچھ بُرائی اپنے ہاتھوں کے

اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ

بھیجے ہوئے پر تو آس توڑ بیٹھیں ، کیا نہیں دیکھ چکے کہ اللہ پھیلا دیتا ہے

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

روزی جس پر چاہے اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو

يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ

جو یقین رکھتے ہیں ، سو تو دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور

السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ؗ وَ

مسافر کو ، یہ بہتر ہے اُن کے لئے جو چاہتے ہیں اللہ کا مُنہ اور

أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِىْٓ

وہی ہیں جن کا بھلا ہے ، اور جو دیتے ہو بیاج پر کہ بڑھتا رہے لوگوں

اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ

کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں اور جو دیتے ہو پاک دل سے

تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَللّٰهُ

چاہ کر رضامندی اللہ کی سو یہ وہی ہیں جن کے دونے ہوئے ، اللہ

الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ

وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر تم کو روزی دی پھر تم کو مارتا ہے پھر تم کو جلائے گا ،

هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَىْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ

کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو کر سکے ان کاموں میں سے ایک کام وہ نرالا ہے

وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور بہت اوپر ہے اس سے کہ شریک بتلاتے ہیں ۔

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (شرک کو مذموم و باطل ثابت کرنے کے لئے) تم سے ایک مضمون عجیب تمہارے ہی حالات میں سے بیان فرماتے ہیں (وہ یہ کہ غور کرو) کیا تمہارے غلاموں میں کوئی شخص تمہارا اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہے کہ تم اور وہ (باعتبار اختیارات کے) اس میں برابر ہوں جن کا تم (تصرفات کے وقت) ایسا خیال کرتے ہو جیسا اپنے آپس (کے شریک وسہیم آزاد خود مختار کا) خیال کیا کرتے ہو (اور ان سے اجازت لے کر تصرفات کیا کرتے ہو یا کم از کم اندیشۂ مخالفت ہی ان سے رہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ غلام اس طرح شریک نہیں ہوتا۔ پس جب تمہارا غلام جو نوع بشر اور بہت سی چیزوں میں تمہارا شریک ہے اور تمہیں جیسا ہے، فرق صرف ایک چیز میں ہے کہ تم مال و دولت کے مالک ہو وہ نہیں اس کے باوجود جب وہ تمہارے خاص حقِ تصرف میں تمہارا شریک نہیں ہو سکتا تو تمہارے قرار دیئے ہوئے معبودات باطلہ جو کہ حق تعالیٰ کے غلام ہیں اور کسی کمال ذاتی یا وصفی میں

خدا تعالیٰ کے مماثل نہیں، بلکہ بعض تو ان میں سے مخلوقاتِ الٰہیہ کے مصنوع ہیں۔ یہ معبودین حق تعالیٰ کے خاص حق معبودیت میں کس طرح اس کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہم نے جس طرح یہ دلیل شافی کافی بطلانِ شرک کی بیان فرمائی، ہم اسی طرح سمجھداروں کے لئے دلائل صاف صاف بیان کرتے رہتے ہیں (اور مقتضایہ تھا کہ وہ لوگ حق کا اتباع اختیار کر لیتے اور شرک چھوڑ دیتے مگر وہ حق کا اتباع نہیں کرتے) بلکہ ان ظالموں نے بلا (کسی صحیح) دلیل (کے محض) اپنے خیالات (فاسدہ) کا اتباع کر رکھا ہے سو جس کو (اس کی ہٹ دھرمی اور عناد و اصرار علی الباطل کی وجہ سے) خدا (ہی) گمراہ کرے اس کو کون راہ پر لاوے (اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ معذور ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ غم نہ کریں آپ کا جو کام تھا وہ آپ کر چکے، اور جب ان گمراہوں کو عذاب ہونے لگے گا تو) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا اور جب اوپر کے مضمون سے توحید کی حقیقت واضح ہوگئی) تو (مخاطبین میں سے ہر ہر شخص سے کہا جاتا ہے کہ) تم (ادیان باطلہ سے) یک سو ہو کر اپنا رُخ اس دین (حق) کی طرف رکھو اور (سب) اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس (قابلیت) پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (مطلب فطرۃ اللہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں خلقۃً یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر حق کو سننا اور سمجھنا چاہے تو وہ سمجھ میں آجاتا ہے، اور اس کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے، اور اس کے مقتضا پر عمل کرے غرض اس فطرت کا اتباع چاہئے اور) اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے پس سیدھا (رستہ) دین (کا) یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس کو بوجہ عدمِ تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے اس کا اتباع نہیں کرتے غرض) تم خدا کی طرف رجوع ہو کر فطرتِ الٰہیہ کا اتباع کرو اور اس (کی مخالفت اور مخالفت کے عذاب) سے ڈرو اور (اسلام قبول کر کے) نماز کی پابندی کرو (جو توحید کا عملی اظہار ہے) اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو، جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا (یعنی حق تو یہ ایک تھا اور باطل بہت ہیں انھوں نے حق کو چھوڑ دیا اور باطل کی مختلف راہیں اختیار کر لیں، یہ ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے کہ ایک نے ایک راہ لے لی دوسرے نے دوسری) اور بہت سے (مختلف) گروہ ہوگئے (اور اگر حق پر رہتے تو ایک گروہ ہوتے اور باوجود اس کے کہ ان حق کے چھوڑنے والوں میں سب کے طریقے باطل ہیں، مگر پھر بھی غایت جہل سے ان میں) ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہیں جو ان کے پاس ہے اور (جس توحید کی طرف ہم بلاتے ہیں باوجود اس کے انکار اور خلاف کرنے کے اضطرار کے وقت عام طور پر

لوگوں کے حال وقال سے اس کا اظہار واقرار بھی ہونے لگتا ہے جس سے مضمونِ توحید کے فطری ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ) جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے (اس وقت بے قرار ہوکر) اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتے ہیں (اور سب معبودین کو چھوڑ دیتے ہیں مگر) پھر (قریب ہی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) جب اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو بس ان میں سے بعض لوگ (پھر) اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو (آرام وعیش) ان کو دیا ہے اس کی ناشکری کرتے ہیں (جو عقلاً بھی قبیح ہے) سو (خیر) چند روز اور حظ حاصل کر لو پھر جلدی تم (حقیقت) معلوم کر لوگے (اور یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خصوصاً اقرار توحید کے بعد تو ان سے کوئی پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے) کیا ہم نے ان پر کوئی سند (یعنی کوئی کتاب) نازل کی ہے کہ وہ ان کو خدا کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہو (یعنی ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نقلی بھی نہیں، اور مقتضائے بداہتِ عقل کے خلاف ہونا خود ان کی تسلیم سے حالتِ اضطرار میں ظاہر ہو جاتا ہے، پس سرتاسر باطل ٹھہرا) اور (آگے مضمون بالا کا تتمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ) ہم جب (ان) لوگوں کو کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس سے (اس طرح) خوش ہوتے ہیں (کہ خوشی میں مست ہوکر شرک کرنے لگتے ہیں جیسا اوپر ذکر آیا) اور اگر ان کے اعمالِ (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو بس وہ لوگ ناامید ہو جاتے ہیں (اس مقام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تتمہ میں اصل مقصود پہلا جملہ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ ہے کہ اس میں ان کے مبتلائے شرک ہونے کا سبب بدمست اور غافل ہونا مذکور ہے، دوسرا جملہ محض تقابل کی مناسبت سے ذکر کر دیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں حالتوں میں اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بہت کم اور ضعیف ہے، ذرا ذرا سی چیز اس تعلق کو فراموش کر دیتی ہے۔ آگے اسی کی دوسری دلیل ہے کہ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں تو) کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے کم دیتا ہے (اور مشرکین کے نزدیک یہ مسلّم بھی تھا کہ روزی کا گھٹانا بڑھانا اصل میں خدا ہی کا کام ہے، بقولہٖ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) اس (امر) میں (بھی توحید کی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (یعنی وہ سمجھتے ہیں اور دوسرے بھی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ جو شخص ایسا قادر ہو گا مستحق عبادت کا وہی ہوگا) پھر (جب دلائل توحید میں معلوم ہوا کہ رزق میں

بسط وقبض اللہ ہی کی طرف سے ہے تو اس سے ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ بخل کرنا مذموم ہے، کیونکہ بخل کرنے سے جتنا رزق مقدر ہو اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، اس لئے نیک کاموں میں خرچ کرنے سے بخل نہ کیا کر بلکہ) قرابت دار کو اس کا حق دیا کر اور (اسی طرح مسکین اور مسافر کو بھی (ان کے حقوق دیا کر جن کی تفصیل دلائل شرعیہ سے معلوم ہے) یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (ہم نے جو یہ قید لگائی کہ یہ مضمون بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا کے طلب گار ہوں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مطلق مال خرچ کر دینا موجب فلاح نہیں ہے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو چیز تم (دنیا کی غرض سے خرچ کرو گے مثلاً کوئی چیز اس غرض سے کسی کو) دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں (شامل ہو کر یعنی ان کے مِلک و قبضہ میں) پہونچ کر (تمہارے لئے) زیادہ ہو (کر آ) جاوے (جیسا نوتہ وغیرہ رسوم دنیویہ میں اکثر اسی غرض سے دیا جاتا ہے کہ یہ شخص ہمارے موقع پر کچھ اور زائد شامل کر کے دے گا) تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا (کیونکہ خدا کے نزدیک پہونچنا اور بڑھنا اس مال کے ساتھ خاص ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جائے جیسا آگے آتا ہے، اور حدیث میں بھی ہے کہ ایک تمرۂ مقبولہ اُحُدْ پہاڑ سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے، اور اُس میں نیت تھی نہیں، لہٰذا نہ مقبول ہوا نہ زائد ہوا) اور جو زکوٰۃ (وغیرہ) دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے لوگ (اپنے دیئے ہوئے کو) خدا تعالیٰ کے پاس بڑھاتے رہیں گے (جیسا ابھی حدیث کا مضمون گذرا اور یہ مضمون اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزّاق پر دلالت کرنے کی وجہ سے توحید کی تاکید کا ذریعہ ہو اس لئے یہ تبعاً آگیا، اصل مقصود توحید کا بیان ہے، اسی لئے آگے پھر اسی توحید کا ذکر ہے)۔

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو موت دیتا ہے پھر (قیامت میں) تم کو جِلائے گا (ان میں بعض امور تو مخاطبین کے اقرار سے ثابت ہیں، اور بعض دلائل سے، غرض کہ وہ ایسا قادر ہے، اب یہ بتلاؤ کہ) کہ تمہارے شرکاء میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے (اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ) وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (یعنی اس کا کوئی شریک نہیں) ÷

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں مضمون توحید کو مختلف شواہد اور دلائل اور مختلف عنوانات میں بتلایا گیا ہے جو ہر انسان کے دل میں اُتر جائے۔ پہلے ایک مثال سے سمجھایا کہ تمھارے غلام نوکر جو تمھارے ہی جیسے انسان ہیں شکل و صورت، ہاتھ پاؤں مقتضیاتِ طبعیہ سب چیزوں میں تمھارے شریک ہیں، مگر تم ان کو اپنے اقتدار و اختیار میں اپنی برابر نہیں بناتے کہ وہ بھی تمھاری طرح جو چاہیں کیا کریں جو چاہیں خرچ کریں، بالکل اپنی برابر تو کیا بناتے ان کو اپنے مال و اختیار میں ادنیٰ سی شرکت کا بھی حق نہیں دیتے، جیسے کسی جزوی اور معمولی شریک سے آپ ڈرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی تصرّف کر لیا تو وہ اعتراض کرے گا غلاموں نوکروں کو یہ درجہ بھی نہیں دیتے، تو غور کرو کہ تمام مخلوقات جن میں فرشتے، انسان اور دوسری کائنات سبھی داخل ہیں، یہ سب کے سب اللہ کی مخلوق اور اسی کے بندے اور غلام ہیں ان کو تم اللہ کے برابر یا اس کا شریک کیسے یقین کرتے ہو۔

دوسری آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ بات تو سیدھی اور صاف ہے مگر مخالف لوگ اپنی اہواءِ نفسانی کے تابع ہو کر کوئی علم و حکمت کی بات نہیں مانتے۔

تیسری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا عام مخاطب کو حکم دیا ہے کہ جب شرک کا نامعقول اور ظلم عظیم ہونا ثابت ہو گیا تو آپ سب خیالاتِ مشرکانہ کو چھوڑ کر اپنا رُخ صرف دینِ اسلام کی طرف پھیر لیجئے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۔

اس کے بعد اس دینِ اسلام کا مطابق اور مقتضائے فطرت ہونا اس طرح بیان فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، یہ جملہ پہلے جملے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا کی توضیح اور دینِ حنیف جس کے اتباع کا حکم پہلے جملے میں دیا گیا ہے اس کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے۔ اور فِطْرَتَ اللّٰهِ کی ترکیب نحوی میں منصوب ہونے کی وجہ مفسرین نے مختلف لکھی ہیں کہ لفظ اِتَّبِعْ یہاں محذوف ہے، یا لفظ اَعْنِیْ، بہرحال یہ متعین ہے کہ دینِ حنیف جس کا اتباع کا پہلے جملے میں حکم دیا گیا ہے اس کو اس جملے میں فِطْرَتَ اللّٰهِ قرار دیا ہے اور معنی اس کے خود اگلے جملے میں یہ بتلائے کہ اللہ کی فطرت سے مراد یہ ہے کہ جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

فطرت سے کیا مراد ہو؟ اس معاملہ میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں انمیں دو زیادہ مشہور ہیں

اول یہ کہ فطرت سے مراد اسلام ہے اور مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اپنی فطرت اور جبلّت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے۔ اگر اس کو گرد وپیش اور ماحول میں کوئی خراب کرنے والا اخراب نہ کردے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا۔ مگر عادۃً ہوتا یہ ہے کہ ماں باپ اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں، جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا۔ جیساکہ صحیحین کی ایک حدیث میں مذکور ہے۔ قرطبی نے اسی قول کو جمہور سلف کا قول قرار دیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہو کہ فطرت سے مراد استعداد ہے۔ یعنی تخلیقِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ہر انسان میں اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کو ماننے کی صلاحیت واستعداد موجود ہے جس کا اثر اسلام کا قبول کرنا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس استعداد سے کام لے۔

مگر پہلے قول پر متعدد اشکالات ہیں، اوّل یہ کہ خود اسی آیت میں یہ بھی آگے مذکور ہو لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اور یہاں خلق اللہ سے مراد وہی فطرۃ اللہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہو اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہیں کہ اللہ کی اس فطرت کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا، حالانکہ حدیث صحیحین میں خود یہ آیا ہے کہ پھر ماں باپ بعض اوقات بچے کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اگر فطرت کے معنی خود اسلام کے لئے جائیں جس میں تبدیلی نہ ہونا خود اسی آیت میں مذکور ہے تو حدیث مذکور میں یہودی، نصرانی بنانے کی تبدیلی کیسے صحیح ہوگی، اور یہ تبدیلی تو عام مشاہدہ ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں سے زیادہ کافر ملتے ہیں، اگر اسلام ایسی فطرت ہے جس میں تبدیلی نہ ہوسکے تو پھر یہ تبدیلی کیسے اور کیوں؟

دوسرے حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق صحیح حدیث میں ہے کہ اس لڑکے کی فطرت میں کفر تھا، اس لئے خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کیا، یہ حدیث بھی اس کے منافی ہے کہ ہر انسان اسلام پر پیدا ہوتا ہو۔

تیسرا شبہ یہ ہو کہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں اس طرح رکھدیا گیا ہے جس کی تبدیلی پر بھی اس کو قدرت نہیں تو وہ کوئی اختیاری فعل نہ ہوا پھر اس پر آخرت کا ثواب کیسا؟ کیونکہ ثواب تو اختیاری عمل پر ملتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے مطابق فقہاءِ امت کے نزدیک بچہ بالغ ہونے سے پہلے ماں باپ کے تابع سمجھا جاتا ہے، اگر ماں باپ کافر ہوں تو بچے کو بھی کافر قرار دیا جائے گا۔ اس کی تجہیز وتکفین اسلامی طرز پر نہیں کی جائے گی۔

یہ سب شبہات امام تورپشتی نے شرح مصابیح میں بیان کئے ہیں۔ اور اسی بنا پر

انھوں نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس خلقی استعداد کے متعلق یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، جو شخص ماں باپ یا کسی دوسرے کے گمراہ کرنے سے کافر ہو گیا اس میں استعداد اور قابلیتِ حق یعنی اسلام کی حقانیت کے پہچاننے کی ختم نہیں ہوئی۔ غلامِ خضر کے واقعہ میں اس کے کفر پر پیدا ہونے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں حق کو سمجھنے کی استعداد ہی نہ رہی تھی، اور چونکہ اس خداداد استعداد و قابلیت کا صحیح استعمال انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے، اس لئے اس پر ثواب عظیم کا مرتب ہونا بھی واضح ہو گیا، اور حدیث صحیحین میں جو یہ مذکور ہے کہ بچے کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، اس کا مفہوم بھی اس دوسرے معنی کے اعتبار سے واضح اور صاف ہو گیا، کہ اگرچہ اس میں استعداد اور قابلیت فطری ہے جو اللہ نے اس کی تخلیق میں رکھی تھی وہ اسلام ہی کی طرف لے جانے والی تھی، مگر عوارض اور موانع حائل ہو گئے اور اس طرف نہ جانے دیا۔ اور حضرات سلف سے جو پہلا قول منقول ہے بظاہر اس کی مراد بھی اصل اسلام نہیں، بلکہ یہی استعدادِ اسلام اور اس کی قابلیت وصلاحیت ہے۔ محدث دہلویؒ نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں جمہور کے قول کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔

اور اسی کی تائید اس مضمون سے ہوتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بے شمار قسم کی مخلوقات مختلف طبائع اور مزاج کی بنائی ہیں، ہر مخلوق کی فطرت اور جبلّت میں ایک خاص مادّہ رکھ دیا ہے، جس سے وہ مخلوق اپنی تخلیق کے منشا کو پورا کر سکے قرآن کریم میں اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مخلوق کو خالق کائنات نے کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اس مقصد کے لئے ہدایت بھی دے دی ہے، وہ ہدایت یہی مادّہ اور استعداد ہے، شہد کی مکھی میں یہ مادّہ رکھ دیا کہ وہ درختوں اور پھولوں کو پہچانے اور انتخاب کرے پھر اس کے رس کو اپنے پیٹ میں محفوظ کر کے اپنے چھتے میں لا کر جمع کرے، اسی طرح انسان کی فطرت و جبلّت میں ایسا مادّہ اور استعداد رکھ دی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے، اس کی شکر گذاری اور اطاعت شعاری کرے، اسی کا نام اسلام ہے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، مذکور الصدر تقریر سے اس جملے کا مطلب بھی واضح ہو گیا کہ اللہ کی دی ہوئی فطرت یعنی حق کو پہچاننے کی صلاحیت و استعداد میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کو غلط ماحول کافر تو بنا سکتا ہے مگر اس کی استعدادِ قبولِ حق کو بالکل فنا

نہیں کرسکتا۔

اور اسی سے اُس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، یعنی ہم نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا، بجز اس کے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت میں ہم نے عبادت کی رغبت اور استعداد رکھ دی ہے، اگر وہ اس استعداد سے کام لیں تو بجز عبادت کے کوئی دوسرا کام اس کے خلاف ہرگز سرزد نہ ہو۔

اہلِ باطل کی صحبت اور غلط ماحول سے الگ رہنا فرض ہے

آیت مذکورہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا جملہ اگرچہ بصورت خبر ہے یعنی اللہ کی اس فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا، لیکن اس میں ایک معنی امر کے بھی ہیں، کہ بدلنا نہیں چاہئے۔ اس لئے اس جملے سے یہ حکم بھی مستفاد ہوا کہ انسان کو ایسے اسباب سے بہت پرہیز کرنا چاہئے جو اس قبولِ حق کی استعداد کو معطل یا کمزور کردیں۔ اور وہ اسباب بیشتر غلط ماحول اور بُری صحبت ہے، یا اہلِ باطل کی کتابیں دیکھنا جب کہ خود اپنے مذہب اسلام کا پورا عالم اور مبصر نہ ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، پچھلی آیت میں انسان کی فطرت کو قبولِ حق کے قابل اور مستعد بنانے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اول قبولِ حق کی صورت یہ بتلائی گئی کہ نماز قائم کریں کہ وہ عملی طور پر ایمان واسلام اور اطاعتِ حق کا اظہار ہے اس کے بعد فرمایا وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، یعنی شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنی فطرت اور قبولِ حق کی استعداد سے کام نہ لیا، آگے ان کی گمراہی کا ذکر ہے:۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا، یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنھوں نے دینِ فطرت اور دینِ حق میں تفریق پیدا کردی، یا یہ کہ دینِ فطرت سے مفارق اور الگ ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے۔ شِيَعًا، شیعہ کی جمع ہے، ایسی جماعت جو کسی مقتدا کی پیرو ہو، اس کو شیعہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ فطرت تو توحید تھا جس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب انسان اس کو اختیار کرکے ایک ہی قوم ایک ہی جماعت بنتے مگر انھوں نے اس توحید کو چھوڑا، اور مختلف لوگوں کے خیالات کے تابع ہوگئے اور انسانی خیالات اور رایوں میں اختلاف ایک طبعی امر ہے، اس لئے ہر ایک نے اپنا اپنا ایک مذہب بنالیا، عوام ان کے سبب مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے، اور شیطان نے ان کو اپنے اپنے خیالات و معتقدات کو حق قرار دینے میں ایسا لگا دیا کہ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ، یعنی ان کی ہر پارٹی اپنے اپنے اعتقادات و خیالات پر مگن اور خوش ہے، اور

دوسروں کو غلطی پر بتاتی ہے، حالانکہ یہ سب کے سب گمراہی کے غلط راستوں پر پڑے ہوئے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ، اس سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ رزق کا معاملہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو پھیلا دیتا ہے اور زیادہ کردیتا ہے، اور جس کا چاہتا ہے رزق سمیٹ کر تنگ کردیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اس کے مصارف میں خرچ کرتا رہے تو اس سے اس میں کمی نہیں آتی، اور اگر کوئی خرچ کرنے میں بخل کرے اور جو کچھ اپنے پاس ہے اس کو جمع کرکے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اس سے مال میں وسعت نہیں ہوتی۔

اس مضمون کی مناسبت سے آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بقول حسن بصری ہر مخاطب انسان کو جس کو اللہ نے مال میں وسعت دی ہو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جو مال اللہ نے آپ کو دیا ہے اس میں بخل نہ کرو بلکہ اس کو ان کے مصارف میں خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اس سے تمہارے مال اور رزق میں کمی نہیں آئے گی۔ اور اس حکم کے ساتھ اس آیت میں مال کے چند مصارف بھی بیان کردیئے، اول ذوی القربیٰ دوسرے مساکین تیسرے مسافر، کہ خدا تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے مال میں سے ان لوگوں کو دو اور ان پر خرچ کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ نے تمہارے مال میں شامل کردیا ہے اس لئے ان کو دینے کے وقت ان پر کوئی احسان نہ جتلاؤ، کیونکہ حق والے کا حق ادا کرنا مقتضائے عدل و انصاف ہے کوئی احسان و انعام نہیں ہے۔

اور ذوی القربیٰ سے مراد ظاہر یہ ہے کہ عام رشتہ دار ہیں، خواہ ذو رحم محرم ہوں یا دوسرے کما ہو قول الجمہور من المفسرین، اور حق سے مراد بھی عام ہے خواہ حقوق واجبہ ہوں جیسے ماں باپ، اولاد اور دوسرے ذوی الارحام کے حقوق یا محض تبرع و احسان ہو جو رشتہ داروں کے ساتھ بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے ذوی الارحام رشتہ دار محتاج ہوں وہ ان کو چھوڑ کر دوسروں پر صدقہ کرے تو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اور ذوی القربیٰ کا حق صرف مالی امداد ہی نہیں ان کی خبر گیری، جسمانی خدمت اور کچھ نہ کرسکے تو کم از کم زبانی ہمدردی اور تسلی وغیرہ جیسا کہ حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ذوی القربیٰ کا حق اس شخص کے لئے جس کو مالی وسعت حاصل ہو یہ ہے کہ مال سے ان کی امداد کرے اور جس کو یہ وسعت حاصل

نہ ہو اس کے لئے جسمانی خدمت اور زبانی ہمدردی ہے (قرطبی)

ذوی القربیٰ کے بعد مسکین اور مسافر کا حق بتلایا گیا ہے یہ بھی اسی طرح عام ہے، وسعت ہو تو مالی امداد نہ ہو تو اچھا سلوک۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِىْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ، اس آیت میں ایک بُری رسم کی اصلاح کی گئی ہے، جو عام خاندانوں اور اہلِ قرابت میں چلتی ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر کنبہ رشتہ کے لوگ جو کچھ دوسرے کو دیتے ہیں اس پر نظر رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے وقت میں کچھ دے گا بلکہ رسمی طور پر کچھ زیادہ دے گا، خصوصاً نکاح، شادی وغیرہ کی تقریبات میں جو کچھ دیا لیا جاتا ہے اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے جس کو عرف میں نوتہ کہتے ہیں۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ اہلِ قرابت کا جو حق ادا کرنے کا حکم پہلی آیت میں دیا گیا ہے ان کو یہ حق اس طرح دیا جائے کہ نہ اُن پر احسان جتائے اور نہ کسی بدلے پر نظر رکھے۔ اور جس نے بدلے کی نیت سے دیا کہ ان کا مال دوسرے عزیز رشتہ دار کے مال میں شامل ہونے کے بعد کچھ زیادتی لے کر واپس آئے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی درجہ اور ثواب نہیں اور قرآن کریم نے اس زیادتی کو لفظ ربٰو سے تعبیر کر کے اس کی قباحت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ایک صورت سود کی سی ہوگئی

مسئلہ: ہدیہ اور ہبہ دینے والے کو اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملے گا یہ تو ایک بہت مذموم حرکت ہے، جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے۔ لیکن بطور خود جس شخص کو کوئی ہبہ عطیہ کسی دوست عزیز کی طرف سے ملے اس کے لئے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی جب اس کو موقع ملے اس کی مکافات کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جو شخص آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا تو اپنے موقع پر آپ بھی اس کو ہدیہ دیتے تھے۔ (کذا روی عن عائشہ رض، قرطبی) ہاں اس مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ

پھیل پڑی ہے خرابی جنگل میں اور دریا میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے

لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ

چکھانا چاہیے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا تاکہ وہ پھر آئیں، تو کہہ

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن
پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام پہلوں
قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ
کا بہت ان میں تھے شرک کرنے والے ، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی
الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ
راہ پر اس سے پہلے کہ آپہنچے وہ دن جسکو پھرنا نہیں اللہ کی طرف سے اس دن
يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾ مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا
لوگ جُدا جُدا ہوں گے ، جو منکر ہوا سو اس پر پڑے اس کا منکر ہونا اور جو کوئی کرے بھلے کام
فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
سو وہ اپنی راہ سنوارتے ہیں ، تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کام کئے
الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٤٥﴾
بھلے اپنے فضل سے بے شک اس کو نہیں بھاتے انکار والے

خلاصۂ تفسیر

(شرک و معصیت ایسی بری چیز ہے کہ) خشکی اور تری (یعنی تمام دنیا) میں لوگوں کے (برے) اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں (مثلاً قحط و وبا، و طوفان) تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعضے اعمال (کی سزا) کا مزہ ان کو چکھادے تاکہ وہ (اپنے ان اعمال سے) باز آجائیں (جیسا دوسری آیت میں ہے وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ اور بعض اعمال کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب اعمال پر یہ عقوبتیں مرتب ہوں تو ایک دم زندہ نہ رہیں، کقولہ تعالیٰ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ اسی معنی سے آیتِ بالا میں وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ فرمایا ہے، یعنی بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کردیتے ہیں، بعض ہی اعمال کی سزا دیتے ہیں۔ غرض جب اعمالِ بد مطلقاً سبب وبال ہیں تو شرک و کفر تو سب سے بڑھ کر موجب عذاب ہوگا اور اگر مشرکین کو اس کے ماننے میں تردّد ہو تو) آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ ملک میں چلو

ایک شبہ کا جواب احادیث صحیحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بھی موجود ہیں کہ دنیا مؤمن کے لئے جیل خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے، اور یہ کہ کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں بصورتِ مال و دولت وصحت دے دیا جاتا ہے، اور مؤمن کے اعمال کا بدلہ آخرت کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے، اور یہ کہ مؤمن کی مثال دنیا میں ایک نازک شاخ کی سی ہے، کہ ہوائیں اس کو کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھکا دیتی ہیں، کبھی سیدھا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اور یہ کہ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ، یعنی دنیا میں بلائیں سب سے زیادہ انبیاء پر آتی ہیں پھر جو اُن کے قریب ہو پھر جو اُن کے قریب ہو"

یہ تمام احادیث صحیحہ بظاہر اس آیت کے مضمون سے مختلف ہیں۔ اور عام دنیا کے مشاہدات بھی یہی بتلاتے ہیں کہ دنیا میں عام طور پر مؤمن مسلمان تنگی اور تکلیف میں اور کفار فجار عیش وعشرت میں رہتے ہیں۔ اگر آیت مذکورہ کے مطابق دنیا کے مصائب اور تکلیفیں گناہوں کے سبب سے ہوتیں تو معاملہ برعکس ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں گناہوں کو مصائب کا سبب ضرور بتلایا ہے مگر علتِ تامہ نہیں فرمایا کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آئے تو گناہ ہی کے سبب سے ہوگی۔ جس پر کوئی مصیبت آئے اس کا گناہگار ہونا ضروری ہو بلکہ عام اسباب کا جو دنیا میں دستور ہے کہ سبب واقع ہونے کے بعد اس کا مسبب اکثر واقع ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی دوسرا سبب اس کے اثر کے ظاہر ہونے سے مانع ہو جاتا ہے تو اس سبب کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، جیسے کوئی مسہل یا مُلیّن دوا، کے متعلق یہ کہے کہ اس سے اسہال ہوں گے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر بعض اوقات کسی دوسری دوا، غذا، یا ہوا وغیرہ کے اثر سے اسہال نہیں ہوتے، جو دوائیں بخار اُتارنے کی ہیں بعض اوقات ایسے عوارض پیش آجاتے ہیں کہ اُن دواؤں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، خواب آور گولیاں کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ جس کی ہزاروں مثالیں دنیا میں ہر وقت مشاہدہ کی جاتی ہیں۔

اس لئے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اصل خاصہ گناہوں کا یہ ہے کہ ان سے مصائب و آفات آئیں، لیکن بعض اوقات دوسرے کچھ اسباب اس کے منافی جمع ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے مصائب کا ظہور نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں بغیر کسی گناہ کے کوئی آفت ومصیبت آجانا بھی اس کے منافی نہیں کیونکہ آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ بغیر گناہ کے کوئی تکلیف ومصیبت کسی کو پیش نہیں آتی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو کوئی مصیبت و

آفت کسی دوسرے سبب سے پیش آجائے جیسے انبیاء و اولیاء کو جو مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کا سبب کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی آزمائش اور آزمائش کے ذریعہ ان کے درجات کی ترقی اس کا سبب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے جن آفات و مصائب کو گناہوں کے سبب سے قرار دیا ہے اس سے مراد وہ آفات و مصائب ہیں جو پوری دنیا پر یا پورے شہر یا بستی پر عام ہو جائیں، عام انسان اور جانور اُن کے اثر سے نہ بچ سکیں۔ ایسی مصائب و آفات کا سبب عموماً لوگوں میں گناہوں کی کثرت خصوصاً علانیہ گناہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ شخصی اور انفرادی تکلیف و مصیبت میں یہ ضابطہ نہیں بلکہ وہ کبھی کسی انسان کی آزمائش کرنے کے لئے بھی بھیجی جاتی ہے، اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترتا ہے تو اس کے درجاتِ آخرت بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مصیبت درحقیقت اس کے لئے رحمت و نعمت ہوتی ہے۔ اس لئے انفرادی طور پر کسی شخص کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بہت گناہگار ہے۔ اسی طرح کسی کو خوش عیش بعافیت دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ بڑا نیک صالح بزرگ ہے۔ البتہ عام مصائب و آفات جیسے قحط، طوفان، وبائی امراض، گرانی اشیاءِ ضرورت، چیزوں کی برکت مٹ جانا وغیرہ اس کا اکثر اور بڑا سبب لوگوں کے علانیہ گناہ اور سرکشی ہوتی ہے۔

فائدہ: حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا کہ اس دنیا میں خیر و شر یا مصیبت و راحت، مشقت و سہولت کے اسباب دو طرح کے ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرے باطنی، ظاہری اسباب تو وہی مادی اسباب ہیں جو عام دنیا کی نظر میں اسباب سمجھے جاتے ہیں۔ اور باطنی اسباب انسانی اعمال اور ان کی بناء پر فرشتوں کی امداد و نصرت یا اُن کی لعنت و نفرت ہیں۔ جیسے دنیا میں بارش کے اسباب اہلِ فلسفہ و اہلِ تجربہ کی نظر میں سمندر سے اُٹھنے والے بخارات (مان سون) اور پھر اوپر کی ہوا میں پہونچ کر ان کا منجمد ہونا، پھر آفتاب کی شعاعوں سے پگھل کر برس جانا ہیں، مگر روایاتِ حدیث میں ان چیزوں کو فرشتوں کا عمل بتلایا گیا ہے۔ درحقیقت ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ایک چیز کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ ظاہری اسباب یہی ہوں، اور باطنی سبب فرشتوں کا تصرف ہو۔ یہ دونوں طرح کے اسباب جمع ہو جائیں تو بارش امید اور ضرورت کے مطابق ہوا اور جہاں یہ دونوں اسباب جمع نہ ہوں وہاں بارش کے وقوع میں اختلال رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اسی طرح دنیا کے مصائب و آفات کے کچھ اسباب طبعیہ مادیہ ہیں جو نیک و بد کو نہیں پہچانتے۔ آگ جلانے کے لئے ہے وہ بلا امتیاز متقی اور فاجر کے سب کو جلائے ہی گی بجز اس کے کسی خاص فرمان کے ذریعہ اس کو اس عمل سے روک دیا جائے، جیسے نارِ نمرود ابراہیم علیہ السلام کے لئے "برد وسلام بنا دی گئی" پانی وزنی چیزوں کو غرق کرنے کے لئے ہے وہ یہی کام کرے گا، اسی طرح دوسرے عناصر جو خاص خاص کاموں کے لئے ہیں وہ اپنی مفوضہ خدمت میں لگے ہوئے ہیں، یہ اسباب طبعیہ کسی انسان کے لئے راحت و سہولت کے سامان بھی فراہم کرتے ہیں، اور کسی کے لئے مصیبت و آفت بھی بن جاتے ہیں۔

انہی اسباب ظاہرہ کی طرح مصائب و آفات اور راحت و سہولت میں مؤثر انسان کے اپنے اعمالِ خیر و شر بھی ہیں۔ جب دونوں ظاہری اور باطنی اسباب کسی فرد یا جماعت کی راحت و آرام اور سہولت و خوش عیشی پر جمع ہو جاتے ہیں تو اس فرد یا جماعت کو دنیا میں عیش و راحت مکمل طور پر حاصل ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس فرد یا جماعت کے لئے اسباب طبعیہ مادیہ بھی مصیبت و آفت لا رہے ہوں اور اس کے اعمال بھی مصیبت و آفت کے مقتضی ہوں تو اس کی مصیبت و آفت بھی مکمل ہوتی ہے جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے۔

اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب طبعیہ مادیہ تو مصیبت و آفت پر مجتمع ہیں، مگر اس کے اعمالِ حسنہ باطنی طور پر راحت و سکون کے مقتضی ہیں ایسی صورت میں یہ اسباب باطنہ اس کی ظاہری آفتوں کو دور کرنے یا کم کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں اس کی عیش و راحت مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات اسباب مادیہ عیش و آرام کے مقتضی ہوتے ہیں مگر اسباب باطنیہ یعنی اس کے اعمال بُرے ہونے کی وجہ سے ان کا تقاضا مصیبت و آفت لانے کا ہوتا ہے، تو ان متضاد تقاضوں کی وجہ سے نہ عیش و راحت مکمل ہوتی ہے اور نہ بہت زیادہ مصیبت و آفت ان کو گھیرتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات مادی اسباب طبعیہ کو کسی بڑے درجہ کے نبی و رسول اور ولی و مقبول کے لئے ناسازگار بنا کر اس کی آزمائش و امتحان کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس تفصیل کو سمجھ لیا جائے تو آیات قرآن اور مذکورہ احادیث کا باہم ارتباط اور اتفاق واضح ہو جاتا ہے تعارض و تضاد کے شبہات رفع ہو جاتے ہیں واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مصائب کے وقت ابتلاء و امتحان یا سزاء و عذاب میں فرق۔ مصائب و آفات کے ذریعہ جن لوگوں کو ان کے گناہوں کی کچھ سزا دی جاتی ہے، اور جن نیک لوگوں کو رفع درجات یا کفارۂ سیئات کے لئے بطور امتحان مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، ظاہری صورت ابتلاء کی ایک ہی سی ہوتی ہے، ان دونوں میں فرق کیسے پہچانا جائے؟ اس کی پہچان حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ لکھی ہے کہ جو نیک لوگ بطور ابتلاء و امتحان کے گرفتار مصائب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو مطمئن کر دیتے ہیں، اور وہ ان مصائب و آفات پر ایسے ہی راضی ہوتے ہیں جیسے بیمار کڑوی دوا، یا آپریشن پر باوجود تکلیف محسوس کرنے کے راضی ہوتا ہے، بلکہ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتا ہے، سفارشیں مہیا کرتا ہے۔ بخلاف اُن گنہگاروں کے جو بطور سزا مبتلاء کئے جاتے ہیں ان کی پریشانی اور جزع و فزع کی حد نہیں رہتی، بعض اوقات ناشکری بلکہ کلماتِ کفر تک پہونچ جاتے ہیں۔

سیدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے ایک پہچان یہ بتلائی کہ جس مصیبت کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اپنے گناہوں پر تنبہ اور توبہ و استغفار کی رغبت زیادہ ہو جائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ قہر نہیں بلکہ مہر اور عنایت ہے، اور جس کو یہ صورت نہ بنے بلکہ جزع و فزع اور معاصی میں اور زیادہ انہماک بڑھ جائے وہ علامت قہر الٰہی اور عذاب کی ہے۔ واللہ اعلم

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی اور تاکہ چکھائے تم کو کچھ مزہ

مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

اپنی مہربانی کا اور تاکہ چلیں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا

اور تاکہ تم حق مانو، اور ہم بھیج چکے ہیں تجھ سے پہلے کتنے رسول

اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ

اپنی اپنی قوم کے پاس سو پہنچے ان کے پاس نشانیاں لے کر پھر بدلہ لیا ہم نے ان سے جو

أَجْرَمُوا ۖ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾ اللَّهُ الَّذِي

گنہگار تھے اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی، اللہ ہے جو

يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ

چلاتا ہے ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلا دیتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے

وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۖ فَإِذَا أَصَابَ

اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ پھر تو دیکھے مینہ کو نکلتا ہے اس کے بیچ میں سے پھر جب اس کو پہنچاتا

بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَإِنْ

ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں تب ہی وہ لگتے ہیں خوشیاں کرنے، اور پہلے سے

كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ ﴿٤٩﴾

ہو رہے تھے اس کے اترنے سے پہلے ہی نا امید

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ

سو دیکھ لے اللہ کی مہربانی کی نشانیاں کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے،

إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾ وَلَئِنْ

بیشک وہی ہے مُردوں کو زندہ کرنے والا اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور اگر ہم

أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ﴿٥١﴾

بھیجیں ایک ہوا پھر دیکھیں وہ کھیتی کو کہ زرد پڑگئی تو لگیں اس کے پیچھے ناشکری کرنے

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا

سو تو سنا نہیں سکتا مُردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو پکارنا جب کہ پھیریں

مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا أَنْتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ

پیٹھ دے کر، اور نہ تو راہ سمجھائے اندھوں کو ان کے بھٹکنے سے، تو تو سنائے

إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾

اسی کو جو یقین لائے ہماری باتوں پر سو وہ مسلمان ہوتے ہیں

۵ ع ۱۳ ۸

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت و وحدت و نعمت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ (بارش سے پہلے) ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی) خوش خبری دیتی ہیں (پس ان کا بھیجنا ایک تو جی خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے) اور (نیز اس واسطے) تاکہ (اس کے بعد بارش ہو اور) تم کو اپنی (اس) رحمت (بارش) کا مزہ چکھا دے (یعنی بارش کے فوائد عنایت فرما دے) اور (نیز اس واسطے ہوا بھیجتا ہے) تاکہ (اس کے ذریعے سے بادبانی) کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ (اس ہوا کے ذریعہ سے بواسطۂ کشتی دریا کے سفر سے) تم اس کی روزی تلاش کرو (یعنی کشتیوں کا چلنا اور روزی تلاش کرنا دونوں ارسال ریاح سے حاصل ہوتے ہیں اول بلا واسطہ اور ثانی بواسطۂ کشتی کے) اور تاکہ تم شکر کرو اور (ان دلائل بالغہ اور نعم سابغہ پر بھی یہ مشرکین حق تعالیٰ کی جو ناشکریاں کرتے ہیں، یعنی شرک اور مخالفت رسول اور ایذاء مؤمنین وغیرہ، تو آپ اس پر غمگین نہ ہوں، کیونکہ ہم عنقریب ان سے انتقام لینے والے اور اس میں ان کو مغلوب اور اہل حق کو غالب کرنے والے ہیں جیسا کہ پہلے بھی ہوا ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبران کی قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائل (ثبوت حق کے) لے کر آئے (جس پر بعضے ایمان لائے اور بعضے نہ لائے) سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم کے ہوئے تھے (اور وہ جرائم تکذیب حق و مخالفت اہل حق ہیں اور اس انتقام میں ہم نے ان کو مغلوب اور اہل ایمان کو غالب کیا) اور اہل ایمان کو غالب کرنا (حسب وعدہ و عادت) ہمارے ذمہ تھا (وہ انتقام عذاب الٰہی تھا اور اس میں کفار کا ہلاک ہونا یا ان کا مغلوب ہونا ہے اور مسلمانوں کا بچ جانا ان کا غالب آنا ہے، غرض اسی طرح ان کفار سے انتقام لیا جائے گا، خواہ دنیا میں خواہ بعد موت اور یہ مضمون تسلی کا بطور جملہ معترضہ کے تھا آگے ارسال ریاح کے بعضے آثار مذکورہ بالاجمال کی تفصیل ہے کہ) اللہ ایسا (قادر و حکیم و منعم) ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو (جو کہ کبھی ان ہواؤں سے پہلے بخارات اٹھ کر بادل بن چکے ہیں اور کبھی وہ بخارات انہی ہواؤں سے بلند ہو کر بادل بن جاتے ہیں پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے یعنی فضائے آسمانی سے یا زمین سے) اٹھاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس (بادل) کو (کبھی تو) جس طرح چاہتا ہے آسمان (یعنی فضائے آسمانی) میں پھیلا دیتا ہے، اور (کبھی) اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے (بسط کا مطلب یہ ہے کہ مجتمع کر کے دور تک پھیلا دیتا ہے اور کَیْفَ یَشَآءُ کا

مطلب یہ ہے کہ کبھی تھوڑی دور تک کبھی بہت دُور تک اور کِسَفًا کا مطلب یہ کہ مجتمع نہیں ہوتا متفرق رہتا ہے) پھر (دونوں حالت میں) تم مینھ کو دیکھتے ہو کہ اس (بادل) کے اندر سے نکلتا ہے (مجتمع بادل سے برستا تو بکثرت ہے اور بعض موسموں میں اکثر بارش متفرق بدلیوں سے بھی ہوتی ہے) پھر (بادل سے نکلنے کے بعد) جب وہ (مینھ) اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہونچا دیتا ہے تو بس وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ قبل اس کے کہ ان کے خوش ہونے سے پہلے اُن پر برسے (بالکل ہی) نا امید (ہو رہے) تھے (یعنی ابھی ابھی نا امید تھے اور ابھی خوش ہوگئے۔ اور ایسا ہی مشاہدہ بھی ہے کہ انسان کی کیفیت ایسی حالت میں بہت جلدی جلدی بدل جاتی ہے) سو (ذرا) رحمتِ الٰہی (یعنی بارش) کے آثار (تو) دیکھو کہ اللہ تعالیٰ (اس کے ذریعہ سے) زمین کو اس کے مُردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد کس طرح زندہ (یعنی تر و تازہ) کرتا ہے (اور یہ بات نعمت اور دلیلِ وحدت ہونے کے علاوہ اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر پوری قدرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا نے مردہ زمین کو زندہ کر دیا) کچھ شک نہیں کہ وہی (خدا) مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے (پس عقلاً ممکن ہونے میں دونوں برابر اور قدرت ذاتی دونوں کے ساتھ برابر اور مشاہدہ میں دونوں کاموں کا یکساں ہونا یہ سب چیزیں اس استبعاد کو دفع کرنے والی ہیں کہ مرنے کے بعد پھر کیسے زندہ ہوں گے) اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (یہ مضمون احیاء موتیٰ کا بمناسب حیاتِ ارض کے جملۂ معترضہ تھا) اور (آگے پھر بارش و ریاح کے متعلق مضمون ہے جس میں اہلِ غفلت کی ناشکری کا بیان ہے۔ یعنی اہلِ غفلت ایسے حق ناشناس و ناسپاس ہیں کہ اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے بعد) اگر ہم ان پر اور (قسم کی) ہوا چلا دیں پھر (اس ہوا سے) یہ لوگ کھیتی کو (خشک اور) زرد دیکھیں (کہ اس کی سبزی اور شادابی جاتی رہی) تو یہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں (اور پچھلی نعمتیں سب طاقِ نسیاں میں رکھ دیں) سو (جب ان کی غفلت اور ناشکری پر اقدام اس درجہ میں ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بالکل ہی بے حس ہیں تو ان کے عدمِ ایمان و عدمِ تدبر پر غم بھی بے کار ہے، کیونکہ) آپ مُردوں کو (تو) نہیں سنا سکتے اور بہروں کو (بھی) آواز نہیں سنا سکتے (خصوصاً) جب کہ پیٹھ پھیر کر چل دیں (کہ اشارہ کو بھی نہ دیکھیں) اور (اسی طرح) آپ (ایسے) اندھوں کو (جو کہ بصیر کا اتباع نہ کریں) اُن کی بے راہی سے راہ پر نہیں لا سکتے (یعنی یہ تو مادّۃ الحواس والحیٰوۃ کے مشابہ ہیں) آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں (اور جب یہ لوگ مُردوں بہروں اندھوں کے مشابہ ہیں پھر ان سے توقع ایمان کی نہ رکھئے اور غم نہ کیجئے)

معارف و مسائل

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۚ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"ہم نے مجرموں کا فروں سے انتقام لے لیا اور ہمارے ذمہ تھا کہ ہم مومنین کی مدد کرتے"۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا تقاضا بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں کبھی شکست نہ ہو، حالانکہ بہت سے واقعات اس کے خلاف بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے کہ مومنین سے مراد وہ مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں جو خالص اللہ کے لئے کفار سے جنگ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ہی انتقام اللہ تعالیٰ مجرمین سے لیتے ہیں اور ان کو غالب کرتے ہیں، جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی صورت پیش آتی ہے وہاں عموماً مجاہدین کی کوئی لغزش ان کی شکست کا سبب بنتی ہے جیسے غزوۂ احد کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا "یعنی شیطان نے ان لوگوں کو لغزش دے دی، ان کے بعض اعمال کی غلطی کے سبب" اور ایسے حالات میں بھی انجام کار اللہ تعالیٰ پھر انہی کو غلبہ اور فتح عطا فرما دیتے ہیں، جبکہ ان کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو جائے جیسا غزوۂ احد میں ہوا۔ اور جو لوگ محض اپنا نام مومن مسلمان رکھ لیں، احکام خداوندی سے غفلت و سرکشی کے عادی ہوں، اور غلبۂ کفار کے وقت بھی اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں وہ اس وعدہ میں شامل نہیں، وہ نصرت الٰہیہ کے مستحق نہیں ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بغیر کسی استحقاق کے بھی نصرت و غلبہ عطا فرما دیتے ہیں، اس کی امید رکھنا اور اس سے دعاء مانگنا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى، اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے رہا یہ معاملہ کہ مُردوں میں سننے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور عام مُردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ کی مختصر تحقیق معارف القرآن سورۂ نمل کی تفسیر میں گذر چکی ہے، اور مکمل تحقیق احقر کے مستقل رسالہ بزبانِ عربی میں ہے جس کا نام "تکمیل الحبور بسماع اہل القبور" ہے، اور جو احکام القرآن بزبان عربی کے حزب خامس کا جز ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً

اللہ ہے جس نے بنایا تم کو کمزوری سے پھر دیا کمزوری کے پیچھے زور

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ

پھر دے گا زور کے پیچھے کمزوری اور سفید بال بناتا ہے جو کچھ چاہے اور وہ

الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬

ہے سب کچھ جانتا کر سکتا ، اور جس دن قائم ہوگی قیامت قسمیں کھائیں گنہگار ،

مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ

کہ ہم نہیں رہے تھے ایک گھڑی سے زیادہ اسی طرح تھے اُلٹے جاتے ، اور کہیں گے جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ

ملی ہے سمجھ اور یقین تمہارا ٹھہرنا تھا اللہ کی کتاب میں جی اُٹھنے کے

الْبَعْثِ ۫ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

دن تک سو یہ ہے اُٹھنے کا دن پر تم نہیں تھے جانتے ،

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ

اس دن کام نہ آئے گا اُن گنہگاروں کو قصور بخشوانا اور نہ اُن سے

یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

کوئی منانا چاہے ، اور ہم نے بٹھلائی ہے آدمیوں کے واسطے اس قرآن میں

مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا

ہر ایک طرح کی مثل ، اور جو تو لائے ان کے پاس کوئی آیت تو ضرور کہیں وہ منکر

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا

تم سب جھوٹ بناتے ہو ، یوں مہر لگا دیتا ہے اللہ ان کے دلوں پر جو سمجھ

یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۶

نہیں رکھتے ، سو تو قائم رہ بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور اکھاڑ نہ دیں تجھ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے

خلاصۂ تفسیر

اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا (مراد اس سے ابتدائی حالت بچپن کی ہے) پھر (اس) ناتوانی کے بعد توانائی (یعنی جوانی) عطا کی پھر (اس) توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا (اور) وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ (ہر تصرف کو) جاننے والا (اور اس تصرف کے نافذ کرنے پر) قدرت رکھنے والا ہے (پس جو ایسا قادر ہو اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ یہ تو بیان تھا بعث کے امکان کا) اور (آگے اس کے وقوع کا بیان ہے یعنی) جس روز قیامت ہوگی مجرم (یعنی کافر) لوگ (وہاں کی ہول وہیبت و پریشانی کو دیکھ کر قیامت کی آمد کو غایت درجہ ناگوار سمجھ کر) قسم کھا بیٹھیں گے کہ (قیامت بہت جلدی آگئی اور) وہ لوگ (یعنی ہم لوگ عالم برزخ میں) ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے (یعنی جو میعاد قیامت کے آنے کی مقرر تھی وہ بھی پوری نہ ہونے پائی کہ قیامت آپہنچی جیسا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اگر پھانسی والے کی میعاد ایک ماہ مقرر کی جاوے تو جب مہینہ گذر چکے گا تو اس کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا مہینہ نہیں گذرا اور مصیبت جلدی آگئی، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) اسی طرح یہ لوگ (دنیا میں) اُلٹے چلا کرتے تھے (یعنی جس طرح یہاں آخرت میں قیامت کے قبل از وقت آجانے پر قسمیں کھانے لگے، اسی طرح دنیا میں قیامت کے وجود ہی کے منکر تھے اور نہ آنے پر قسمیں کھایا کرتے تھے) اور جن لوگوں کو ایمان اور علم عطا ہوا ہے (مراد اہل ایمان ہیں کہ اخبار شرعیہ کا علم ان کو حاصل ہے) وہ (ان مجرمین کے جواب میں) کہیں گے کہ (تم برزخ میں میعاد سے کم تو نہیں رہے، تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ) تم تو (میعاد) نوشتہ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے، سو قیامت کا دن یہی ہے، (جو میعاد مقرر تھی برزخ میں رہنے کی) ولیکن (وجہ اس بات کی کہ قیامت کو میعاد سے پہلے آیا ہوا سمجھتے ہو یہ ہے کہ) تم (دنیا میں قیامت کے وقوع کا) یقین (اور اعتقاد) نہ کرتے تھے (بلکہ تکذیب و انکار کیا کرتے تھے اس انکار کے وبال میں آج پریشانی کا سامنا ہوا اس وجہ سے گھبرا کر یہ خیال ہوا کہ ابھی تو میعاد پوری بھی نہیں ہوئی اور اگر تصدیق کرتے اور ایمان لے آتے تو اس کے وقوع کو جلدی نہ سمجھتے بلکہ یوں چاہتے کہ اس سے بھی جلدی آجاوے، کیونکہ انسان جب اس سے کسی راحت و آرام کا وعدہ ہو تو طبعی طور پر اس کا جلدی آنا چاہتا ہے اور انتظار شاق اور اس کی مدت طویل معلوم ہوا کرتی ہے۔ جیسا حدیث میں بھی ہے

کہ کافر قبر میں کہتا ہے رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ اور مؤمن کہتا ہے رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ، اور مؤمنین کے اس جواب سے بھی جو یہاں مذکور ہے کہ مقامِ برزخ کو انھوں نے بہت سمجھا ہے، یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ مشتاق تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ جلد آجاوے) غرض اس روز ظالموں (یعنی کافروں کی پریشانی اور مصیبت کی یہ کیفیت ہوگی کہ ان) کو ان کا (کسی قسم کا جھوٹا سچا) عذر کرنا نفع نہ دے گا اور نہ اُن سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جاوے گا (یعنی ان کا موقع نہ دیا جاوے گا کہ توبہ کرکے خدا کو راضی کرلیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے اس قرآن (کے مجموعہ یا اس کے اس خاص جزو یعنی اس سورۃ) میں ہر طرح کے عمدہ (اور عجیب) مضامین (ضروریہ) بیان کئے ہیں (جو اپنی بلاغت اور کمال کی وجہ سے مقتضی اس کو ہیں کہ ان کافروں کو ہدایت ہوجاتی، مگر ان لوگوں نے غایتِ عناد سے اس کو قبول نہ کیا اور اس سے منتفع نہ ہوئے) اور (قرآن کی کیا تخصیص ہے ان لوگوں کا عناد اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ) اگر (قرآن کے علاوہ ان معجزات سے جن کی یہ خود فرمائش کیا کرتے ہیں) آپ اُن کے پاس کوئی نشان لے آئیں تب بھی یہ لوگ جو کہ کافر ہیں یہی کہیں گے کہ تم سب (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین جو آیات تشریعیہ وتکوینیہ کی تصدیق کرتے ہیں) نرے اہلِ باطل ہو (پیغمبر کو سحر کی تہمت لگا کر صاحبِ باطل کہیں اور مسلمانوں کو سحر کی تصدیق کرنے سے اہلِ باطل کہیں اور ان لوگوں کے اس عناد کے بارے میں اصل بات یہ ہے کہ) جو لوگ (باوجود مکرر نشانیاں اور دلائلِ حق ظاہر ہونے کے) یقین نہیں کرتے (اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر یوں ہی مُہر کردیا کرتا ہے (جیسا کہ ان کے دلوں پر ہو رہی ہے، یعنی روزانہ استعداد قبولِ حق کی مضمحل وضعیف ہوتی جاتی ہے، اس لئے انقیاد میں ضعف اور عناد میں قوت بڑھتی جاتی ہے) سو (جب یہ ایسے معاندین ہیں تو ان کی مخالفت اور ایذاء رسانی اور بدکلامی وغیرہ پر) آپ صبر کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ کا وعدہ (کہ آخر میں یہ ناکام اور اہلِ حق کامیاب ہوں گے) سچا ہے (وہ وعدہ ضرور واقع ہوگا پس صبر وتحمل تھوڑے ہی دن کرنا پڑتا ہے) اور یہ بد یقین لوگ آپ کو بے برداشت نہ کرنے پائیں (یعنی ان کی طرف سے خواہ کیسی ہی بات پیش آئے مگر ایسا نہ ہو کہ آپ برداشت نہ کریں)۔

معارف و مسائل

اس سورت کا بڑا حصہ منکرین قیامت کے شبہات کے ازالہ سے متعلق ہے جس کے لئے حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی بہت سی آیات اور نشانیاں دکھلا کر غافل انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کا سامان کیا گیا ہے۔ مذکور الصدر پہلی آیت میں ایک نئے انداز سے اسی مضمون کا اثبات ہے وہ یہ کہ انسان اپنی طبیعت سے جلد باز واقع ہوا ہے اور سامنے کی چیزوں میں لگ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینے کا عادی ہے، اور اس کی یہی عادت اس کو بہت سی مہلک غلطیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ جس وقت انسان جوان ہوتا ہے اس کی قوت اپنے شباب پر ہوتی ہے، یہ اپنی قوت کے نشہ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، حدود پر قائم رہنا اس کو دو بھر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو متنبہ کرنے کے لئے اس آیت میں قوت و ضعف کے اعتبار سے انسانی وجود کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں دکھلایا ہے کہ انسان کی ابتداء بھی کمزور ہے، اور انتہا بھی، درمیان میں بہت تھوڑے دنوں کے لئے اس کو ایک قوت ملتی ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس چند روزہ قوت کے زمانہ میں اپنی پہلی کمزوری اور آنے والی کمزوری سے کبھی غافل نہ ہو، بلکہ اپنی اس کمزوری کے مختلف درجات کو ہمیشہ سامنے رکھے۔ جن سے گذر کر یہ قوت و شباب تک پہونچا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ میں انسان کو یہی سبق دیا گیا کہ اپنی اصل بنیاد کو دیکھ کس قدر ضعیف بلکہ عین ضعف ہے کہ ایک قطرہ بے جان، بے شعور، ناپاک، گھناؤنی چیز ہے۔ اس میں غور کر کہ کس کی قدرت و حکمت نے اس گھناؤنے قطرہ کو ایک خون منجمد کی صورت میں پھر خون کو گوشت کی صورت میں پھر اس گوشت کے اندر ہڈیاں پیوست کرنے میں تبدیلیاں کیں۔ پھر اس کے اعضاء و جوارح کی نازک نازک مشینیں بنائیں کہ یہ ایک چھوٹا سا وجود ایک چلتی پھرتی فیکٹری بن گیا، جس میں سیکڑوں عجیب و غریب خودکار مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ اور زیادہ غور سے کام لو تو ایک فیکٹری نہیں بلکہ ایک عالم اصغر ہے کہ پورے جہان کے نمونے اس کے وجود میں شامل ہیں۔ اس کی تخلیق و تکوین بھی کسی بڑے ورکشاپ میں نہیں، بلکہ بطنِ مادر کی تین اندھیریوں میں ہوئی۔ اور نو مہینے اسی تنگ و تاریک جگہ میں بطنِ مادر کے خون اور آلائشوں سے غذا پاتے ہوئے حضرتِ انسان کا وجود تیار ہوا۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ظہور کے لئے راستہ آسان فرما دیا اس عالم میں آئے تو ان کی شان یہ تھی کہ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

شَيْئًا، یعنی تمہیں شکم مادر سے اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اب قدرت نے تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلا ہنر رونے کا سکھلایا جس سے ماں باپ متوجہ ہو کر اس کی بھوک پیاس اور ہر تکلیف کو دور کرنے پر لگ جائیں۔ پھر ہونٹوں، مسوڑوں کو دبا کر ماں کی چھاتیوں سے دودھ نکالنے کا ہنر سکھلایا جس سے وہ اپنی غذا حاصل کرے۔ کس کی مجال تھی جو اس لایعقل بچے کو یہ دونوں ہنر سکھا دے جو اس کی موجودہ ساری ضرورتوں کی کفالت کرتے ہیں، بجز اس قدرت کے جو اس کی تخلیق کی مالک ہے۔ اب ضعیف بچہ ہے ذرا ہوا لگ جائے تو بے مردہ ہو جائے، ذرا سردی یا گرمی لگ جائے تو بیمار ہو جائے نہ اپنی کسی ضرورت کو مانگ سکتا ہے، نہ کسی تکلیف کو دور کر سکتا ہے۔ یہاں سے چلئے اور جوانی کے عالم تک اس کی تدریجی منازل تک غور کرتے جائیے تو قدرت حق جل شانہٗ کا ایسا عظیم شاہکار سامنے آئے گا کہ عقل حیران رہ جائے گی۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً، اب یہ قوت کی منزل میں پہونچے تو زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے، چاند اور مریخ پر کمند پھینکنے لگے، بحر و بر پر اپنے قبضے جمانے لگے، اپنے ماضی و مستقبل سے غافل ہو کر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (ہم سے زیادہ کون قوی ہو سکتا ہے) کے نعرے لگانے لگے۔ یہاں تک کہ اسی قوت کے نشہ میں اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے اور اس کے احکام کی پیروی کو بھی۔ مگر قدرت نے اس کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا:۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً، کہ غافل! خوب سمجھ لے کہ یہ قوت تیری چند روزہ ہے۔ پھر اسی ضعف کے عالم کی طرف لوٹنا ہے، اور اسی تدریج سے ضعف بڑھنا شروع ہوگا جس کا اثر ایک وقت کے بعد شَيْبَة بالوں کی سفیدی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور پھر سب ہی اعضاء و جوارح کی شکل و صورت میں تبدیلیاں لائے گا۔ دنیا کی تاریخ اور دوسری کتابیں نہیں خود اپنے وجود میں لکھی ہوئی اس مخفی تحریر کو پڑھ لو تو اس یقین کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ يَخْلُقُ مَا يَشَاۤءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ، کہ یہ سب کارسازی اس رب العزت کی ہے جو پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور علم میں بھی سب سے بڑا ہے اور قدرت میں بھی۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کچھ شبہ کی گنجائش رہ گئی، کہ وہ جب چاہے مُردوں کو دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔

آگے پھر منکرین قیامت کی لغو گوئی اور ان کی جہالت کا بیان ہے، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ، یعنی جس روز قیامت قائم ہوگی تو یہ منکرین قیامت اس وقت کے ہولناک مناظر سے مدہوش ہو کر یہ قسمیں کھانے لگیں گے

کہ ہمارا قیام تو ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہا۔ مراد اس قیام سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کا قیام ہو کیونکہ ان کی دنیا آرام وعیش سے گذری تھی اور اب مصائب شدیدہ سامنے آئے تو جیسے انسان کی طبعی عادت ہے کہ راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھا کرتا ہے اس لئے قسمیں کھا جائیں گے کہ دنیا میں تو ہمارا قیام بہت ہی مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس قیام سے مراد قبر اور برزخ کا قیام ہو، اور مطلب یہ ہو کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ قبر یعنی عالم برزخ میں قیام بہت طویل ہوگا اور قیامت بہت زمانہ کے بعد آئے گی، مگر معاملہ برعکس ہو گیا، کہ ہم برزخ میں تھوڑے ہی دیر ٹھہرنے پائے تھے کہ قیامت آگئی۔ اور یہ جلدی آنا ان کو اس بناء پر محسوس ہوگا کہ قیامت میں ان کے لئے کوئی خوشی وراحت کی چیز تو تھی نہیں، مصیبت ہی مصیبت تھی۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ مصیبت آنے کے وقت پچھلی راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھنے لگتا ہے اور کافروں کو اگرچہ قبر و برزخ میں بھی عذاب ہوگا مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ بھی راحت محسوس ہونے لگے گا، اور اس زمانے کو مختصر سمجھ کر قسم کھائیں گے کہ قبر میں ہمارا قیام بہت مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

کیا محشر میں اللہ کے سامنے کوئی جھوٹ بول سکے گا؟

اس آیت سے معلوم ہوا کہ محشر میں کفار قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ ہم تو دنیا میں یا قبر میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، اسی طرح ایک دوسری آیت میں مشرکین کا یہ قول مذکور ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔ وجہ یہ ہے کہ محشر میں رب العالمین کی عدالت قائم ہوگی وہ سب کو آزادی دیں گے کہ جو چاہے بیان دے، جھوٹ بولے یا سچ بولے۔ کیونکہ رب العزت کو ذاتی علم بھی پورا پورا ہے، اور عدالتی تحقیقات کے لئے وہ ان کے اقرار کرنے نہ کرنے کا محتاج نہیں، جب انسان جھوٹ بولے گا تو اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اور کھال وبال سے شہادت لی جاوے گی وہ سچ سچ سارا واقعہ بیان کر دیں گے، جس کے بعد اس کو کوئی حجت باقی نہ رہے گی، اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ الآیۃ کا یہی مطلب ہے۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں مختلف مواقف ہوں گے، ہر موقف کے حالات الگ ہیں۔ ایک موقف وہ بھی ہوگا جس میں بغیر اذنِ الٰہی کسی کو بولنے کا اختیار نہ ہوگا اور وہ صرف سچ اور صحیح بات ہی بول سکے گا، جھوٹ پر قدرت نہ ہوگی، جیسا ارشاد ہے: لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ

صَوَابًا۔

قبر میں کوئی جھوٹ نہ بول سکے گا اس کے برخلاف قبر کے سوال و جواب میں احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ جب کافر سے پوچھا جائے گا کہ تیرا رب کون ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ تو وہ کہے گا، ھَاہْ ھَاہْ لَا اَدْرِی، یعنی ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا اگر وہاں جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو کیا مشکل تھا، کہہ دیتا کہ میرا رب اللہ ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تو یہ ایک عجیب بات ہے کہ کافر لوگ اللہ کے سامنے تو جھوٹ بولنے پر قادر ہوں اور فرشتوں کے سامنے جھوٹ نہ بول سکیں۔ مگر غور کیا جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں، وجہ یہ ہے کہ فرشتے نہ تو عالم الغیب ہیں، نہ ان کو یہ اختیار ہے کہ ہاتھ پاؤں کی گواہی لے کر اس پر حجت تمام کردیں، اگر ان کے سامنے جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو سب کافر فاجر عذابِ قبر سے بے فکر ہو جاتے، بخلاف اللہ جل شانہ کے کہ وہ دلوں کے حال سے بھی واقف ہیں۔ اور اعضاء و جوارح کی شہادت سے اس کا جھوٹ کھول دینے پر قادر بھی ہیں۔ اس لئے محشر میں یہ آزادی دے دینا عدالتی انصاف میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم :

تمّت

سورۃ الرّوم بحمد اللہ فی یوم السبت ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ